سندھ

ایک عام جائزہ

ایچ ٹی لیمبرک

مترجم: مظہر یوسف

سندھی ادبی بورڈ، جامشورو

Digitized By M. H. Panhwar Institute Of Sindh Studies, Jamshoro.

تاریخ سندھ سلسلہ۔ حصہ اوّل

سندھ

ایک عام جائزہ

[SINDH A GENERAL INTRODUCTION]

از:

ایچ۔ ٹی۔ لیمبرک

مترجم:

مظہر یوسف

سندھی ادبی بورڈ

جام شورو، سندھ

2010ء

پاران ايم ايچ پنھور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.
Digitized by M. H. Panhwar Institute of Sindh Studies, Jamshoro.

کتاب ہذا کے جملہ حقوق سندھی ادبی بورڈ کے پاس محفوظ ہیں

اشاعت اول سال 2010ء تعداد ایک ہزار

کتاب ہذا کے کسی بھی حصہ کو ادارے کی اجازت کے بغیر، الیکٹرانک یا کسی دوسرے طریقے، جس میں استورتج یا ریٹریول سسٹم شامل ہو، بروئے کار نہیں لاسکتا۔

قیمت: تین سؤ بیس روپے

[Price Rs: 320-00]

خریداری کیلئے:

سندھی ادبی بورڈ کتاب گھر

تلک چاڑھی، حیدرآباد سندھ

(Ph: 022-2633679, Fax: 9213422)
Email:sindhiab@yahoo.com
www.sindhiadabiboard.org

یہ کتاب سندھی ادبی بورڈ، جام شورو کی طرف سے سیکریٹری پروفیسر سید زوار حسین شاہ نقوی نے شایع کی اور ایلیگینٹ پریس کراچی میں طبع ہوئی۔

Digitized By M. H. Panhwar Institute Of Sindh Studies, Jamshoro.

پاران ایم ایچ پنهور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

ازطرف ناشر

''سنڌھ ایک عام جائزہ'' ایچ ٹی لیمبرک کی تحقیقی کتب میں سے ایک کتاب ہے۔ سال ۱۹۵۲ء میں سندھی ادبی بورڈ نے ''سنڌھ کی تاریخ سیریز'' پر ۹ کتابیں چھپوانے کا پراجیکٹ بنوایا جس میں یہ پہلی کتاب ہے، اس کتاب میں سنڌھ کی جغرافیائی صورتحال، طول وعرض، خاص طور پر دریائے سنڌھ کی مختلف گذرگاہوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے، اس میں وادی سنڌھ کے دو گمشدہ دریا، سرسوتی اور ھاکڑہ کا بھی ذکر آتا ہے، ھاکڑہ دریا جس کے کنارے پر قدیم سندھو تھذیب نے جنم لیا اور اُس کے خشک ہونے پر راجستھان کے راجواڑوں میں سے سومرا اور سما قبائل نے پہلے جنوبی سنڌھ اور بعد میں قوت حاصل کر کے ملتان تک سندھو سلطنت کو قائم کیا۔

مسٹر ایچ ٹی لیمبرک بہت ہی باریک بین اور نتیجے اخذ کرنے والے محققین میں سے ایک تھے۔ انہوں نے اپنے سیر وسفر کے دوراں دریائے سنڌھ کی جن گذرگاہوں کی قدیم طبعی صورت حال کا جائزہ لیا تھا، بعد میں دریائے سنڌھ کے فضائی تصاویر حاصل کرنے والے محققین نے کم وبیش وہی صورت پیش کی ہے۔

اس طرح سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسٹر لیمبرک نے سنڌھ کی طبعی وجغرافیائی صورتحال کو بغور دیکھا اور دریائے سنڌھ کی ہزاروں برس پہلے کے وہ نقشے پیش کئے ہیں جن سے پتہ

چلتا ہے کہ دریائے سندھ کن کن علائقوں کو خوشحال کرتا رہا اور برباد کرتا رہا۔ جو کہ کتاب میں دیئے گئے نقشہ جات سے صاف نظر آتا ہے۔

مسٹر لیمبرک نے سندھ پر ہونے والی تحقیق کے متعلق تمام جنرل اور کتب سے استفادہ حاصل کر کے یہ کتاب ''سندھ ایک عام جائزہ'' تیار کی ہے جو کہ ان کی برسہا برس کی محنت کا ماحصل ہے، اس کا یہ اردو ترجمہ محترم مظہر یوسف صاحب نے بہت عرصہ پہلے مکمل کیا تھا مگر اس کے چھپنے کا سامان اب تیار ہوا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اپنے انگریزی اور سندھی ایڈیشن کی طرح مقبول عام اور پذیرائی حاصل کرے گا۔

پروفیسر سید زوار حسین شاہ نقوی
سیکریٹری

جام شورو، سندھ
20 رمضان المبارک 1431ھ
بمطابق 31 اگست 2010ء

مختصر تعارف

سندھی ادبی بورڈ نے تاریخ سندھ کے سلسلۂ مطبوعات کا ایک پروگرام مرتب کیا ہے، زیرِنظر کتاب اُسی سلسلہ کی پہلی جلد ہے۔ سندھی ادبی بورڈ ۱۹۵۱ء میں حکومت نے قائم کیا تھا۔ اِس کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ سندھ کی زبان اورادب کی ترویج وترقی کے لئے اِس بورڈ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ چنانچہ اِس مقصد کو مدِنظر رکھتے ہوئے سندھ کی ایک ایسی تاریخ مرتب کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو زمانہ قبل تاریخ سے ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان تک کے حالات مستند منظم طریقہ پر پیش کر سکے۔ اِس کتاب کو تین زبانوں یعنی سندھی، اُردو اور انگریزی میں شائع کرنے کا پروگرام ہے۔ منصوبہ کے مطابق تاریخ کے نو جلدوں پر مشتمل ہوگی:

جلد اوّل

عام معلومات سے متعلق ہوگی۔ اِس میں ملک کے جغرافیائی اور موسمی کیفیات کی تفصیلات شامل ہوں گی اور دکھایا جائیگا کہ کس طرح اِنھوں نے اِس تمام زمانہ میں ملک کے تاریخی حالات کو متاثر کیا۔ چنانچہ اِس عرصۂ دراز میں دریائے سندھ کا جو کردار رہا ہے اُس کا جائزہ لیا گیا ہے۔

بالخصوص دریائے سندھ کے بہاؤ اور راستے کی تبدیلیوں سے ملک کے تمدّنی مراکز پر اثرات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ سندھ کی آبادی اور اُس کے مشترکہ عناصر، مقامی زبانیں، مختلف زمانوں کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ سب اوراس متعلق معلومات بھی اسی جلد میں شامل ہیں۔

جلد دوئم

تمدن سندھ، ایرانیوں کے اقتدار کا زمانہ۔ سکندر اعظم کا حملہ۔ سیتھین (Scythian) نسل کے لوگ اور اُن کے جانشین۔ بودھ مذہب کا دور۔ برہمن خاندان اور اُس کا زوال۔

جلد سوئم

سندھ میں عربوں کی آمد اور دورِ اقتدار: اس سلسلہ میں ابتداً مسلمانوں کی آمد اور مذہب اسلام متعلق مختصر بیان بھی شامل ہے۔

جلد چہارم

غزنوی اور غوری اور اِن کے جانشین، سومرا دوَر

جلد پنجم

سما دوَر

جلد ششم

ارغون، ترخان اور مغل دوَر

جلد ہفتم

کلہوڑا اور داؤدپوتہ دوَر

جلد ہشتم

تالپور دوَر

جلد نہم

فرنگی دور، صوبہ سندھ کی (بمبئ سے) علیحدگی اور قیام پاکستان

مندرجہ بالا کتب کی تدوین مختلف مصنفین کے سپرد کی گئی تھی، جدل اوّل ودوئم ڈاکٹر ایچ۔ ٹی لیمبرک کے حصّہ میں آئیں۔ موصوف "سر چارلس نیپئر اینڈ سندھ" اور "جان جیکب آف جیکب آباد" کے مصنف کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ دونوں جلدیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ جلد سوئم جسے ڈاکٹر ممتاز پٹھان نے ترتیب دیا ہے اور حال ہی میں سندھی زبان میں شایع ہوئی ہے۔ اوران کے علاوہ جلد پنجم اور جلد ہشتم کی طباعت عنقریب متوقع ہے۔ جلد ہفتم جسے مولانا غلام رسول مہر نے ترتیب دیا ہے اُردو زبان میں دوحصّوں میں شائع کی جا چکی ہے۔

مقدمہ

(انگریزی ایڈیشن طبع دوم ۱۹۹۲ء)

سال ۱۹۶۴ء میں یہ کتاب (Sindh: A General Introduction) ''سندھ ایک عام جائزہ'' طبع ہوا، میں نے تقریباً دو سال کے بعد ایک مضمون میگزین ''سائنٹیفک امریکہ'' مئی ۱۹۶۶ء میں پڑھا جو کہ موہن جو دڑو کے زوال کے بارے میں میرے نظرئے کی مخالفت میں لکھا گیا تھا، جو میں نے اس زیر نظر کتاب میں مدلل نمونے پیش کیا تھا، اس مضمون میں میرے نظرئے کو رد کیا گیا تھا، جبکہ قحط سالی اور آب وہوا کی تبدیلی والے نکتۂ نظر میں ہم آہنگی تھی، میں نے اس مضمون کے زیراثر، اپنے نظرئے کو بنیادی طور پر غلط سمجھتے ہوئے اس موضوع پر آب پاشی اور آبی قوت کے ماہر سائنسدان آنجہانی سر کلاڈ انگلس (Sir Claude Inglis) سے خط و کتابت شروع کی، موصوف نے میرے نظرئے کی تائید کی، میں نے انہیں اس مسئلے کو حل کرنے کی گذارش کی، مگر وہ اپنے محققانہ کاموں میں اس قدر مصروف تھے یا وہ اس اختلافی بحث میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ چاہتے تھے کہ میں اس مسئلے کو باہم خط و کتابت کی روشنی میں حل کروں۔ پھر میں نے ایک مضمون "The Indus flood- Plain and the Indus Civilization" کے عنوان سے "The Geographical Genral" میں لکھ کر بھیج دیا۔ جو سال ۱۹۶۷ء کے آخر میں شائع ہوا۔ مسٹر ہولمیس (D.A.Holmes) جو کہ خود ''لوئر انڈس پراجیکٹ'' میں 'سائل سروئیر' تھے، تقریباً ایک سال کے اندر ان کا ایک مضمون اس ہی میگزین ''دی جیوگرافیکل

جرنل'' میں "The Recent History of Sind" کے عنوان سے شائع ہوا، جس کی سیاق وسباق میں گویا میرے نظریے کی تائید کی گئی تھی، مسٹر ہولمیس نے اپنے مضمون میں دریائے سندھ کے گذشتہ دو ہزار سالوں کے دوران مختلف گذرگاہوں کا جائزہ لیا گیا تھا، جس کا تمام انحصار ۴۰۰۰۰ اپیمائش کی فضائی تصاویر پر تھا، جو کہ لوئر انڈس پراجیکٹ کی جانچ پڑتال کے دوراں نقشہ بندی اور ناپنے کے لیے استعمال کی گئی تھیں۔ ہولمیس کا کہنا ہے کہ ان تمام فضائی تصاویر سے حاصل کئے گئے ثبوت میرے اختیار کیئے ہوئے نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ اس کتاب میں دیئے گئے کہ چار نقشوں اور ہولمیس کے مضمون میں دئے گئے نقشوں کے باہم موازنہ کرنے سے اس تاریخ کے درست ہونے کو ثابت کیا جاسکتا ہے۔ مسٹر ہولمیس کے مضمون ''دریائے سندھ کی پرانی گذرگاہیں'' میں دیا گیا نقشہ نمبر ۲ دریائے سندھ کی ممکنہ قدیم گذرگاہوں اور شاخوں کی موجودگی اور ان کی پیمائش کی تصدیق کرتا ہے، جس کا جامع تفصیل میرے دیئے گئے نقشہ نمبر ۱ میں دیا گیا ہے، میں نے یہ تمام نقشہ جات مسٹر ہولمیس کی طرح سے ہوائی جہاز کی ذریعے سے نہیں بلکہ اپنے گہرے مشاہدے اور فکر کی مدد سے تیار کئے تھے، یہ صحیح طور سے معلوم کرنے کے لئے کہ کس دور میں دریائے سندھ کون سی گذرگاہ سے رواں دواں رہتا ہے، اس کی تصدیق میرے دیئے گئے نقشہ نمبر ۳، ۷ اور ۱۱ اور مسٹر ہولمیس کے دئے گئے نقشہ نمبر ۳، ۴ اور ۵ سے تقابل کے بعد ہو جاتی ہے (سکندر اعظم کی فتوحات، عربوں کی اوائلی دور اور سولہویں صدی عیسوی)۔

مسٹر ہولمیس کا کہنا ہے کہ : ''فضائی تصاویر سے ہمیں براہِ راست وادیٔ سندھ کی قدیم تہذیب کے عروج کے وقت دریائے سندھ کی گذرگاہ کے مکمل ثبوت نہیں ملتے''۔ آگے چل کر وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ ''دریائے سندھ کی قدیم گذرگاہوں کی معلومات کی بنا پر سندھ کے کسی بھی ضلع کی خوشحالی کے بارے میں مکمل طور پر کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا''۔

۱۹۶۸ء کے بعد سندھ کی قدیم تہذیب کے زوال کے متعلق میرے اور مسٹر ہولمیس

کے نقطۂ نظر کی مخالفت میں کسی نے کچھ لکھا ہوتو وہ میرے علم میں نہیں آیا، اس لئے ۱۹۷۳ء میں میرے لکھے ہوئے اس ہی سلسلے کی دوسری کتاب "Sindh before the Muslim Conquest" کا ایک باب بہ عنوان "The Indus Civilization Zenith and decline" میں اسی ہی نظریے کو دہرایا ہے، اس ہی طرح سے سکندر اعظم کی ہندستان سے واپسی کے متعلق گذشتہ دس سالوں میں اگر کچھ شائع ہوا ہے تو اس کے متعلق اپنی لاعلمی کا برملا اظہار کروں گا، دوسری صورت میں اپنے "Nearchus Vouage" کے ابتدائی مراحل کی وضاحتوں میں ردوبدل کرنی ہوگی، اس لیے "Sind: A Gernal Introduction" میں معمولی تصحیح کے علاوہ طبع دوم اصل میں طبع اول کی ہی طرح ہے۔

۱۹۷۵ء　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　اچ. ٹی. لیمبرک

مقدمہ

(انگریزی ایڈیشن طبع اول ۱۹۶۴ء)

سندھ کی جغرافیائی اور موسمی کیفیات نے اِس ملک کی تاریخ کے دھارے کو جس حد تک متاثر کیا ہے اِس جلد میں اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اِس قسم کے جائزے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین کی طرف رجوع کیا جائے، مثلاً ماہرین علم ارضیات، بحریات، علم الآثار، جغرافیہ اور تاریخ، جن ماہرین سے استفادہ کیا گیا اُنھیں ذیلی نوٹ اور حوالہ جات میں بیان کر دیا گیا ہے۔ عام طور پر تفصیلات، تنقید اور دوسرے بیانات جن کے ضمن میں کوئی سند پیش نہیں کی گئی اُن کے متعلق میں نے اپنے ہی مشاہدات اور معلومات، تنقید اور دوسری اور معلومات پر تکیہ کیا ہے۔ سندھ اور یہاں کے باشندوں کے متعلق جو معلومات مجھے حاصل ہیں وہ اِس علاقہ میں برسوں قیام کرنے اور اندرون ملک سفر کرنے کے دوران حاصل ہوئیں ہیں۔

مجھے خوش قسمتی سے اپنے سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں سکھر سے دریائے سندھ کے دہانہ تک بار بار دریائے سندھ پر لائڈ بیراج (Lioyd Barage) اس وقت تک تعمیر نہیں ہوا تھا، ان تمام باتوں کے باوجود صوبہ کے کچھ حصّوں کے بارے میں میرا کام ناکافی تھا، لیکن ۱۹۴۱ء کی مردم شماری نے جسکا میں سربراہ تھا، اِس کمی کو پورا کر دیا۔

سندھ کے بارے میں معلومات کے اِس وسیع خزانہ کے لئے جو میں نے ایک طویل مدت میں جمع کیا۔ میں اتنے لوگوں کا ممنون ہوں کہ اُن کا شکریہ صرف اجتماعی طور پر ہی ادا کر سکتا ہوں۔ مختلف موضوعات پر اِن معلومات سے میں نے جو کام لیا اسکا صرف میں ذمہ دار ہوں۔

مرحوم ڈاکٹر یو۔ایم۔داؤدپوتہ اور پروفیسر این۔اے۔بلوچ کا احسانمند ہوں۔اِن حضرات نے کتاب کے ابتدائی مسودہ کا بغور مطالعہ کیا اور بہت سی قیمتی تنقیدات، اصلاحات اور تجاویز سے مجھے نوازا اور مسودہ کو بہتر بنایا۔

آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کے مسٹر کے۔ای۔بٹلر (K.E.Butler) اور دوسرے حضرات بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے میرے نقشہ جات کے عکس بہت مہارت اور احتیاط کے ساتھ پیش کیے۔ میں ڈاکٹر اے۔جی۔ایم ویڈل (Dr.A.G.M) فیلو آف اوریئل کالج کا بھی مشکور ہوں کہ اُنھوں نے اپنے قیمتی وقت کا بہت سا حصّہ میری تصاویر کی پلیٹوں کی تیاری پر صرف کیا اور بہت ذہانت کے ساتھ اِس کام کو انجام دیا۔سندھ یونیورسٹی کے پروفیسر این۔اے۔بلوچ انتہائی پابندی کے ساتھ اِس کتاب کے پروف دیکھے اور مسلسل محنت کی جس کے لئے میں تہ دل سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔اپنی بیوی کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جو اِس سلسلہ کے مختلف کاموں میں میری مددگار رہیں۔

نقشہ جات نیز کتاب کے مضامین میں چند جغرافیائی اور تاریخی نام ایسے ہیں جن کے تلفظ میں مختلف جگہوں پر یکسانیت نہیں ملے گی، اِس کی وجہ یہ ہے کہ ماہرین جن کے حوالہ جات سے استفادہ کیا گیا ہے، وہ اِن ناموں کو مختلف طریقوں سے بیان کرتے رہے ہیں۔بہرحال اِس کوتاہی کے لئے معذرت پیش کرتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ ایک ذہین پڑھنے والے کے لئے تلفظ مندرجہ بالا اختلاف سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوگی۔

ایچ۔ٹی۔ایل

فہرست

باب	عنوان	صفحہ
اوّل۔	عمومی جغرافیائی جائزے	23
	تشریحات	32
دوسرا۔	مشرقی ریگستان	33
	تشریحات	34
تیسرا۔	سندھ کے میدان اور دریائے سندھ	46
	تشریحات	79
چوتھا۔	سندھ کا پہاڑی علاقہ	85
	تشریحات	103
پانچواں۔	ماقبل تاریخ سندھ کی ابتدائی تہذیبیں	104
	تشریحات	133
چھٹا۔	وادیٔ سندھ کی تہذیب ماحول اور آب وہوا	137
	تشریحات	171
ساتواں۔	ماضی بعید کے تاریخی دور کا سندھ	189
	تشریحات	230
آٹھواں۔	سندھ کا حال بعد کی کلاسیکی مستند تحریروں کی زبانی	243
	تشریحات	263
نواں۔	ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ کے حالات	267
	تشریحات	297

دسواں۔ سندھ۔ مسلمانوں کے دور میں ---------- 312
تشریحات ---------- 351
گیارہواں۔ سندھ کی مختلف نسلیں اور قومیں ---------- 367
تشریحات ---------- 393
بارہواں۔ سندھی زبان ---------- 399
تشریحات ---------- 408
ضمیمہ۔ اوّل: ریگستانِ ہند کا گمشدہ دریا ---------- 409
تشریحات ---------- 419
ضمیمہ۔ دوم: زمانہ وسطیٰ کے عرب جغرافیہ دانوں کی کاوشیں اور اُن کی اہمیت ---------- 422
تشریحات ---------- 429
ببلیوگرافی ---------- 432
اشاریہ۔ اوّل۔ جغرافیائی مقامات ---------- 439
دوم۔ اسماءِ رجال ---------- 455
ادبی تحریریں (کتب) ---------- 460

فہرست تصاویر

پلیٹ نمبر 1	صفحہ نمبر 49
تصویر نمبر 1	دریائے سندھ لکھی(Lakhi) پہاڑی سلسلہ کی سمت رُخ کرتے ہوئے۔
تصویر نمبر 2	پٹ(Pat) یا بالائی سندھ کا ریگستان
پلیٹ نمبر 2	صفحہ نمبر 68
تصویر نمبر 3	ریگستان تھر(Thar)
تصویر نمبر 4	منچھر(Manchhar) جھیل، موہانہ لوگ مچھلیاں پکڑتے ہوئے
پلیٹ نمبر 3	صفحہ نمبر 112
تصویر نمبر 5	گبر بند(Gabar Band): گوزبانی(Gozbani): تعلقہ سہون
تصویر نمبر 6	کاندھی واھی(Kandhi Wahi) تعلقہ سہون میں قبل تاریخ کی ایک آبادی کے آثار
پلیٹ نمبر 4	صفحہ نمبر 120
تصویر نمبر 7	میری(Miri)، تونگ(Toung)، محال کوہستان میں
تصویر نمبر 8	چشمہ رتن شاہ(Ratan Shah)، تونگ کے مقام پر مورچہ بندی کے نشانات
پلیٹ نمبر 5	صفحہ نمبر 121
تصویر نمبر 9	لنڈی بتھی(Lundi Buthi)/ نئینگ(Naing)/ تعلقہ سہون کے نزدیک
تصویر نمبر 10	کائی بتھی(Kai Buthi)۔ تعلقہ سہون
پلیٹ نمبر 6	صفحہ نمبر 164

تصویر نمبر 11	اسٹوپا (Stupa) سے مغرب کی سمت رُخ کرنے پر موہن جو دڑو کا منظر
تصویر نمبر 12	تھیئر مرڑو۔ تعلقہ روہڑی کے نزدیک وادی سندھ کی تہذیب کے دور کی آبادی کے آثار۔
پلیٹ نمبر 7	صفحہ نمبر 349
تصویر نمبر 13	کافر قبرستان، ڈملوٹ، تعلقہ کراچی کے نزدیک
تصویر نمبر 14	پہاڑی گپھا، نیئنگ، تعلقہ سہون کے نزدیک
پلیٹ نمبر 8	صفحہ نمبر 350
	قدیم مورچہ بندی کے نشانات، واگھودر، تعلقہ کراچی کے نزدیک

مصنف نے ۱۹۳۱ سے ۱۹۴۴ کے دوران جو فوٹو لئے اُن سے مندرجہ بالا عکسی تصاویر بنائی گئی ہیں۔

فہرست نقشہ جات

1. زیریں سندھ کے میدانی خاکے، صفحہ نمبر 8.3
2. قدیم سندھ۔ قبل تاریخ اور بودھ دور کے مقامات۔ صفحہ نمبر 188
3. سندھ۔ ۳۲۶۔۳۲۵ قبل مسیح کے وقت! سکندر اعظم کے حملہ کا نقشہ۔ صفحہ نمبر 240-241
4. ۳۲۵ قبل مسیح کا جنوب مغربی سندھ اور لسبیلہ۔ صفحہ نمبر 242
5. ۱۵۰ عیسوی میں شمالی مغربی ہندوستان: کلاڈیس ٹولیمی کے بیان کے مطابق۔
صفحہ نمبر 260-261
6. ۶۴۴ ۔ ۶۴۳ عیسوی میں سندھ اور ملحقہ علاقے۔ یوان چوانگ کے سفر کا
نقشہ: صفحہ نمبر 309
7. ۹۲ تا ۹۵ ہجری کے دوران سندھ (۷۱۰ تا ۷۱۴ عیسوی) مسلمانوں کی فتوحات کا
نقشہ: صفحہ نمبر 310
8. سندھ اور پڑوسی ممالک کے ملحقہ علاقے بمطابق اشکل البلاد (Ashkul-ul-Bilad)
(۱۱۰۰ عیسوی): صفحہ نمبر 375
9. الور (Alor) بکھر اور گردو پیش کا علاقہ: صفحہ نمبر 376
10. بہمن آباد۔ منصورہ (Mansurah) اور گردو پیش کا علاقہ: صفحہ نمبر 377
11. زیریں سندھ ۱۵۰۰ء سے ۱۷۵۰ء کے دوران: صفحہ نمبر 378-379
12. الف: دریائے سندھ کا وہ ڈیلٹا جو مبینہ طور پر ۱۸۱۷ء میں تھا۔ صفحہ نمبر 380
13. ب: دریائے سندھ کا وہ ڈیلٹا جو مبینہ طور پر ۱۸۳۷ء میں تھا۔ صفحہ نمبر 381
14. ریگستان ہند کے گمشدہ دریا (گھاگر۔ ہاکڑا (Hakra)) صفحہ نمبر 420-421
15. سندھ۔ طبعی۔ صفحہ نمبر 430-431
16. موجودہ سندھ: صفحہ نمبر 462-463

اصطلاحات

یہ کتاب سندھ کے متعلق ہے اِس لئے میں نے بلا جھجک بہت سی سندھی اصطلاحات کو ایسے موقعوں پر استعمال کیا ہے جہاں ملک مخصوص قدرتی حالات یا زرعی معمولات کو ظاہر کرنا مقصود تھا۔ چند اہم اصطلاحات کو اُن کے معنیٰ کے ساتھ درج ذیل فہرست میں پیش کیا جارہا ہے۔

بارانی: وہ زمین جس کی زراعت کا انحصار بارش پر ہے

بند(Bund): پشتہ۔ جو زمین کو سیلاب کی زد سے محفوظ رکھنے کے لئے تعمیر کیا گیا ہو

بوٹھی(Buthi): ٹیلہ کی شکل میں تاریخ سے پہلے زمانہ کی آبادی کے آثار

ڈھنڈ(Dhand): جھیل یا دلدلی زمین۔ (ضروری نہیں کہ سال بھر ایسی ہی رہتی ہو)

ڈھورو(Dhoro): چشمہ۔ دریا کی شاخ یا دریائے سندھ کا سابقہ راستہ

جبل(Jabal): پہاڑ

کچا(Kacha): غیر مستقل زمین

خریف(Kharif): موسم گرما کی فصل

کوہستان(Kohistan): سندھ کا پہاڑی علاقہ

لک(Lak): پہاڑی درّہ

نئے(Nai): پہاڑی علاقہ میں بارہ مہینے بہنے والا چشمہ

نالا، نلہ (Nala) (Nullah): آبی گذرگاہ، جو عموماً خشک رہے

پیش(Pish):(Palam) کی سوکھی ہوئی پتی

ربیع(Rabi): موسم بہار کی فصل

ریگستان: ریتیلا علاقہ، بالخصوص روہڑی (Rohri) پہاڑیوں کے جنوب اور نارا (Nara) کے مغرب کی سمت کا علاقہ

سیلابی: وہ قابل کاشت زمین جو گذرے ہوئے سیلاب سے نم ہو۔
ٹکر(Takar): پہاڑی (جیسے گنجوٹکر(Ganjo Takar)
تعلقہ(Taluka): انتظامی امور کے لئے تحصیل کا ایک حصّہ
واہ(Wah) : زرعی آبپاشی کی نہر
واہی(Wahi): چھوٹی نہر

سندھ میں پائے جانے والے خاص خاص درختوں، جھاڑیوں اور پودوں کو اُن کے سندھی ناموں سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ پیش کئے گئے تمام نام معہ ان کے دوناموں کے جنھیں انگریزی میں پیش کیا گیا ہے ذیل میں اپنے مخصوص نباتاتی ناموں کے ساتھ درج ہیں۔

اک(AK): کیلوٹروپس پروسیرا	(Calotropis Procera)
ببول(Babul): اکیشیا اربیکا	(Acacia Arabica)
باہن(Bahan): پوپلس یوفریٹیکا	(Populus euphratica)
باجرہ(Bajhra): پینسیلاریا ٹائی فوڈیم	(Pencillaria typhodieum)
بیر(Ber): ززی فس جوجوبا	(Zizy Phus Jujuba)
کیکٹس (Cactus): یوفوربیا نیری فولیا	(Euphorbia Nereifolia)
کنڈی/ردیوی(Kandi): پروسوپس اسپی جیرا	(Prosopis Spicigera)
کھبڑ(Khabbar): سیلواڈورا پرسیکا	(Salvadora persica)
کھپ(Khip) لیپٹاڈینیا اسپارٹیم	(Leptadenia Spartium)
کرڑ(Kirir): کیپارس، افائیلا	(Capparis aphylla)
لانی(Lani): سالسولا	(Salsola)
پھوگ(Phog): کالی گونم پولی گونائیڈس	(Calligonum Polygonides)
سر(گھاس)(Sar) فریگمیٹس کارکا	(Phragmitis Karka)

سسو یا ٹالی (Sisso or Tali) دلبر جیا سیسو (Dalbergia Sissoo)

ٹمارسک (Tamarisk): ٹمارکس گیلی کا (Tamarix Gallica)

ٹمارسک ڈیوسیا (Tamarix dioica)

ٹمارسک آرٹیکولاٹا (Tamarix articulata)

تل (Til) سیسامم انڈیکم (Sesamum Indicum)

مخففات۔ علیٰ الترتیب

ایم۔ جی۔ ایس۔ آئی	میموائرس آف دی جیولوجیکل سروے آف انڈیا
M.G.S.I	Memoirs of the Geological Survey of India
ایس۔ آر۔ بی۔ جی	سلیکشنز فرام دی رکارڈس آف دی بمبئی گورنمنٹ
S.R.B.G	Selections from the Records of the Bombay Government
جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس	جرنل آف دی سندھ ہسٹوریکل سوسائٹی
J.S.H.S	Journal of the Sindh Historical Society
اے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ آئی	اینوئل رپورٹ آف دی آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا
A.R.A.S.I	Annual Report of the Archaeological Survey of India
ایم۔ اے۔ ایس۔ آئی	میموائرس آف دی آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا
M.A.S.I	Memoirs of the Archaeological Survey of India

آئی۔ڈی۔سی	انڈس ڈیلٹا کنٹری۔ بائی میجر جنرل ایم۔آر۔ ہیگ
I.D.C	Indus Delta Country by Major General M.R Haig
سی۔ایچ۔آئی	کیمبرج ہسٹری آف انڈیا
C.H.I	Cambridge History of India
جے۔اے۔ایس بنگال	جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
J.A.S.Bengal	Journal of The Asiatic Society of Bangal
جے۔آر۔اے۔ایس	جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی
J.R.A.S	Journal of the Royal Asiatic Soceity
آر۔اے۔ایس	رائل ایشیاٹک سوسائٹی
R.A.S	Royal Asiatic Soceity
اے۔جی۔آئی	اینشینٹ جیوگرافی آف انڈیا۔ بائی میجر جنرل سر اے کننگھام
A.G.I	Ancient Geography of India, by Major General Sir A. Cunningham

سندھ ایک عام جائزہ

بابِ اوّل

عمومی جغرافیائی جائزہ

سَندھ جس کا صحیح تلفظ سندھو ہے اُس دریا کا ملکی نام ہے جسے مغربی دنیا میں انڈس (Indus) کے نام سے پکارا جاتا ہے، غلط تلفظ مسلسل استعمال کے بعد غلط العام کی حیثیت اِس لئے اختیار کر گیا کہ سکندرِ اعظم کے ساتھ آنے والے کوائف نگاروں نے سکندر کی مہمات بیان کرتے ہوئے یہ غلط نام ہی استعمال کیا تھا جو رفتہ رفتہ مشہور ہو گیا۔ حتّٰی کہ مشرق میں بھی اِسی نام کا استعمال عام ہو گیا۔ ایک یونانی تحریر جو پہلی صدی عیسوی میں لکھی گئی زیادہ صحیح تلفظ پیش کرتی ہے، یعنی اِسے سنتھون کے نام سے پکارتی ہے۔[1]

دریائے سَندھ کے زیریں حصّہ سے سیراب ہونے والے ملک کا نام بھی اِسی دریا کے نام پر سَندھ مشہور ہو گیا۔ اِسی طرح پانچ معاون دریا جو شمالی حصّہ میں دریائے سَندھ میں شامل ہوتے ہیں اِس بات کا سبب بنے کہ اُن سے سیراب ہونے والا مُلک پنجاب کہلائے، جہاں یہ دریا سَندھ میں گرتے ہیں اُس کے بعد کا تمام حصّہ زیریں سَندھ کہلاتا ہے۔

اِس ملک کا یہ نام حقیقت کے مطابق ہے کیونکہ یہ زمین اِسی عظیم دریا کی بنائی ہوئی ہے، یہ تمام علاقہ جو کئی سو میل لمبا اور تقریباً ایک سو میل چوڑا ہے دریائے سندھ کے پانی کا تعمیر کردہ ہے۔ صدیوں کے طویل سلسلہ میں دریا نے مٹی کی ایک سطح پر دوسری بڑھائی اور اِس طویل و عریض میدان کو اِس حالت تک پہنچایا جس میں ہم اِسے دیکھ رہے ہیں، موہن جودڑو کے باسی سَندھ کی جس زمین پر چلتے پھرتے رہے ہوں گے یا اُن سے پہلے کے لوگوں نے جس سطح کو اپنے پاؤں تلے روندا ہوگا وہ اِس زمین سے مختلف تھی جس پر آج ہم چلتے پھرتے ہیں۔ یہ مٹی جو دریائے سَندھ نے ہمارے پاؤں تلے بچھائی ہے اور جسے گرمی، پانی اور نباتات کے

عمل نے سنوارا ہے سینکڑوں میل دور وادی کے کناروں تک مسطح شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور وہ زمین جسے اندازاً پانچ ہزار سال پہلے وہ لوگ جانتے تھے موجودہ میدانی سطح سے کئی گز نیچے دفن ہے۔ وہ زمین موجودہ ساحل سمندر سے کافی پیچھے سمندر سے ملتی تھی جس کے نشیب وفراز موجود مصدقہ خاکے سے بہت مختلف رہے ہوں گے۔ اُس حالت کا تصور تو کیسے ممکن ہو سکتا ہے جبکہ موجودہ نقشہ بھی مکمل طور پر انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ہم دریائے سندھ کے اِس میدان کا قریب سے جائزہ لیں گے جسے بنیادی سندھ کہا جا سکتا ہے لیکن پہلے ملحقہ علاقوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں۔

دریائے سندھ کی یہ وسیع وادی بائیں ہاتھ پر یا مشرق کی سمت تھر (Thar) سے گھری ہوئی ہے۔ ہندوستان کا یہ عظیم ریگستان تین سو میل وسعت کے ساتھ اپنی خاموشی اور تنہائی کی چادر میں جیسے جیسے آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے بلند ہوتا جاتا ہے تا آنکہ کوہ آبو (Mount Abu) اور اراولی (Aravalli) پہاڑی سلسلہ سے جاملتا ہے۔

جنوب کی سمت تقریباً جمراؤ ہیڈ (Jamrao Head) کے عرض البلد سے رن کچھ (Rann of Chtch) تک اِس میدان اور دوسرے علاقہ کی درمیانی سرحد اس قدر واضح ہے جیسے ساحلِ سمندر، کیونکہ مٹی کی پہاڑیاں یک لخت یہاں چٹانوں کی شکل میں بلند ہوگئی ہیں اور میدانی سطح سے ممیز ہیں۔ آگے، شمال کی سمت میں ریت کے ٹیلے وادی کی سیلابی مٹی کے میدان میں ناجائز تجاویز کے طور پر گھسے ہوئے ہیں اور سندھ کے سیلاب اِس ریتیلے علاقہ میں دور تک گھس جاتے ہیں یہ دونوں طبعی طور پر مختلف الاصل ہیں لہٰذا ان کا سرحد غیر واضح ہے، عام طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرحدی لائن جیسی مقام پر ظاہر معلوم ہوتی ہے اُس سے کافی فاصلہ پر مشرق میں ہے، اِس ریتیلی سرحد لائن کے شمالی اور جنوبی حصّوں میں جو ردوبدل ہوتا ہے وہ جنوبی مغربی مان سون (Mansoon) کی قوت یا کمزوری اور اُس کے بہاؤ یا ٹھہراؤ پر موقوف ہے۔

اِس میدان کی اپنی طرف یا مغرب میں وہ پتھریلے ڈھلوان شروع ہوتے ہیں جو

پہاڑی علاقہ سے مل جاتے ہیں، اور اس طرح یہ سلسلہ بلوچستان تک چلا گیا ہے۔ وہاں تک اس میدان کی آخری حد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میدان کا وہ حصہ جو ڈھلوانوں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے اُس مٹی سے بنا ہے جسے پانی پہاڑیوں سے بہا کر نیچے لے آیا ہے اور یہ دریائے سندھ کی لائی ہوئی مٹی سے واضح طور پر مختلف ہے، یہ علاقہ جو مقامی طور پر کچھو (Kacho) کہلاتا ہے اور جس کا بیشتر حصہ کم چوڑا اور ایک تنگ پٹی کی شکل میں ہے کوہ، سلیمان اور درہ بولان سے جنوب کی سمت پھیلے ہوئے پہاڑوں کے درمیان زاویہ میں کئی سو مربع میل کا ایک ٹکڑا ہے۔ اِس قطعہٗ زمین کا وہ حصہ جو سندھ کے میدان سے ملحق ہے کھریا جیسی مٹی کا ایک ریگستان ہے اور ہر قسم کی نباتات سے محروم ہے۔ یہ بھی ایسی ہی ایک قدرتی رکاوٹ ہے جیسے وہ پہاڑ جو اِس کی دوسری سرحدوں پر واقع ہیں۔

سیاسی اعتبار سے کچھی (Kachhi) صوبہ اس ملک سے ملحق رہا ہے جو شمال مغرب میں واقع ہے بہ نسبت اُس کے جو جنوب مشرق میں واقع ہے، یہ حقیقت اِس کے محل وقوع سے ثابت ہے۔

سندھ کے میدانی علاقہ کے مغرب میں واقع کوہستانی علاقہ اور مشرق میں واقع ریگستانی سرحد اگر اُلٹی ترتیب کے ساتھ دیکھا جائے تو ایک دوسرے کے ساتھ مماثلت رکھتے ہیں، اِس کا مطلب یہ ہے کہ شمالی حصہ کچھی کے کنارے سے منچھر جھیل تک ایک فصیل نما ٹیلہ معلوم ہوتا ہے جبکہ منچھر سے جنوب کی طرف ایسے ہی ٹیلوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے جن کے بیچ میں میدانی ٹکڑے آ گئے ہیں۔

جنوب کی سمت بڑھتے ہوئے یہ ٹیلے زیادہ سے زیادہ چوڑے ہوتے جاتے ہیں جبکہ اِن کی بلندی گھٹتے گھٹتے اتنی کم رہ جاتی ہے کہ مغربی سمت کوئی حد فاصل نہیں رہتی، اِس سمت میں حب ندی (Hab River) اور چھوٹے پہاڑی سلسلہ کو عبور کرنے کے بعد ہم لس (Las) کے میدانی علاقہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جو ساحلِ سمندر سے تقریباً ساٹھ میل اندر تک شمال کی سمت پھیلا ہوا ہے جبکہ اِس میدان کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی تیس میل

ہے، یہ میدان پورالی ندی (Porali Nadi) اور کچھ دوسری پہاڑی ندیوں کی بہا کر لائی ہوئی مٹی سے بنا ہے جس میں کچھ مقدار اُس مٹی کی بھی شامل ہے جو بارش کا پانی پہاڑیوں سے بہا کر لایا۔ یہ مذکورہ بالا کچھی میدان سے کافی حد تک ملتا جلتا ہے، یہ میدان مختلف اوقات میں سندھ میں شامل رہا ہے لیکن اکثر اس سے جُدا بھی رہا ہے۔

چنانچہ اِس قسم کے مختلف علاقے ہیں جن کے کچھ حصے مختلف زمانوں میں اُس ملک کا حصہ رہ چکے ہیں جسے سندھ کہا جاتا ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے، کہ ریگستان طبعی طور پر راجپوتانہ کا حصہ ہے اور دشوار گذار پہاڑی علاقہ بلوچستان سے تعلق رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغربی کوہستان یا مشرقی ریگستان تھر کے علاقہ ''کاچھو'' (Kachho) میں رہنے والے دہقان آج بھی یہ کہتے ہیں "میں سندھ جارہا ہوں" یہ نام اُن کے لئے آج بھی وہی معنی رکھتا ہے جو ابتدائے زمانہ میں تھا، یعنی وہ میدان جسے سندھو نے بنایا اور سندھو ندی نے سیراب کیا، موجودہ صوبہ سندھ ۲۸ ڈگری ۳۰ منٹ شمالی عرض البلد اور ٦٦ ڈگری ۴۲ منٹ اور ۷۱ ڈگری ۱۰ منٹ مشرقی طول البلد کے درمیان واقع ہے۔

شروع زمانہ میں جو انگریز یہاں آتے تھے اُنھوں نے سندھ کو " چھوٹا مصر (Young Egyp) کا نام دیا، حالانکہ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سندھ کا تمدن قدیم ہونے میں کسی طرح مصر سے کم نہیں لیکن یہ ضرور تسلیم کرنا پڑیگا کہ دریائے نیل اور دریائے سندھ کی زیریں وادیاں مشاہدہ کرنے والے کے لئے ایک دوسرے سے بہت مشابہ نظر آتی ہیں، دونوں میں دائیں سمت سے بائیں سمت تک خشک پہاڑی سلسلہ، دریائی مٹی کا میدان اور ریگستانی علاقہ ایک دوسرے سے متوازی پھیلے ہوئے ہیں۔

اور درمیانی وادی دونوں جگہ اپنی زرخیزی وشادابی کے لئے دریا کے سالانہ طغیانی کے پانی کی محتاج ہے، بارش کی نہیں۔ آب وہوا اور ارضی کیفیات کے اعتبار سے دونوں ممالک کی نباتاتی اور حیواناتی زندگی میں تضاد کی نسبت مماثلت کہیں زیادہ ہے، سندھ کا کوئی باشندہ اگر سویز (Suez) سے قاہرہ (Cairo) تک بذریعہ کار سفر کرے اور وہاں سے دریائے

نیل کا ڈیلٹا پار کر کے لیبیا (Libya) کے ریگستان میں داخل ہو وہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک جو کچھ دیکھتا رہیگا وہ اُس کے اپنے ملک سے اِس قدر متاثر ہوگا کہ وہ حیران رہ جائیگا۔ اور محسوس کریگا کہ اُس نے کراچی سے حیدرآباد ہوتے ہوئے مارواڑ تک سفر کیا ہے، ڈیلٹا کے اوپر دریائے نیل کا جو میدان شروع ہوتا ہے وہ وادی سندھ سے کم چوڑا ہے کیونکہ حیدرآباد سے آگے اگر میدان کو وقفہ وقفہ سے دریا کے کنارے تک ناپا جائے تو تین سو میل تک کسی جگہ بھی آٹھ میل سے کم چوڑائی نہیں ملی گی۔

درجہ ہائے حرارت میں انتہائی تفاوت سندھ کی آب و ہوا کی خصوصیت ہے، اِسی طرح بارش کی کمی بھی۔ ساحلی علاقہ کا موسم نسبتاً مرطوب ہے۔ سمندری ہوائیں ملک کے اندر کافی دور تک چلتی ہیں۔ یہ سال میں چار مہینے تک خاص طور پر تیز ہوتی ہیں جن کی وجہ سے گرمی کی شدت کم ہو جاتی ہے اور ٹھنڈک پیدا ہو جاتی ہے، لیکن جنوبی مغربی مان سون جب اِن عروض البلاد تک پہنچتی ہیں تو اُس کی شدت ختم ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ ہے کہ جون سے ستمبر تک جو بادل ساحل سے اُٹھتے ہیں اُن سے بہت کم بارش ہوتی ہے، اِس کے برعکس اگر مانسون طاقتور بھی ہو تب بھی، چونکہ مغربی پہاڑی علاقہ اتنا بلند نہیں کہ اُن کو روک سکے لہٰذا بارش کی زیادتی ممکن نہیں ہوتی، لیکن علاقہ کے مغربی ڈھلوانوں پر مانسون کا اثر خاصا واضح ہے اور قطعاً خشک اور بنجر نہیں ہے۔

اِس موسم میں اگر بارش ہوتی ہے تو وہ عموماً مقامی موسمی تغیرات کی وجہ سے ہوتی ہے یعنی جب مانسون کے مقابل دوسری ہوائیں مخالف سمت سے چلنے لگتی ہیں۔ سال کے بیشتر حصہ میں یہ بادل گرم علاقہ میں پہنچ کر بھاپ بن کر تحلیل ہو جاتے ہیں اور اُن کا زیادہ سے زیادہ اثر یہ ہوتا ہے کہ ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔ یہ ہوا تھر ریگستان کے جنوبی حصہ میں داخل ہوتے ہوئے بہت تیز ہو جاتی ہے کیونکہ گرم ریت کی وجہ سے وہاں کی ہوا گرم ہو کر بلند ہو جاتی ہے اور خلا پیدا ہو جاتا ہے جسے یہ ہوا پُر کرتی ہے، سندھ کے میدانی علاقہ میں سمندری ہوا کے آخری جھونکے پڈعیدن تک پہنچتے ہیں، یہ مقام حیدرآباد سے تقریباً ایک سو

میل شمال میں واقع ہے، لیکن اگر پڈعیدن اور لکی پہاڑ کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی جائے تو اِس خط کے مغربی حصہ میں یہ ہوا بمشکل محسوس ہوگی، چنانچہ یہ علاقہ جو مفروضہ خط کھینچ کر الگ کیا گیا ہے بالائی سندھ کا وہ علاقہ ہے جہاں موسم کی شدت سب سے زیادہ ہے۔

یہاں سات ماہ سخت گرمی پڑتی ہے، جو صرف چند روز کے لئے اتفاقی بارش کی وجہ سے کسی قدر کم ہو جاتی ہے، لیکن یہ بارش عام طور پر موسلا دھار ہوتی ہے اور جلد ہی ختم ہو جاتی ہے، اپریل کے بعد یہاں رات بھر سخت حبس اور گرمی رہتی ہے اور شاید صبح سویرے درجۂ حرارت کم ہو کر ایک سو ڈگری فارن ہائٹ ہوتا ہے، مئی اور جون کے مہینوں میں سائے کا درجہ حرارت عموماً ۱۲۰ اور ۱۲۵ ڈگری کے درمیان رہتا ہے، موسم انتہائی خشک اور ہوا کے جھونکے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بھٹی سے نکل کر آرہے ہوں۔

طبعی حیثیت میں سندھ کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی پہاڑی علاقہ، دریائی میدان اور ریگستانی علاقہ اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، یہاں کے باشندے ملک کو عرض البلدی طریقہ پر تین مختلف موسمیاتی خطوں میں تقسیم کرتے ہیں، یہ خطّے، سرو (Siro) وچولو (Vicholo) اور لاڑ (Lar) نام سے مشہور ہیں، اور بالائی وسطی اور زیریں سندھ کے مطابق ہیں، ملک کی سیاسی اور انتظامی حد بندی عموماً اِسی تقسیم کے مطابق رہی ہے۔

بالائی اور زیریں سندھ کا موسمی اختلاف کسی مختلف نباتاتی شکل میں ظاہر نہیں ہوتا۔ سندھ کی نباتات عام طور پر خشک موسم، ریتیلی زمین جس میں کھار ہو، اُس کا مظہر ہے درختوں اور پودوں میں ایک خاص بات جو نظر آئے گی وہ اُن کی چھوٹی پتیاں ہیں یا پھر پتیاں بالکل ہی غائب ہیں۔ یہ پودے اور درخت زیادہ تر خاردار ہیں۔ دریا کے قریب یا آبپاشی سے سیراب ہونے والے علاقے اور پہاڑی یا ریگستانی علاقے میں پیدا ہونے والی نباتات کی سبزی میں صرف کم یا بیش کا فرق ہے۔ سندھ کے میدانی منظر میں ببول، کانڈی، ٹمارسک، بیر اور درجنوں چھوٹی جھاڑیاں جس طرح نمایاں طور پر نظر آئیں گی اُسی طرح ریگستانی اور پہاڑی علاقوں میں بھی۔ ببول جو ریگستانی علاقہ میں ملے گا وہ شاید اس ببول کا غریب رشتہ دار ہے جو پانی کے

علاقہ میں نظر آئیگا۔ خواہ سندھ کا میدانی علاقہ یا ریگستانی یا پہاڑی، اسی طرح کھپ (Khip) اور پھوگ (Phog) جیسی جھاڑیاں جو زیادہ تر ریگستان میں ملتی ہیں وہ سرسبز وشاداب میدانی علاقہ میں ایسی جگہ بھی نظر آئیں گی جہاں کچھ ریتیلے ٹکڑے رہ گئے ہیں۔

سندھ جس نباتاتی خطے کا حصہ ہے وہ پنجاب کے بیشتر علاقہ، مغربی راجپوتانہ، کاٹھیاواڑ اور کچھ (Kuchh) تک پھیلا ہوا ہے، حالانکہ کچھ ایسے پودے جو ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں عام ہیں۔ یہاں بھی ملیں گے۔ لیکن مماثلت زیادہ تر اُن ممالک سے ہے جو مغرب کی سمت واقع ہیں جیسے مکران، ایران کے گرم علاقے، خلیج کے ساحلی علاقے عراق اور جیسا بیان کیا جاچکا ہے، اور جہاں آب وہوا کافی حد تک سندھ سے ملتی جلتی ہے۔

سندھ میں پائے جانے والے جانوروں خاص طور پر پرندوں کے بارے میں بھی یہی کہا جاسکتا ہے جو قسمیں خاص طور پر یہاں ملتی ہیں وہی اُن ممالک میں بھی مخصوص نظر آئیں گی، جو مغرب میں واقع ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ریگستان تھر بہت موثر طبعی رکاوٹ ہے جس نے سندھ کو ہندوستان سے جُدا کردیا ہے جبکہ مغربی پہاڑی علاقہ کوئی رکاوٹ نہیں بالخصوص اِس صورت میں ہیں کہ قدرتی طور پر نباتاتی اور حیواناتی دنیا میں بہت کچھ مشترکہ ہے، آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ یہ حالات سندھ کی سیاسی تاریخ پر بھی اثر انداز ہوئے؟

اب سندھ کے مشرقی ریگستان سے شروع کرتے ہوئے ہم سندھ کے جغرافیہ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

تشریحات باب پہلا

1. "دی پیری پلس آف دی اریتھرین سی" ایک گمنام مصنف کی کتاب
The Periplus of the Erythrean Sea, by an Unknown author

باب دوسرا

مشرقی ریگستان

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، ساحل کی طرف سے چلنے والی مان سون ہواؤں کے مسلسل عمل کے نتیجہ میں جنوبی مغربی تھر ریگستان کا ریت اُڑ کر بڑے بڑے متوازی ٹیلوں کی شکل میں اونچا ہو گیا ہے جو اندر سے کھوکھلے ہیں۔ اور یہ بھٹ (Bhit) کہلاتے ہیں۔ اِن کے درمیان وادی کی شکل میں خالی زمین ہے اور یہ جنوب مغرب سے شمال مشرق کے رُخ پر پھیلے ہوئے ہیں، یعنی جس رُخ پر ہوا چلتی ہے۔ شمالاً جنوباً اِن متوازی ٹیلوں کے سلسلہ کو جگہ جگہ ریت کے ڈھیر کاٹتے ہوئے نظر آئیں گے اور جیسے جیسے کوئی ریگستان میں آگے بڑھتا جائیگا یہ منظر عام طور پر اُس کے سامنے ہوگا، اور یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ تقریباً ایک سو پچاس میل کے بعد یعنی باڑمیر (Barmer) سے آگے ریت کی پہاڑیاں سب اِس قسم کی ہیں، یعنی ہوا کے رُخ سے زاویۂ قائمہ بناتی ہیں۔ (2) ریگستان کا یہ حصّہ خاصا اندر راجپوتانہ میں ہے، اِس کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اِس کے برعکس سندھ کے سرحدی علائقہ میں واقع ریت کی پہاڑیوں کی ظاہری شکل اور خصوصیات سمجھنے میں مدد ملے گی، تھر کی تمام ریت ہوا سے اُڑنے والی ہے، لیکن جب عارضی طور پر یہ ساکن ہو جاتی ہے تو اِس پر چلنے والی ہوا کی قوت سے اِس کی مختلف شکلوں کا تعین ہوتا ہے، کسی بھی بھاری سخت چیز کے ساتھ یا اُس کی آڑ میں ریت جمع ہونی شروع ہوتی ہے، اور بڑھتے ایک پہاڑی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اور ہلکی ہوا کے دباؤ سے ایک گول گنبد نما صورت نکل آتی ہے، جبکہ آڑ کی طرف عمودی ڈھلوان بن جاتی ہے، جب تیز ہوا ایک سمت سے مسلسل چلتی ہے تو ریت کا ابتدائی ڈھیر گھوڑے کی نال جیسی شکل اختیار کر لیتا ہے، یعنی آڑ کی طرف کھوکھلا ہوتا رہتا ہے اور دونوں طرف کے بازو آہستہ آہستہ اس پر جو ڈھال بنتا ہے وہ بھی آہستہ اس

ریت سے بڑھتے رہتے ہیں جو خود ان کی مہیا کی ہوئی آڑ میں جمع ہوتا رہتا ہے۔ ہوا کے رخ پر جو ڈھال بنتا ہے وہ بھی آہستہ آہستہ مسطح ہوتا رہتا ہے کیونکہ باریک ذرات اُس سے الگ ہوتے رہتے ہیں اور چوٹی غائب ہوکر ایک لمبی چھت نما شکل اختیار کر لیتی ہے جو ہوا کے متوازی دیوار کی شکل میں بلند ہوتی رہتی ہے۔ کراچی کے آس پاس بہت آسانی سے اِس عمل کا مشاہدہ مان سون کے دوران کیا جا سکتا ہے۔

یہی ہوا کافی قوت کے ساتھ مسلسل جنوبی مغربی تھر (ریگستان) پر چلتی رہتی ہے، خاص طور پر رات کے وقت چنانچہ ریت کے ٹیلوں کا دباؤ طول البلدی ہے۔ اِن ٹیلوں کی درمیانی وادی میں جسے ٹالی (Tali) یا ڈہر (Dahar) کہتے ہیں، ہوا ایک محدود جگہ پر جمع ہوکر ریت کو اُکھاڑنے اور منتقل کرنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ (3)

جب مان سون کی رفتار سست ہو جاتی ہے یا سال کے مختلف اوقات میں جب دوسری ہوائیں چلتی ہیں، اُس وقت وہ ریت جو اِن وادیوں مین جمع ہو چکی ہے وہ وہیں جم کر بلند ٹیلے کی شکل اختیار نہیں کرتی بلکہ مان سون کے عمل کے تحت ایک عام شکل اختیار کر لیتی ہے، لیکن اِس کی قوت ریگستان کے پچھلے حصہ میں صرف اتنی ہے کہ دریائی مٹی کی سطح جس پر ہلکا ریت پھیلا ہوتا ہے مشکل سے ہی کبھی نظر آتا ہے۔

باڑمیر سے آگے جنوبی مغربی ہوا کی قوت بہت کم ہو جاتی ہے چنانچہ میدان میں جو ریت کے ٹیلے وجود میں آتے ہیں وہ ضرب کے نشان سے مشابہ ہیں، یہ جنوب مغرب طرف چوڑی ڈھلوان کی شکل رکھتے ہیں اور شمالی مشرقی طرف عمودی ڈھلوان۔ ریت کی ایسی پہاڑیاں شمال میں بیکانیر تک چلی گئی ہیں۔

اگر فضا سے مشاہدہ کیا جائے تو تھر ریگستان کا شمالی مشرقی نصف اور جنوبی مغربی نصف، دونوں بھورے رنگ کے سمندر معلوم ہوں گے، اور یہ تیز ہواؤں کے اثرات کی وجہ سے ہے، لیکن جنوبی مغربی حصے کی لہریں جو فی الحقیقت ہوا کے رُخ کے متوازی چلی گئی ہیں بہت طویل اور ایک دوسرے سے بہت نزدیک ہیں جبکہ شمالی مشرقی حصہ میں یہ لہریں چھوٹی۔ ایک

دوسرے سے زیادہ فاصلہ پر اور ہوا کے رُخ سے زاویۂ قائمہ بناتی ہوئی نظر آئیں گی۔

اِس ریگستان کا عام منظر ہوائی جہاز سے اس وقت بہت واضح اور صاف نظر آتا ہے جبکہ سورج ڈھل چکا ہو، لیکن جو تاثر اِس طرح پیدا ہوگا وہ کئی اعتبار سے غلط ہوگا۔ جنوبی مغربی حصّے یا سندھ کے ریگستان میں پھیلے ہوئے بھٹ اپنی درمیانی وادیوں یعنی ترائی سے جتنے بلند ہیں ہوائی جہاز سے اُس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ صحرائی نشیب فراز ایسے پر فریب ہیں کہ جہاز کو ایک مخصوص بلندی پر اُڑنا پڑتا ہے۔ اِسی طرح ریگِ صحرا جس نباتات کو پرورش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اُس کے معیار کا بھی صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔ لیکن کسی بلند بھٹ کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑے ہوکر مشاہدہ کیجیے، جو ترائی سے تقریباً ڈیڑھ سو فٹ بلند ہوگی تو منظر بالکل واضح ہوگا، سفیدی مائل بھورا ریت حدِ نظر تک چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے داغدار نظر آئیگا، جیسے چیتے کی کھال پر گُل پڑے ہوں۔ جیسے پلائنی (Pliny) نے پہاڑی کی چوٹی سے نظر آنیوالے صحرائے نیوبی (Nubian) اور اُس کے نخلستانوں کا حال بیان کیا ہے۔ یہ پودے اور جھاڑیاں بھٹ کی چوٹی پر جتنی گنجان ہیں اُتنی ہی ڈھلوانوں اور ترائی میں بھی ہیں۔ یہ مٹیالے سبز یا مٹیالے سُرخ جھنڈ پتوں سے آزاد کھپ اور پھوگ کی جھاڑیوں یا بوہ، لانی اور آک کے پودوں نے بنائے ہوئے ہیں۔ اِن پودوں جسامت میں بھی زیادہ اور استعمال میں بھی جھاڑیاں ہیں وہ کرڑ اور پیلوں ہیں۔ لیکن یہ کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔ کھبڑ عموماً کھاری زمین پر ہوتا ہے یا ترائی کی سخت زمین پر کنڈی اور بیر ملیگا، کنویں کے قریب کنڈی کا پودا خاصا اونچا ہوجاتا ہے لیکن زیادہ تر یہ پودے پستہ قد ہی ہوتے ہیں۔

بہرنوع بے شمار اونٹ اور بھیڑ بکریاں اِن سے چارہ حاصل کرتی ہیں۔ ریگستان گھاس کی مختلف اقسام اور عمدگی کے اعتبار سے دوسری زمینوں سے بدرجہا بہتر ہے۔ کئی ماہ تک یہاں سبزہ کا نشان بھی مشکل سے ہی ملیگا، لیکن جیسے ہی بارش ہوئی یک لخت تر و تازہ حالت میں نمودار ہوجائیگا۔ اُس وقت ریت پر سبزے کی ایک چادر پھیل جاتی ہے اور ریگستان

خوبصورت اور خوش حال نظر آنے لگتا ہے۔ آبی زمین کے گھاس کی نسبت یہ گھاس اِس قدر غذائیت رکھتا ہے کہ مویشیوں کے بڑے بڑے گلے ریگستان میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ مویشی یہ گھاس چر کر موٹے ہو جائیں۔

یہاں انتہائی موافق موسم میں بھی پانی کی قلت برقرار رہتی ہے اور انسانوں اور جانوروں کے لئے پانی دو تین سو فٹ گہرے کنوؤں سے حاصل کیا جاتا ہے جو ترائی میں کھودے جاتے ہیں۔ فطرتاً کھیتی باڑی بھی ترائی کے تھوڑے تھوڑے ایسے علاقوں تک محدود ہے جہاں بارش کا پانی محفوظ کرنے کے لئے پُشتے یا بند بنائے گئے ہیں۔ اگر مناسب وقت پر کئی مرتبہ بارش ہو جائے تو باجرہ کی عمدہ فصل ہو جاتی ہے۔ لیکن ماضی کی طرح اب بھی باشندے گلّہ بانی ہی کرتے ہیں۔ اور اِس بات کے عادی ہیں کہ اپنے جانور، گھی اور کھالیں میدانی علاقہ جات میں فروخت کر کے اپنی ضرورت کا غلّہ وہاں سے خریدیں۔

مندرجہ بالا تفصیلات تھر ریگستان کے اُس حصّہ کے لئے بھی درست ہیں جو سندھ میں شامل ہے لیکن اِس کے وسطی اور شمالی حصّوں میں ریگستان کی کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو دوسری جگہ نہیں پائی جاتیں، مثلاً بھٹ اور ترائی کا سلسلہ جنوبی مغربی اور شمالی مشرقی ہونے کے بجائے تقریباً شمالی اور جنوبی ہے اور کراس نما ٹیلے زیادہ تعداد میں ملتے ہیں، عرض البلد ۲۰ ڈگری ۳۰ فٹ کے قریب اور طول البلد ۶۹ اور ۷۰ ڈگری کے درمیان۔ بھٹ اور ترائی کی جگہ سینکڑوں مربع میل کے علائقہ میں ریت کے بہت بڑے بڑے اونچے ڈھیر پھیلے ہوئے ہیں۔ (نمبر۴) گہرے اور نرم ریت کے یہ پلیٹو دراڑیں (Dararans) کہلاتے ہیں، اور ہوا کے ہر بہاؤ کے ساتھ اِن کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اِس ہمہ وقتی تغیر کا نتیجہ یہ ہے کہ اِن پر نباتات کا اُگنا ممکن نہیں اور اِن پر سے گذرنا بھی عملاً ناممکن ہے، دراڑوں (Dararns) کے اِس علاقہ کے شمال میں ریگستان اپنی عمومی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، یعنی ہوا کے رُخ کے متوازی بھٹ کی دیواروں کا سلسلہ اور اُن کے درمیان ترائی کے میدان، جیسا کہ جنوب میں ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اِس علاقہ میں ریت کے اُڑنے

والے پہاڑ کیسے پیدا ہوتے رہتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ دوسرے حصّوں کی نسبت اِس حصہ میں جو ریت ہے وہ بہت نرم اور باریک ہے، یہی اِس کی وجہ ہے۔ عام موسمی حالات میں مان سون کی ریت منتقل کرنے والی قوت یہاں تک پہنچتے پہنچتے ختم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ علائقہ شاید حدودِ مان سون کے آخری مان سون پر ہے اور یہ علائقہ مان سون ہوا کے مغربی علائقہ میں واقع ہے۔ ریت کے وزنی ذرات پیچھے کے علائقہ میں جمع ہو جاتے ہیں اور صرف باریک ذرّات یہاں تک آپاتے ہیں۔ اگر یہ نظریہ درست ہے تو تسلیم کرنا پڑیگا کہ گذرے ہوئے زمانہ میں مان سون کی شدت زیادہ تھی اِس وجہ سے آگے شمال میں بھی اُس نے ریگستان کا نقشہ اُسی طرح مرتب کیا ہے جس طرح جنوب میں۔ لہٰذا دراڑوں (Daranes) کا وجود نسبتاً ماضی قریب سے تعلق رکھتا ہے، اور ممکن ہے سابقہ زمانہ کے نشیب و فراز اِس کے اندر پوشیدہ ہوں۔ یہ حقیقت بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ دو دراڑیں ایسی ہیں جن کے درمیان بھٹ اور ترائی کی ایک پتلی پٹی موجود ہے۔

یہ کچھ عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ اِس غیر آباد لق و دق صحرائی علائقہ میں چند جھیلیں موجود ہیں، جنھیں میٹھے پانی کے تالاب کہا جائے تو زیادہ موزوں ہوگا اور یہ ریگستانِ تھر کے اندرونی علائقہ میں ہیں۔ جبکہ کھار (Salt) اور الکلی (Al kaline) پانی کی جھیلیں بہت سی ہیں، وہ ایسے نشیب یا ترایوں میں واقع ہیں جنھیں مقامی طور پر گوچر (چراگاہ = Gochars) کہا جاتا ہے۔ پانی کے نیچے جو زمینی سطح ہے، وہ دریائی مٹی سے بنی ہے اور اُس ریت سے پاک ہے جو اس نے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے، دراڑوں کے وسیع بنجر علائقہ میں کچھ ایسے پایاب نشیب بھی ہیں جن میں کیچڑ یا ایسے کہیں کہیں پانی اور کہیں کہیں ریت کی موٹی نمی شدہ تہ تلے میں موجود رہتی ہے۔ اِس علائقہ میں پانی کی یہ موجودگی اِس وجہ سے ہے کہ نرم ریت کے وسیع علائقہ پر جب بارش ہوتی ہے تو اُس کا پانی زمین کے اندر سے چھن کر نشیب میں جمع ہو جاتا ہے۔ نرم ریت کی آخری تہ چونکہ سخت زمین سے ملتی ہے لہٰذا یہ تو ہمہ وقت پانی کو جذب کرنے کے عمل میں مصروف رہتی ہوگی۔ جس جگہ

پانی دریائی مٹی پر قائم رہتا ہے جیسے دراڑوں کے کناروں پر ڈھنڈ (Dhand)۔ وہاں عام طور پر کھاریا الکلی پانی ہے۔ لیکن جن مقامات پر ریت میں ذرا اونچی سطح پر پانی ٹھہرا رہتا ہے وہاں پانی میٹھا ہے۔

الکلی پانی کے بہت سے ڈھنڈ ایسے ہیں کہ گرمی کے موسم میں جب پانی بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے تو ایک مادۂ زمین پر باقی رہ جاتا ہے۔ جس میں تیزاب کی آمیزش ہوتی ہے جسے ٹرونا (Trona) کہتے ہیں۔ بعض موافق برسوں میں یہ تیزابی مادہ (Sesquicari bonate of Soda) کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے، اور برآمد کیا جاتا ہے، ایسی جھیلوں کی اکثریت دو مخصوص دراڑوں کے درمیان جو پور چندر (Pur Chandar) اور ساموئی (Samio) کے نام سے مشہور ہیں، ایک وادی میں واقع ہیں، یہاں جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے ٹالی اور بھٹ کی پتلی مٹی موجود ہے۔ ڈھنڈ چونکہ ترائی میں واقع ہوتی ہیں۔ اِس لئے عموماً لمبوتری شکل کے ہیں اور جنوب سے مغرب یا شمال سے مشرق کی سمت پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن دراڑوں کے درمیان واقع گوچر (چراگاہ) کوئی خاص شکل نہیں رکھتے۔

ریگستان تھر کا تیسرا ٹکڑا جو سندھ سے ملحق ہے وہ دراڑوں اور جھیلوں کی پٹی کے شمال میں پھیلا ہوا ہے یہاں ریت کی پہاڑیاں چونکہ ہلکی ہوا کی زد میں رہتی ہیں اِس لئے اُس سلسلۂ بھٹ کی نسبت جو دراڑوں کے علاقہ کے جنوب میں واقع ہے کم نکھری ہوئی ہیں اور جیسے جیسے کوئی آگے بڑھتا ہے اُسے نظر آتا ہے کہ ایسے ہی اِدھر اُدھر بکھری ہوئی ہیں۔ اگرچہ غور سے دیکھا جائے تو ایک مخصوص ترتیب واضح ہوتی ہے۔ ایک طرف ریتیلی زمین کے بڑے بڑے قطعات کے درمیان دریائی مٹی کی بنجر پٹیاں جو تقریباً مشرق سے مغرب کی سمت پھیلی ہوئی ہیں، نظر آئیں گی۔ جبکہ ریت کے ٹیلے جو ریت کے قطعات میں واقع ہیں وہ تقریباً شمال سے جنوب کی سمت پھیلے ہوئے ہیں۔

وہ چیز جو اِس علاقہ میں پہلی ہی نظر میں مشاہدہ کرنے والے کو متوجہ کرتی ہے، قدیم

دریاؤں کے نشانات ہیں جو غیر آباد صحرا میں خطِ منحنی کی شکل میں موجود ہیں، یہ دریا جو طبعی طور پر سندھ کی درمیانی وادی سے تعلق رکھتے ہیں اب ہمارے تفصیلی جائزے کا موضوع بنیں گے، ریگِ صحرا نے اِن دریاؤں پر اب قبضہ کر رکھا ہے، اِس کی وجہ پانی کے اُن راستوں کا بند ہو جانا ہے جو بارانی پانی کے تیز دھاروں کو یہاں تک پہنچاتے تھے اور دریاؤں میں جمع ہونے والے بہت سے ریت کو بہا کر لے جاتے تھے، جو نظریہ پہلے پیش کیا جا چکا ہے اُس کے ثبوت میں مزید شواہد ملیں گے اگر آپ اِس علاقہ میں سفر کریں اور وہ نظریہ یہ ہے کہ جنوبی ہوائیں ماضی کے ایک دور میں آج کی نسبت زیادہ تیز رفتاری اور قوت کے ساتھ چلتی تھیں، اگر ہم غور کریں تو اِن کے آثار ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہیں گے۔ مثال کے طور پر ڈرب ڈیتھری (Drib Dethri) کو لیجیے، جہاں ایک قدیم بستی کو ہواؤں کے ساتھ اُڑنے والی کثیر ریت نے دفن کر دیا ہے۔

وہ زمین جو سندھ کے ریگستانی حصّے کے نیچے دبی ہوئی ہے، خواہ مذکورہ بالا قدیم دریائی علاقہ میں ہو یا شمالی داڑوں کے نیچے اور خواہ جنوب میں طویل اور بلند سلسلۂ بھٹ کی درمیانی ترائیوں میں ہو۔ زیادہ تر سخت دریائی مٹی سے بنی ہوئی ہے، یہ عین ممکن ہے کہ چونے کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ جو روہڑی سے جنوب کی طرف چلا گیا ہے اور بالآخر جنوب میں ریت کے علاقہ میں غائب ہو گیا ہے۔ کافی دور آگے تک ریت کے اندر دفن ہو۔ اور ہم دیکھتے ہیں کہ اِسی قسم کی بنی ہوئی چٹانیں تقریباً ایک سو میل مشرق میں ریت کی پہاڑیوں میں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ سلسلہ جیسلمیر (Jaisalmir) میں رام گڑھ (Ram garh) سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ اگر سندھ کی وادی سے تقریباً اِس فاصلہ تک ایک خط کھینچ دیا جائے تو اِس خط تک ریگستان کی سطح مسلسل بتدریج بلند ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسی چٹانوں کی کثیر تعداد خود جیسلمیر (Jaislamir)، باڑمیر (Barmer) اور چوٹن (Choton) کے آس پاس باہر نکلی ہوئی نظر آئے گی۔ چٹانوں کا یہ بنجر اور وہ پہاڑیاں جو ریت کے سمندر میں عمودی جزیرے معلوم ہوتے ہیں۔ سندھ کی چونے کی پہاڑیوں سے قطعاً مختلف الاصل ہیں۔ اِسی طرح نگرپارکر (Nagar Parker) کے نزدیک کارونجھر (Karunjhar) پہاڑی بھی

جو رن کچھ کی سمت واقع ہے، اِس کے برعکس کچھ کی چٹانیں زیادہ تر چونے کی ہیں۔

تھر کے بیچوں بیچ مغربی راجپوتانہ میں جو ریت ہے اُس کا تجزیہ ثابت کرتا ہے کہ یہ مقامی چٹانوں کے بھرنے سے بنا ہے، کیونکہ اِس کے ذرّات میں کثرت سے وہ عناصر شامل ہیں، جن سے یہاں کی اکثر پہاڑیاں بنی ہیں۔ یہ عمل اُسی صورت میں واقع ہوتا ہے جب کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ درجہ حرارت کے درمیان بہت زیادہ فرق ہوتا ہے، یعنی چٹانوں کی تہیں کبھی پھیلتی ہیں کبھی سکڑتی ہیں۔ اور یہ ان چٹانوں کی شکل سے ظاہر ہے۔ اُس پر تیز ہواؤں کی مار، جو اِنھیں ذرہ ذرہ کر ڈالتی ہے لیکن لا۔ توش (LaTouche) نے ریت کے جو نمونے جُدا جُدا مقامات سے جمع کیے اُن میں چونے سے متعلق ذرّات بھی ملے جو صدیاں گذرنے کی وجہ سے پتھرائے ہوئے تھے اور لا توش کو یقین ہے کہ اِن کا تعلق رن کچھ کے کینوزوک ٹرسٹری زمانے سے لاکھوں سال پتھرائے چونے کے پتھروں سے ہے، ہوا نے اِن کو اپنے روش پر اُٹھایا اور ۵۰۰ میل دور پھینک دیا۔ بلکہ اِس سے بھی زیادہ کیونکہ بیکانیر (Bikaner) کے نزدیک بھی ایک جگہ اُسے ایسے ہی ذرّات ملے ہیں۔

* ارضیات کی ماہروں نے زمین کی عمر کو مختلف زمانوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ زمانے تین (۱) کنوزوک (اب سے تقریباً ۶۵۵ لاکھ سال پہلے کا زمانہ، (۲) میوسوزوک (۶۵۵ لاکھ سال پہلے سے ۲۲ کروڑ ۵۵ لاکھ سال پہلے کا زمانہ، (۳) پئلوزوئک (۲۲ کروڑ ۵۵ لاکھ سال پہلے سے بھی ۵۷ کروڑ ۵ لاکھ پہلے کا زمانہ) ہیں۔ کنوزوئک زمانے کو دو حصو میں تقسیم کیا گیا ہے، ا۔ کناٹرنری (۲۰ لاکھ سال کا) اور ۲۔ ٹرشری (۶۳۵ لاکھ سال کا) کناٹرنری زمانے کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ (۱) قریبی اور (۲) پلائیسٹوسین، تازہ زمانے کا دور ۱۰ ہزار سال سے کچھ آگے سے شروع سمجھا جاتا ہے۔ اسی حساب سے دوسرے زمانے کے دور کا خاتمہ ۱۹ لاکھ ۹۰ ہزار سال پر ہوتا ہے۔ ٹرشری زمانے کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) پلایوسین (۵۰ لاکھ کا) (۲) مایوسین (۱۹۰ لاکھ سال کا) (۳) اولیگوسین (۱۲۰ لاکھ سال کا) (۴) ایوسین (۱۶۰ لاکھ سال کا) اور (۵) پیلیوسین (۱۱۵ لاکھ سالوں کا) اسی طرح میسوزوک زمانے کو تین دوار میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) کریٹیس (۲۱۰ لاکھ سال) (۲) جوراسک (۵۷۰ لاکھ سال) اور تیسرا ٹرائنک (۳۲۰ لاکھ سال کا) پئلیوزوئک دور کو ۶ زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) پرمین (۵۵۰ لاکھ سالوں کا (۲) کاربنیفیرس (۶۵۰ لاکھ برسوں کا) ڈونین (۵۰۰ لاکھ برسوں کا) (۴) سائلورئین (۴۰۰ لاکھ برسوں کا) (۵) آرڈو ویشین (۶۵۰ لاکھ برسوں کا) اور (۶) کیمبرین (۷۰۰ لاکھ برسوں کا)۔ ان جگوں کے حساب سے زمین کی کل عمر ۵۷ کروڑ ۵ لاکھ کے قریب ٹھہرتی ہے۔ اس سے پہلے کا زمانہ جو ''پری کیمبرین وقت'' کے نام سے پکارا جاتا ہے، اگر صرف اس کو شمار میں لایا جائے تو زمین کی عمر ۴ ارب برس سے بھی زیادہ ہوگی۔ جانداروں کے لحاظ سے یہ زمانہ ''اعلیٰ جانداروں کا دور'' اس سے پہلے والے دور کو ''درمیانہ جانداروں کا دور'' اس میں پہلے والے دور کو ''قدیم جانداروں کا دور'' کہا جاسکتا ہے۔ بلکل نئے انسان کو زمین پر پیدا ہوئے بھی تقریباً دس ہزار برس کا زمانہ گذر چکا ہے۔ سندھ کی اس زمین کو ''درمیانہ جگ'' کے پہلے زمانے کی پیدائش کہا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سندھ کی سرزمین کو پیدا ہوئے ۱۳ کروڑ برس گذر چکے ہیں۔ (زمین کی عمر کے لیے، دیکھئے؟ ریڈرز ڈائجسیٹ کی بڑی انسائیکلو پیڈیائی لغت (۱۹۶۴ء) جلد اول ص ۳۶۵ (مترجم)

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وادیٔ سندھ اور راجپوتانہ کی چٹانوں کے درمیان سندھ کی تھر ریگستان میں ریت کا یہ عظیم ذخیرہ کہاں سے آیا؟ اہم بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے وہ یہ کہ دریائے سندھ کی وادی سے ملحق ریگستان کا ریت بہت ہلکے رنگ کا ہے جبکہ وہ ریت جو باڑمیر اور جیسلمیر کے درمیان ریت کے ڈھیروں میں ہے گہرے رنگ کا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وادی سے ملحقہ ریت کا سائنسی تجربہ کیا گیا ہے یا نہیں، البتہ لا۔توش کے تحقیقاتی تجربات کے مطابق یہ ریت زیریں سندھ کی چونے کی پہاڑیوں کے گھستے رہنے سے وجود میں آیا ہے، زیریں سندھ سے مراد وہ علاقہ ہے جو کراچی سے مانجھند (Manjhand) تک ایک خط کھینچنے کے بعد نیچے رہ جاتا ہے، اِس میں حیدرآباد کے جنوب میں واقع گنجو ٹکر (Ganjo Takar) بھی شامل ہے، اِس علاقہ پر وہی مان سون گذرتے ہیں، یہ علاقہ درجہ حرارت کے شدید تفاوت کا شکار ہیں، اور تیز و تند ہوائیں جو رن کچھ کی پہاڑیوں پر چلتی ہیں، یہاں بھی چلتی ہیں، ریت کے اِس ذخیرہ کا ایک یقینی ذریعہ اور بھی ہے اور بلینڈ فورڈ (Bland Ford) کے نظریہ کے مطابق یہ سب سے بڑا ذریعہ ہے، یعنی وہ ریت جو سمندر خشکی سے پیچھے ہٹتے وقت چھوڑتا رہا۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ زمانۂ تاریخ میں بھی ایسا دور موجود ہے کہ سمندر وادی سندھ کے زیریں حصہ کے بڑے ٹکڑے پر پھیلا ہوا تھا خاص طور پر وہ حصہ جسے ہم سندھ کا ڈیلٹا کہتے ہیں۔ ساتھ ہی رن کچھ کا بیشتر علاقہ بھی۔ زمانہ کی طویل کروٹوں کے ساتھ ایک نیا ساحل جنم لیتا رہا جس کے ریت کو جنوبی مغربی مان سون اُڑاتی رہی اور شمالی مشرقی علاقہ میں جہاں بارش کی کمی تھی اور جہاں ایسے آبی گذرگاہیں نہیں تھیں جو ریت کو بہا کر دوبارہ سمندر میں لے جائیں، جمع کرتی ہیں۔ نمبر۶۔

ریت کی یہ نقل مکانی ساحل سمندر کے مقامات پر بڑی آسانی کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہے، خاص طور پر دریائے سندھ کے دہانے کے آس پاس آپ دیکھیں گے کہ جب بھی جنوبی مغربی ہوا شدت پکڑتی ہے تو کناروں کا تمام ریت اُڑ جاتا ہے اور دریائی مٹی نمایاں ہوجاتی ہے۔ ذرا فاصلہ سے دیکھیں تو اُڑتا ہوا ریت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جھاڑیوں میں

آگ لگنے سے دھواں زمین سے ملا ہوا اُڑتا محسوس ہوتا ہے اور نزدیک سے تمام فضا اُڑتے ہوئے ریت سے مکدّر نظر آئے گی۔ اِس اُڑتے ہوئے ریت کا کچھ حصّہ بہت فاصلہ طے نہیں کریگا۔ بلکہ جیسے ہی کوئی رکاوٹ راستہ میں حائل ہوگی یہ ایک ڈھیر کی شکل میں جمع ہوتا رہیگا جو ممکن ہے کئی برسوں تک باقی رہے، خواہ اُسی جگہ یا آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہوئے، لیکن منتشر ہوئے بغیر۔ لیکن ہماری دلچسپی تو اُس ریت سے ہے جو عارضی طور پر تو چاہے کسی جگہ ٹھہر جائے لیکن جیسے ہی ہوا کے شدید جھونکے آئیں، وہ آگے روانہ ہوجائے گا، اور دریائے سندھ، اس کی نہروں، درختوں اور کھیتوں پر سے گذرتا ہوا برسوں سفر کرتا رہے گا، تا آنکہ ریگستانی تھر کی آغوش میں پہنچ کر ریت کے ذخیرہ میں اضافہ کا سبب بن جائے کیونکہ یہاں پہنچ کر ہوا میں اتنی قوت باقی نہیں رہتی کہ وہ اِس ریت کے آرام میں مزید خلل ڈال سکے۔

حیدرآباد کے شمال اور مشرق میں دریائے سندھ کی سابقہ گذرگاہ بھی خاصی مقدار میں موسمی ریت کو آگے روانہ کرتی ہے، چنانچہ تھر اور اِس مقام کے درمیان کئی جگہ ریت کے ایسے عظیم الجثہ ٹیلے ہیں جنھیں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہوئے رُک گئے ہیں، سندھ کے میدان میں آبپاشی کے ذرائع کی زیادتی اور اِس کی وجہ سے نباتاتی اضافہ یقیناً اِس عمل پر اثر انداز ہوا ہوگا اور ریت کی منتقلی بڑی حد تک سست پڑ گئی ہوگی، جب ریت کے ٹیلے خاصے بلند ہوجاتے ہیں اور اُن پر گھاس اور جھاڑیاں اُگنے لگتی ہیں تو وہ اپنی جگہ مضبوطی کے ساتھ قائم ہوجاتے ہیں، چنانچہ اِس پر غور کرتے ہوئے کہ ریگستان تھر میں ریت کے عظیم ذخیرے کس طرح جمع ہوئے۔ ہمیں یہ تصور کرنا پڑیگا کہ سندھ کا میدانی علاقہ ہزاروں برس تک گنجان نباتات سے خالی رہا ہوگا جس کی وجہ سے ریت کے آگے بڑھنے میں بہت معمولی رکاوٹیں پیش آئی ہوں گی، سندھی کی ایک کہاوت ہے "قطر وقطر و تلاؤ" (قطرہ قطرہ مل کر تالاب بن جاتا ہے)، یہ اِس جگہ صادق ہے۔

ریگستانی علاقہ کے باشندوں کا رہن سہن گذری ہوئی صدیوں میں برائے نام ہی

تغیر پذیر ہوا ہوگا، وہ لوگ زیادہ تر چرواہے اور گلہ بان ہی رہے ہیں، اِس کے ساتھ اون کی کتائی اور کھالوں کا چمڑا بنانے کے پیشے بھی شامل کئے جاسکتے ہیں، زراعت تو اُسی وقت ممکن ہے جب موسم کے مناسب ایام میں بارش ہوجائے اور وہ بھی ریت کی پہاڑیوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے میدانی اور نشیبی ٹکڑوں میں۔ہل عموماً اونٹوں کی مدد سے جوتا جاتا ہے، ریگستان کے جنوبی حصّہ میں نمک کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں جنھیں ایسے برساتی نالوں نے جمع کردیا ہے جن کا پانی کچھ دھوپ سے خشک ہوجاتا ہے اور کچھ زمین میں جذب ہوجاتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے شمال کے الکلی نالوں میں سوڈے کی تعداد جمع ہوجاتی ہے، یہ ذخیرے صدیوں تک مقامی ضرورت کو پورا کرتے رہے ہوں گے اور اب ایک صدی یا کچھ زیادہ عرصہ سے کثیر پیانہ پر اِن چیزوں کی مقدار تجارتی مقاصد کے لئے فراہم کرتے ہیں۔

تھر کی چراگاہوں میں لوگ جھاڑیوں سے پُرانے طرز کی گول جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں، اِس کے لئے بڑی لکڑیوں کی ضرورت پیش نہیں آتی، چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ زمانۂ قدیم سے یہی طریقہ اِس علاقہ میں مُروّج ہے۔

چونکہ تھر کی معیشت زیادہ تر مویشی پالنے اور انہیں چراگاہوں میں چرانے پر منحصر ہے اِس لئے جس سال بارش نہیں ہوتی یا مسلسل دو سال تک معمولی مقدار میں ہوتی ہے تو قحط کے آثار نمودار ہوجاتے ہیں، زیادہ اموات مویشیوں میں ہوتی ہیں کیونکہ اُنھیں چراوا ہے ریگستان سے باہر نکالنے میں اِس امید پس وپیش سے کام لیتے ہیں کہ شاید بارش ہوجائے، آخر وہ وقت آجاتا ہے کہ مویشیوں میں ریگستان سے چل کر دریائی میدانی علاقوں تک پہنچنے کی قوت بھی نہیں رہتی چنانچہ اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے اونٹ اور بکریاں جو صحرائی جھاڑیوں کے سہارے زندہ رہنے کی اہلیت رکھتے ہیں، کم نقصان اُٹھاتے ہیں، بہرنوع چونکہ جانوروں کے لئے بھی پانی انسان ہی کنوؤں سے نکالتا ہے، لہٰذا جب وہی ریگستان سے باہر نکل جاتا ہے اور جانوروں کو نہیں نکال سکتا تو نتیجہ اِن جانوروں کی موت کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے۔ اگر مارواڑ میں بھی قحط سالی کی صورت پیدا ہوجائے۔ تو تھر سے گذرنے والے خاص راستوں پر نقل مکانی کرنے والے لوگوں کا ہجوم ہوجائیگا۔کنویں جو اکثر اوقات دوسو سے تین سو فٹ تک گہرے ہیں، ایک یا دو سال کی بارش سے یہ خشک تو

نہیں ہوتے لیکن اُن سے پانی کھینچنا سخت زحمت کا باعث ہوجاتا ہے۔

عام پرسکون حالات میں سندھ اور مارواڑ، گجرات اور رن کچھ کے درمیان اونٹوں کے قافلے کافی سامان تجارت کے ساتھ آتے جاتے رہتے ہیں، روہڑی اور کھپرو (Khipro) سے گجرات، کچھ جانے والے کاروانی راستے آج کی نسبت کچھ عرصہ پہلے زیادہ مستعمل تھے۔ ریگستان میں ریلوے لائن بچھائی جانے کے بعد پُرانے راستوں کی اہمیت کم ہوگئی ہے لیکن کچھ نئے راستے وجود میں آگئے ہیں۔

اِس قسم کے باہمی روابط اور میل جول کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ریگستان سندھ اور سندھ کے مشرقی ممالک کے درمیان ایک مؤثر حد فاصل ہے۔ محمود غزنوی اور محمد بن تغلق نے جب اپنی افواج کو گجرات سے ریگستان کے راستے پیش قدمی کا حکم دیا تو اُن کے تجربات نے بھی یہی ثابت کیا۔ اِسی طرح شہنشاہ ہمایوں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ جب جان بچا کر بھاگا تو سخت گرمی کے باوجود اُس نے جیسلمیر سے امرکوٹ تک اِسی ریگستان سے گذرنا مناسب سمجھا کیونکہ اُسے یقین تھا کہ اُس کے دشمن اس راستہ پر اُس کا تعاقب نہیں کریں گے۔ واقعہ مشہور ہے کہ جب ہمایوں نے دوبارہ سلطنت حاصل کی تو رانک ڈہر (Ranak Dahr) کے مقام پر جو سندھ کی سرحد پر واقع ہے اُس نے پتھر کا ایک تالاب پانی کے لئے بنوادیا تاکہ اُس احسان کا بدلہ چکا سکے جو اِس جگہ کے باشندوں نے سخت پیاس اور گرمی کے عالم میں اُس کے لئے پانی مہیا کر کے کیا تھا۔

لیکن اِس نوعیت کے چند رومانوی واقعات کے علاوہ تاریخ سندھ میں تھر کو کوئی اہمیت حاصل نہیں رہی، اکبر اعظم نے تو اتفاقی طور پر امرکوٹ کو اپنی جائے پیدائش بنایا لیکن اِس کے علاوہ کوئی قابل ذکر شخصیت اِس علاقہ میں پیدا نہیں ہوئی۔ یہاں کے گلّہ بان باشندے اپنے دونوں طرف کے پڑوسی ممالک سے بیگانہ ہی رہے، اور اُن کے ملک نے کسی کی مہمان نوازی کی سعادت حاصل نہیں کی، اور یہ لوگ اِس بات سے بھی لاتعلق ہی رہے ہیں کہ اُن کے حکمران وادیٔ سندھ سے تعلق رکھتے ہیں یا راجپوتانہ سے۔

تشریحات باب دوسرا

1. ''معمائرز آف جیالاجیکل سروی آف انڈیا'' XXXV لاتوش جیالاجی آف ویسٹرن راجپوتانہ، ص ۱۳۔
2. ایم۔بی۔ایس۔آئی، XXXV لاتوش، جیالاجی آف ویسٹرن راجپوتانہ، ص ۳۷۔
3. آر۔ڈی۔اولڈھام' جیالاجی آف انڈیا'' (۱۸۹۳ء) ص ۴۵۷۔
4. ایم۔جی۔ایس۔آئی۔ XLVII پارٹ، دی الکلائن لیکس اینڈ دی سوڈا انڈسٹری آف سندھ۔
5. ایم۔بی۔ایس۔آئی XXXV لاتوش، جیالاجی آف ویسٹرن راجپوتانہ، ص ۱۰
6. بلانفورڈ نوٹس جیالاجی آف ویسٹرن سندھ ایم۔جی۔ایس۔آئی (۱۸۸۰ء) XVII میں بتایا ہے پہاڑی سلسلے گنجونکر کے چونے کے پتھروں کی اوپری سطح پر ہوا کے ذریعے اُڑنے والی ریت کے ٹکرانے کے سبب جُھریاں پڑ گئی ہیں۔ جن کا رُخ ۲۵ درجہ شمال کی جانب ہیں''۔

باب تیسرا

سندھ کے میدان اور دریائے سندھ

موسم سرما کے ابتدائی ایام میں زیریں وادیٔ سندھ کے اُس حصہ میں کھڑے ہوکر اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائیے جو نہروں سے سیراب ہوتا ہے تو اِس ملک کی لامحدود زرخیزی کا اندازہ ہوگا، گیہوں کے چھوٹے چھوٹے پودوں کی تروتازہ گہری ہریالی سے گذرتی ہوئی ہماری نظریں، جوار کے اُن سنہری بقیہ پودوں پر پڑتی ہیں جو فصل کٹنے کے بعد کھیت میں باقی رہ جاتے ہیں، ایک طرف کپاس کے پودے دور تک لہلہاتے ہوئے دکھائی دیں گے جو اپنی آخری چنائی کے منتظر ہیں اور کھلے ہوئے سفید ڈوڈے برف کے ٹکروں کی مانند پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں، اگر آبپاشی کی نالی کے ساتھ ساتھ کچھ دور آگے دیکھیں گے تو اِدھر اُدھر مکانات اور اناج گاہنے صاف کرنے کے فرش (پڑ)، اُن کے آس پاس ببول کے گنجان درخت نہر کے کنارے کنارے دور تک سایہ کئے ہوئے کھڑے ہوں گے اور شاید ذہن یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ ایسے مناظر کا نہ ٹوٹنے والا سلسلہ کچھ کم تین سو میل تک چلا گیا ہے جس کی چوڑائی تیس سے لیکر اسی میل تک ہے، اِس خطۂ زمین کو اِس کی قدرتی حالات میں یک لخت دیکھنے کے لئے کسی قدر تصوراتی کاوش کی ضرورت ہے، تاکہ صرف وہ منظر سامنے آجائے جس میں انسانی عقل و کوشش کا دخل نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ کھیتوں کے اِسی سمندر میں ریگستانی جزیرے بھی ہیں، ریت کی پہاڑیاں بھی، آبپاشی کی سطح سے بلند بنجر زمین بھی اور جنگل سے ڈھکے ہوئے زمین کے کٹے پھٹے ٹکڑے بھی، لیکن قدیم سندھ کا صحیح نقشہ سکھر بیراج (Sukkar Barrage) کے آگے ملیگا، جہاں وسیع کھلے ہوئے زمینی یا آبی ٹکڑے نظر آئیں گے، جو ہزارہا برس سے سندھ کی انوکھی خصوصیات میں شامل رہے ہیں۔ جتی (Jati) نمک کے میدان یا اُن کے مقابل صوبہ کے

آخری حدود کے پاس شہدادکوٹ کا "پٹ (Pat) جو ہر قسم کی نباتات سے محروم ہیں۔

یہاں زمین کی خمیدگی بالکل اسی طرح نظر آتی ہے جس طرح کسی پرسکون سمندر کے کنارے سے۔ دوسرے مقامات بھی ایسے ہیں جہاں سے خط اُفق حد نظر تک ساکت اور مسطح نظر آئیگا، کہیں کہیں کسی درخت یا دوسری شے سے اگر اس خط مستقیم میں رخنہ بھی پڑتا ہے تو اُس سے اِس بے کراں وسعت کا وجود مزید نکھر جاتا ہے خراب نہیں ہوتا۔ اِسی طرح دریائے سندھ، جب اس میں بھرپور سیلاب ہو، انسانوں کے تعمیر کردہ پشتوں کے درمیان بھی دس میل چوڑا پاٹ لئے ہوئے اور اپنے اس ڈیلٹے کی بیشتر زمین کو آبی چادر سے ڈھکے ہوئے، آج بھی اپنے قدیم نام ''مٹھودریا'' (Mithu Darya) کا حقیقی وارث نظر آتا ہے جس کے معنی ہیں میٹھے پانی کا سمندر، سندھ کی ایسی ہی خصوصیات میں روہڑی ڈویژن کے موٹے گھاس کے میدان بھی شامل ہیں۔ اور حد نظر تک پھیلے ہوئے دریائی جنگلات اور وہ ڈھنڈ (جھیل) جن کو گھنے سرکنڈے کے پودوں نے ڈھانپ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ماضی کے سندھ کی روح اِسی متضاد منظر میں پوشیدہ ہے جس میں ایک طرف صحرائی شادابی اور دوسری طرف انتہائی بیابانی موجود ہے، دونوں کو آج آبپاشی کے جدید طریقے سے آراستہ کیا جارہا ہے۔

سندھی منظر کی یکسانیت جس کا بنیادی پہلو وسعت ہے بلاشبہ قدرتی نباتات کے اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے بدلا ہوا معلوم ہوتا ہے، اِس کی وجہ زمینوں میں فرق ہے۔ کچھ ''پکی'' (Paki) ہے جو کسی وقت دریائی پانی سے سیراب ہوتی تھی لیکن اب یہ پانی وہاں تک نہیں پہنچتا، یہ زمین قدیم دریائی مٹی سے بنی ہے زمین کے یہ ٹکڑے اتنے سخت ہیں کہ گھوڑے کے سموں کے ٹاپ دور تک سنائی دیتے ہے۔ کاچھو (Kachho) زمین جو پہاڑی مٹی سے بنی ہے اور جس کے متعلق آگے چل کر بیان کریں گے کسی قدر گہرے رنگ کی ہوتی ہے جبکہ پکی مٹی کا رنگ ہلکا ہوتا ہے، اِس سخت زمین پر کنڈی (Kandi) کا خاردار درخت کرڑ (Kirir) یا کیپر (Caper) جس پر پتے نہیں ہوتے اور بیر (Ber) ملیں گے جو برائے نام بارش پر بھی زندہ رہ جاتے ہیں۔

اِس کے برخلاف پوپلے ریت کی زمین ''واریاسی'' (Wariasi) ہے اور اِسی سے ملحقہ نرم زمین جس کا رنگ سفید اور ذرات اتنے باریک کہ مٹھی بھر کر دبایئے تو پاؤڈر بن جائیگا، اِس سے جو غبار اُٹھتا ہے وہ لوگوں کے لئے خاصا پریشان کُن ہے، یہاں خصوصیت کے ساتھ جو پودے اور جھاڑیاں ملیں گی اُن میں کھپ (Khip) کا پودا شامل ہے، اِس میں تپلی تپلی شاخیں ہوتی ہیں لیکن پتہ ایک آدھ ہی ملی گا۔ شمالی مغربی یورپ میں جس قسم کی جھاڑ و استعمال ہوتی ہے یہ اُس سے مشابہ ہے، دوسری جھاڑی پھوگ (Phog) ہے جس کی تپلی تپلی مڑی ہوئی شاخیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے نقش و نگار۔ آک (Ak) کے پودے بھی اِسی زمین میں ہوتے ہیں۔ اِسی پودے کی شاخیں روئیں دار اور پتیاں بہت چوڑی ہوتی ہیں۔ یہاں کی نرم زمین نباتات کی بہت سی اقسام کی پرورش کرتی اور جہاں پانی بھی موجود ہو تو نباتات بکثرت ہوتی ہیں۔

سیم تھور (کلر) (Kalar) زمین بھی سندھ کا ایک امتیازی نشان ہے۔ اس میں نمک کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ تجربہ کے مطابق اس کے مرکب میں چالیس فیصدی سوڈیم سلفیٹ (Sodium Sulphate) موجود ہوتا ہے۔ یہ زمین رنگ میں سیاہ اور چکنی ہوتی ہے اور اِس پر کوئی نباتات اُگ نہیں سکتی، لیکن زیریں سندھ میں اِس کے جو قطعات گہرے بھورے رنگ کے ہیں اُن میں کئی قسم کے پودے اُگتے ہیں، خاص طور پر سندھی "پیلو" (کھبڑ Khabar)۔ شمالی سندھ کے ایسے ہی کلّر (تھوڑ زدہ زمین) پر خودرو پودے اور جھاڑیاں ملتی ہیں خاص طور پر وہ جن سے نیلا رنگ حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ قطعات زمین آنکھوں کو بھلے معلوم نہیں ہوتے، بعض بعض مقامات پر زیر زمین پانی کی سطح اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ اس کھاری زمین کے اوپر آجاتا ہے اور بہنے لگتا ہے اور بہت سا نمک اِس میں شامل ہو جاتا ہے، جب یہ پانی تمازت سے بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے تو ایک چمکدار مادہ زمین پر جما ہوا چھوڑ دیتا ہے جو پودوں کے لئے سخت نقصان دہ ہوتا ہے۔ پروفیسر پگوٹ (Piggot) نے بجا طور پر اِسے "برف کی شیطانی نقل'' کہا ہے۔ بہرنوع زمین کی یہ کیفیت اُس منزل کی نشاندہی کرتی ہے کہ

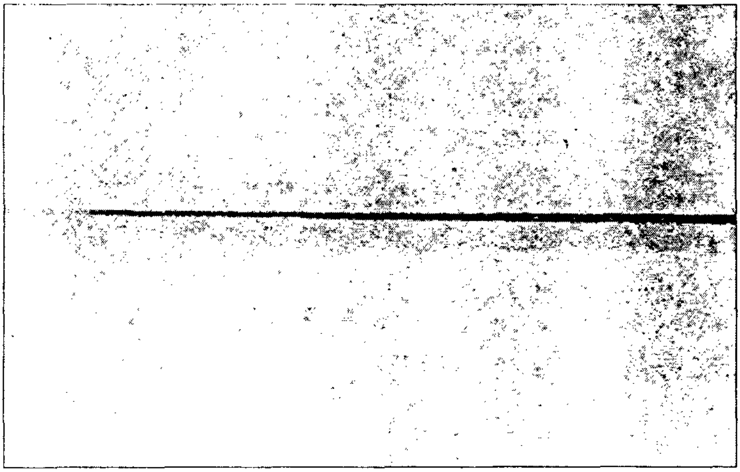

دریائے سندھ: لکی (Laki) پہاڑی سلسلے کی سمت کرتے ہوئے

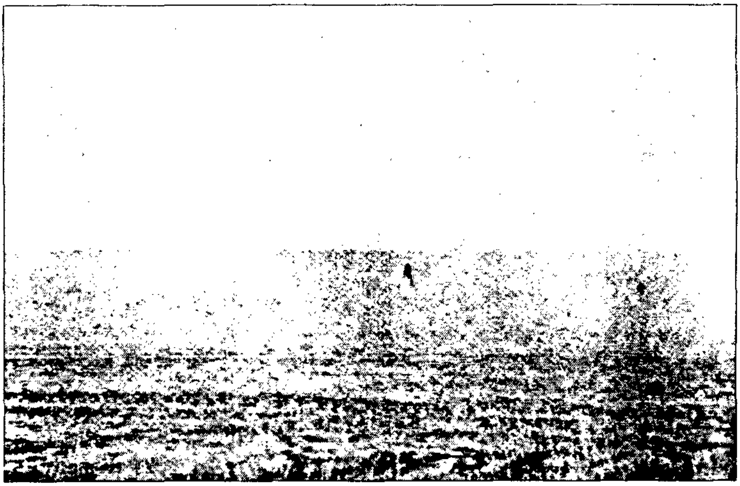

پٹ (Pat) یا بالائی سندھ کا ریگستان

اگر نہری پانی اِسے دستیاب ہو جائے تو یہ زمین چاول کی کاشت کے لئے استعمال کی جاسکتی ہے، البتہ اگر نمکیات زمین کے اندر خاصی گہرائی تک موجود ہیں تو اُسے کارآمد نہیں بنایا جاسکتا۔

دریائے سندھ کے کنارے کنارے والی زمین کلّر کی نسبت " کچو " (Kacho) زمین بہت بہتر ہوتی ہے، یہ ہلکی نمی کے ساتھ مٹی اور ریت کا مرکبّ ہوتی ہے، یہ زمین انتہائی شاداب ہوتی ہے۔ دریائے سندھ میں سیلابی طغیانی کے بعد جب پانی اُتر جاتا ہے تو دونوں کناروں پر اِس مٹی کے پشتے بن جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اِن پر مختلف درختوں اور جھاڑیوں کی ہریالی چھا جاتی ہے یہ پودے قریبی جنگل سے بہہ کر آتے ہوئے بیجوں سے پیدا ہوتے ہیں اور زرخیز زمین جلد ہی اِن کو بہت تروتازہ کر دیتی ہے۔ اگر آنیوالے موسم برسات کے سیلاب اِنھیں بہا کر نہ لے جائیں اور انھیں سال بھر تک بڑھنے کا موقع مل جائے تو چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک جنگل کھڑا ہو جاتا ہے۔ اِس کی زرخیزی کا اندازہ کچھ اِس تقابل سے ہوسکتا ہے کہ نہری زمین کے بہترین قطعات جنھیں آبپاشی کی بدولت دریائی مٹی کی ایک مقدار سے مسلسل تازگی حاصل ہوتی رہتی ہے۔ پیداوار کے معاملہ میں دریا کی " کچو " زمین کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ تمام زمینیں، سوائے چاول کی کاشت کے بہترین زمین پر مسلسل فصلیں اُگانے سے خراب ہوجاتی ہیں۔

میدانی سندھ کی زمینوں کی یہ خاص قسمیں ہیں جو ہم نے بیان کیں۔ یہ میدان بہ ظاہر بیس ہزار مربع میل کے علاقہ میں بالکل ہموار سطح کے ساتھ پھیلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک دوہری ڈھلوان کے ساتھ ہے۔ ایک ڈھلوان دریائے سندھ کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ، طول البلدی حیثیت میں اور دوسرا ڈھلوان دریائے سندھ کے دونوں کناروں سے عمودی زاویہ پر۔ ہر دو طرف اِس میں اتنی یکسانیت نہیں جتنی اول الذکر میں ملے گی۔ جتنے بھی مٹی بہا کر لانے والے دریا ہیں جسے وہ سیلاب کے وقت اپنی وادی میں پھیلاتے رہتے ہیں اُن کے آخری ثلث میں زمین کی مذکورہ طبعی حالت ہر جگہ ایسی ہی ملے گی۔ اِس کی دو وجوہات ہیں، اول یہ ہے کہ اُن کی آبی گذرگاہ زبردست سیلاب کے موقع پر تمام پانی کی نکاسی لئے

ناکافی ہوتی ہے، دوم یہ کہ اُن کے پانی میں تحلیل مٹی کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس مسلسل عمل سے زمین کی سطح دریا کے بہاؤ کی سمت ایک نفیس ڈھلوان کی شکل اختیار کرتی رہتی ہے۔ ایسے ایک دریا جب کے پانی میں مٹی شامل نہیں ہوتی وہ وادی کے نشیبی علائقے میں یہ عمل اختیار کرتے ہیں، لیکن ان کے برعکس سندھ جیسے دریا اپنے کناروں کے ساتھ ایک وسیع وعریض ڈھلواں پُشتہ بناتے ہوئے چلتے ہیں۔

علم الارضیات کی رو سے یہ کوئی انتہائی قدیم زمانہ کی بات نہیں کہ جہاں آج شمالی مغربی ہندوستان کے میدان اور گنگا کی وادی واقع ہے وہاں سمندر تھا، تخلیق ارضی کے تیسرے دور میں جب وہاں پہاڑ نمودار ہوئے تو نئے دریا بھی پرانے دریاؤں کے ساتھ مل گئے، جنہوں نے پیچھے ہٹتے ہوئے سمندر سے نئی زمین حاصل کرنی شروع کی۔ چنانچہ مذکورہ سمندری علائقہ دریائی مٹی کے ایک عظیم ذخیرہ سے پُر ہوکر میدان کی شکل اختیار کرتا چلا گیا۔ یہ مٹی جو خالصتاً دریائی مٹی ہے کئی ہزار فٹ موٹی تہہ کی شکل میں اس میدان میں موجود ہے۔ دریا جو پہاڑوں کے تنگ شگافوں سے نکلتے ہیں، تیز رفتاری اور قوت کے ساتھ بہتے ہیں چنانچہ جب وہ نیم پہاڑی میدان میں داخل ہوتے ہیں تو خاصا گہرار راستہ اپنے لئے بنالیتے ہیں۔ یہ میدان جو دراصل اِن دریاؤں کے دونوں کناروں میں چٹانی مٹی کے ذخائر جمع ہوتے رہنے سے بنا ہوتا ہے سطح میں اونچا ہوجاتا ہے اور میلوں تک یہ دریا اِس میدانی سطح سے پست سطح پر بہتے ہیں، دریائی بہاؤ کا یہ دوسرا مرحلہ کہلاتا ہے۔ اِس مرحلہ میں بھی زمینی ڈھال کافی ہوتا ہے اور ہر موسم میں پانی کے بہاؤ کی رفتار تیز رہتی ہے۔ زمین کاٹتے کاٹتے وہ اپنا راستہ بنالیتے ہیں جسے " کھادر (Khadir) کے نام سے پکارا جاتا ہے، یہ کئی میل چوڑا علائقہ ہوتا ہے جس میں یہ دریا مسلسل کروٹیں بدلتے ہوئے بہتے رہتے ہیں۔ جبکہ دو دریاؤں کے درمیان بلند زمین کی ایک لمبی زبان پھیلی رہتی ہے، اِسے "بھنگر" (Bangar) یا "بر" (Bar) کہتے ہیں، شمالی مشرقی پنجاب کا نصف حصہ اِسی قسم کی زمین پر مشتمل ہے۔ تیز بہاؤ سے ہر دو طرف کی زمین کٹتی رہتی ہے اور پانی میں ملتی رہتی ہے جس سے اُن کی رفتار سُست اور تہہ کی زمین بلند ہوتی رہتی ہے اور

زمین کی کٹاؤ کرنے والی قوت ماند پڑ جاتی ہے۔

یہ دریائی بہاؤ کا تیسرا مرحلہ ہوتا ہے اس میں جیسا کہ آپ صوبہ سندھ میں بھی دیکھتے ہیں کہ وہ آس پاس کے علائقہ کی سطح سے تھوڑی سی پستی پر بہتا ہے۔ بشرطیکہ صاف موسم ہو اور طغیانی نہ ہو۔

جب ہمالیہ پہاڑ کی برف پگھلنا شروع ہوتی ہے اور ترائی میں بارش ہوتی ہے تو اِن دریاؤں میں طغیانی اور سیلاب کی وجہ سے پانی کا اخراج بیس سے چالیس گُنا بڑھ جاتا ہے اور اِسی طرح اِن کا پاٹ دس سے بیس گُنا زیادہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ موسم سرما کی نسبت سے اِس زمانہ میں رفتار کہیں تیز اور پانی میں ملی ہوئی مٹی کی مقدار بھی بے حد زیادہ ہو جاتی ہے، سیلاب کے زمانہ میں پاٹ چوڑا ہو کر تمام کھنڈر میں پھیل جاتا ہے لیکن بھنگر کے علائقے میں نہیں پھلیتا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ پانی کی تیزی دباؤ کے کناروں کو کاٹ دے۔ مزید آگے بڑھ کر صورت یہ ہو جاتی ہے کہ سیلاب کا پانی دریا کے کناروں میں نہیں سما سکتا، اور کھادر (Khadir) سے نکل کر وسیع علائقہ میں پھیل جاتا ہے، اِس کی تیز رفتاری کافی حد تک کم ہو چکی ہوتی ہے، مٹی اور ریت اب بیٹھنے لگتی ہے، پہلے بھاری اور نوکیلے ذرّات تہہ میں بیٹھتے ہیں اور جیسے جیسے پانی آگے بڑھتا ہے باریک سے باریک ذرات بھی تہہ میں جمنے لگتے ہیں، سیلابی دریا کی پیش قدمی کے ساتھ زمین کی سطح پر پھیلنے والی مٹی کی مقدار کم ہوتی رہتی ہے۔ اس مسلسل عمل سے کبھی نہ کبھی دریا اپنے موجودہ پشتوں کو چھوڑ کر راستہ تبدیل کر دیگا اور نئے راستہ پر بہاؤ کی جگہ زمین کی سطح بلند ہونے اور پشتے بنانے کا عمل شروع ہو جائیگا۔ پرانے اور نئے راستے کے درمیان ایک وادی چھوٹ جائیگی، ایک روز دریا اِس کے اندر سے بھی بہنے لگے گا اور اِس کی سطح کو بھی بلند کر دیگا۔

چنانچہ ہزاروں سال کے عرصہ میں دریائے سندھ اپنا راستہ بدلتا رہا اور علائقہ کی سطح کو بلند کرتا رہا ہے، گڑھے اور نشیب جن میں مٹی ملا ہوا پانی باقاعدگی سے پہنچتا رہتا ہے مٹی سے بھر کر سطح کے برابر ہو جاتے ہیں، کیونکہ سیلاب کے خاتمہ پر جو پانی اِن میں موجود رہتا ہے

اُس کی مٹی تہہ میں جم جاتی ہے، لیکن ایسے نشیب اور گڑھے جو زیادہ فاصلہ پر واقع ہیں اُن میں وہ پانی پہنچتا ہے جس سے مٹی کی مقدار پہلے ہی خارج ہوچکی ہوتی ہے۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ، جو بے قاعدگیاں دریا کرتا ہے اُنھیں خود ہی اپنے عمل سے درست کرتا رہتا ہے۔ اگر سندھ کے میدان میں ایک خط سطحی اِس طرح کھینچا جائے کہ وہ دریا کے بہاؤ کو کاٹتے ہوئے گذرے تو اُس کے سامنے یکے بعد دیگرے ایسے ہی مسطح کٹے ہوئے پشتے اور اُن کے درمیان سطح کی ہوئی وادیاں آئیں گی حالانکہ عام طور پر دیکھنے سے اُن کی تمیز مشکل ہے اور طول البلدی سمت میں سمندر کے رُخ میدانی ڈھال تقریباً یکساں نظر آئیگا۔

دریائے سندھ میں شامل مٹی کی کثیر مقدار دریا کے آبی راستہ کے ساتھ ہی آگے بڑھتی ہے۔ اِس مٹی کی زیادہ مقدار تو آبی راستہ کے تہہ میں ہی جم جاتی ہے کیونکہ بھنگر زمین جو دریا میں طغیانی کے وقت اِس کے بیرونی کناروں کی حیثیت اختیار کرتی ہے، اِس مٹی سے محفوظ رہ جاتی ہے، جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جاچکا ہے، چنانچہ طغیانی کے زمانہ میں اصل آبی راستہ میں مٹی بھر جانے کی وجہ سے مذکورہ دوسرے علاقہ دریا کی بڑی گذرگاہ بن جاتے ہیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ د۔یا کا راستہ اور اُس کے زیر اثر علاقہ ہی بدل جاتا ہے، اِسی طرح سے دریا کی تہہ اور پشتوں کی زمین کی حالت بھی دریا کے بہاؤ کے تمام علاقہ میں بدلتی رہتی ہے، اور دریا اپنی رفتار کو اِن زمینوں کے تقاضہ کے مطابق ڈھالتا ہے، جہاں زمین نرم ملتی ہے جو آسانی سے پانی میں شامل ہوجاتی ہے وہاں بتدریج پھیل کر سست رفتاری سے بہتا ہے۔

ایسا کرنے میں دریا کے لئے صرف ایک ہی صورت ممکن ہوتی ہے کہ وہ اپنے بہاؤ کے راستہ کو طویل کردے، یعنی بل کھاتا ہوا بہے۔

بہاؤ میں اِس قسم کی مسلسل مقامی تبدیلی اور ردو بدل کے مقابل یہ دیکھا گیا ہے کہ ایک دریا جب بھی اپنے بہاؤ کے راستہ میں نیم دائرہ بنالیتا ہے، تو راستہ کو صحیح رکھنے کے لئے اُس کے برابر دوسرا نیم دائرہ بھی بناتا ہے، خاص طور پر دریائے سندھ میں یہ بات پائی جاتی

ہے کہ وہ اپنے بہاؤ کی عمومی سمت اور راستہ کو قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اِس کے موڑ مرکزی بہاؤ سے پانچ یا چھ میل ادھر یا اُدھر زیادہ فاصلہ تک قائم نہیں رہتے۔ سیلاب کے پانی کی کثیر مقدار کو اپنے پہلوؤں سے باہر پھینک دینا عام حالات میں اِس کی خصوصیت رہی ہے جس کی وجہ سے شاذ و نادر ہی اِس کے بہاؤ کے راستہ میں کوئی تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ پانی کے اِس طرح بہہ جانے کی وجہ سے دریائے سندھ جیسے جیسے سمندر سے نزدیک ہوتا جاتا تھا اُس میں پانی کا اخراج کم ہوتا جاتا تھا۔

دریائے سندھ کے بہاؤ کی ایک اور خاص بات اِس کی وہ گذرگاہ ہے جو چونے (Limestone) کی پہاڑیوں کے سلسلہ کے درمیان واقع ہے، یہ سلسلہ سکھر سے ایک یا دو میل شمال مغرب سے شروع ہو کر روہڑی سے آگے تک تقریباً چالیس میل جنوب کی سمت چلا جاتا ہے۔ دریا اِس پہاڑی سلسلہ میں بہت تنگ مقام سے داخل ہوتا ہے، اس شگاف کے دہانہ پر ایک چٹانی جزیرہ بکھر (Bukhar) واقع ہے، بکھر سے آگے اور چھوٹے جزیرہ سادھ بیلا (سادھو کا جھنگل =Sadhbelo) سے پہلے دریائے سندھ کی چوڑائی ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک صرف چھ سو گز ہے۔ اِس شگاف میں داخلہ سے قبل بالائی میدان میں دریا زیادہ سے زیادہ چوڑا ہو گیا ہے اور تقریباً بارہ میل کے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔[1] اِس مقام پر مشاہدہ کرنے سے یہ بات قطعاً غیر موزوں نظر آئیگی کہ یہ دریا پہاڑیوں کے درمیان انتہائی تنگ راستہ اختیار کریگا حالانکہ اِس پہاڑی شگاف سے صرف دو میل شمال میں دریائی مٹی کا میدان موجود ہے جو سطح کے اعتبار سے بھی پہاڑی علاقہ سے پست تر ہے جس میں دریا کو کشادہ راستہ مل سکتا تھا اور وہ آگے جا کر اپنے موجود بہاؤ کے راستہ سے مل سکتا تھا، دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی تھی کہ شگاف سے پہلے جو اُس کا بائیں سمت کا موڑ ہے۔ اُسے کسی قدر بڑھا کر وہ اُس ڈھلوان سے بہہ سکتا تھا جو نارا (Nara) وادی میں مل جاتا ہے۔ اِس طرح روہڑی کا پہاڑی سلسلہ مشرق میں رہ جاتا۔ نیچی سطح کے ہر دو ممکنہ راستے جو بیان کئے گئے ہیں آج بھی سندھ کے سیلابی پانی کی کثیر مقدار سے بھر جاتے ہیں، اِس کے باوجود

مصدقہ تاریخی شہادت کے مطابق سات سو سال سے اور ممکن ہے اِس سے بھی زیادہ طویل زمانہ سے دریائے سندھ نے بکھر کے شگاف جسے ''چورلک'' کہتے ہیں وہاں سے اپنا راستہ بر قرار رکھا ہے۔[۲]

دریائے سندھ نے جس وفاداری کے ساتھ اِس تنگ نائے ''چورلک'' سے اپنے بہاؤ کو برقرار رکھا ہے اُس کی وجہ پانی کو کھینچنے کی وہ قوت ہے جو خود تنگ نائے میں پوشیدہ ہے۔ سیلابی سطح سے اِس شگاف کی سطح تقریباً ساٹھ فٹ نیچی ہے، اور اِس طرح بالائی حصہ کی گذرگاہ کی نسبت بہت گہرائی میں واقع ہے۔ چنانچہ پانی کی یہ فطرت ہے کہ جیسے ہی اُس کا ایک حصہ کسی گہرائی کی طرف مائل ہوتا ہے اُس کی پوری مقدار ایک سیّال زنجیر کی طرح پوری قوت کے ساتھ اُس گہرائی کی طرف کھچنے لگتی ہے۔ بہرنوع سوال یہی پیدا ہوتا ہے کہ آخر دریائے سندھ نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا، ماہرارضیات آر۔ ڈی۔ اولڈہم (R.D. Oldham) اِس کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے۔

"خیرپور کی پہاڑیوں کے اطراف جو میدانی علاقہ پھیلا ہوا ہے، قدیم زمانہ میں وہ دریائے سندھ کی کروٹوں کی آماجگاہ تھا۔ اور بالآخر اس کے ہر ایک حصہ کی سطح کو اُس نے بلند کر دیا۔ اِس عمل کے آخری مرحلہ میں یعنی موجودہ طبعی صورت اختیار کرنے سے پہلے دریائے سندھ اپنے موجودہ راستہ سے مشرق کی سمت بہتا تھا جہاں میدانوں کی سطح اونچی کرنے کے بعد وہ مغرب کی سمت پلٹ گیا۔ اِس وقت تک ذخیرۂ خاک جو زمین پر پھیلتا رہا اُس کی سطح بلند ہو کر خیرپور کی پہاڑیوں میں روہڑی کے مقام پر واقع تنگ نائے کی سطح کے برابر ہوگئی۔ اور چونکہ پشتہ کی شمالی سمت کی نسبت جنوبی سمت کی سطح کافی پست ہوگی، اِس لئے دریائے سندھ کے پانی کو اِس پہاڑی دراڑ ''چورلک'' سے گذرنے کا جیسے ہی موقع ملا اُس نے یہاں مستقل بہاؤ اختیار کر لیا۔ یعنی اِس تنگ نائے کی تہہ کو اُس نے اپنے بہاؤ سے مزید گہرا کر لیا۔[۳] اس تنگ نائے کو مقامی لوگ سندھی زبان میں ''چورلک'' (چوردروازا) کہتے ہیں۔

اولڈہم نے یہ بیان نہیں کیا کہ دریائے سندھ بکھر شگاف کا راستہ اختیار کرنے سے پہلے، کس راستے سے سمندر میں پہنچتا تھا۔ میں آگے چل کر اِس سوال کا جواب دینے کی

کوشش کرونگا در ین اثناء ہماری توجہ دریا کی زیریں گذرگاہ پر مرکوز ہونی چاہیئے۔

سائنس کے اعتبار سے مٹی بہا کر لانے والے دریاؤں کا تیسرا مرحلہ اُن کے ڈیلٹائی علاقہ میں شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ سندھ کا پورا میدان اِسی درجہ میں شامل ہے۔اب بھی دریائے سندھ کے لئے طبعی طور پر ممکن ہے کہ اِس میدانی علاقے کے خاص شمال میں وہ دو شاخوں میں تقسیم ہو جائے اور عہد عتیق میں جبکہ سمندر موجودہ میدان کے کافی حصہ پر پھیلا ہوا تھا۔ یہ دریا یقیناً دو شاخوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ ہم جب تاریخی زمانہ میں داخل ہوتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ دریائے سندھ آج جس جگہ سے دو شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے اُس سے ایک سو میل شمال میں ہی دو شاخوں میں بٹ گیا تھا اور اُس زمانہ کے ساحل سمندر سے شاخوں کے جدا ہونے کا مقام تقریباً اتنے ہی فاصلہ پر تھا۔ سندھو جیسے مٹی لانے والے دریا کا ڈیلٹا عموماً اُس وقت نمود اختیار کرنا شروع کرتا ہے جب سمندر کا پانی دریا کے پانی کے بہاؤ کی رفتار کو سست کر دیتا ہے، سست رفتاری کا یہ اثر ایک سو میل لمبی شاخوں سے زیادہ نہیں ہو سکتا، یہ دونوں شاخیں اور ڈیلٹا اُس قدیم عمل کی نشاندہی کرتی ہیں جو کسی وقت زیادہ فاصلہ پر شمال سے شروع ہوتا تھا اور رفتہ رفتہ ساحل سمندر کے آگے بڑھ جانے کی وجہ سے خود بھی آگے بڑھتا رہا اور اب موجودہ دہانہ کے قریب جاری ہے اور دونوں شاخوں کے دہانوں پر جاری ہے۔ اِس طرح ایک بڑے محیط ڈیلٹا کے اندر ایک کئی چھوٹے ڈیلٹے وجود اختیار کر رہے ہیں۔

چونکہ پُرانے اور نئے وجود کو ایک نام دیکر بیان کرنا ممکن نہیں اِس لئے پڑھنے والوں کو اِن دونوں کا فرق یاد رکھنا ضروری ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دونوں سابقہ شاخوں کا درمیانی ڈیلٹا اپنے بالائی یا اطرافی میدان سے کسی طرح سطحی طور پر مختلف نہیں ہوگا جبکہ نئی شاخوں کا ڈیلٹا جو ابھی حالت نمود میں ہے مسلسل سیلاب کی زد میں رہیگا اور طغیانی کے موسم میں مکمل طور پر پانی سے ڈھک جائیگا۔

چنانچہ ڈیلٹا وہ علاقہ ہے جو دریا اور سمندر کی باہمی کشمکش کے لئے اکھاڑے کا کام دیتا ہے اور اِس کی وجہ سے نئی زمین پیدا ہوتی ہے۔ دریا کا پانی سمندری پانی کی مزاحمت کے

سامنے پنکھے کی شکل اختیار کر کے نیم دائرہ میں پھیل جاتا ہے اور جو کیچڑ اس کے پانی میں موجود ہوتی ہے اُسے تہہ میں پھیلا دیتا ہے۔ حتّٰی کہ زمین وجود میں آجاتی ہے جو آہستہ آہستہ سطح سمندر سے بلند ہو جاتی ہے۔ یہ جیسے جیسے ڈیلٹا سمندر کی سمت بڑھتا ہے، دریا کی وادی کا ڈھال اور سطح آب کم ہوتی رہتی ہے کیونکہ آبی گذرگاہ کی لمبائی بڑھتی رہتی ہے، جبکہ کم سے کم سطح سمندر تبدیل نہیں ہوتی۔ اِس طرح جو زمین وجود میں آتی ہے، وہ بہت نرم ہوتی ہے کیونکہ وہ ایسے باریک ذرات سے بنتی ہے جو آخری مرحلہ میں دریا کے پانی میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ بھاری ذرات ابتدائی مراحل میں نیچے بیٹھ چکے ہوتے ہیں۔ ان وجوہات کی بدولت اور دریائے سندھ کے معاملہ میں سمندری پانی کے چڑھاؤ کی وجہ سے جس مزاحمت کا سامنا ہوتا ہے اُس کی وجہ سے دریا کا پانی شاخوں میں بکھر جاتا ہے اور یہ شاخیں خود بھی چھوٹی چھوٹی شاخوں میں منقسم ہو جاتی ہیں اور یہ سب مل کر باریک مٹی کا ایک ذخیرہ سمندر میں جمع کرتی رہتی ہیں اِس عمل کی وجہ سے پنکھے نما زیرآب مٹی کا ٹیلا بڑھتا رہتا ہے جس کا زیادہ سے زیادہ حصہ رفتہ رفتہ پانی کی سطح سے بلند ہو کر باہر نکلتا رہتا ہے۔

سندھ کی ڈیلٹا کے علاقہ میں دریا کی تمام آبی گذرگاہیں اپنے کناروں کو بلند کرنے کا وہی عمل جاری رکھتی ہیں جیسے بیان کیا جا چکا ہے یعنی مٹی بہانے والے دریا آخری مرحلہ میں یہ مٹی کناروں پر پھیلاتے رہتے ہیں اور یہ عمل خاصا تیزی سے جاری رہتا ہے اور صرف سیلاب کے زمانہ میں ہی نہیں عام موسم میں بھی سمندر کا چڑھاؤ دریا کے پانی کو روک کر اُسے کناروں سے باہر نکل کر بہنے پر مجبور کرتا ہے۔ شاخوں کے درمیان کا نشیبی علاقہ قدرتی ذخیرۂ آب ہے، جو سمندر کے اُتار کے ساتھ خود بخود خالی ہو جاتا ہے پانی کی خاصی مقدار شاخوں کی آبی گذرگاہ میں واپس ہو کر تیزی سے بہتی ہے اور راستے کو گہرا کرتی رہتی ہے۔ یہ گذرگاہیں بہر طور بالکل عارضی ثابت ہوتی ہیں۔ چنانچہ ڈیلٹا کا ایک نقشہ جو آج بنایا جائے ایک یا دو سال کے بعد بالکل غلط ثابت ہوگا۔

نرم زمین کے استحکام میں اور اُسے دریا کے کٹاو اور مان سونی سمندر کے عمل سے

محفوظ رکھنے میں نباتاتی پیداوار اہم کردار ادا کرتی ہے، شمالی حصہ میں خار دار پودوں اور جھاڑیوں کا ایک جنگل پھیلا ہوا ہے، زیریں حصہ میں لمبی پتیوں (Elephant grass) والی گھاس اپنی دور تک پھیلی ہوئی جڑوں کی وجہ سے مٹی کو تھامے رہتی ہے۔ اس علائقہ کی قدرتی پیداواری صلاحیت سندھ کے تمام علائقوں سے بدتر ہے۔ لیکن علائقہ مضرِ صحت ہونے کی وجہ سے غیر آباد ہے اس لیے زراعت سے خالی ہے۔ ہر طرف زمینی سطح اور نباتاتی پیداوار ایک جیسی نظر آئے گی۔ جس سے منظر میں ایک عجیب قسم کی یکسانیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دریائی ڈیلٹاؤں کے عمل تخلیقی کی رفتار کو خاصی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اِس سے یہ اندازہ رہتا ہے کہ ایک مخصوص وقت میں کتنی نئی زمین سمندر سے باہر آجائیگی۔ کہا جا سکتا ہے کہ اِس موضوع پر تحقیق دریائے نیل پر شروع کی گئی۔۵ اگر اس کا تقابل سندھ سے کیا جائے کیونکہ دونوں ہی مٹی بہانے والے دریا ہیں تو اُس سے بہت سی مفید معلومات حاصل ہوں گی، دونوں میں عمل کا طریقہ یکساں ہے لیکن بہت سے پہلو واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

وادیٔ نیل کا فاصلہ اسوان ڈیم سے ڈیلٹا کے ابتدائی مقام قاہرہ تک پانچ سو پچیس میل ہے۔ لیکن اِس کی چوڑائی کا اوسط چار میل ہے اور زیادہ سے زیادہ پندرہ میل کا فاصلہ جو صحرائی چٹانوں کے درمیان ہے۔ اِس تنگ راہ داری کے درمیان دریائے نیل دائیں بائیں موڑ کھاتا ہوا بہتا ہے اور ایسے ہی بلند کناروں سے گذرتا ہے جو سندھ کی طرح اِس کے سیلابی پانی نے بنائے ہیں، سندھ کی نسبت دریائے نیل کا سالانہ سیلاب زیادہ یقینی اور خود ساختہ ہے، اِس کے پانی کا زیادہ سے زیادہ اخراج تین لاکھ مکب فٹ فی سکنڈ ہے جبکہ سندھ کا چار لاکھ مکب فٹ فی سکنڈ ہے۔ سیلابی زمانہ میں پانی کے اندر ملی ہوئی مٹی کی تعداد میں بھی نمایاں فرق ہے، سندھ میں اِس کا تناسب پانی کے ساتھ ایک اور دو سو سینتیس ہے جبکہ نیل میں ایک اور چھ سو چھیاسٹھ ہے۔٦

باقاعدہ اندازہ کے مطابق طغیانی کے ایک سو ایام کے دوران دریائے سندھ تقریباً

گیارہ کروڑ نوے لاکھ مکب گز مٹی سمندر تک لے جاتا ہے جبکہ نیل کے لئے پورے سال کا تخمینہ چار کروڑ مکعب گز ہے، یہ تعداد علی الترتیب اڑتیس اور تیرہ مربع میل زمین کے لئے کافی ہے۔ بشرطیکہ وہ ایک گز گہری ہو۔ ے لہٰذا یہ ظاہر ہوا کہ اگر ہر دو ڈیلٹا کے تخلیقی عمل کے دوسرے عناصر میں ہم آہنگی ہو تو مذکورہ رفتار سے سندھ کا ڈیلٹا۔ نیل کے ڈیلٹا سے تین گنی رفتار سے بڑھتا رہیگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحیرۂ عرب کا طاقتور ردِعمل جو مانسون کے زمانہ میں جبکہ دریائے سندھ کا بھی سیلابی موسم میں اور بھی بڑھ جاتا ہے اور ڈیلٹا کی تخلیق میں بڑی حد تک اعتدال پیدا کر دیتا ہے۔ اِس کے برعکس بحرۂ روم میں اُتار چڑھاؤ کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی یہ ثابت ہے کہ نیل کا ڈیلٹا طول البلدی سمت میں دو ہزار تین سو سالوں کے عرصہ میں اڑتیس میل وسیع ہوا ہے یعنی اوسطاً ۲۹ گز فی سال لیکن گذشتہ صدی میں ڈیلٹا کی پیش قدمی خاصی سست رہی ہے۔ دریائے سندھ کے ڈیلٹائی جائزے ابھی شروع ہوئے ہیں، اور پہلے تقابل سے یہ معلوم ہوا کہ دریا کے بڑے دہانہ کے کنارے دس سال کے عرصہ میں ایک میل آگے بڑھے ہیں۔ ۸ لیکن دریا کی شاخوں کے کنارے میں اضافہ کا عمل سروے کے وقت تک جاری تھا وہ واضح طور پر اتنا کم ہوا کہ ختم ہونے کے برابر کیا جا سکتا ہے۔

اِس لئے سندھ ڈیلٹا کی تخلیقی پیش قدمی کے متعلق یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ دریا کے دہانہ کے سامنے جتنا ساحلی سمندر ہے وہ ہر مقام پر تھوڑا تھوڑا آگے بڑھ رہا ہے۔ صحیح صورت یہ ہے کہ مرکزی دہانہ کے سامنے زمین تیز رفتاری سے پیش قدمی کر رہی ہے جبکہ شاخوں کے سامنے یہ پیش قدمی اگر جاری بھی ہے تو برائے نام۔ اِس کے علاوہ جتنا ساحلی حصہ ہے اور یقیناً بیشتر حصہ وہی ہے، وہ یا تو اپنی جگہ قائم ہے، یا مقامی طور پر زمین کے اندر تھوڑا بہت گھس جاتا ہے۔ اِس کے بعد دریا اپنی مٹی کو اُگلنے کے لئے دوسرا دہانہ استعمال کرنے لگتا ہے۔ دہانے کی اِس تبدیلی سے پیش قدمی کا موقع و محل بھی بدل جاتا ہے۔

شہادت موجود ہے کہ نسبتاً تھوڑے زمانہ میں زمین نے سمندر کے خاصے حصے پر قبضہ جمالیا ہے، لیکن اس کے مخالف عمل کی کوئی شہادت نہیں۔ مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ

۱۸۷۳ء اور ۱۹۰۴ء کے درمیانی عرصہ میں دریائے سندھ کے دہانے پر ستانوے مربع میل کا نیا علاقہ زمین میں شامل ہوا، اِس اضافہ کا مقام ڈیلٹا کی وہ مرکزی جگہ ہے جو سمندر کے مقابل ہے۔ یہاں ابھی تک دریا کی وہ شاخیں سمندر میں گرتی ہیں جن سے دریا کے پانی کی بیشتر مقدار خارج ہوتی ہے۔ گھار و اور کوری کریک کے درمیان یہ نئی زمین ڈیلٹا کے ساحلی نصف دائرے سے نمایاں طور پر آگے نکلی ہوئی ہے۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ۱۹۳۰ء میں سیلاب کے پانی کو روکنے کے لئے جو آخری چند پشتے دریائے سندھ پر تعمیر کئے گئے اُن سے پشتوں کی تعمیر کا طویل سلسلہ مکمل ہوگیا۔۹ ہمیں یہ معلوم ہے کہ دریا کے اخراج کے صدر دہانے ڈیلٹا کے اِسی مرکزی علاقہ میں تقریباً ایک صدی سے چلے آرہے ہیں۔ اِس سے قبل وہ اندر شمال مغرب میں تھے، ڈیلٹا کے جنوبی مشرقی حصّے میں دریا کی جو شاخیں ہیں اُن سے کثیر مقدار میں پانی کا اخراج شاید دو سو سال پہلے ہوا تھا۔ پھر بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ سمندر نے اپنے جوابی عمل سے اِس حصہ میں زمین کے کسی ٹکڑے پر قبضہ کیا ہو۔ اِس نتیجہ پر پہنچنے سے گریز ممکن نہیں، گو کہ سمندر ایسا ہے کہ اُس میں چڑھاؤ اور اُتار کا عمل جاری ہے لیکن اُس کے اثرات ہمیشہ ہی زمین کے لئے تباہ کن نہیں ہیں۔ اُس کی لہریں جو مسلسل زمین سے ٹکراتی رہتی ہیں وہ یقیناً دریا کی نرم مٹی سے بنی ہوئی زمین کو سخت اور مضبوط بنانے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔۱۰

اِسی ضمن میں ایک اور سوال جو زبردست دلچسپی کا باعث ہے یہاں پیدا ہوتا ہے، سندھ کا میدان مجموعی طور پر دریائے سندھ کے عمل سے کس رفتار سے بلند ہوتا رہا ہے؟

اِسی مقصد کے لئے ہمیں ایک بار پھر اُن اعداد و شمار کی طرف رجوع کرنا پڑیگا جو کہ دریائے نیل کے متعلق جمع کئے گئے ہیں۔ یہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ وادیٔ نیل کی زمین تین انچ سے کچھ زیادہ پانچ انچ تک ایک صدی کے عرصہ میں بلند ہوتی رہی ہے۔ پہلے آبشار سے ڈیلٹا کے سرے تک وادی کا رقبہ اکیس 2100 سو مربع میل سے تھوڑا زیادہ ہے۔ یہ رقبہ اصل ڈیلٹا کا تقریباً ایک چوتھائی رقبہ ہے، جبکہ دریائے سندھ کے بنائے ہوئے میدان کا

رقبہ ٹھٹھ کوٹ میں پانچوں دریاؤں کے سنگم سے آخر تک بشمول ڈیلٹا کم از کم بیس ہزار مربع میل ہے اور سندھ کا ڈیلٹا دریائے نیل کے ڈیلٹا سے بہت چھوٹا ہے۔ چنانچہ زیریں سندھ نے اپنی مٹی سے جو میدان بنایا وہ دریائے نیل کے عمل سے پیدا شدہ زمین سے تقریباً دوگنا ہے۔

سندھ کے پانی میں ملی ہوئی مٹی کی مقدار چونکہ ایسی مٹی سے تین گنا زیادہ ہے جو دریائے نیل کے پانی میں موجود ہوتی ہے اور اِس کا سیلابی اخراج بقدر ایک تہائی کے زیادہ ہے لہٰذا سندھ کا میدان جو دریائی مٹی سے بنے ہوئے مصری علاقہ سے دوگنا ہے، ہر صدی میں مصر کی نسبت چار انچ سے بھی زیادہ بلند ہوتا رہا ہوگا، وہ خطۂ میدان جس میں دریائے سندھ گذشتہ تین ہزار سالوں کے دوران بہتا رہا ہے یقیناً اِسی شرح سے بلند ہوتا رہا ہے، خوبیِ اتفاق سے مندرجہ بالا اندازے موہن جودڑو میں کھدائی کے دوران جب جانچے گئے تو بہت سی مفید معلومات حاصل ہوئیں۔ اور اب یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ میدان کا وسطی حصہ جس میں گذشتہ پانچ ہزار سالوں سے سندھ نے اپنا بہاؤ جاری رکھا ہے تقریباً تیس فٹ بلند ہوا ہے یعنی اوسطاً سات انچ ہر صدی کے دوران۔ یہ بھی اندازہ لگایا گیا ہے کہ دریا سے ملحقہ علاقہ میں جہاں تقریباً ایک سو سال سے یہ مسلسل بہہ رہا ہے، یہ سو سالہ بلندی تقریباً ایک فٹ ہے۔ دریا سے زیادہ فاصلہ پر یہ اوسط بتدریج کم ہوتا جائیگا۔[11]

یہ امر پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ موجودہ سندھ کے بہاؤ کی حالت اُس کی طبعی حالت سے بہت مختلف ہے۔ دریائے سندھ کے کناروں پر حفاظتی بند اور پشتے زیریں حصہ میں مسلسل ڈیلٹا کے سرے تک بنا دیئے گئے ہیں اور پُرانے زمانہ میں جس طرح سیلاب کا پانی کناروں سے نکل کر سارے علاقے میں پھیل جاتا تھا اب اِن پشتوں کی وجہ سے نہیں پھیلتا۔ اِسی کا نتیجہ یہ ہے کہ سیلابی پانی صرف پشتوں کے درمیان سمندر کی طرف بہتا ہے اور اِس تنگ راہداری کی سطح بلند کر رہا ہے۔ یہ سطح اِس قدر بلند ہو سکتی ہے کہ اگر پشتوں میں بڑا رخنہ پڑ جائے تو دریا اپنے بہاؤ کا راستہ تبدیل کر دے گا۔

پشتوں کے باہر کی زمین کو دریائے سندھ کا پانی اب نہروں کے توسط سے میسّر ہوتا ہے۔

ایک مقام پر دریا کا پانی ممکن ہے، دو سو میل کا نہری فاصلہ طے کرنے کے بعد پہنچا ہو جبکہ یہ مقام درحقیقت دریا سے کل دو سو گز کے فاصلہ پر ہی واقع ہو۔ بیراج والے علاقہ میں نہریں اُن بلند معدوم کناروں کے متوازی کھودی گئی ہیں جو سندھ کے قدیم بہاؤ کی نشانیاں ہیں۔۱۲ اور اس طرح سے درمیان کی تمام زمین نہری پانی کی رسائی میں آجاتی ہے۔ اسی طرح سے نہروں کا بتدریج ڈھال بھی اتنا ہے کہ جس کی وجہ سے پانی میں دریائی مٹی کی مقدار اُس وقت تک باقی رہتی ہے جب تک کہ وہ کھیتوں میں پہنچ کر اُسے وہاں پھیلا نہیں دیتا، اسی طرح مصنوعی آبپاشی میدانی علاقہ کے لیے باقاعدگی اور مکمل طور پر وہ کام سرانجام دے رہی ہے جو بے قید سیلابی بہاؤ کسی پروگرام کے بغیر اپنی مرضی سے جب چاہتا انجام دیتا تھا، اور جیسے جیسے زمانہ گذرتا ہے دریائے سندھ کے بہاؤ کے قدیم راستے اور شاخوں کے نشانات معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ علاقہ کے باشندوں کو عام طور پر یہ قدیم راستے گذر گاہیں اب بھی خوب معلوم ہیں۔ کیونکہ زمین کی سطح میں ایک یا دو فٹ بلندی کا اضافہ ہو جائے تو کاشتکاروں کے لئے یہ کوئی معمولی اہمیت کی بات نہیں ہوتی۔

ایک تجربہ کار مشاہدہ کرنیوالا بہ آسانی تمیز کرسکتا ہے کہ وسیع علاقہ میں نظر آنے والے نشیب حقیقت میں کیا ہیں۔ حالانکہ اُن کے مخالف پانی کی نہریں اور پشتے جو آبپاشی کے لئے انسان نے بنائے ہیں آنکھوں کو دھوکہ میں مبتلا کرتے ہیں۔ لیکن فضا سے چونکہ نظروں کے سامنے ایک وسیع منظر ہوتا ہے اور اور مصنوعی نالے وغیرہ نظر نہیں آتے اِس لئے اِن قدیم دریائی ریاستوں کے نشیب کا بہ آسانی مشاہدہ کیا جاسکتا ہے یہ میدان جسے گھوڑے پر سوار ہو کر اگر طے کیا جائے تو بے کیف معلوم ہوگا اور منظر میں کوئی تنوع نظر نہیں آئیگا۔ وہی چوکور کھیت اور آبپاشی کی سیدھی نہریں، لیکن پانچ ہزار فٹ کی بلندی سے جو منظر سامنے ہوگا اُس میں دریاؤں کے لہراتے ہوئے سائے۔ ہر ایک یا دو میل کے بعد نہایت شان کے ساتھ موڑ کے بعد موڑ لئے ہوئے اور اِن کی موجودگی کناروں پر اُگنے والی نباتات کی زیادتی کی وجہ سے زیادہ گہری ہو کر مزید واضح طور پر نظر آئیگی۔

حالانکہ پشتوں کی تعمیر سے دریائے سندھ اپنے سیلابی بہاؤ کے قدرتی راستوں سے محروم ہوگیا ہے، پھر بھی سکھر سے نکلنے والی نہریں جتنا دریائی پانی کھینچتی ہیں اُس کی وجہ سے کسی حد تک دریا کی یہ ضرورت پوری ہوگئی ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ نہریں اپنی گنجائش سے زیادہ پانی کی متحمل نہیں ہوسکتیں جبکہ صورت یہ ہے کہ عام حالات میں سندھ کے پانی کی جتنی زیادہ سے زیادہ اوسط مقدار سکھر پر موجود ہوتی ہے۔ ۱۳ سیلاب کے زمانہ میں اُس سے دوگنی ہوجاتی ہے۔ ایسے حالات میں پانی کی زیادہ مقدار کا دباؤ بہرحال اپنا اثر دکھائے گا۔ ۱۹۴۲ء میں سکھر سے اوپر بند میں دونوں طرف شگاف پڑ گئے، اور سیلاب نے آس پاس کے علاقوں کو گھیر کر وہی قدیم ڈرامہ پیش کیا۔ سکھر اور شکارپور کے شمال میں نشیبی علاقہ میں پانی کا ایک سمندر داخل ہوگیا، اور تین چار میل چوڑے محاذ پر مغرب کی سمت پیش قدمی کرتا رہا۔ اِس کے جنوب مغرب اور پھر جنوب کی طرف مڑ گیا، تا آنکہ اِس طرح ۱۸۰ میل کا سفر طے کرنے کے بعد یہ منچھر جھیل میں داخل ہوگیا ۱۴۔ سکھر کے بیگاری بند کی تعمیر سے پہلے سیلابی پانی کا یہی مخصوص راستہ تھا۔ لاڑکانہ کے بڑے بوڑھے ایسے سیلاب کا حال بیان ضرور کرتے تھے، لیکن اب ایسا واقعہ رونما ہونے کی توقع نہیں ہے۔ اِس سیلابی راستہ کا آخری نصف یعنی سارو ڈھنڈ (Saro Dhandh) سے آگے، یہ سیلاب وادی کا سب سے نشیبی راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے سندھ کی مٹی، پہاڑیوں سے بہہ کر آنے والی مٹی سے ملتی ہے۔

مزید شمال کی طرف قدیم زمانہ میں جو سیلاب دریائے سندھ کے دائیں کنارے سے شروع ہوتے تھے، وہ بھی قریب قریب ایسا ہی راستہ اختیار کرتے تھے۔ یہ کشمور (Kashmor) سے تھوڑا نیچے کی طرف شروع ہوتے تھے۔ یہ عام طور پر سرحدی ضلع میں مغرب کی سمت بہتے تھے، اور تقریباً اُسی جگہ سے جہاں دریائی اور پہاڑی مٹی کا میل ہوتا ہے، یہ سیلاب گذرتے تھے۔ موہمل (Mohmal) کے نزدیک سیلاب اپنا راستہ قدرے تبدیل کر لیتا تھا، اور جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں بیان کیا جاچکا ہے اُسی راستہ سے باگودیرو

(Bagodero) اور دوستالی (Dostali) کے درمیان جا ملتا تھا۔ وہ نشیب جو اِس سیلابی راستہ کا آخری نصف کہلا سکتا ہے کچھ عرصہ پہلے " نشیب سندھ " کے نام سے خوب مشہور تھا۔ ۱۵؎ شمالی مغربی سندھ کے یہ دونوں سیلاب شمال اور مغرب میں واقع پہاڑیوں سے بہہ کر آنے والے پانی کے ریلے کی وجہ سے اور بھی وسعت اختیار کر لیتے تھے۔ شدید بارشیں بھی سندھ میں پانی کے کثیر ترین اخراج کے ساتھ شامل ہو جاتی تھیں۔

۱۹۴۲ء کی انتہائی طغیانی نے روہڑی (Rohri) کے اوپر قاسم پور (Qasimpur) کے بائیں پشتے میں شگاف ڈال دیا تھا اور نارا وادی (Nara valley) کے بالائی حصہ کے تمام علاقہ میں سیلاب کا پانی پھیل گیا تھا۔ پہلے وقتوں میں یہ علاقہ بھی کثرتِ آب کے زمانہ میں کناروں سے بہنے والے پانی سے بھر جاتا تھا، تمام روہڑی ڈویژن جو دریائے سندھ اور ریگستان کے درمیان واقع ہے۔ ۱۶؎ وہ علاقہ ہے جو مسلسل سیلاب کی زد میں رہا ہے ماضی کی یہ حقیقت علاقہ کی طبعی شکل سے آج بھی بخوبی عیاں ہے، ماضی کے اِن سیلابی حادثات میں سب سے اہم اور سب سے دیرپا وہ سیلاب تھا جس نے دریائے سندھ کو بھاولپور راسٹیٹ میں غوث پور (Ghauspur) کے مقام پر ایک ایسے نشیب میں منتقل کر دیا جس میں یہ تقریباً ایکسو بیس میل تک بہتا ہے اور اِس کا پانی اکثر نارا وادی میں بھر جاتا ہے۔ بہر نوع یہ تمام علاقہ دریا کی شاخوں، نشیبی زمینوں اور گڑھوں سے بھرا پڑا ہے جن کا تعلق دریائے سندھ کے متروکہ آبی راستوں سے ہے۔ اب جبکہ دریائے سندھ نسبتاً بلند سطح پر بہتا ہے تو یہ شاخیں اور نشیب موسم برسات میں اپنے حصہ کا پانی بہر حال دریا میں پہنچاتے رہتے ہیں۔

یہ سمجھنا کہ سیلاب کے موسم میں کناروں سے باہر نکل کر بہنے والا پانی، ایک وسیع چادر کی شکل میں ملک سے گذرتا تھا غلط ہے، اکثر و بیشتر یہ پانی معروف سیلابی شاخوں سے گذرتا تھا جو اپنا ایک آبی راستہ کاٹ لیتی تھیں اور زمانہ گذرنے کے ساتھ جب اِن کی تہہ بھی بلند ہو جاتی تھی تو کثرتِ آب اِن کے کناروں سے باہر نکل کر مزید چھوٹی چھوٹی شاخوں

میں پھیل جاتی تھی۔ یہاں صدیوں پرانی آبی گذرگاہیں جو آبپاشی کے لئے خاص طور پر کلہوڑا۔ تالپور اور برطانوی زمانہ میں استعمال ہوئیں آج بھی پہچانی جاسکتی ہیں۔ گھاڑ (Ghar) اور غربی نارا (Wastern nara) ایسی ہی نہروں میں شمار کی جاتی ہیں۔ حفاظتی پشتوں کی عدم موجودگی نیز اِن کے بل کھاتے ہوئے راستے آج بھی ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں کہ یہ قدرتی آبی گذرگاہیں تھیں ۱۹۔ ان آبی گذرگاہوں کی قدامت کا اندازہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ اِن کے راستے ملحقہ وادیوں، بلندیوں اور نشیبوں سے مطابقت نہیں رکھتے جیسا کہ یقیناً ماضی بعید میں ہوگا اور ان کی وجہ صرف یہ ہے کہ دریائے سندھ کی طرح اِن آبی گذرگاہوں نے بھی اپنے اطراف نئی زمین کی تخلیق کی ہے۔ ۲۰ اِن کے برعکس دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع موسمی نہریں جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی زمانہ میں سیلابی شاخیں رہی ہوں گی، علاقہ کے سب سے زیادہ نشیبی علاقہ میں اپنے بہاؤ کا راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ کہا جاسکتا ہے کہ عمر کے لحاظ سے یہ نئی ہیں ۲۱۔

حیدرآباد سے ذرا جنوب میں جسے سابقہ ڈیلٹائی علاقہ کہا جاتا ہے مشہور نہریں کلری (Kalri)، بگھاڑ (Baghar)، پنیاری (Paniari)، اور ستو (Sata) ماضی کے مختلف اوقات میں دریائے سندھ کی وہ شاخیں تھیں جن سے دریا کا زائد پانی سمندر تک پہنچتا تھا، یہ بات عام طور پر مشہور ہے۔

سندھ کا عمومی منظر جو ایک ہزار سال قبل ہوگا اُس کا نقشہ ہم آج بھی قریب قریب ٹھیک طرح سے بنا سکتے ہیں۔ آج زرخیز اور بیابانی زمینوں میں جو تضاد پایا جاتا ہے، ہزار سال پہلے اُس میں ایک بے ساختگی کا پہلو تھا، وہ بہت نمایاں تھا۔ سبزی و شادابی بہت قلیل اور ناکارہ زمین اور ریگستان بہت وسیع تھا، لیکن دریا کے دونوں کناروں پر جنگلات یا گنجان ان گنت نباتات اُس وقت کہیں زیادہ تھی جو دریائے سندھ کی شاخوں، نشیبی علاقوں اور سیلابی گذرگاہوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دریا خود ایک بڑا درخت ہے جس سے

بہت سی سرسبز شاخیں فاصلہ سے نکل کر پھیل گئی ہیں۔ آجکل دریائے جنگلات میں ٹھوس لکڑی کثرت سے ملے گی اُس وقت زیادہ تر درخت ہلکی لکڑی والے تھے۔ کثرت آب کے زمانہ میں دریائے سندھ کے پشتوں کی وجہ سے ملحقہ جنگلات میں، زیرِ زمین پانی کی سطح خاصی اونچی رہتی ہے، جو باہن اور ببول کی پیداوار کے لئے ضروری ہے، لیکن نشیبی علائقوں میں جہاں سیلاب کا پانی جمع ہوجاتا ہے یا گذرتا ہے وہ کنڈی وغیرہ کے پودوں کی زیادتی اور اونچائی سے سیلاب کی مدّت عمل کا صحیح پتہ چلتا ہے۔۲۲ وہ مقامات جہاں کثرتِ آب کے زمانہ میں باقاعدگی سے پانی پہنچتا ہے، نباتات کی پیداوار بتدریج کم سے کم تر نظر آئیگی۔ جو دریا سے نزدیک رہیں وہاں زیادہ اور جو مقامات دریا میں پانی کی مقدار کم ہوجانے کی وجہ سے دور رہ جاتے ہیں، وہاں کم۔ یہاں پودوں کو پانی ملنے کا اوسط ایک سال کے اندر تقریباً چار ماہ لیکن دوسرے سال صرف چند یوم بلکہ اِس سے بھی کم ہے، اگر آبی گذرگاہ کی پوری لمبائی کا مشاہدہ کیا جائے تو یہ ایک گہرا نشیبی علائقہ معلوم ہوگی، جس میں کچھ مٹی اور کنڈی اور بیر کی جھاڑیاں جو طویل خشکی کا زمانہ برداشت کرسکتی ہیں دکھائی دیں گی۔ یہ نشیب اِس بات کی علامت ہے کہ پیاسے ریگستان کی وسعتوں کے درمیان اِس مقام تک کبھی کبھی پانی پہنچتا رہتا ہے۔

بھورے رنگ کی زمین کے یہ وسیع قطعات جو نباتات سے قطعاً محروم ہیں اور کھار کے سفید سفید دھبوں کی وجہ سے نظر کو بُرے معلوم ہوتے ہیں، کہیں ایک آدھ جھاڑی شاید نظر آجائے، ایسے قطعات نے سندھ کے میدانی علائقہ کے بڑے حصّے کو گھیرا ہوا تھا، لیکن جس طرح دیکھنے میں مکروہ ہیں اِسی طرح اِن کے بیان کو جاری رکھنا بھی طبیعت کے لئے ناگوار ہے۔

پھر دریائے سندھ کے بیان کی طرف لوٹتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ دریا کے کناروں پر جنگل کی جو پٹی پھیلی ہوئی ہے اُس میں کہیں کہیں مٹیالے رنگ کے ریت کے تودے نصف دائرے کی شکل میں کئی مربع میل کے علائقہ میں پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، یہ علامت

ہے کہ پانی کا سیلابی ریلا اِس مقام سے حال ہی میں بہہ کر نکلا ہے، ممکن ہے یہ بہاؤ صرف مختصر وقت تک ہی قائم رہا ہو۔ اِسی طرح سے بہت سی دریائی شاخوں کے بہاؤ کے راستے جب بدلتے ہیں تو کثیر مقدار میں ایسی مٹی کی پیچھے چھوڑ دیتے ہیں جس میں قوتِ نمو نہیں ہوتی۔ تضادِ منظر دیکھئے، بڑے بڑے نشیبی قطعات اِنھیں شاخوں سے ملحق ایسے بھی ہیں جن میں سرکنڈوں کی جھاڑیاں جگہ جگہ اُگی ہوئی نظر آئیں گی، اور ذیلی شاخوں کے بہاؤ سے راستہ کے جو مقامات گہرے ہو گئے ہیں وہ پانی سے بھرے ہونے کی وجہ سے چھوٹی چھوٹی جھیلیں معلوم ہوں گے۔ گو یہ تمام شاخ خشک پڑی ہوگی، اور اِن جھیلوں کے کنارے گھنی نباتات سے سرسبز و شاداب نظر آئیں گے، ایسی بے شمار (جھیلیں) ڈھنڈیں چھوٹی بھی بڑی بھی بمعہ ایسے نشیبوں کے جن میں سیلابی ریلوں کا پانی جمع ہو کر سال کے بیشتر حصّہ میں باقی رہتا ہے۔ ماضی کے سندھ کے طبعی منظر کا ایک عام نقشہ تھا۔ اور اِن سب میں منچھر جھیل کو زمانہ قدیم سے آج تک ایک ممتاز مقام حاصل رہا ہے۔ یہ جھیل دریائے سندھ اور مغربی پہاڑیوں کے درمیان صوبہ کے وسطی علاقہ میں نشیبی ترائی میں واقع ہے۔ اِس جھیل میں پہاڑی علاقے کا پانی بھی جمع ہوتا ہے اور بالائی سندھ میں دریا کے دائیں کنارے سے جو سیلابی ریلے بہہ نکلتے ہیں وہ بھی اِسی میں گرتے ہیں۔ غربی نارا جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے قدیم زمانہ میں سندھ کے سیلابی پانی کی مستقل گذرگاہ تھی۔ دریا کا سیلابی پانی اِس گذرگاہ سے تقریباً ڈیڑھ سو میل کا چکّر کاٹتا ہوا جھیل میں پہنچتا تھا۔ گو خط مستقیم سے یہ فاصلہ صرف اسی میل ہے۔ جھیل کا زائد پانی نہر اڑل (Aral) کے ذریعہ نکل کر پھر دریائے سندھ میں جا گرتا تھا لیکن یہ اُسی وقت ممکن تھا کہ سندھ کی طغیانی سطح کم ہو کر معمول کے مطابق نیچی ہوگئی ہو۔ سیلاب کے وقت تو خود دریائے سندھ نہر اڑل کے ذریعہ اپنا پانی منچھر جھیل میں پہنچاتا تھا۔ اِس طرح یہ دریا ایک عجوبہ ہے جو کبھی کبھی اپنے بہاؤ کے رُخ کے خلاف اُلٹا بہنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ہم دریائے سندھ کے متعلق عموماً یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ اپنے ڈیلٹا تک یہ ایک اکیلے

ریگستان تھر (Thar)

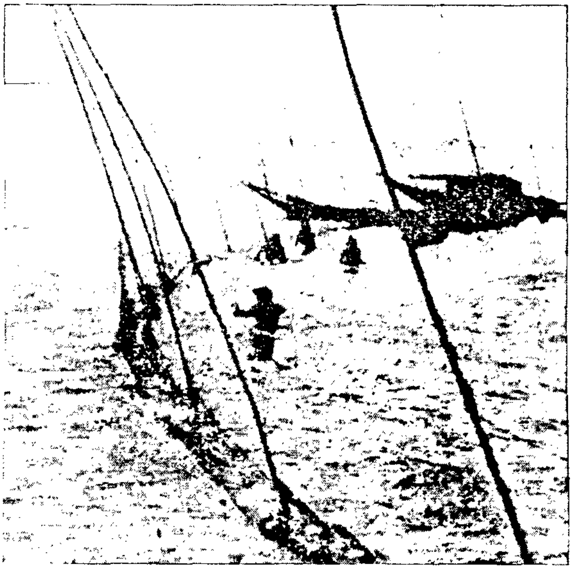

منچھر (Manchhar) جھیل، موہانہ لوگ مچھلیاں پکڑتے ہوئے

بڑے دریا کی شکل میں پہنچ کر پھر شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور راستہ میں صرف معمولی اور وقتی ذیلی گذرگاہیں پیدا ہوتی ہیں، جو اصل دریا سے تقریباً ملحق ہی رہتی ہیں۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ دریائے سندھ کے بارے میں اِس تاثر کو اُن نباتات سے زیادہ تقویت ملی جو سکندر اعظم کے ہمراہیوں سے منسوب ہیں۔ کیونکہ دو ہزار دو سو برس پہلے جب وہ لوگ دریائے سندھ کے راستے گذرے تو انہوں نے اپنے بیانات میں ایسی تفصیلات پیش نہیں کیں جن سے معلوم ہوتا کہ دریا کا عمل حقیقت میں اِس کے برعکس ہے۔ اِس کے باوجود اگر عرب جغرافیہ دانوں کی شہادت کے بغیر جنہوں نے یہ تحریر کیا ہے کہ اُن کے زمانہ میں دریائے سندھ میدانی علاقہ کے وسطی حصہ میں دو شاخوں میں تقسیم ہو کر خاصے بڑے علائقہ کو اپنے درمیان لیتا ہوا آگے جا کر ایک ہو جاتا تھا۔[۲۴] ہم اُن قدرتی حالات کا بغور مطالعہ کریں جو ہمارے سامنے موجود ہیں تو ایسی تبدیلیاں عین ممکن نظر آئیں گی۔ یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسی شاخیں جتنی طویل ہوں گی اتنا ہی اور امکان کم ہوگا کہ دونوں میں بارہ مہینے پانی کا بہاؤ موجود رہے اور یہ بات مستقل ڈیلٹے کی شاخوں کے لئے بھی یکساں درست ہے۔

یہاں سیلابی پانی کی ایک بڑی گذرگاہ کا بیان مناسب ہوگا جسے ایک قدیم دریائی راستہ کہنا موزوں ہے، ایسا دریائی راستہ جو کبھی کبھی دریائے سندھ سے بھی سیلابی پانی حاصل کرتا تھا، لیکن اُس دریا کا اس دریا سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ہندوستان کا گمشدہ دریا ہے، ہاکڑا (Hakra) جو گھاگھر، ہاکڑو (Hakro) کے نام سے کافی مشہور ہے، کہیں کہیں اسے سانگرا (Sankra) یا نالہ سانگرا (Nala Sankra) بھی پکارا جاتا ہے، اِس دریا کا آدھا راستہ صوبہ سندھ میں ہے اِس آبی راستہ کا وہ حصہ جو سندھ میں ہے مختلف ناموں سے مشہور ہے، مثلاً رینی (Raini)، واہندہ (Wahinda)، نارا (Nara) اور ہاکڑا (Hakra)۔ اِس کا عام رُخ ایک عجیب اتفاق کے طور پر سندھ سے مطابقت رکھتا ہے اور اس کے بہاؤ کا راستہ دریائے سندھ کے مشرق میں کہیں بیس میل اور کہیں ستر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔

اِس دریا کے نشانات ایک مسلسل نشیب کی شکل میں موجود ہیں جس کا بالائی حصہ ریگستان تھر کے نچلے حصہ میں اور آخری حصہ تھر کے کناروں سے ملتا ہے۔ قدیم زمانہ کا دریا ہونے کے اعتبار سے ہاکڑا کے حق میں کیا شواہد موجود ہیں (اِن پر ہم آگے چل کر غور کریں گے) اِن سے قطع نظر یہ تو ثابت ہے کہ ایک طویل زمانہ تک سیلاب کے زمانہ میں یہ ایک امدادی راستے کا کام دیتا رہا ہے اور دوسرے دریاؤں کے زائد پانی کو نکالتا رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب بھی سندھ میں انتہائی درجہ کا سیلاب آتا ہے تو دریا کا پانی غوث پور کے قریب، نشیب سے گذر کر جیسے میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں اور اُس آبی گذرگاہ کا پانی بھی جسے ہریاری (Hariari) کہا جاتا ہے اور یہ ستلج اور چناب کے سنگم کے نیچے سے پنجند کے متوازی بہتا ہوا اِس گمشدہ دریا میں پہنچتا ہے۔ ۲۵

ایک نہر جو روہڑی سے ذرا اوپر کی طرف دریائے سندھ سے نکالی گئی ہے اور تقریباً ایک صدی پُرانی ہے ہاکڑا کے دو سو میل کے علاقہ میں اپنی شاخوں کو پھیلائے ہوئے ہے (یہ نارا کہلاتی ہے۔ ۲۶) اور اب اِس علاقہ کو سکھر بیراج سے بھی ایک نہر دیدی گئی ہے، نارا میں ایک قدرتی دریا کی تمام صورتیں موجود ہیں۔

ایک اُتھلی وادی میں یہ چکّر کاٹتے ہوئے بہتا ہے۔ اور کہیں کہیں دو یا تین میل چوڑا ہے، لیکن ریت کے پہاڑوں نے اِس کے راستہ میں جگہ جگہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ ایسا بھی ہوتا رہا ہے۔ کہ کثیر طغیانی کے وقت دریاؤں سے نکلا ہوا پانی اِس وادی میں داخل ہوا اور سیلابی شکل میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بھر گیا، لیکن یہ پانی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ کر خارج ہو گیا۔ ۲۷ اور میدانوں میں نکل آیا۔ نارا ہاکڑا ریگستان تھر کے کنارے کے ساتھ ساتھ بہتا ہے، اِس مقام سے جنوب کی سمت اِس کا راستہ بہت واضح نظر آتا ہے۔

صوبہ سندھ میں ہاکڑا کا بالائی حصہ تقریباً غیر معروف ہے۔ اور زیریں حصہ کے برعکس اِس میں سیلابی پانی گذشتہ صدیوں میں کبھی کبھی داخل ہوا ہے۔ حالانکہ قدیم زمانہ میں ایسا اتفاقاً بھی ہوتا رہا ہے کہ اِس حصہ میں بھی پانی کی کثیر مقدار داخل ہوئی، جن ذرائع سے

یہ پانی یہاں پہنچا وہ ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہیں کیونکہ عہد قدیم سے شمالی ہندوستان کے دریاؤں کا جو طرز عمل رہا ہے اُس سے اِس کا گہرا تعلق ہے۔ اور اِس موضوع پر خاصا بحث مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ ۲۸

بظاہر دریائے سندھ ایسے پانی کا ایک ذریعہ تھا جو غوث پور (Ghauspur) کے نشیب سے پہنچتا تھا۔ بالائی سندھ میں تالپور خاندان کے جاں نشین حکمران جن کی جاگیر یں نارا پر واقع جانوجی (Januji) کے آس پاس ہیں روایتی طور پر اِس میں داخل ہونے والے پانی کے کسی دوسرے غیر معروف ذریعہ کی نشاندہی نہیں کرتے۔ ۲۹ اِس کے باوجود ہاکڑا کی آبی گذرگاہ کے نشانات بھاولپور (Bahawalpur) اور بیکانیر (Bikaneer) ریاستوں میں تسلسل کے ساتھ موجود ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ کئی دریا ؤں کے سنگم سے یہ وجود میں آیا جن میں گھاگر (Ghaggar)، مرکنڈا (Markanda) سرسوتی (Sarsuti) اور چتانگ (Chitang) قابل ذکر ہیں۔ مغرب میں دریائے ستلج اور مشرق میں دریائے جمنا کے مخرج کے درمیان واقع سیوالک (Siwalik) کی پہاڑیوں سے یہ دریا نکلتے ہیں۔ یہ مذکورہ ندیاں تھوڑے تھوڑے علاقہ کا پانی کھینچتی ہیں اور زیادہ تر بارش کے پانی پر انحصار کرتی ہیں، لہٰذا یہ سوچنا سادہ دلی ہوگا کہ پانی کی کثیر مقدار جو آٹھ سو میل کا راستہ طے کر کے سمندر تک پہنچ سکے اِن ندیوں سے حاصل ہوتی ہوگی۔ ۳۰ بیکانیر اور بھاولپور کے علاقہ میں تقریباً ڈیڑھ سو میل تک ہاکڑا کی آبی گذرگاہ کی چوڑائی صرف ایسے کثیر سیلابی پانی کی وجہ سے ہی قائم ہوسکتی ہے جو ہمالیہ کے برفانی پہاڑوں سے نکلنے والے دریاؤں سے ہی خارج ہوتا ہوگا۔

مندرجہ بالا بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں دریائے جمنا بھی ہاکڑا میں بہنے والے پانی کا ایک ذریعہ تھا جو چتانگ ۳۱ کی ایک میل چوڑی آبی گذرگاہ کے ذریعہ سے پہنچتا تھا، سندھی ہاکڑا اور دریائے گنگا دونوں کے دامن کو الگ کرنے والا خط موجود زمانہ میں جمنا اور چتانگ کے درمیان ڈھلوان پر قائم کیا جا سکتا ہے، دریائے جمنا کوہستان ہمالیہ

سے نکلنے والا ایسا دریا ہے جو کثیر مقدار میں مٹی بہا کر لاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں یہ دریا مذکورہ ڈھلوان سے بہتا تھا۔ جس سے سیلابی پانی دونوں کناروں سے خارج ہوتا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ بلند ڈھلوان مشرق کی سمت کھسک گئی اور اِس کا آبی راستہ بھی دریائے چیانگ، بھاولپور کے نزدیک گھاگھر اور ہاکڑا سے مل جاتا ہے، مخالف سمت میں یعنی دائیں کنارے پر ستلج کی طرف سے آنے والے سیلابی پانی کی گذرگاہوں کے نشانات موجود ہیں، اور ممکن ہے کہ خود دریائے ستلج ہی تین مختلف مقامات پر ہاکڑا سے ملتا ہو اور یہ مقامات ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر واقع ہوں۔ بعد ترین، اور سب سے کم واضح مقام گذرگاہ کے بالکل ابتدائی حصّہ میں بھٹ نیر (Batnir) ۳۲ کے نزدیک معلوم ہوتا ہے جو چیانگ کے سنگم سے تقریباً پچیس میل اوپر ہے، اِسی ترتیب کے مطابق دوسرا مقام جو دریائے ستلج کے قدیم راستہ کا موڑ ہے، ہاکڑا سے ولہار (Walhar) کے قریب ملتا ہے۔ یعنی بھاولپور کی سرحد سے نزدیک۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ستلج کے قدیم راستہ سے تعلق رکھتا ہے جو قدیم زمانہ میں بھٹنڈا (Bhatinda) اور ملوٹ (Malot) سے گذرتا تھا۔ ہاکڑا برانچ کنال تقریباً اِسی راستہ کو اختیار کیئے ہوئے ہے۔ ۳۳ اِن الحاقی گذرگاہوں کی تیسری شاخ بہاولپور شہر کے مشرق اور شمال مشرق میں تقریباً بیس میل کے فاصلہ سے شروع ہو کر ہاکڑا سے کڈوالا (Kudwala) کے نزدیک ملتی ہے۔ اِسی شاخ کے عام رُخ سے مطابقت رکھتے ہوئے آجکل ایک دوسری آبپاشی کی نہر بہتی ہے جو ریگستانی شاخ کہلاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پہلے یہ ایک قدرتی خشک دریائی گذرگاہ تھی اور واہندا (Wahinda) کے نام سے مشہور تھی۔ اِس کے ذریعہ سانگرا (Sankara) میں پانی پہنچتا تھا۔ ۳۴ اِس سنگم سے تقریباً تیس میل بہاؤ کی طرف۔ ڈیرہ وال (Derawal) کے آس پاس ہاکڑا کا دامن وسیع ہو کر بہت سی چھوٹی شاخوں کا ایک ڈیلٹا نظر آتا ہے۔

اِس مقام سے صوبہ سندھ کی شمالی سرحد کے بیس میل اندر تک مختلف دریاؤں کے سنگم اور شاخوں کے مخرج کا اُلجھا ہوا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ۳۵ لیکن غوث پور نشیب جس کے

ذریعہ سیلابی پانی ہاکڑا میں داخل ہوتا تھا اُس سے نیچے ہاکڑا کی گذرگاہ بہت واضح ہے۔ صوبہ سندھ کی سرحد میں، ونجڑوٹ (Wingnath) جہاں ایک قدیم آبادی کے آثار ہیں، وہ جگہ ہے جہاں پہنچ کر ہاکڑا منقسم ہوجاتا ہے اور تقریباً تین سومیل تک اِس نام سے نہیں پکارا جاتا۔ بڑی شاخ جو واہندہ کے نام سے مشہور ہے چکر کاٹتی ہوئی پہلے عام طور پر جنوب کے سمت بڑھتی ہے اور مٹھڑاؤ (Mithrhao) نام کے ایک مقام تک پہنچتی ہے جو روہڑی اور جیسلمیر کے درمیان قافلوں کے قدیم راستہ پر واقع ہے۔ یہاں سے یہ مغرب کی سمت مڑ جاتی ہے، اِس کے بعد جنوب مغرب اور آخر کار پھر جنوب کی سمت چلی جاتی ہے اور روہڑی کے جنوب میں واقع پہاڑیوں کے سلسلے میں داخل ہوجاتی ہے، اِس اثناء میں دوسری شاخ جو رینی نالہ (Raini Nalla) کہلاتی ہے اور نسبتاً سیدھا راستہ اختیار کرکے جنوب مغرب اور جنوب کی سمت بہتی ہے، اِس سے ملحق ہوجاتی ہے۔

رینی دراصل نالہ کہلانے کی مستحق بھی ہے کیونکہ یہ ایک گہرا آبی راستہ ہے جس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی چالیس گز لیکن اِس کے پشتے پندرہ سے بیس فٹ تک اونچے ہیں۔ اِس کے دونوں طرف کی زمین سخت ہے جس پر جگہ جگہ ریت کی پہاڑیاں ہیں، یہ زمین دونوں طرف سے دریا کی سمت ڈھلوان ہے۔ [۳۶] اِس کے برعکس دوسری شاخ واہندہ چوڑی اور اُتھلی پھیلی ہوئی سطح رکھتی ہے۔ چند مقامات پر تو ہوا سے منتقل ہونے والے ریت کی وجہ سے اِس کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے۔ اِس کو دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے سیلاب اکثر اِس راستے سے گذرتے رہے ہیں اور ریت کی پہاڑیوں کے درمیان خالی مقامات اُن کی مٹی سے بھر کر برابر ہوگئے ہیں۔ میلوں تک ایسا ہی منظر ہے، یہ بھی تاثر پیدا ہوتا ہے کہ سیلابی پانی نے جنوب کی سمت بہت طویل فاصلہ طے نہیں کیا بلکہ اُس کا بہاؤ زیادہ تر رینی نالہ کی طرف ہی رہا۔ پانی چونکہ اِس نالے کی گنجائش سے کہیں زیادہ ہوتا تھا اِس لئے کچھ دور تک کناروں سے باہر بھی بہتا رہا لیکن کچھ آگے بڑھ کر جہاں زیادہ نشیب تھا اُس نے وسطی نالے کی سطح کو اپنی رفتار اور مقدار کی وجہ سے زیادہ گہرا کردیا۔

اِس علاقہ کا ڈھال جنوب مشرق کی سمت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ رینی نالہ دریائے سندھ سے نیچی سطح پر بہتا ہے اور واہندہ رینی نالہ سے بھی نیچی سطح رکھتا ہے۔ واہندہ سے آگے جہاں موجود جیسلمیر کی سرحد ہے وہاں اِس سے بھی نیچی سطح کے نشیب ہیں۔ لیکن جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے کسی مسلسل نیچی سطح کی وادی کی موجودگی کا نشان نہیں۔ روہڑی سے تقریباً تیس میل جنوب میں اور اُس مختصر سے پہاڑی سلسلہ کے مشرق میں جنوب کی طرف چلا گیا ہے، رینی نالہ واہندہ اور دوسری سیلابی شاخیں بتدریج نارا میں ضم ہو جاتی ہیں۔ خیرپور کی سرحد سے گذرتے ہی چونے کے پتھر کی جگہ ریت کی پہاڑیاں شروع ہو جاتی ہیں اور یہاں سے نارا ایک دو میل چوڑی وادی میں پیچ وخم کھاتا ہوا تقریباً ساٹھ میل تک آگے بڑھتا ہے جس کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے سے ملی ہوئی ریت کی پہاڑیاں ہیں اور سمت جنوب سے قدرے مغرب کی طرف ہے۔ میدان میں پہنچ کر نارا مشرقی ریگستان کے گرد گھومتا ہے یہ موڑ جنوب مشرق اور جنوب کی طرف اتنا گھومتا ہے کہ ۲۵ ڈگری تیس فٹ کی عرض البلدی حد پر پہنچ کر ریت کی پہاڑیاں یک لخت مشرق کی طرف ہٹ جاتی ہیں اور دریائی مٹی کے میدانی علاقہ کے کچھ حصہ کو درمیان میں لے لیتی ہیں۔ نارا اِس حصہ سے گذرتا ہے اور جنوب میں ریگستان کے کنارے کو چھوتا ہوا دوبارہ اپنا متوازی راستہ اختیار کر لیتا ہے اور جنوب۔ مغرب کی طرف بڑھ جاتا ہے تا آنکہ رن کچھ (Rann cutch) میں گر جاتا ہے۔ دریا کے اِس طویل راستے کا آخری حصہ وہ ہے جہاں اِسے وہ نام واپس مل جاتا ہے جو اِس نے چار سو میل اوپر کھو دیا تھا، یعنی ہاکڑا (Hakra)۔

وادیٔ نارا ہاکڑا کے آخری دو سو پچاس میل کا ٹکڑا سطح کے اعتبار سے وادیٔ سندھ کے پست ترین مشرقی حصہ سے مطابقت رکھتا ہے۔ کھاڑی کے دہانہ پر جہاں امرکوٹ (Amarkot) واقع ہے، صورت حال اِس سے مختلف ہے۔ یہاں زمین مشرق کی سمت مزید نیچی ہوتی چلی گئی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۸۵۹ء میں جب پہلی بار باقاعدگی کے ساتھ نارا میں پانی چھوڑا گیا تھا تو اِس کی کثیر مقدار بائیں کنارے پر واقع

اُتھلے اور گہرے بہت سے نشیبوں کے بھرنے میں جو سانگھڑ (Sanghar) اور کھپرو (Khipro) تعلقہ میں واقع ہیں کام آ گیا تھا۔ یہ نشیب تھر کے مخصوص ریت کے پشتوں کے درمیان ایک دوسرے کے برابر برابر پھیلے ہوئے ہیں۔۳۷ بہت سے اِن میں سے ایسے ہیں کہ جب پانی داخل ہوگا تو نارا کے پاٹ سے بھی دس میل دور تک پانی بھر جائیگا۔ یہ قیاس درست معلوم ہوتا ہے کہ اگر اِس نیچی سطح کو ریت کے پشتوں کی رکاوٹ کا سامنا نہ ہوتا تو نارا کئی میل مشرق کی طرف بہاؤ کا راستہ اختیار کرتا۔

مذکورہ بالا چند مستثنیات کے علاوہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نارا ہاکڑا نے وادی کے بائیں حصّہ کی سب سے نچلی سطح کو بہاؤ کے لئے اختیار کیا ہے۔ پہلے دریائے ستلج کی وادی اور اِس کے بعد دریائے سندھ کی وادی، جہاں اِن دونوں دریاؤں کی لائی ہوئی مٹی قدرے بلند زمین سے ملتی ہے، جو خود بھی ریگستانِ تھر کے مغربی کناروں پر ریت کے نیچے دبی ہوئی ہے اور قدیم زمانہ کی دریائی مٹی سے بنی ہے، یہ ایک ایسی اہم حقیقت ہے کہ قدیم سندھ کے متعلق آبی تحقیق میں اِسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اِس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت دریائے ستلج (Sutlaj) کے پانی کا بڑا دھارا یا مکمل دریا مختلف مقامات سے داخل ہو کر ہاکڑا کے راستے بہتا رہا ہے، اور پھر دریائے سندھ بھی اپنے تمام معاون دریاؤں کا پانی حاصل کر لینے کے بعد کبھی کبھی پانی کی کثیر مقدار یا کُل مقدار ہکڑو اور نارا کے راستے سے سمندر میں پہنچاتا رہا ہے۔ یہ صورت حال تعمیر ارضی کے انتہائی قدیم زمانہ میں واقع ہوئی یا متبادل نظریہ یہ ہو سکتا ہے کہ جب بھی ہوئی نسبتاً تھوڑے زمانہ تک قائم رہی۔

میدان میں دریائی مٹی کی جو تہیں ملتی ہیں وہ اِس کا ناقابل تردید ثبوت ہے، ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہاکڑا اور نارا کے بہاؤ کا صرف کچھ حصّہ اِن عظیم دریاؤں نے طویل عرصہ تک یا پھر نسبتاً قریب کے زمانہ میں مُستعار لیا، لیکن ریورٹی (Raverty) نے "سندھ کے مہران" (Mehran of Sindh) کا تصور پیش کرتے ہوئے جہاں یہ بیان کیا ہے کہ ابتدائی زمانہ سے ۹۵۰ء تک دریائے سندھ ہاکڑا کے راستے پر بہتا رہا ہے وہ بلاشبہ

غلط ہے، اِس ملک کے طبعی نشیب وفراز یہ بات واضح کردیتے ہیں کہ برفانی پہاڑوں سے نکلنے والے دریاؤں کا مجموعہ یعنی بڑا دریائے سندھ گذشتہ پانچ ہزار سال کے دوران (جو ایک دریا کی طبعی عمر کا معمولی حصہ کہا جاسکتا ہے) مشرق اور مغرب میں وادی کی جو حدود ہیں اُن کے درمیان ہی مختلف راستوں پر بہتا رہا ہے۔ اِسی دوران یا اِس سے بھی زیادہ عرصہ تک ہاکڑا نارا ایک موسمی سیلابی گذرگاہ کے طور پر موجود رہا ہے، جس سے سیلابی پانی کی عظیم مقدار ہر سال یا ہر سیلاب کے موقع پر باقاعدگی سے گذرتی رہی، لیکن یہ بارہ مہینے بہنے والے دریا کی حیثیت اختیار نہیں کرسکا۔ ۳۸

وہ وقت کہ جب دریائے سندھ نے بکھر کی پہاڑی تنگ نائے کو دریافت کرکے اُسے اپنے مستقل راستے کے طور پر اختیار کیا تاریخی اصطلاح میں بھی قدیم زمانہ نہیں۔ اِس تنگ نائے کی گہرائی کا واحد سبب ہے، کہ دریا نے اسے مستقل راستے کے طور پر اختیار کیا۔ شمال اور جنوب میں پہاڑیوں کے درمیان دیگر ایسے ہی مقامات موجود ہیں لیکن اُن کی پتھریلی سطح اِس تنگ نائے کی سطح سے بہت بلند ہے۔ خود بکھر کی تنگ نائے کی گہرائی دریائے سندھ کے تیز رفتار پانی کے مسلسل گذرتے رہنے اور زمین کو گہرا کرتے رہنے کی وجہ سے ہے۔ بہرنوع دریائی مٹی سے تعمیر شدہ میدانوں کی طبعی حالت کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے، کہ دریائے سندھ کی زندگی میں بکھر کی تنگ نائے کا راستہ نسبتاً ماضی قریب کا ہی واقعہ ہے۔ ۳۹ میدان کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ دریائے سندھ کے بہاؤ کا راستہ ابتدائی زمانہ سے کہاں کہاں رہا ہے اور کہاں کہاں نہیں رہا۔

جہاں تک بکھر سے اوپر دریائے سندھ کے راستے کا سوال ہے طبعی ارضی سطح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف زمانوں میں یہ دریا سکھر کے شمال اور مغرب میں اور روہڑی کے جنوب اور مشرق میں بہتا رہا ہے۔ یہ راستہ علی الترتیب تقریباً اُسی جگہ سے گذرتے تھے جہاں سے سندھ ڈھورو (Sindh Dhoro) اور سندھ واہ (Sindh wah) گذرتے ہیں، یعنی لکھی (Lakhi) کے نشیب سے شمال کی جانب ڈہرواہ (Dahar

(Wah) اور یارُ ولنڈ (Yarolund) سے ہوتے رینی (Raini) وادی کے شمالی مغربی کنارے پر، ایسی شہادتیں زیادہ واضح ہیں جن سے مؤخرالذکر راستہ کا ثبوت ملتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ دریائے سندھ کے بہاؤ کا یہ قدیم راستہ زیادہ عرصہ تک دریا کے تصرف میں رہا ہو یا پھر ایسا ہوگا کہ یہ راستہ قریب کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہو، یہ بھی ممکن ہے کہ دریا کا راستہ ایسا ہو جو اِن دونوں راستوں کی شمولیت سے بنا ہو۔ اگر حقیقت یہی ہے کہ دریائے سندھ صوبہ کے بالائی حصہ میں اِسی مشرقی راستہ پر بہتا رہا تو یقیناً یہ راستہ روہڑی کی پہاڑیوں سے مشرق میں واقع ہوگا اور اِس کے بہاؤ کی سمت وہی ہوگی جو نارا کی ہے لیکن شاید موجودہ نارا وادی سے یہ نہیں گذرتا تھا۔

جس مقام پر نارا میدان میں داخل ہوتا ہے وہاں ارضی سطح کا مطالعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ معاون دریاؤں کے مل جانے کے بعد بڑا دریائے سندھ ایسے راستے پر بہتا تھا تو نارا ہاکڑا وادی سے چند میل مغربی کنارے پر واقع تھا اور عین ممکن ہے کہ یہاں دریا غیر منقسم صورت میں ایک ہی گذرگاہ کو استعمال کرتا رہا ہو۔ بالغرض اگر یہ دو شاخوں میں تقسیم بھی ہوا تو کم ازکم یہ ضرور ہے کہ دونوں شاخوں نے جو بہاؤ کی سمت اختیار کی، وہ جنوب کے مشرقی طرف تھی، کیونکہ چھبیس 26 اور پچیس 25 عروض البلد اور تقریباً ۶۰ ڈگری ۴۰ فٹ طول البلد کے درمیانی علائقہ کا ڈھال جنوب کے مشرقی کنارے کی طرف بہت زیادہ ہے (حیدرآباد سے اٹھارہ میل مشرق میں شمالاً جنوباً ایک خط اگر کھینچ دیا جائے تو مذکورہ علائقہ کی طول البلدی سرحد سمجھ میں آجائیگی) یہ علائقہ اُس قدیم ڈیلٹائی خطّ کا نصف بیاباں ہے جو سکرنڈ (Sakrand) اور نوابشاہ (Nawabshah) سے شروع ہوکر گول پنکھے کی شکل میں پھیل جاتا ہے۔

لٰہذا یہ مفروضہ کہ تاریخی زمانہ کے ابتدائی ایام میں ایک دریا تقریباً اُسی راستہ پر بہتا تھا جو نارا کا راستہ ہے اور یہ کہ جمڑاؤ ہیڈ (Jamrao Head) سے ایک شاخ اِس دریا سے نکل کر جنوب اور جنوب مغرب کے رُخ ہالا (Hala) کی سمت بہتی تھی، وہ علائقہ

کی ٹیبی ٹیج کی بناوٹ سے غلط ثابت ہو جاتا ہے، اگر ایسا ہوتا تو لازماً اتنے وسیع علاقہ کے ڈھال کی طرف اِس شاخ کو عمودی حیثیت میں بہنا چاہئے تھا۔ اور ایسی صورت زمین سندھ کی تعمیر کے کسی قدیم دور سے تعلق رکھتی ہوگی۔

مذکورہ بیان کی اہمیت آنیوالے ابواب سے مزید واضح ہو جائیگی۔ تاریخی دور کی طرف بڑھتے ہوئے ہمیں دریائے سندھ کے مختلف آبی راستوں کی تبدیلی پر غور کرنیکا موقع ملیگا اور ساتھ ہی اُس زمانہ کے دریائے ہاکڑا کی صورت کا تجزیہ کرنے کا موقع بھی ملیگا۔ ایسی تبدیلیوں سے سندھ جیسی کیفیات رکھنے والے میدان میں مقامی طور پر تبدیلیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ ایک شاداب وسیراب قطعہ زمین ریگستان میں تبدیل ہو جائے اور ایک ریگستان گھنے جنگل کی شکل اختیار کرلے، وہ اُسی صورت میں ممکن ہے کہ کوئی قدیم آبی گذرگاہ ہر سال علاقہ میں یا مٹی پھیلاتی رہی ہو اور خود اپنی سطح کو بلند کرتی رہی ہو، یا پانی کے بہاؤ سے زمین کٹتی رہی ہو اور ایک نئی آبی گذرگاہ بنتی رہی ہو۔

ایسے حالات میں تقریباً یقینی ہے کہ سندھ کے باشندوں کا پیشہ مویشی پالنا اور چراگاہوں میں گھومنا رہا ہوگا۔ اور مچھلی اور شکار آبادی کے دوسرے بڑے حصہ کے لئے ذریعہ معاش بن گیا ہوگا، جبکہ زراعت بہت کمزور وہ بھی اتفاقات پر منحصر ہوگی۔ ہزار سالہ تاریخی اور قبل کے زمانہ کا یہ عام پس منظر ہے۔ لیکن آنیوالے ابواب میں وادیءِ سندھ کے حالات کو ہم اِس پس منظر میں دیکھیں گے کہ زراعت اور بستیاں بنا کر رہنے کا معیار یہاں کے باشندوں نے کب اور کیسے اختیار کیا۔

تشریحات باب تیسرا

1. جہاں دریا کے پانی کے اخراج کا راستہ متعین و محدود ہے، اُس کے بہاؤ میں پیچ وخم دونوں طرف ہوں گے اور اُس کی نسبت دوگنے علاقہ کو گھیر لیں گے جہاں اخراج کا راستہ محدود متعین نہیں۔
2. ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال''، جلد ۴۵، حصہ دوئم (۱۸۸۷ء)۔ ''آن پرابئبل چینجز اِن دی جیوگرافی آف دی پنجاب اینڈ اِٹس ریورز'' از: آر۔ڈی اولدھام، ص ۳۲۵، اولدھام کے مضمونوں میں استعمال شدہ الفاظ 'جنوب' اور 'شمال' والے حصے کی معنی 'زیریں' اور 'بالائی' لی جائے، روہڑی سے آتے ہوئے سندھو دریاء کا رُخ مشرق سے مغرب ہے۔
3. آر۔بی۔ بکلے، 'اریگیشن ورکس اِن انڈیا اینڈ ایجپٹ' (لنڈن ۱۸۹۳ء)، ص۹۴۔
4. یعنی یورپ سے باھر 'پوہ' ندی اور اس سے کچھ کم، 'رہون' ندی کا صدیوں سے مطالعہ کیا جارہا ہے۔
5. آر۔بی۔ بکلے، 'اریگیشن ورکس اِن انڈیا اینڈ ایجپٹ' (لنڈن ۱۸۹۳ء) ص۳۶۔۳۷۔
6. آر۔بی۔ بکلے، 'اریگیشن ورکس اِن انڈیا اینڈ ایجپٹ' ص ۳۷، ھئگ، نیل ندی کے لیئے جو ۲۴ کروڑ مکعب گز بتایا گیا ہے، وہ قدرتی طرح اس دلیل کو غلط ثابت کرتا ہے۔میجر جنرل۔ایم۔آر۔ھئگ، دی انڈس ڈیلٹا کنٹری، ص ۷۔
7. ''سندھو دریاء کا اخراج، مارچ ۱۸۷۷ء کی سروے رپورٹ'' از لیفٹیننٹ اسٹیف سابقہ ھندستان کی سمندری فوج، بحوالہ ھئگ، مذکورہ کتاب ص ۷۔
8. گزیٹیر آف سندھ، ۱۹۰۷ء، ص ۱۱۰۔
9. ایلیزی ریکلس، ''دی ارتھ'' لنڈن ۱۸۷۷ء، ص ۴۰۲۔
10. ایلیزی ریکلس، ''دی ارتھ'' لنڈن ۱۸۷۷ء، ص ۴۱۲۔

11. سرکلاڈ انگلس، مذکورہ کتاب، ص۱۷۲۔
12. سرکلاڈانگلس، مذکورہ کتاب، ص۲۲۔
13. دریائے سندھ سے پانی کے اخراج کا زیادہ سے زیادہ اوسط جو سکھر میں ریکارڈ کیا گیا ڈبلیو، ایل اسٹرینج کے مطابق نو لاکھ مکعب فٹ فی سکنڈ ہے۔(انڈین انجینئرنگ، صفحہ ۱۴۴)، سرکلاڈ انگلس تحریر فرماتے ہیں "انتہائی سیلاب جو ریکارڈ کیا گیا (میٹر رُک جانے کی وجہ سے جو غلطیاں ہوئیں اُن کی اصلاح کے بعد) وہ ساتھ لاکھ تیس ہزار کیوسک ہے" جبکہ یہ صاحب زیادہ سے زیادہ متوقع اخراج نو لاکھ کیوسک دیتے ہیں۔ اخراج کی رفتار کو صرف ۱۹۲۱ء سے ضابطہ تحریر میں لایا جارہا (دی بی ہیویر اینڈ کنٹرول آف ریورز اینڈ کنالز، صفحات ۱۶۷، ۱۸۳)۔
14. اِس شگاف سے اخراج کا اندازہ نوے ہزار کیوسک ہے اور دو ہزار چھ سو مربع میل کا علاقہ سیلاب کی زد میں آگیا تھا۔(سرکلاڈ انگلس، مذکورہ کتاب، صفحہ ۱۷۷)
15. دیکھئے جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال۔ جلد ۵۱، پارٹ نمبر 1 (۱۸۹۲) دی مہران آف سندھ اینڈ اِٹس ٹری بیوٹریز "میجر ایچ-جی ریورٹی صفحہ ۳۰۷ نوٹ ۳۰۷ متعلقہ نشیب سندھ صفحات ۳۱۱-۳۱۲ بابت سیلاب عظیم ۱۸۷۴ء جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُس دن سے آج تک اِس سیلاب نے ایسی شدت اختیار نہیں کی۔
16. تقریباً دو ہزار مربع میل۔
17. غوث پور صوبہ سندھ کی سرحد سے تقریباً پچاس میل دور ہے اور بھاولپور شہر سے اِس کا فاصلہ قدرے زیادہ ہے، اور یہ مٹھن کوٹ کے بالکل مقابل ہے۔ سلیکشنز فروم دی ریکارڈ آف دی بمبئی گورنمنٹ نمبر ۴۵ رپورٹ آن دی، اپر پورشن آف دی ایسٹرن نارا "لفٹننٹ جے- جی فائف وغیرہ، صفحات ۱۲-۲۶-۳۷ بھی دیکھئے۔
18. اسٹرینج، مذکورہ کتاب، صفحہ ۱۲۹۔
19. "گزیٹیر آف سندھ "صفحات ۲۸۳-۲۸۶ اور رہیگ کی کتاب "انڈس ڈیلٹا

کنٹری "تتمہ" سی "صفحہ ۱۳۱ بھی دیکھئے۔

20. ۳۲-۱۸۳۱ء میں سفر کرنے والے مسٹر میسن (Mr Mason) نے مغربی نارا کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "معلوم ہوتا ہے کہ حالیہ برسوں کے دوران پانی کی کثیر مقدار بہ نسبت پہلے چند برسوں کے اسی نہر سے گذرتی رہی ہے اور چشمۂ اعلیٰ کی طرح اس میں بھی پانی کناروں سے باہر نکل جاتا ہے"۔ (نیریٹیو آف ویریس جرنیز ان بلوچستان، افغانستان اینڈ پنجاب، ۱۸۴۲ء جلد دوئم۔ صفحہ ۱۳۹)۔

21. "سندھ گزیٹیر" ۱۹۰۷ء صفحہ ۳۰۳۔

22. مندرجہ بالا گزیٹیر صفحہ ۴۰۔

23. سندھ گزیٹیر صفحہ نمبر ۲۸۶-۲۸۸۔

24. مختلف مصنفین کی تحریروں کے اقتباسات جو "دی ہسٹری آف انڈیا ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹر وریئز" جلد اول مصنفہ سرایچ-ایم-ایلیوٹ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ پلائنی نے میگیستھنیز کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "دریائے سندھ نے دو شاخوں میں تقسیم ہو کر بیچ میں بہت بڑا جزیرہ بنا دیا تھا۔

25. آر-بی بکلے کی کتاب "اریگیشن ورکس آف انڈیا" صفحہ ۱۵۷، ملاحظہ فرمائیں (ڈبلیو-ایچ-ایلین ۱۸۸۰ء)۔

26. ایس-آر-بی-جی-نیو سریز "رپورٹ آن دی اپر پورشن آف دی ایسٹرن نارا "اور کیپٹن فائف کی "رپورٹ آن دی ایسٹرن نارا"۔

27. کیپٹن بیکر پہلے انجینئر تھے جنھوں نے نارا آبی گذرگاہ کا معائنہ کیا اور انھیں ایسے سیلاب کے واضح نشانات ملے جو اٹھارہ فٹ بلند ہو گیا تھا۔ (مہران صفحہ ۴۶۱)۔

28. مطابق مندرجہ ذیل۔

"کلکتہ ریویو" جلد ۵۹ (۱۸۷۴) مضمون نمبر 1 "نوٹس آن دی لوسٹ ریور آف دی انڈین ڈیزٹ" اور جلد ۶۰ مضمون نمبر ۵ "دی لوسٹ ریور آف دی انڈین ڈیزٹ" اے کومنٹ بائی نیرکس جے-اے-ایس بنگال (۱۸۸۷) مضمون

نمبر ۱۸ "پروبیبل چینجز ان دی جیوگرافی آف دی پنجاب اینڈ اٹس ریورز "آر-دی-اولڈ ہم، اور "دی مہران آف سندھ اینڈ اٹس ٹری بیوٹریز" میجر ایچ-جی-ریورٹی۔ زیرِ نظر کتاب کا تتمہ نمبر 1 دیکھئے۔

29. جے-ایس-ایچ-ایس جلد ہشتم صفحہ ۵۱۔

30. رگ وید میں ایک مقام پر سرسوتی کو "دریاؤں کا سردار۔ پاکیزہ پانی کا دریا جو پہاڑوں سے نکل کر سمندر تک بہتا ہے" ترجمہ ایچ-ایچ ولسن۔ جلد چہارم صفحہ ۱۸۹۔ بحوالہ سرآوریل اسٹین "جیوگرافیکل جرنل، مین جلد صفحہ ۱۷۶۔

31. ایچ-ڈبلیو۔ نکلس، "دی ریورکورسز آف دی پنجاب اینڈ سندھ" بحوالہ آر-بی وہائٹ ہیڈ۔ انڈین اینٹی کوئری۔ جلد ۶۱۔ صفحہ ۱۶۸ : "مہران" صفحہ ۴۱۹۔

32. "مہران" صفحہ ۴۱۱-۴۱۲۔

33. "مہران" ۴۱۰-۴۱۱-۲۱۳ : سرآریل اسٹین" اے سروے آف اینشی اینٹ سائٹس الونگ دی لوسٹ سرسوتی ریور" جیوگرافیکل جرنل۔ جلد صفحہ ۱۷۹۔

34. آر-بی- بکلے۔ "دی اریگیشن ورکس آف انڈیا" صفحہ ۱۵۶۔

35. "مہران" صفحہ ۴۲۸-۴۳۰۔

36. جے-ایس-ایچ-ایس۔ جلد ہشتم صفحہ ۵۲۔

37. مذکورہ بالا، باب ۲۔ یہ جھیلیں عام طور پر لمبی اور پتلی اور محل وقوع کے اعتبار سے جنوب مغرب سے شمال مشرق کے رُخ پر ہیں۔ اونچے پشتوں کی وجہ سے نارا کا پانی براہ راست اِن میں داخل نہیں ہوتا یہ صورت طویل عرصہ سے قائم ہے۔ لیکن کئی جھیلیں زیرزمین سوتوں کے ذریعہ اتنا پانی حاصل کرلیتی ہیں کہ اوپر تک بھر جاتی ہیں۔

38. "مہران" صفحہ ۴۷۸-۴۷۹ "بہنے والے دریاؤں" کے متعلق میجر ریورٹی معلومات رکھتے تھے۔ کیونکہ اپنی تحریروں میں اُنھوں نے فائیف کی "رپورٹ آن دی ایسٹرن نارا" کا حوالہ دیا ہے۔ صفحہ ۴۱۵۔ نوٹ ۴۴۶۔

39. سندھ کی طبعی ارضی سطح کا نقشہ۔ صفحہ ۱۶۵، "دی بی ہیویر اینڈ کنٹرول آف ریورز اینڈ کینالس" سرکلاڈ انگلس۔ جس کے مطابق مذکورہ جلد کا نقشہ نمبر ۲ بنایا گیا ہے۔

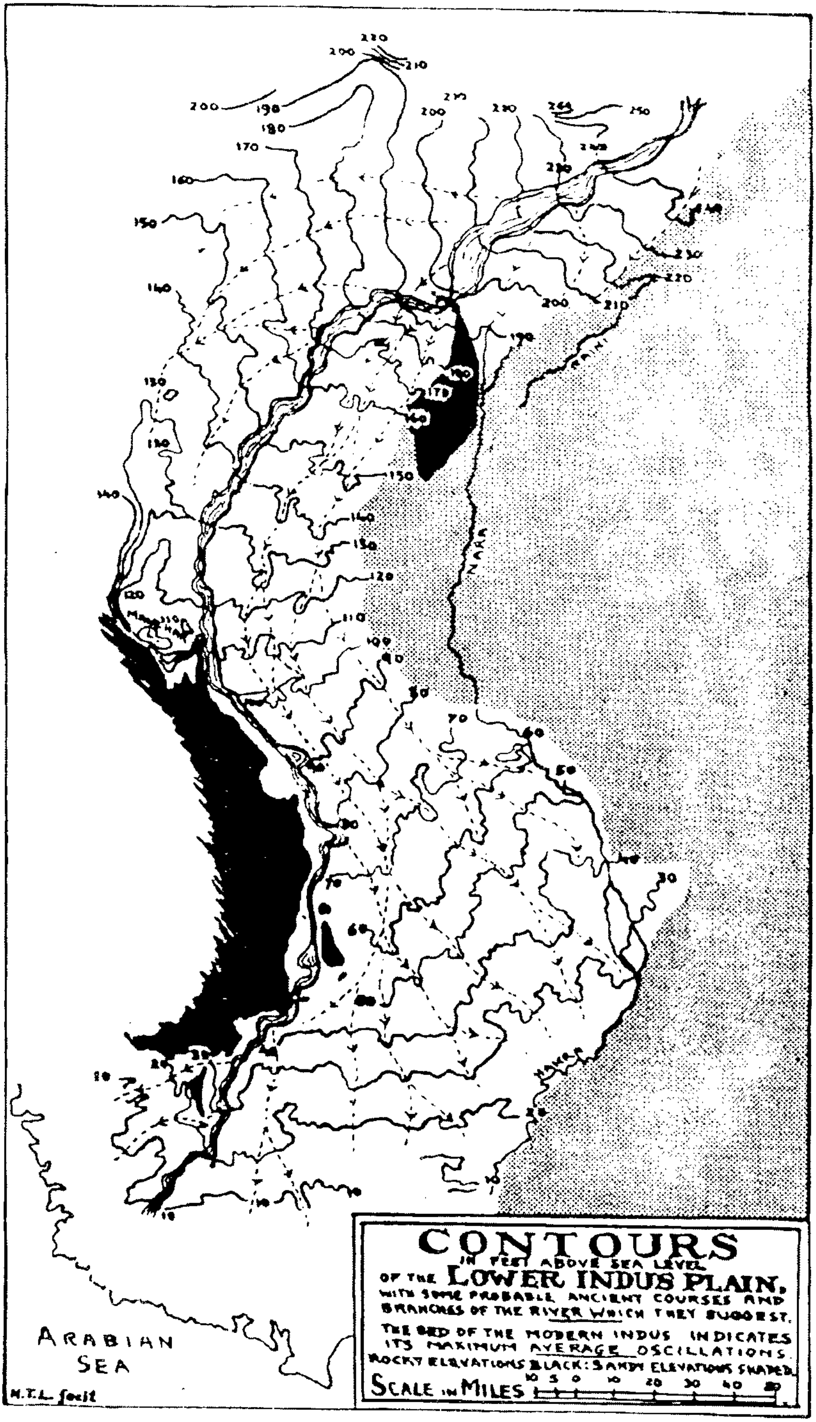
CONTOURS
IN FEET ABOVE SEA LEVEL
OF THE LOWER INDUS PLAIN,
WITH SOME PROBABLE ANCIENT COURSES AND BRANCHES OF THE RIVER WHICH THEY SUGGEST.
THE BED OF THE MODERN INDUS INDICATES ITS MAXIMUM AVERAGE OSCILLATIONS.
ROCKY ELEVATIONS BLACK: SANDY ELEVATIONS SHADED.
SCALE IN MILES
ARABIAN SEA
NARA
EAIN
H.T.L. fecit

باب چوتھا

سندھ کا پہاڑی علاقہ

سندھ کا تمام غربی پہاڑی علاقہ۔ بشمول اُن بلندیوں کے جو جگہ جگہ سندھ کے میدانوں میں اُبھری ہوئی الگ الگ نظر آتی ہیں۔ تقریباً اُن چٹانوں سے بنا ہے جو ارضی تعمیر کے عہدِ سوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اِن میں سے اکثر و بیشتر اُن ذرات سے مل کر بنی ہیں، جنھیں پانی نے بہا کر جمع کیا، یعنی پانی ذریعہ تشکیل ہے۔ سمندری حشرات اور گھونگے جب ایک جگہ جمع ہو گئے تو وقت گذرنے کے ساتھ اُنہوں نے چونے کے پتھر کی شکل اختیار کر لی۔ ایسی مخلوق عہد عتیق کے سمندروں میں جس تیزی کے ساتھ افزائش نسل کرتی تھی اُس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ کے ابتدائی ایام سے جزیرہ نمائے ہند ایک خشک زمین کی حیثیت سے موجود رہا۔ لیکن سندھ اور مغرب قریب کا علاقہ زیادہ تر سمندر کے پانی میں ڈوبا ہوا تھا، علاوہ چند اہم مقامات کے اور یہ صورت اُس زمانہ تک قائم رہی جسے ماہرین علم الارض عہد سوم کا قدیم ترین عہد شمار کرتے ہیں۔

زمین کی سب سے آخری اوپری سطح کی تعمیر و تشکیل کے زمانہ کے اختتام سے اُس وقت تک جسے علم الارض کی زبان میں عہد جدید کہا جاتا ہے۔ سندھ کا خطہ زمین کے کن انقلاب سے گذرا ہے اُس کا ایک خاکہ ماہرین ارضیات نے اِس بنیاد پر قائم کیا ہے کہ کونسی ارضی تہہ میں کس قسم کے جانداروں کے پتھرائے ہوئے انڈے اور اجسام موجود ہیں۔ یا موجود نہیں ہیں۔

سمندر کی تہہ میں کئی ہزار فٹ نیچے تک خورد بینی سمندری مخلوق کے مُردہ اجسام کی تہہ پر تہہ جمع ہوتی رہی، جو کرہ ارض سے زمین کے وسیع و عریض ٹکڑے کی شکل میں سطح سمندر سے کافی بلند ہوگئی۔ ایک مخصوص حرکت مشرق سے مغرب کی سمت قابل ذکر ہے۔ جس کا اثر

یہ ہوا کہ جمی ہوئی تہہ اطراف سے سمٹتی رہی اور یکساں سطح بلند و پست ہوتی رہی۔ سندھ میں پہاڑی سلسلوں کا شمالاً جنوباً واقع ہونا اِسی سبب سے ہے، جس سطح کو اطراف سے دبایا گیا، اُس پر قوس کی شکل میں اُبھرے ہوئے پہاڑی سلسلے اُس سطح کی جُھریاں ہیں جو حالیہ ارضی بناوٹوں کی موجودگی کی وجہ سے بدلی ہوئی نظر آئی ہیں۔ اِن قوس نما بلند جُھریوں کی پوٹیوں سے باریک اجسام ٹوٹ ٹوٹ کر جُدا ہوتے رہے اور سخت، ٹھوس چونے کا وہ پتھر نمایاں ہوگیا جسے پتھرائی ہوئی باریک سمندری مخلوق کی باقیات کہا جاسکتا ہے۔

تقریباً تمام معروف پہاڑی سلسلے اِسی طبعی کیفیت سے تعلق رکھتے ہیں، اِن میں بلند ترین اور طویل ترین کوہستان کھیر تھر (Khirther) ہے۔ یہ ڈیڑھ سو میل لمبا ہے اور شروع سے آخر تک پانی کے بہاؤ کے لئے حدِ فاصل ہے، سوائے ایک مقام کے جو اِس سلسلہ کے درمیان میں ہے۔ یہاں گاج نائے (Gaj Nay) ایک ناقبل گذر تنگ نائے کے ذریعہ ایک طرف سے دوسری طرف نکلتا ہے، اگر میدانی علائقہ سے اِس کوہستانی سلسلہ پر نظر ڈالی جائے تو ایک فصیل معلوم ہوتا ہے۔ ڈیڑھ سو میل طویل سلسلہ میں صرف آٹھ دس مقامات ایسے ہیں جہاں سامان سے لدے ہوئے اونٹ اِس سلسلہ کو پار کر کے دوسری طرف جاسکتے ہیں اِن میں سے آدھے راستے ایک دوسرے سے قریب واقع ہیں۔ جنوب میں منچھر جھیل کے عرض البلد کے قریب کھیر تھر سلسلہ کی بلندی تقریباً پانچ ہزار فٹ ہے جو بظاہر سندھ کی قدرتی سرحد معلوم ہوتا ہے۔

اِس سلسلہ کوہستان کی خاص چیز جو پہلی نظر میں انسان کو متوجہ کرتی ہے، وہ اِس کے پتھروں کا پیلا رنگ ہے، ہلکا مٹیالا، فاختئی بلکہ سفیدی مائل، اوپر کی مٹی بُھر بُھر کر گر جانے کے بعد پتھر کی جو سطح نکلتی ہے۔ جیسا کہ نئینگ وادی سے اوپر گوزبانی (Gozbani) کے علائقہ میں بڑے پیمانہ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ بالکل چاک مٹی کی طرح سفید نظر آتی ہے۔ کھیر تھر کا شمالی حصہ عوام الناس میں دراصل "اچھو جبل (Achho Jabal) کے نام سے مشہور ہے، یہاں سلسلہ کے اطراف میں جو چٹانیں ہیں بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں اور

اپنے گہرے رنگ کی وجہ سے صاف طور پر مختلف معلوم ہوتی ہیں۔ کھیر تھر کا چونے کا پتھر سطح کی صفائی اور ٹھوس پن کی وجہ سے ممتاز ہے۔ سلسلہ کے شمالی سرے سے تھوڑا پہلے میاں گن (Miangun) کی بلندیوں پر یہ خوبی نہایت خوبصورتی کے ساتھ عیاں ہے۔ یہاں سے نیچے کی طرف مشرق میں بلندی کا چھوٹا سلسلہ چلا گیا ہے۔ جو اصل سلسلہ کے تقریباً متوازی ہے، اور مشرق سے مغرب کی طرف ایک نصف اُبھار والا قوس بن جاتا ہے، اِسی طرح بلندی و پستی کے یہ ادھورے دائرے کھیر تھر سلسلہ کے بلوچستانی سمت تک چلے گئے ہیں۔ یہاں سے بارش کے زمانہ میں کھینجی نائے (Khenji Nai) کا بہاؤ شروع ہوتا ہے۔

یہاں سے جنوب کی طرف کچھ فاصلہ پر ایک دوسری پہاڑی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور مچل (Machal) اور رنگو (Rangu) کی چوٹیوں سے بھی آگے تقریباً دس میل تک چلا گیا ہے۔ یہ مندرجہ بالا سلسلے کے مقابل ٹوٹے پھوٹے نیم دائروں اور نشیب و فراز کو پیش کرتا ہے۔ یہاں یہ سلسلہ مغرب کی طرف گھوم جاتا ہے، اور مشرق کی سمت سے آنے والے سلسلے سے کافی اونچا نظر آتا ہے، مزید جنوب کی طرف چٹانیں اس سلسلہ کی چوٹیوں کی بلندی کے قریب افقی حیثیت میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جس کی وجہ سے لکھانی (Lakhani) اور ڈاڑھیارو (Darhyoro) کے مقام پر ایک چھوٹی سطح مرتفع بن گئی ہے۔ ڈاڑھیارو پر تقریباً ایک مربع میل ہموار زمین موجود ہے جس پر کھیتی باڑی کی جا سکتی ہے اور یہ چھوٹا میدان تقریباً چھ ہزار فٹ کی بلندی پر چاروں طرف سے چٹانوں سے گھرا ہوا ہے۔ اِس پہاڑی سلسلہ کی چوٹیوں پر اِسی طرح کے چھوٹے قطعات چٹانوں کے درمیان پائے جاتے ہیں جن کو کھیتی باڑی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

"کتے جی قبر (Kute-je-Qabar) اُس ۶۸۷۷ فٹ بلند بڑی چوٹی کا نام ہے جو ڈاہاڑرو سطح مرتفع کے فوراً جنوب میں واقع ہے۔ یہ چوٹی اِس پہاڑی سلسلہ کی عام بلندی سے تقریباً ایک ہزار فٹ اونچی ہے، بالائی سندھ علاقہ میں یہ ایک ممتاز نشانِ ارض

ہے جو بہت دور سے نظر آتا ہے۔ لیکن تقریباً دس میل جنوب میں اِس سلسلہ کی واضح ترین بلندی" کوری جی مٹ (Kori-je-Mut) واقع ہے۔ یہ بلندی مذکورہ" کتے جی قبر" سے صرف تین سوفٹ کم ہے، اِس مقام سے آگے یہ سلسلہ یک لخت پستی کی طرف چلا جاتا ہے اور ھرباب (Harbab) کے مقام پر تقریباً دو ہزار فٹ نیچی سطح اختیار کر لیتا ہے۔ اِس پہاڑی سلسلہ کو پار کرنے کے لئے جو اونٹوں کے قافلوں کے راستے سندھ اور بلوچستان کے درمیان موجود ہیں اُن میں سے شمال کی جانب آخری راستہ ھرباب سے ہی گذرتا ہے۔ ملحقہ میدان سے قریب جو تنگ درّہ شاہ گودڑا (Shah Godiryo) کے نام سے مشہور ہے۔ ۳؎ وہی نام اِس راستہ کا بھی ہے۔

ھرباب کے جنوبی سمت یہ پہاڑی سلسلہ ۷۱۱۲ فٹ بلند ہو جاتا ہے۔ یہ سندھ کا بلند ترین مقام "بندے جی قبر" (Bande-je-Qabar) کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں سے دوسرے بلند مقام کچرک (Kachrak) تک کھیرتھر کا دوہرا پہاڑی سلسلہ ہے۔ مغربی سلسلہ اصل سلسلہ ہے اور بلند تر ہے، جبکہ مشرقی سلسلہ تقریباً ایک ہزار فٹ نیچا ہے، اِن دونوں سلسلوں کے درمیان کڑھائی نما گہرائی عام طور پر ایسی چٹانوں سے ڈھکی ہوئی ہے جو اپنی قدامت کے اعتبار سے ارضیات کے عہد سوم (Tertiany Perood) سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ جبکہ ناری (Nari) کے نام سے مشہور ہے اور مخالف تھر.بی عمل نے چٹانوں کو مٹی میں تبدیل کر دیا ہے۔

چند میل جنوب کی طرف گاج نائے (Gaj Nai) اِس پہاڑی سلسلہ کے اندر مشرق کی طرف بہتی چلی گئی ہے۔ کھیرتھر کے چونے کی پتھروں کے درمیان اِس کا راستہ تنگ ہے اور دونوں طرف عمودی کنارے ہیں۔ یک لخت بہاؤ کے سامنے چٹانوں کے حائل ہونے کی وجہ سے راستہ مسدود ہو گیا ہے، اور پانی ایک تنگ نائے سے نکلتا ہے جس کے دونوں طرف درّے ہیں۔

کھیرتھر کے شمال نصف کی تفصیلات آپ کے سامنے پیش کی گئیں جسے مشرق کی طرف

سے نوکیلی پہاڑیوں کے ایک سلسلہ نے گھیرا ہوا ہے۔ یہ پہاڑیاں قدامت کے اعتبار سے ارضیات کے عہد سوم کے اُسی زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جس کا بیان پہلے ہی کیا جا چکا ہے۔ یعنی چونے کے پتھروں کے اوپر پتھرائے ہوئے سمندری اجسام کی تہہ کا جس زمانہ سے تعلق ہے۔ یہ پہاڑیاں سلسلۂ ناری (Nari) کہلاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر چونے کے پتھروں پر مشتمل ہیں جن کا رنگ پیلا اور بھورا ہے اِن پتھروں کے درمیان ریت اور گھونگے کے پتھروں کی باریک تہیں موجود ہیں۔ گو پتھروں کا زیادہ حصہ ریت سے بنا ہوا ہے اِن پہاڑیوں کا حد سے زیادہ کھُردراپن اِن کی ٹھوس طبعی بناوٹ کی بدولت ہے۔ مختلف چٹانوں پر موسم کا اثر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ کہیں چکنا پتھر ہے تو کہیں چٹان تڑخ گئی ہے۔ کسی جگہ پتھر کی تہیں الگ الگ ہوگئی ہیں۔ یہ پہاڑیاں بارش کے پانی کے بہاؤ سے بھی بہت متاثر ہوئی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے چشمے جو کھیر تھر کے مشرقی ڈھلوانوں سے جاری ہوتے ہیں، اِس پہاڑی سلسلہ سے بھی گذرتے ہیں۔ بلندترین پہاڑی تین ہزار فٹ اونچی ہے۔ گاج (Gaj Group) کی پہاڑیاں مشرق کی طرف اِن پہاڑیوں سے تقریباً ملی ہوئی ہیں۔ قدامت کے اعتبار سے سندھ میں گاج گروپ دوسرے نمبر پر ہے۔ گاج کے پہاڑی علائقہ میں چونے کا سخت پتھر جو سیاہی مائل بھورے رنگ کا ہے خاص طور پر نمایاں ہے، یہ چٹانیں سب سے پہلے کھینجی نائے (Khenji Nai) کے شمال میں بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور نمایاں ڈھال کے ساتھ مغرب کی سمت چلی گئی ہیں۔ بہر نوع بیشتر چٹانیں مٹی اور کوکلوں سے بنی ہیں، مزید جنوب کی طرف یہ ایک علیحدہ پہاڑی سلسلہ کی شکل اختیار کرلیتی ہیں۔ جس میں امرو (Amru) اور ہاشم (Hashim) جیسی چوٹیاں ہیں اور انتہائی بلندی ۲۷۰۰ فٹ ہے۔

کھیر تھر کے بیرونی کناروں پر جو پہاڑیاں ہیں وہ سندھ میں سب سے کم عمر کی شمار ہوتی ہیں اور انھیں سلسلہ منچھر (Manchar) کہا جاتا ہے۔ یہ چٹانیں مٹی، ریت اور کیچڑ سے بنی ہیں اور اِن کے اندر چونے کے پتھر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بھی پیوست ہیں اور

بہت بڑے علاقہ میں پھیلی ہوئی ہیں۔ان کی بلندی کم ہے۔چنانچہ انہیں بلندز مین یا ٹیلے کہا جاسکتا ہے۔ان میں جگہ جگہ برساتی نالوں نے بڑے بڑے شفاف ڈال دیئے ہیں۔ان کی بالائی سطح سندھ کے دریائی مٹی کے میدان سے یک لخت بلند ہوگئی ہے۔

ایک سلسلہ کی شکل میں اگر یہ واضح ہے تو اپنی بلندی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نوکیلے پن کی وجہ سے ہے۔ویسے مازرانی (Mazarani) اور دادر نائے (Dadar Nai) کے درمیان ککاریو (Kakario) نام کی ایک چوٹی خاصی ممتاز ہے اور تقریبا ۱۸۰۰ فٹ بلند ہے۔منچھر سلسلہ کی دو متوازی شاخوں میں، مغربی (یعنی بیرونی) شاخ سے یہ چوٹی اُبھرتی ہے۔منچھر سلسلہ کی دو متوازی شاخوں میں مغربی (یعنی بیرونی) شاخ سے یہ چوٹی اُبھرتی ہے۔اِن دونوں شاخوں کے درمیان قوسی نشیب دریائے مٹی سے بھرا ہوا ہے۔

یہ پہاڑیاں جو "بان (Ban) کہلاتی ہیں اُن میں ندیوں کے تیز بہاؤ کی وجہ سے جگہ جگہ شگاف پڑ گئے ہیں کیونکہ یہ ندیاں بلند علاقوں کا تمام کثیر المقدار پانی کھینچتی ہیں، بارش کے بعد تنگ مقامات سے بھاری مقدار میں پانی گذرتا ہے اور اکثر اوقات کافی آگے میدانوں میں تباہی مچاتا ہے لیکن عام حالات میں اکثر ندیاں بڑے سے بڑے سیلاب کے عالم میں بھی پہاڑی علاقہ سے باہر نہیں نکلتیں۔البتہ گاج نائے (Gaj Nay) کا پانی اکثر میدانوں تک پہنچ جاتا ہے۔تقریباً دس بارہ میل تک اِن چشموں میں بارہ مہینے پانی بہتا ہے جہاں مختلف قسم کے خوبصورت مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔یہاں آبشار ہیں، گہرے گڈھے ہیں، پتھروں کے درمیان تیز بہاؤ کے مقامات ہیں۔مختصر جھیلیں جن کے کناروں پر چٹانیں جھکی ہوئی ہیں۔وادی ایسے مقامات پر کشادہ ہوگئی ہے۔پانی کی چھوٹی چھوٹی نالیاں ندیوں کے کناروں کے ساتھ ساتھ کسی مقام پر چشمہ سے بلند مقام تک پہنچ گئی ہیں۔پھر یک لخت ایک دو ایکٹر ہموار زمین کی طرف مڑ جاتی ہیں اور اُسے سیراب کرتی ہوئی اُسی میں جذب ہوجاتی ہیں۔گاج کے شمال میں کھیرتھر کی بلندیوں سے جو ندیاں نکلتی ہیں وہ تعداد میں نو یا دس ہیں، اور پہاڑی علاقہ کے اندرونی راستے جو پیدل سفر کے لئے استعمال ہوئے

ہیں اِنھیں ندیوں کی وادیوں سے گذرتے ہیں یا اِن کی معاون شاخوں کے ساتھ ساتھ۔

گاج نے جس مقام پر کھیر تھر پہاڑی سلسلہ کو تقسیم کر دیا ہے اُس سے تقریباً ساٹھ میل جنوب تک اِس پہاڑی سلسلے اور ذیلی سلسلوں کی طبعی کیفیات تقریباً وہی ہیں جو اِس کے شمالی حصّہ کی ہم بیان چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اوسط بلندی بتدریج کم ہوتی چلی گئی ہے۔ تنگ نائے سے ملحق شمال میں کوہستانی سدِ آب چار ہزار سے بھی زیادہ بلند ہے۔ لیکن تین میل جنوب کی طرف چلئے تو یہ پانچ سو فٹ کم ہوگئی ہے اور یہ مقام شکلوئی کھنڈ (Shakloi Khand) کے نام سے مشہور ہے اور اونٹوں کے لئے آسان گذرگاہ ہے۔ گورگ (Gorag) (آجکل اسے گورکھ کہتے ہیں جو ضلع دادو میں ہے) کے مقام پر یہ سلسلہ پر ۵۶۰۰ فٹ بلند ہو جاتا ہے اور گاج کے جنوب میں اِسے بلند ترین چوٹی کہا جا سکتا ہے۔ اِس کے بعد میلوں تک سلسلۂ کھیر تھر کی چوٹی نوکیلی نہیں بلکہ کُشادہ ہے۔ اِس پر پتھر کی تہہ بالکل سیدھی اُفق کے متوازی پھیلی ہوئی ہے۔ اِس کے نیچے دونوں طرف نصف چوڑائی کے کنارے ساتھ ساتھ چلے گئے ہیں۔

مشرق کی طرف سے جو راستہ پہاڑ پر چڑھتا ہے وہ پھوسی (Phusi) کے مقام پر ساڑھے تین ہزار فٹ کے قریب بلند ہے لیکن ناری نائے (Nari Nai) کی بالائی وادی کے کشادہ ڈھلوان کی وجہ سے آسان ہے، پندرہ میل کے اندر پانچ گذرگاہیں موجود ہیں جن میں روہیل (Rohel) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اِس کے آس پاس پہاڑ کی بلندی کم ہو کر تین ہزار فٹ رہ گئی ہے۔ لیکن سلیمانی (Soleimani) کے مقام پر یہ پھر بلند ہو جاتا ہے، اور گرّو (Garro) کے مقام کی ایک چوٹی نمایاں ہوگئی ہے۔ یہ چوٹی دراصل خاص سلسلہ کی ایک چوڑی شاخ پر ہے جو شمال مشرقی سمت ڈھلتی چلی گئی ہے۔ بالآخر اِس نواح میں یہ پہاڑی سلسلہ جنوب اور جنوب مشرق کی سمت بڑھتے ہوئے اپنی حدِ اختتام پر پہنچ جاتا ہے۔ سلیمانی کے جنوب میں ایک درّہ ہے جو خاصا استعمال میں ہے اِسے گاڑلک (Garre Lak) کہتے ہیں اور یہ سندھ کی طرف سے انگئی نائے (Angai Nai) تک جاتا

ہے۔اِس طرح سے ہم منچھر جھیل کے عرض البلد تک پہنچ جاتے ہیں جس کے جنوب میں سندھ کی پہاڑی تنظیم بہت پیچیدہ ہو جاتی ہے، اِس پر غور کرنے کے لئے ہمیں اِس کے آبی راستوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا، شمالی علاقوں میں بھی اور جنوبی میں بھی۔ کیونکہ کم از کم اِس مقام پر ہمیں ایسی پہاڑی بلندیوں کا سامنا ہے جو مشرق سے مغرب کی سمت پھیلی ہوئی ہیں اور دونوں طرف کے پانی کے لئے سدِ آب کا کام دیتی ہیں۔

چنانچہ پہلے مشرقی سمت کو لیجیئے۔سلیمانی سے آگے دور تک بھوری پہاڑیوں اور وادیوں کا پیچیدہ سلسلہ پھیلا ہوا ہے جن کے درمیان انگئی (Angai) ندی بہتی ہے۔یہاں ہماری نظریں کھیرتھر سلسلہ کی ایک آخری پہاڑی پر ٹھہر جاتی ہیں جو پہلے چونے کے پتھر سے بنی ہے کُل فاصلہ جس کا ہم نے جائزہ لیا بارہ میل ہے اور یہ سلسلہ بھٹ (Bhit) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔یہ ایک کشادہ قوسی اُبھار ہے جس کی چوٹی تقریباً مسطح ہے۔اِس کا بلند ترین مقام دو ہزار سات سوفٹ اونچا ہے، جنوب کی طرف تقریباً بیس میل تک چلے جانے کے بعد یہ کیرتھر کے بڑے سلسلہ سے مل جاتی ہے۔اب بھٹ کی بلندی کے مشرقی کنارے پر آیئے۔ہماری نظر نیچے پھیلی ہوئی نئینگ نائے (Naing Nai) کی وادیء پر پڑے گی، جس کا بالائی حصہ انتہائی پتھریلا اور زیریں حصہ دریائی مٹی سے بنا ہے۔یہ وادی سامنے کی سمت میں بھی منچھر سلسلہ کی پہاڑیوں تک چلی گئی ہے، اِس جگہ دریا ننگ نائے (Naing Nai) تقریباً تیس میل شمال کی طرف بہنے کے بعد جنوب کی طرف مُڑ جاتا ہے اور منچھر جھیل میں داخل ہو جاتا ہے جس کے نام پر اِن پہاڑیوں کا نام بھی منچھر سلسلہ ہو گیا ہے۔

نئینگ وادی (Naig Valley) کے مشرق میں بڈرو (Badro) پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں جو شمالاً جنوباً تقریباً تیس میل لمبی ہیں۔اِن کی بلندی دو ہزار چار سوفٹ ہے۔یہ کشادہ قوسی ابھار ہے۔یہ پہاڑی سلسلہ سمندری حشرات کے پتھرائے ہوئے اجسام سے وجود میں آیا اور دور سے وہیل (Whale) مچھلی کی پشت معلوم ہوتا ہے یہ جگہ جگہ آبی راستوں کی وجہ سے کٹا پھٹا ہے، اِس کی ظاہری شکل مری بگٹی (Marri-Bugti)

علاقہ کے سرطاف (Sartaf) سے مشابہ ہے، کھیر تھر کے اختتام سے تقریباً دس میل پہلے بڈرو سلسلہ اِس سے مل جاتا ہے جہاں یہ پتلی گردن معلوم ہوتا ہے۔ اِس کے درمیان درۂ دارنگ (Darang) واقع ہے۔

بڈرو کے درمیانی حصہ سے ایک بار پھر مشرق کی سمت چلتے ہیں یہاں ہم بندھنی (Bandhani) کی کشادہ وادی میں اتر جاتے ہیں، یہاں ایک اور ندی شمال کی سمت بہتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جو منچھر جیل میں گرتی ہے اِس وادی کا خاصہ بڑا حصہ دریائی مٹی سے بنا ہے۔ لیکن بے ہنگم طریقہ پر اُبھری ہوئی پہاڑیوں اور چٹانوں سے اِس کی سطح خراب ہوگئی ہے۔ اِس کے سامنے والے کنارے کے ساتھ ساتھ نیچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں اور کھیر تھر کے چونے کے پتھر کا ایک اور قوسی اُبھار نظر آتا ہے جو شمال سے جنوب میں پھیلا ہوا ہے اور لکی (Laki) پہاڑ کہلاتا ہے۔ بندھنی نائے جو شمال میں بہتی ہے اُس کے آبی علاقہ کو جنوب میں بہنے والی ندیوں کے آبی علاقہ سے جُدا کرنے والی بلندی ملیری (Maliri) کے مقام پر ہے۔ اِسی نام سے ایک مختصر پہاڑی سلسلہ بھی ہے جس کے دونوں طرف اِس کے متوازی پہاڑی سلسلے ہیں۔

جنوب کی طرف ڈھلوانی علاقہ کا جائزہ لینے کے لئے ہم کھیر تھر پہاڑی سلسلہ پر لوٹتے ہیں یہاں ہمیں نوکیلا قوسی اُبھار میہی (Mehi) پہاڑی کے نام سے دکھائی دیتا ہے۔ اِس کے جنوب مغرب میں یعنی کھیر تھر اور بھٹ سلسلوں کے اتصال سے کوئی چھ میل دور ایک اور پہاڑی ہے، گز (Gaz) اور دمبار (Dumber) نام کے نیچے اور کشادہ یہ دو پہاڑی سلسلے میہی پہاڑی کو ایک وادی کے جنوب تک طویل کر دیتے ہیں۔ طبعی اعتبار سے گز اور دُمبار بھی پہاڑی سے مشابہ ہیں، میہی اور کھیر تھر کے درمیان سے شروع ہوکر باران ندی (Baran Nadi) اپنا نوے میل کا سفر کرتی ہے اِس کے بہاؤ کا راستہ عام طور پر جنوب اور جنوب مشرق کی سمت ہے، یہ کیر تھر کے آخری سرے پر مشرق کی طرف مُڑ جاتی ہے، یہاں کیر تھر ایک عظیم قوسی ابھار کی شکل رکھتا ہے۔ جس کے کنارے سپاٹ عمودی اور اونچائی

تین ہزار تین سوفٹ ہے۔ کھیرتھر کے اس جنوبی سرے کے مشرق میں ایک پتھریلی وادی ہے جو کشادہ تو ہے لیکن ہر جگہ اس کی حالت یکساں نہیں ہے۔ اس میں شدید بارانی پانی کے آبی راستے ہیں جو باران ندی سے ملتے ہیں۔ اگر ان میں سے دو آبی راستوں کے اخراج کی طرف چلتے رہیں تو ہم درہ دارنگ (Darang) اور ملیری (Maliri) سر آب تک پہنچ جائیں گے جن کا پہلے ہی ذکر آ چکا ہے۔ اس کا مشرقی حصہ ڈپھڑو (Daphro) پہاڑیوں کے سلسلے تک چلا گیا۔ یہ پہاڑیاں کھیرتھر کے چونے کے پتھروں کا ایک ٹوٹا پھوٹا قوسی ابھار ہیں۔ اور عموماً شمالاً جنوباً واقع ہیں۔ پہاڑیوں کا یہ سلسلہ جو کافی مختصر ہے تقریباً دو ہزار فوٹ بلند ہے۔ اور بلکل قریب مشرق میں واقع لکی سلسلہ سے بہت قریب ہے۔ پوکھران (Pokhran) سے رنی کوٹ (Rani kot) تک اس میں ایک درہ ہے۔ رنی کوٹ کا قلع لکی پہاڑیوں کے درمیان ایک میدان میں واقع ہے، جسے تالپور حکمرانوں کا قلعہ کہا جاتا ہے۔ اس مقام پر جو لکی سلسلہ کے قریب قریب درمیان میں ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان سے موہن نائے (Mohen Nai) نمونے گذرتی ہے، اور گاج کھیرتھر میں جس سے گذرتی ہے اس سے کسی حد تک مشابہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہاڑی سلسلہ کا شمالی حصّہ لکی (Laki) کے نام سے مشہور ہے جبکہ باقی حصّوں کے نام الگ الگ ہیں بہرنوع لکی کے مشرق میں کٹی پھٹی زمین کا ایک وسیع قطعہ ہے اور منظر کے لحاظ سے قطعاً بے کیف ہے اِس کے آگے دریائے سندھ بہتا ہے اور درمیان میں دریائی مٹی کی بنی ہوئی ایک تنگ پٹی ضرور موجود ہے۔

علم ارضیات کے لئے لکی پہاڑیوں میں سندھ کے دوسرے مقامات کی نسبت سے دلچسپی کا بہت سامان موجود ہے۔ زمین کے اطرافی دباؤ اور حرکت نے نہ صرف یہ کہ اِس قوسی اُبھار کو توڑ دیا ہے بلکہ مشرقی سمت میں دھکیل کر سیدھا کر دیا ہے، اور کسی مقام پر اِس میں نشیب اور گڑھے پیدا کر دیئے ہیں۔ اِسی ارضی حرکت کی بدولت مغربی حصّہ اونچا ہو گیا ہے اور دونوں حصّوں کے درمیان چٹانیں اُبھر آئی ہیں۔ یہ چٹانیں اُسی مواد کی پیداوار ہیں جو کھیرتھر کے نیچے موجود ہے۔ اِن میں قدیم ترین چٹانیں ارضی تشکیل کے اُس عہد سے تعلق

رکھتی ہیں جب کہ چاک مٹی کی چٹانی تہہ نے وجود اختیار کیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایک تہ پگھلی ہوئی چٹانوں کی بھی موجود ہے جسے "دکن ٹریپ (Daccan Trap) کہا جاتا ہے، یہ لاوا اُس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جس میں رنی کوٹ کی نچلی تہ میں دریائی مٹی نے زمین کو تشکیل دیا۔ کوٹری کے شمال مغرب میں لیلاآن (Leilan) کے آس پاس بھی زمین کی ایسی ہی تہہ کے بڑے بڑے ٹکڑے موجود ہیں، لیلان کے مقام پر بھورے رنگ کے کوئلے کے ذخیرے تقریباً ایک صدی قبل دریافت ہوئے تھے۔ اور ایسے ہی ذخیرے کچھ آگے جنوب میں بھی ملے تھے۔

لکی پہاڑ کی بلند ترین چوٹی دو ہزار تین سوفٹ اونچی اور سلسلہ کے شمالی سرے پر واقع ہے، بیچ بیچ میں جنوب تک کئی چوٹیاں ملتی ہیں جو دو ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں، اِس پہاڑی سلسلہ کے جنوبی نصف حصہ کے مغربی کنارے پر بارن نائے (Baran Nai) ایک کشادہ وادی میں بہتی اور اِس پہاڑی سلسلہ کو کاٹتی ہوئی جنوب مشرق کی سمت مُڑ جاتی ہے۔ اِس کے ایک کنارے پر سرجانو (Sarjano) پہاڑی رہ جاتی ہے۔ جس کا سلسلہ جنوب مغرب میں درواٹ (Darwat) کے درّہ تک چلا گیا ہے۔ پتھریلی بلند زمین میں تقریباً تیس میل کا راستہ طے کرنے کے بعد بارن نائے دریائے سندھ سے مل جاتی ہے لیکن اِس کا پانی پہاڑیوں سے باہر نہیں نکلتا تاوقتیکہ طغیانی نہ آجائے۔

لکی پہاڑی سلسلہ کے مقابل اور وادی بارن کے دوسرے کنارے پر کامبھو (Kambhu) پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہ بھی کھیرتھر کی طرح چونے کے پتھر کا ایک بڑا قوسی اُبھار ہے جو تقریباً بیس میل لمبا اور دو ہزار تین سوفٹ اونچا ہے، کامبو کے اختتامی سرے سے آگے جنوب مغرب کی سمت الگ الگ پہاڑیوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ یہ بھی کامبھو جیسے مواد سے ہی بنا ہے، یہ سلسلہ کارا (Kara) نامی چوٹی تک ختم ہو جاتا ہے جو کراچی اور حیدرآباد کے درمیان واقع ہے۔

اِس سلسلہ کے مغربی حصہ کی پہاڑیوں جو حب (Hab) ندی کی وادی سے ملحق ہیں ایسی چٹانوں سے بنی ہیں جن کا تعلق تشکیل ارضی کے عہد سوم کے اختتامی دور سے ہے، اِن دو پلیٹیو یعنی (Plateaux) مول (Mol) اور میہر (Mehar) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ کئی میل چوڑے ہیں اور مشرق شمال اور مغرب میں پھیلے ہوئے علاقہ سے یک لخت ایک ہزار فٹ بلند ہو گئے ہیں اِن کے کنارے شدید ڈھلوان اور کٹے پھٹے ہیں۔ جنوب کی طرف یہ پلیٹو بتدریج ڈھلتے چلتے گئے ہیں، یہ دونوں بلندیاں " گاج " (Gaj) کے دامن میں اُفقی حیثیت میں پھیلے ہوئے ہیں اور ناری (Nari) سے متصل ہیں۔ تین مذکورہ اطراف میں اِنھیں پانی نے کاٹ دیا ہے ہر ایک کے درمیان میں ہلکا سا قوسی نشیب ہے اور جنوب کی طرف بہنے والی ایک ندی اِس نشی کا پانی سینچ کر لے جاتی ہے۔ یہ ندی پندرہ سو فٹ بلند میہر پہاڑی سے شروع ہوتی ہے، اور فوراً ہی شمال کی طرف گھوم کر دونوں سطح مرتفع کے درمیان سے گذرتی ہوئی حب ندی سے مل جاتی ہے، مول ندی دو ہزار فٹ بلند مقام سے شروع ہوتی ہے اور جنوب کی سمت بہتی رہتی ہے اور " کھدے جی " (Khadiji) سے مل جاتی ہے یہ متحدہ چشمہ جو عرف عام میں ملیر (Malir) کے نام مشہور ہے، کراچی کے مشرق میں واقع گذری (Gizri) کے مقام پر سمندر میں گر جاتا ہے۔

پہاڑی علاقہ کا یہ وسیع ٹکڑا جس کا ڈھال جنوب کی طرف ہے اُس ٹکڑے سے جو شمال کی طرف ڈھل گیا ہے، بہت زیادہ کشادہ ہے۔ پہاڑیاں حسب معمول شمال سے جنوب کی طرف پھیلی ہوئی ہیں جبکہ جنوب مغرب میں اِن کا پھیلاؤ زیادہ تر جنوب یا جنوب مغرب ہے۔ جیسے جیسے اِس سمت میں آگے بڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اِن کی اوسط بلندی بتدریج کم ہو رہی ہے، اِن کے درمیان بے ڈھنگے پتھریلے میدان ہیں جو کافی چوڑے ہیں، اِن میں کہیں کہیں چٹانیں بھی نکلی ہوئی ہیں، کسی کسی جگہ دریائی مٹی کی زمین کے بھی خاصے بڑے ٹکڑے موجود ہیں۔ حب ندی کے پار لسبیلہ (Lasbela) کی پہاڑیاں بہت زیادہ بلند ہو گئی ہیں۔

اِن کے ڈھلوان تقریباً عمودی ہیں اور پہاڑیوں کی لمبائی سندھی پہاڑیوں سے زیادہ ہے، لیکن اِن کی بناوٹ اور طبعی کیفیات یکساں ہیں، اور یہ سندھی پہاڑیوں کے متوازی پھیلی ہوئی ہیں۔

سندھ کوہستان کے جنوبی مشرقی نواحی علائقہ کا خاکہ بے ترتیب ہے جبکہ جنوب مغربی علائقہ کا اِس سے بہتر ہے، اِس میں چٹانی بلندیاں بھی بے ڈھنگے پن سے نکل آئی ہیں، یہ علائقہ تشکیل کے اعتبار سے رنی کوٹ کے ضمن میں آتا ہے، اِس میں بہت سے چمکدار خول (کوکلے) اور کچھ سیاہ رنگ کے ریت کے پتھروں میں لوہے کی مقدار بھی شامل ہے اور لال رنگ کے آہنی پتھر پائے جاتے ہیں، اِس علائقہ کے کناروں پر کھلے مقامات میں ایسے ڈھانڈ موجود ہیں جن میں تمام سال پانی موجود رہتا ہے، مثلاً سونہری (Sonahri) کینجھر (Kinjhar) اور ہالیجی (Haleji)۔ پہاڑی ندیاں اِن میں پانی پہنچاتی ہیں لیکن کہیں دریائے سندھ کا پانی بھی پہنچ جاتا ہے۔

اِس پہاڑی علائقہ کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد دو خصوصیات سامنے آتی ہیں، نمبر ایک پتھریلے ڈھلوان جو کہیں کہیں دو سے چار میل تک چوڑے ہیں اور یہ پہاڑی کی بنیاد کے پاس اِس طرح واقع ہیں کہ درمیان میں آنے والی وادی کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ ندی نکلنے کے مقام پر اِن ڈھلوانوں کی سطح زیادہ سے زیادہ دبیز ہے اور ندیاں عموماً اِن کی سطح سے کافی گہرائی میں بہتی ہیں۔ بجری اور کنکر کے ایسے تودے " گاج ندی " کے نزدیک کئی تنہا پہاڑیوں اور ٹیلوں پر بھی ملیں گے۔ اِن کی بے حد بڑھوتری کا سبب شاید بارش کا فقدان ہے۔ کیونکہ جو معمولی بارش ہوتی ہے اُس کے پانی میں بس اتنی ہی قوت مشکل سے ہوتی ہے کہ وہ کنکروں پتھروں کے عمودی ڈھلوانوں کی جڑ تک پہنچ سکتا ہے۔

نمبر دو خصوصیت جو اکثر مقامات پر موجود ہے گندھک کے گرم چشمے ہیں۔ اِن میں سے دو چشمے جو بہت مشہور ہیں کراچی کے قریب منگھو پیر کے مقام پر ملیں گے، اِن کا درجۂ حرارت ۱۲۷ ڈگری فارن ہائٹ ہے، دوسرے اہم چشمے لکی (Laki) تو تنگ

(Taung) نئینگ (Naig) غازی شاہ (Ghazi Shah) اور سندھ کی شمالی سرحد سے آگے پیر لاکھا (Pir lakha) کے مقام پر واقع ہیں۔ گھارو (Gharo) کھاڑی کے دہانے کے نزدیک واگھودر (Waghodar) کے مقام پر بھی ایک چھوٹا گندھک کا چشمہ ہے۔ اِن میں بہت سے چشمے کثیر مقدار میں چونے اور چاک کو جمع کر دیتے ہیں۔

قبل اِس کے کہ ہم سندھ کے میدانی علائقہ میں الگ الگ واقع پہاڑیوں کے متعلق غور کریں جو بہر نوع مغربی سندھ کے خاص پہاڑی سلسلوں سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جنوب مشرقی کونہ میں واقع ایک تنہا پہاڑی کا جائزہ لیں۔ یہ پہاڑی ہر اعتبار سے مختلف ہے، اِس کا نام کارونجھر (Karunjhar) پہاڑی ہے اور یہ نگرپارکر (Nagar parkar) کے قریب ہے۔۵؎ ریتیلے میدان میں یہ پہاڑی یک لخت اُبھری ہوئی معلوم ہوتی ہے اور بارہ سو فٹ بلند ہے۔ اِس پر کھڑے ہوکر رن کچھ کا نظارہ کیا جا سکتا ہے، اِس میں کھردار سرُخ گرینائٹ پتھر شامل ہے۔ یہ پتھر اُس قبیل سے ہے جس کا تعلق ارضی تشکیل کے ابتدائی دور سے ہے۔ زمین کی بیرونی تہ کی قدیم ترین چٹانیں اِس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسی چٹانیں راجپوتانہ کے علائقہ میں زیادہ تر موجود ہیں اور طبعی اعتبار سے یہ علائقہ بھی راجپوتانہ سے تعلق رکھتا ہے۔

کسی قدر بعد کے زمانہ سے تعلق رکھنے والی پہاڑیاں جو الگ الگ بلندیوں کی شکل میں سندھ کے میدانوں میں نظر آتی ہیں مختلف وجوہات سے باعثِ دلچسپی ہیں۔ اِن کا سب سے لمبا سلسلہ سکھر سے تین میل شمال مغرب سے شروع ہوتا ہے اور روہڑی کے جنوب میں چالیس میل تک چلا گیا ہے۔ اِس کی زیادہ سے زیادہ چوڑائی پندرہ میل ہے۔ اِن پہاڑیوں میں جو چونے کا پتھر موجود ہے وہ سمندری حشرات کے پتھرائے ہوئے اجسام کے اجتماع سے وجود میں آیا ہے اور اُفقی حیثیت میں پھیلا ہوا ہے، مغربی سمت میں یہ پتھر گھس کر گول ہو گئے ہیں۔ میدانی سطح سے ان کی بلندی صرف دو سو فٹ ہے۔ اِن پہاڑیوں کے شمالی سرے کے قریب

دریائے سندھ اِن میں داخل ہوگیا ہے جس نے بکھر اور دوسرے دو چٹانی تودوں کو جزیرے کی شکل میں اپنے اندر لے لیا ہے۔ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ دریائے سندھ کا موجودہ آبی راستہ جو اِسنے پہاڑیوں میں بنایا ہوا ہے اِس دریا کا واحد راستہ نہیں، جس پہاڑی پر قدیم سکھر آباد ہے، اُس کا مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی زمانہ میں یہ دریا کا آبی راستہ رہ چکا ہے جو رفتہ رفتہ مٹی بھر جانے سے بند ہو گیا، پُرانی سکھر کنال اسی راستہ سے نکالی گئی تھی اِس سے بھی زیادہ واضح اروڑ (Arore) کا نشیب ہے جو روہڑی سے چار میل جنوب میں ہے، اِس کے متعلق مشہور روایت ہے کہ دسویں صدی عیسوی کے اوسط میں یہ دریائے سندھ کی آبی گذرگاہ تھا، پھر بھی یہ مشکوک ہے کہ دریائے سندھ کا بڑا حصہ اِس تنگ راستے سے گذرتا ہوگا۔ بیراج کی تعمیر سے پہلے اِس آبی راستہ کو نارا سے نکالی جانے والی ایک نہر کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ اُسی وقت سے بڑا فیڈر اِس راستے سے گذر کر نارا میں پہنچتا ہے گویا نہر سے مخالف سمت یعنی مغرب سے مشرق کی طرف جاتا ہے۔

سکھر اور روہڑی کے علاقہ میں چونے کے پتھروں کی بالائی تہہ میں چقماق کے بڑے بڑے ذخیرے ہیں کچھ مقامات پر اِن کے اوپر کی مٹی رفتہ رفتہ موسم کے انقلابات سے ہٹ گئی ہے اور یہ اوپر نکل آئے ہیں، اور چقماق حاصل کرنے والوں کی توجہ کا مرکز بن گئے ہیں اِن کے ریزے اور پتلے ٹکڑے بڑی مقدار میں کئی مقامات پر پڑے ہوئے ملیں گے۔

وہ پہاڑی جس پر حیدرآباد شہر تعمیر کیا گیا ہے اور اِس کی جنوب میں گنجوٹکر (Ganjo Takar) دونوں ہی سکھر روہڑی علاقہ کی پہاڑیوں سے کسی حدت تک ملتی جلتی ہیں، اِن کی چوٹیاں سطح اور کنارے گول ہیں۔ خاص طور پر جنوبی سمت کا حصہ جہاں گنجوٹکر دریائی میدان سے دو سو فٹ بلند ہے۔ سفید چونے کے پتھر کی سب سے اوپر کی تہہ کے نیچے ایک تہ ایسی مٹی کی بھی موجود ہے جس میں ایلمونیم قسم کی دھات ملتی ہے۔ اِس کے کناروں میں کٹاؤ کے واضح نشانات ملیں گے۔ تیز ہواؤں سے اُڑنے والے ریت کے نوکیلے ذرات نے یہ کٹاؤ پیدا کیے ہیں۔ اِن کا رُخ مشرق، ۲۵ ڈگری شمال ہے۔

ٹھٹہ کے قریب مکلی (Makli) پہاڑیاں بھی ایسی ہی بلند زمینیں ہیں جو چاروں طرف سے دریائی میدان سے گھری ہوئی ہیں اِن کی جسامت تقریباً وہی ہے جو حیدرآباد کے پہاڑی جھنڈ کی ہے اور تقریباً ایک جیسا ہی نقشہ پیش کرتی ہیں، اِن کی بناوٹ البتہ کسی قدر مختلف اور بلندی کم ہے، مکلی کے جنوب میں پیر پٹھو (Pir Patho) نام کی ایک الگ تھلگ پہاڑی ہے، بگھاڑ (Baghar) نہر اِن دونوں کے درمیان سے بہتی ہے۔

پیر پٹھو سے جنوب۔ جنوب مشرق میں زمین کے ایک چھوٹے سے ڈیڑھ میل لمبے اور آدھا میل چوڑے ٹکڑے میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اونچی پہاڑی جو ابن شاہ (Abbanshah) کے نام سے مشہور ہے میدانی سطح سے صرف چھتر فٹ بلند ہے، سندھ کے جنوب میں یہ آخری چٹان کہی جا سکتی ہے اور کھرُ درے ریت کے پتھر اِس میں موجود ہیں۔ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے کہ دریائے سندھ پیر پٹھو اور ابن شاہ کے درمیاں بہہ رہا ہے اور اِس دریا کا خاص ڈیلٹا ابن شاہ سے چند میل کے فاصلہ پر شروع ہوتا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ دریائے سندھ کے بیچ دھارے میں چٹانیں موجود ہیں جو اِن دونوں پہاڑیوں کے درمیان کے فاصلہ کے نصف پر واقع ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال جھرک سے دو میل اوپر بھی ملی گی، جہاں دریا کے اندر چٹانیں موجود ہیں۔ یہاں بھی ایک اکیلی پہاڑی بدھ جوٹکر کے نام سے ہے جسے دریائے سندھ مغرب میں واقع چٹانوں سے الگ کرتا ہے۔

سندھ کا پہاڑی علاقہ یوں ہی غیر آباد اور دشوار گذار ہے جسے نباتات کی انتہائی کمی نے اور بھی وحشت انگیز بنا دیا ہے کچھ فاصلہ سے دیکھیئے تو پہاڑ بالکل ننگے نظر آتے ہیں البتہ نزدیک جا کر غور سے دیکھیئے تو چھوٹے پودے اور جھاڑیاں جو اِن پہاڑوں پر اُگ سکتی ہیں نظر آئیں گے اور اِن کے ساتھ ہی گھاس بھی۔ گھاس کا عالم یہ ہے کہ بہت جلد خشک ہو کر مٹی اور پتھروں کی ہم رنگ ہو جاتی ہے۔ جہاں بھی ذرا سی مٹی موجود ہے یہ اُگ آتی ہے اور بھیڑ بکریوں کے چرانے کے لئے عمدہ چارا ثابت ہوتی ہے۔ پہاڑی بکرے اور بھیڑیں جو اِس علاقہ میں عام ہیں اِسی پر بسر

اوقات کرتے ہیں۔کھیرتھر کے مغربی کناروں پر چھوٹا تاڑ (Dwart Palm) اور بلندی پر کہیں جنگلی زیتون بھی ملتا ہے۔ پہاڑی علائقہ کے جنوبی مغربی حصہ میں تھوہر (Cactus) کا پودا عام طور پر ملتا ہے۔

ندیوں کنارے عام طور پر سندھ کے مخصوص پودے اور درخت نظر آئیں گے جن میں جھاؤ (Tamarise) کا کنڈی اور لمبا گھاس (Pamba grass) خاص طور پر شامل ہیں۔سخت زمین پر بیر بھی عام ہے اور ایسی جگہ جہاں سیلاب کے پانی کی وجہ سے کھار زیادہ ہے اس لیے کھبڑ (Khabbor) کا درخت عام ملیگا، ببول کا درخت عام طور پر ایسے کھیتوں کی ڈول پر اُگتا ہے جو ندی کے پانی سے سیراب کئے جاتے ہیں۔ایسے مقامات کی شادابی جیسے لکھن جی کُنڈ، کھینجی ندی پر واقع ہے ایک اچھی مثال ہے اور نواحی بنجر علائقہ کے مقابلہ میں دلفریب منظر پیش کرتا ہے۔ بڑے بڑے کھیت اُن چشموں سے سیراب ہوتے ہیں جو پہاڑیوں کے کناروں سے نکلتے ہیں، یا کوہستان کی وادیوں کے بلند مقامات سے جاری ہوتے ہیں۔ایسے چشمے خاص طور پر تونگ (Taung) اور نئینگ (Naig) میں ملیں گے، وہ فصلیں جو کھیرتھر کے بلند مقامات پر اُگائی جاتی ہیں پہلے ہی بیان کی جاچکی یہ فصلیں بارش کے پانی پر انحصار کرتی ہیں۔جنوبی پہاڑی علائقہ کے کناروں پر جو نیچی زمین ہے اُن میں بھی کھیتی باڑی ہوتی ہے۔یہاں کھیتوں کے گرد پانی روکنے کے لئے پُشتے (بند) بنائے جاتے ہیں۔

سندھ کا کوہستانی علائقہ سات ہزار مربع میل میں پھیلا ہوا ہے، اچھی فصل سال میں اِسی علائقہ میں بمشکل دو ہزار ایکڑ زمین پر کاشت ہوسکتی ہے۔چنانچہ علائقہ کی معیشت کا انحصار کسی طرح اِس کھیتی باڑی پر نہیں۔بھیڑ بکریوں کی افزائش اور گلّہ بانی اور جنوب کی نسبتاً نیچی اور کشادہ زمین پر چوپائے پالنا اور کھیرتھر کے مشرقی کاچھو (Kaccho) میں اونٹ پالنا یہاں کے باشندوں کا باقاعدہ پیشہ ہے، لوگوں کی اکثریت خانہ بدوش ہے۔یہ لوگ اپنے کمبل کے خیمے اور کھالوں کی پھولداریاں ایسے مقامات پر لگا لیتے ہیں جہاں پانی آسانی

سے دستیاب ہوتا ہے اور جیسے ہی نواح میں چارے کی قلت ہوتی ہے یہ اپنے مویشیوں کو لے کر دوسرے مقام کی تلاش میں چل دیتے ہیں۔ دوسرے لوگ خاص طور پر وہ جو شمالی کوہستان میں رہتے ہیں محفوظ وادیوں میں سردی کے زمانہ میں ندی کے پاس مکان بنا لیتے ہیں اور موسم گرما میں بلند مقامات کی طرف چلے جاتے ہیں جہاں وہ لوگ اپنے کھیتوں کے پاس پتھروں سے گول جھونپڑی نما مکانات بنا لیتے ہیں۔ کوہستان میں مستقل آبادیاں ہیں ہی نہیں۔ یہاں اون اور بکریوں کی کھال اور بالوں کے تاجر عموماً رہتے ہیں۔ جو اُون اُتارنے کے زمانہ میں چرواہوں کے پڑاؤ کے دورے کرتے ہیں۔ لیکن جس سال بارش بہت کم ہوتی ہے تو تقریباً تمام آبادی ملحقہ میدانی آبادیوں میں منتقل ہو جاتی ہے جن کے ساتھ اِن لوگوں کا مویشیوں کا لین دین رہتا ہے۔

آمدورفت کے چھوٹے چھوٹے مقامی راستوں کے علاوہ دو بڑی تجارتی شاہراہیں منچھر جھیل کے نواحی علاقہ سے شروع ہوتی ہیں۔ ایک مغرب کی سمت میں ناری اور انگئی ندیوں کی وادیوں کی طرف چلی جاتی ہیں اور کھیرتھر کے بڑے دروں سے گذرتی ہوئی، پٹھانی وٹ (Pathani vat) پر دوسرے راستوں سے مل جاتی ہیں جو جھالاوان کی طرف جاتے ہیں۔

دوسری شاہراہ لکی پہاڑ اور نواحی علاقہ سے جنوب کی طرف چلی جاتی ہے اور جب باران ندی کی وادی میں پہنچتی ہے تو کئی شاخوں میں تقسیم ہو کر زیریں پہاڑی علاقہ میں پھیل جاتی ہے۔9 یہ تجارتی سامان کی صرف گذرگاہیں ہیں کیونکہ کوہستانی علاقہ میں کوئی منڈی ایسی تجارت کے لئے موجود نہیں ہے۔

یہ راستے ہزار سال سے آنیوالے قبائل کی دست اندازیوں کو بھی برداشت کرتے رہے ہیں اور مقامی قبائل کی باہمی جنگ وجدل کو بھی۔ جس کے نشانات بہت سے مقامات پر موجود ہیں لیکن کوہستانی علاقہ میں سندھ کی تاریخ کا کوئی اہم واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ اور اِس علاقہ کی معیشت کا ڈھنگ جیسا کہ مشرقی ریگستان میں اُسی طبعی حالت اور موسمی حالات پر منحصر ہوتا ہے، اِس علاقہ میں بھی صدیوں سے ایسا ہی رہا اور بہت کم بدلا ہے۔

تشریحات باب چوتھا

1. یہ باب زیادہ تر ڈبلیو۔ٹی فورڈ کی کتاب "دی جیولوجی آف ویسٹرن سندھ " سے ماخذ ہے۔
2. " کوہ سفید " بجا طور پر " گزیٹر آف دی پروانس آف سندھ "بی" جلد اول صفحہ ۳ (ضلع کراچی میں یہ تحریر ہے کہ لوگ پہاڑی سلسلوں کو عموماً ان کی چوٹیوں یا مقامی آبادیوں سے منسوب کر کے پکارتے ہیں۔ اس کھیر تھر کا سلسلہ عوام الناس کے نزدیک اس پہاڑی سلسلہ کے جنوبی حصہ کا نام ہے۔ بر خلاف اس کے سہون سے سیوی تک کا تمام پہاڑی سلسلہ ابوالفضل کے الفاظ میں "کھتر " کے نام سے مشہور تھا۔ (آئین اکبری بحوالہ رورٹی) "نوٹس آن افغانستان اینڈ پارٹس آف بلوچستان ۱۸۸۸۔ صفحہ ۵۵۸) برطانوی باشندے جب سندھ میں وارد ہوئے تو اُبتدائی دور میں کھیر تھر اور لکی پہاڑوں کو " ھالار پہاڑ " کہتے تھے۔
3. جھلاوان گزیٹیر۔ صفحہ ۳۳۶۔
4. یہ سلسلہ بھگوتوڑو سے درواٹ تک تقریباً ستر میل تک شمالاً جنوباً پھیلا ہوا ہے۔
5. سر۔ای پاسکو "اے مینول آف دی جیولوجی آف انڈیا اینڈ برما"۔ طبع سوم ۔۱۹۰ جلد اول صفحہ ۴۲۴۔
6. اِن کی زیادہ سے زیادہ لمبائی اکیس میل اور زیادہ سے زیادہ چوڑائی ۶ میل ہے۔
7. اِس میں نگر پارکر کے نزدیک واقع کارونجھر پہاڑی شامل نہیں ہے۔
8. جھلاوان گزیٹیر۔ صفحہ ۲-۳۲۲۔
9. ایس۔آر۔بی۔جی نمبر ۱۷۔نیو سیریز۔ جلد ۷ (۱۸۵۵) بحوالہ "راستے" نمبر ۱۰ اور ۱۶ صفحہ ۵۷۷ کے بعد ضمیمہ ملاحظہ ہو۔

باب پانچواں

ماقبل تاریخ سندھ کی ابتدائی تہذیبیں

ہزاہا سال پہلے ایک زمانہ کرہ ارض پر ایسا بھی گذرا ہے جس کی قدامت کا اندازہ اُن پتھرائے ہوئے اجسام سے کیا جاتا ہے جو زمین کی نچلی تہ میں پائے جاتے ہیں۔ سندھ کے علائقہ میں انسانی آبادی کے جو شواہد بے ڈھنگے سنگی اوزاروں کی شکل میں ملتے ہیں اُن سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ اُسی عہد عتیق سے تعلق رکھتے ہیں جو اوپر بیان کیا گیا۔ لیکن ایسے اوزاروں کے ساتھ انسانی کھوپڑی یا دوسری جسمانی شہادت نہیں ملی ہے۔ صرف منطقی طور پر ہی یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسے اوزار عہد عتیق کے انسان ☆ نے ہی بنائے ہوں گے۔ سب سے پہلے روہڑی کے قریب چونے کے پتھروں کی نیچی پہاڑیوں پر یہ باقیات دریافت ہوئیں۔ یہ زیادہ تر چقماق سے بنائے گئے ہیں اور ڈھائی سو میل جنوب میں واگھودار (Waghodar) کے مقام پر بھی ایسے ہی سنگی اوزاروں کو شناخت کیا گیا ہے۔ نیز کراچی کے مشرقی ساحلی اور نواحی علائقہ میں بھی دریافت کئے گئے ہیں۔[1]

ایک بہتر قسم کا ہتھیار جس کا پھل پتلا اور کنارے تیز دھار والے ہیں، چقماق کے بڑے پتھر کو تراش کر بنایا گیا تھا کافی دور دور تک پایا گیا ہے، کئی مقامات ایسے ہیں جہاں چقماق کا پتھر کاٹ کر نکالا جاتا ہے، اِن میں روہڑی، کوٹ ڈجی، وسطی کوہستان اور ساحل

---

(۱) ہیروڈوٹس سے پہلے والے زمانے کو ''قبل از تاریخ'' کا دور کہا جاتا ہے، یہ یونانی مورخ عیسوی سن سے ساڑھے چار صد سال پہلے ہو کے گزرا ہے، یہ یونانی مورخ سندھ میں آیا تھا اور اُس نے کپاس کے پودے دیکھ کر لکھا کہ ''سندھ میں ایسے درخت ہوتے ہیں جن پر اُون اُگتی ہے۔ (سندھی مترجم)

☆ آثار قدیمہ کے ماہرین کے مطابق تہذیب کی یہ پہلی منزل ہے، اُسی زمانے میں تراشے ہوئے پتھروں کے اوزار اور ہتھیار کام میں لائے جاتے تھے، اُس کے بعد 'نیا حجری دور' آتا جب پتھروں کو گسا کر چمکدار اوزار بنانے کا رواج ہوا، کھیتی باڑی اور تمام ہنرمندی میں یہ اوزار کام لائے جاتے تھے۔ اس کے بعد ترتیبوار ''تانبے کا زمانہ'' جس میں قلعی اور تانبے کو ملا کر ''بھرت'' والا زمانہ اور اس کے بعد ''لوہے کا زمانہ'' آتا ہے، جب لوگوں نے لوہے کے اوزار بنانا شروع کئے اور آج کل کا زمانہ ''مشینری کا زمانہ'' اور ایٹم کا زمانہ اور ''خلائی دور'' کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ (سندھی مترجم)

کے قریبی پہاڑیاں شامل ہیں۔ اکثر مقامات پر مذکورہ اوزاروں کے ساتھ گلی ظروف کے ایسے ٹکڑے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن کا تعلق پتھر اور تانبے یا کانسی کے زمانہ کی تہذیبوں سے ہے لیکن پتھر نکالنے کے مقامات جہاں سے صرف پتھر کے ٹکڑے یا ورق دستیاب ہوئے ہیں اُن کا تعلق پتھر کے زمانہ کی تہذیب سے ہے۔

پتھر کے پھل والے لیکن چھوٹے اوزار بنانے والے لوگ جنوبی مغربی سندھ میں بھی آباد تھے، مذکورہ بالا تہذیبوں سے اِن کا تمدن بالکل مختلف ہے۔[2] پتھر کے یہ اوزار اکثر و بیشتر نصف چاند کی شکل سے مشابہ ہیں اِن کے متعلق یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مچھلی کا شکار کرنے والے نیزے ہوں گے۔ یا ممکن ہے تیر ہوں کیونکہ ان کے لکڑی کے بنے ہتھے وقت گذرنے سے گل گئے ہونگے، دوسری قسم اوزاروں کی ایسی ہے، جنھیں ہڈی کے ہتھوں میں لگایا گیا ہوگا، پتھر سے تعلق رکھنے والی ایسی صنعتیں جنوبی اور غربی ہندوستان میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں اور گمان کیا جاتا ہے کہ شمال مغرب سے آنیوالے لوگوں نے یہ اوزار ہندوستان میں رائج کئے ہوں گے۔ کوئی ایسی شہادت تو موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا کہ یہ لوگ محض شکاری پیشہ تھے، یا مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا بھی جانتے تھے۔ اِن کے مماثل پتھر کے زمانہ کے جو لوگ یورپ کے علاقوں میں گذر چکے ہیں اُن کی مدد سے سندھ میں آباد پتھر کی تہذیب کے لوگوں کا عصری تعین ممکن نہیں۔ اِس کے برعکس اِس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ تہذیب کانسی کے عہد سے مخلوط ہے کیونکہ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ اِس عہد میں چقماق اور دوسرے پتھروں کے اوزار مستعمل تھے۔

پاکستان اور ہندوستان میں ایک اجنبی کے لئے یہ بات چاہے حیرت کا باعث ہو لیکن مقامی باشندوں کے لئے عام بات ہے کہ ایسی برادریاں ساتھ ساتھ رہتی ہیں، جو معیار تمدن کے اعتبار سے ایک دوسرے سے ہزاروں سال کے فاصلہ پر ہیں۔ چنانچہ ۳۲۵ قبل مسیح سکندر اعظم کا امیر البحر نیر کس (Admeral Nearchus) شمالی مغربی ہندوستان کی "وحشی" سلطنتوں کے رہن سہن کو خاصا مہذب جانتا ہے۔ یہ علاقے اور لے

تا آئی تک پھیلے ہوئے تھے، لیکن یونانیوں نے جب اِن کے پڑوسی اکتھیو (Or gtai) پھا گی (Chthyophagi) قبیلے کے رہن سہن کو دیکھا تو ششدر رہ گئے۔ [۳]

اُنہوں نے دیکھا کہ مچھلی کھانے والے یہ وحشی چیزوں کو کاٹنے کے لئے پتھر کے تیز دھار والے اوزار استعمال کرتے تھے کیونکہ اِنھیں لوہے کا علم نہیں تھا۔ اور یہ بات حقیقت سے بہت دور نہ ہوگی اگر ہم یہ کہیں کہ سندھ میں جو لوگ اِن سے پہلے آباد تھے انہیں کے تباہ شدہ تمدن کی یادگار یہ لوگ تھے، انتہائی دشوار گذار اور غیر زرعی ساحل سے یہ لوگ چمٹے ہوئے تھے۔ اُس نے اِنھیں ساری دنیا سے الگ تھلگ کر دیا تھا، جبکہ اِن کی قوم کے وہ افراد جو اندرون سندھ آباد تھے ایک اچانک تباہی کا شکار ہو کر ختم ہو گئے تو یہ لوگ بچ گئے یہ کیا مصیبت تھی جو اچانک اِن کی قوم پر نازل ہوئی؟ صرف قیاس ہی کیا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کاکیشس (Caucasus) کے آس پاس سے جب کثیر تعداد میں لوگوں نے نقل مکانی کی تو اُنھیں میں ایک ایسی سخت جان قوم بھی شامل ہوگی جس نے سندھ کے باشندوں کو اُن کے علاقوں سے بے دخل کر دیا اور اگر یہ لوگ خود ہی اپنے علاقہ کو چھوڑ کر منتقل ہوئے تو شاید اِس کہ وجہ بھی یہی ہوگی کہ آنیوالوں نے آہستہ آہستہ اِن کی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔

کم از کم یہ تو ثابت ہے کہ جب اسکندر (Alexandader) اِس راستہ سے گذرا تو، گیدروشیا (Gedrosia) (مکران) کی آب و ہوا اِسی قدر شدید اور وسائل معیشت اتنے ہی کمیاب تھے جتنے ہمارے زمانہ میں ہیں۔ سکندر کے مورخین نے اِس علاقہ سے لشکر کے گذرنے کی جو تفصیلات قلمبند کی ہیں وہ دلچسپ بھی ہیں اور اہم بھی۔ فوجیوں کو جو زحمتیں برداشت کرنی پڑیں اُن کا بیان عام طور پر وہ تمام وجوہات پیش کر دیتا ہے اور علاقہ سے متعلق وہ تمام خصوصیات سامنے لے آتا ہے جن کی وجہ سے یہ صعوبتیں پیش آئیں۔ [۴] کوئی تعجب نہیں اگر اِن مورخین نے سابقہ آبادیوں کے اُجڑے ہوئے نشانات کا تذکرہ نہیں کیا۔ [۵] کیونکہ ماحول کو دیکھتے ہوئے یہ بات اُنھیں قدرتی نظر آئی۔ اور وہ خود بھی، بھوک، پیاس اور خوف میں اتنے مبتلا تھے کہ تنظیم عسکری ختم ہو چکی تھی، صرف جان بچانے کی

نکر تھی۔ حالانکہ کوئی دشمن فوج مقابل نہ تھی لیکن سلامتی صرف لیڈر کے فیصلہ اور حکم پر منحصر ہو کر رہ گئی تھی۔ اُن کا تعلق زندہ انسانوں سے تھا جو وہاں موجود تھے۔ خواہ وہ غریب اور قلیل التعداد کیوں نہ تھے۔ کیونکہ یہی لوگ فوج کے راہ نما اور یہی اپنی معمولی زراعت سے فوج کے خور ونوش کا سامان مہیا کرنے والے تھے، یہ لوگ اپنے کسی تمدن رفتہ اور خوشحالی کے متعلق شیخی بگھارنے سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ اور اگر یونانیوں نے اپنے فطری تجسس سے مجبور ہوکر اِن لوگوں سے یہ دریافت بھی کیا ہوگا کہ اُجڑی ہوئی بستیوں کے یہ آثار کیا اُن لوگوں سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں سیمی رامس (Semiramis)(۱) اپنے حملہ کے دوران تباہ کیا تھا یا پُرانے طرز تعمیر کے جو نشانات موجود ہیں اُنھیں مقامی باشندے ہرکیلس (Heracles)☆ سے نسبت دیتے ہیں تو یقین ہے کہ اِن لوگوں نے جو کچھ جواب میں کہا ہوگا وہ یہ ہوگا "پرانے وقتوں سے یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ اِن نشانات کے خالق ایک قدیم قوم سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے جو اِس علاقہ کے بھی مالک تھے لیکن یہ کون تھے اور اِن کا انجام کیا ہوا۔ یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔؟

یہ ٹیلے جو قدیم آبادیوں کے مدفن ہیں اور چُنے ہوئے پتھروں کے بڑے بڑے پُشتے سندھ اور بلوچستان کی مشترکہ سرحد سے ملحق علاقہ میں موجود ہیں۔ یہ سوال کہ آیا یہ تمدّن رفتہ سے تعلق رکھتے ہیں یا کسی مقامی تہذیب سے؟ ابھی طے نہیں ہو سکا۔ البتہ ٹیلوں کی کُھدائی سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اِن کا تعلق دو ہزار سے تین ہزار سال قبل مسیح سے ہے۔

لیکن پتھروں کے عظیم الشان جناتی پشتے کتنے قدیم ہیں یہ طے نہیں ہو سکا۔ یہ آبی گذرگاہوں پر دور وادیوں میں بہنے والی پہاڑی ندیوں کو روکنے کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بارش کے پانی کو زراعت کے لئے ذخیرہ کرنے کی خاطر اُنھیں تعمیر کیا گیا ہوگا۔ کئی مثالیں ایسی ہیں کہ پشتوں کی تعمیر اِس ڈھب سے کی گئی ہے کہ پہاڑیوں سے بہہ کر

---

(۱) وہ اسیریا کی بہت ہی خوبصورت اور دانشمند رانی تھی جو کہ جانینوس کی بیوی تھی، ایک روایت کے مطابق بابل اور نینوا کے شہر اُس نے ہی بنوائے تھے، ایران کے ھنخامنشی حکمرانوں اور یونان سکندر اعظم سے پہلے اُس ہی رانی نے سندھ پر حملہ کیا تھا۔

☆ یعنی ہرکیولس، یونانی دیومالائی ھیرو، جو کہ اپنی زبردست طاقت اور پہلوانی کی وجہ سے مشہور تھا۔ (سندھی مترجم)

آنے والی مٹی کو روکا جا سکے اور اُسے سخت زمین میں تبدیل کیا جا سکے۔ تا کہ پہاڑی ڈھلوان مسطح میدان جائیں۔ سندھ کی موجودہ سرحد کے نواحی علاقہ میں بالخصوص ایسی مثالیں ملتی ہیں۔ جو بھی ان پشتوں کے معمار تھے وہ علاقہ کی طبعی حالت کے متعلق مکمل معلومات رکھتے تھے اور موجودہ باشندوں کے مقابلہ میں اُن کا علم اور تعمیراتی مہارت کہیں زیادہ تھی۔ یہ لوگ جن میں خانہ بندوش چرواہے، گمنام قبائلی سردار اور لکیر کے فقیر مذہبی علماء شامل ہیں، ایک برتر تمدّن کے اِن آثار کو گبر بند (Gobarband) یا گوہر بند (Gohar band) صرف اِس لئے کہتے ہیں کہ اسلام سے قبل حکمرانوں اور ان کی تہذیبوں سے متعلق جو روایات اِن لوگوں کے پاس ہیں وہ زرتشتوں کے علاوہ کسی دوسری قوم کے متعلق انھیں معلومات بہم نہیں پہنچاتیں۔ ے

یہ بات ایسی ناممکن نہیں کہ ایران کے ساسانی (Sassanians) اور ہخامنشی (Achaemenian) حکمرانوں نے اپنی سلطنت کے اِس مشرقی صوبہ کی حالت زار کو دیکھ کر جس کو قدرت کی طرف سے بہت کم وسائل ملے تھے۔ تعمیراتی کاموں سے اِس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی ہو۔ مسٹر آر۔ ہیوز بلر (R. Hughes Buller) جس نے سب سے پہلے اِن پشتوں یا "بندوں" کے متعلق تحقیق کی، مغربی ایران کے دریائے کارون (Karun) پر شوستر اور دیگر مقامات پر تعمیر کردہ بندوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ قدیم ایرانی باشندے پانی ذخیرہ کرنے کے لئے ایسے ہی بند تعمیر کرتے تھے۔ ۸ یہ بہرصورت تسلیم کرنا پڑیگا کہ زراعت کی ترقی کے لئے اُن کا مخصوص طریقہ کاریز (Karez) اور اِس قسم کی تعمیرات کرنے سے تعلق رکھتا تھا۔ جو شمالی بلوچستان میں مروج ہے۔ اور یہ طریقہ اِن تمام علاقوں میں بھی ملتا ہے جن میں گبر بند بنائے گئے ہیں۔ لسبیلہ کے شمال اور مکران میں متعدد کاریزیں موجود ہیں۔ مکران میں ایک کاریز خُسرو (Cytus) سے منسوب ہے۔ ۹

اپنے مشاہدے کے دوران ہیوز بلر بلوچستان کے ایک علاقہ میں اِس بات سے بھی

متاثر ہوا کہ وہاں زمانۂ اسلام سے قبل کی کوئی قبر دریافت نہیں ہوئی حالانکہ جس زمانہ میں گبر بند استعمال کئے جا رہے تھے یہ علاقہ نسبتاً گنجان آباد ہوگا۔ اِسی علاقہ میں گول عمارتی ڈھانچوں کے جو آثار موجود ہیں، جن کا فرش دوسرے قسم کے پتھروں کی اینٹوں سے بنا ہوا ہے بُلر کے قول کے مطابق ''یہ دخمے'' (Dakhmas) ہیں جن میں مُردوں کو ٹھکانے لگایا جاتا تھا۔ لیکن مُردوں کو دفن کرنے اور مُردہ اجسام کو فنا کر دینے کے درمیان بہت سے طریقے ہیں جو برائے نام ظاہری آثار چھوڑتے ہیں، جزوی تدفین اور جلانا۔ بہرنوع یہ باور کرنے کے لئے معقول وجوہات موجود ہیں، کہ قبل تاریخ یہاں کے باشندوں میں ایسے ہی طریقے رائج تھے۔

لیکن ایسی شہادتیں کہ جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایرانی بادشاہوں کے زمانہ سے پہلے یہ پُشتے تعمیر کئے گئے تھے زیادہ معتبر ہیں، سب سے پہلے یہ بات عیاں ہے کہ بندوں اور قدیم آبادیوں کے آثار جو اِن کے آس پاس موجود ہیں، اِن کے درمیان ضرور کوئی تعلق ہوگا، یہ تعمیرات ایسے معیار کی زراعت کے لئے کافی تھے جو موجود زمانہ سے کہیں زیادہ آبادی کا بوجھ برداشت کر سکے۔ بہت سے ٹیلے اپنی بلندی کے اعتبار سے یہ ثبوت مہیا کرتے ہیں کہ اِن میں انسانی آبادی طویل مدت تک یا مسلسل باقی رہی ہے۔ اِن ٹیلوں کی کُھدائی تادمِ تحریر چند خندقوں کی کھدائی سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اِسی کے باوجود جو باقیات دستیاب ہوئیں ہیں وہ سب کانسی کے عہد کے زراعتی تمدّن کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہ تمدّن تمام مغربی ایشیا میں تین ہزار سے ایک ہزار سال قبل مسیح تک پھیلے ہوئے تھے۔ کیا ہمیں یہ سمجھ لینا چاہئے کہ یہ انسانی برادریاں جو اپنے دیہاتی مکانات زیادہ تر پتھروں سے تعمیر کرتی تھیں ایسی موسمی حالات میں پروان چڑھی تھیں جس میں ضرورت کے مطابق زراعت ایسے زمین سُدھار تعمیراتی کاموں کی مدد کے بغیر کی جا سکتی تھی؟ اور یہ کہ موسمی حالات زمانہ کے ساتھ ساتھ اِس قدر مخالف ہو گئے کہ جو لوگ اِن کے بعد یہاں آباد ہوئے وہ نہایت موزوں بند، آبپاشی کی نہریں وغیرہ تعمیر کرنے کے لئے مجبور ہوئے تاکہ

زندہ رہ سکیں اور اِس کے باوجود کوئی دوسری نشانی اُن کے وجود کی باقی نہ رہی؟ کیا وہ لوگ جنہوں نے احمد بند (Ahmed Band) ''پیر مناغرا'' (Pir Managhra) جیسی تعمیرات کی تخلیق کی، ایسے مٹی کے گھروں میں رہنے پر قانع تھے جن کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہا؟ یہ تمام نظریات تقریباً نافہم معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کے برعکس جو بات حقیقت سے قریب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہی قدیم باشندے جو اِن آبادیوں میں رہتے تھے۔ جن کے آثار اِس علاقہ میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ ماہر زرعی انجینئر بھی تھے۔ اُنہوں نے اِس خطۂ زمین کو زیادہ سے زیادہ زراعت کے قابل بنانے کے لئے سخت جدو جہد کی۔

ہرگریوز (Hargreaves) جس نے نال (Nal) اور مرکزی جھلوان (Jhalwan) کے آس پاس کے علاقہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اِس نظریہ کا قائل ہے، سر اوریل اسٹین (Sir Aurel Stein) کا خیال ہے کہ خاص طور پر خاران میں توجی (Toji) کے مقام پر قدیم آبادیوں کے جو آثار موجود ہیں اُن میں اور گبر بندوں کی ابتدائی اور قدامت میں گہرا تعلق ہے۔[۱۳] ایسی کوئی شہادت جس سے براہِ راست یہ ثابت ہو کہ گبر بندوں کی تعمیر پتھر اور تانبے کے مخلوط عہد سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا کارنامہ ہے شاید مستقبل میں میسر آجائے۔ لیکن اِس کی عدم موجودگی مندرجہ بالا نظریہ کو باطل نہیں کرتی۔ یہ ظاہر ہے کہ یہاں کھیت تھے، رہائشی مکانات نہیں، ایسی صورت میں مخصوص استعمال اشیاء مثلاً فصل کاٹنے والے کی درانتی، چرواہے کی بکریوں سے متعلق اوزار، بند کے قریب برسات کے موسم میں جب پانی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا ہو کسی رکھوالے کا ہتھیار، اور اِن بندوں کی مرمت کرنے والے مزدوروں کے اوزار۔ اگر ان لوگوں نے چیزیں گرائی بھی ہونگی۔ تو اُن کی تعداد نہایت قلیل ہو سکتی ہے۔ اگر آگے چل کر اِس قسم کی باقیات بندوں کے نواح سے دستیاب ہوتی ہیں اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اشیاء ایران کے ہخامنشی یا ساسانی بادشاہوں کے عہد سے تعلق رکھتی ہیں تب بھی یہ مناسب نہ ہوگا کہ یہ عجلت کے ساتھ اِن پشتوں کی تعمیر کو اِسی عہد سے منسوب کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ عین ممکن ہے کہ اِن لوگوں نے

اپنے سے پہلے لوگوں کی زرعی تعمیرات کی دیکھ بھال اور مرمت کر کے انہیے اپنے استعمال کیلئے برقرار رکھا ہو۔آج جولوگ اِس علاقہ میں موجود ہیں اور جن کے لئے زراعت صرف دوسرے درجہ پر ایک وسیلۂ حیات ہے تو اتنی عقل ضرور رکھتے ہونگے کہ اِن پشتوں میں جتنے بھی اُن کے لئے کارآمد ہوسکیں اُنھیں تھوڑی بہت مرمت کے بعد، یعنی شگافوں میں مٹی بھرنے کے بعد پھر سے استعمال کرتے رہیں۔

سندھ کے کوہستانی علاقہ کے ایک حصہ میں جہاں جہاں گبر بند کوہ تراش (Kohtrash) کے آس پاس قدیم آبادیوں کے آثار ملتے ہیں اُن کی شکل بھی وہی ہے۔شاید سب سے زیادہ قابل توجہ پشتوں کا وہ مجموعہ ہے جو کھیرتھر سلسلہ کے جنوبی سرے پر ملتا ہے اور کوہ تراش کے نواح میں ہے۔ اِن میں ایک مثال خاصے بڑے پشتے کی ہے۔یہ پُشتہ زمین کے ایک بڑے کٹاؤ پر تعمیر کیا گیا ہے اور اِس کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی ذخیرہ گاہ بنائی جائے۔۱۵ اسی قسم کے پشتے کی عمدہ مثال تقریباً تیس میل شمال میں ملتی ہے۔یہ پشتہ ایک الگ تھلگ وادی گوزبانی میں واقع ہے۔یہ وادی کھیرتھر اور نینگ ندی کی بالائی وادی کے درمیان ہے(Gozbani)وسطی سلسلۂ کوہ کی ایک چوٹی جونگھند کے نام سے مشہور ہے، سیتا (Sita) اور تراپن (Trapan) ندیوں کے درمیان مزید ایک سو میل شمال کی طرف ہے،اِس کے قریب جس پشتے کے آثار ہیں وہ ایک ماہرانہ تعمیر کی نشاندہی کرتے ہیں، یہاں ایک سیدھا پہاڑی ڈھلوان کے مقابل زراعتی مقاصد کے جو پشتہ تعمیر کئے گئے ہیں وہ نگھند کے مشرقی سمت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

یہ تعمیرات کھنڈر بن چکی ہیں، مقامی باشندے جب اِن کا ذکر کرتے ہیں تو قبل اسلام کافر قوموں کی اقوام کے ماہرانہ تعمیرات کو رشک کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔اسٹین (Stein) کہتا ہے کہ ایسی تعمیرات اِن جنگلی چرواہوں کے بس کی بات نہیں، وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ بظاہر معمولی سے فائدے کے لئے اتنی انسانی محنت کیوں کھپائی گئی۔حقیقت یہ ہے کہ ایسا عمدہ اہتمام یہ ظاہر کرتا ہے کہ اگر اُس زمانہ میں یہاں کی آبادی گنجان اور آج کی

"گوہر بند" گوز بانی، تحصیل سیہون

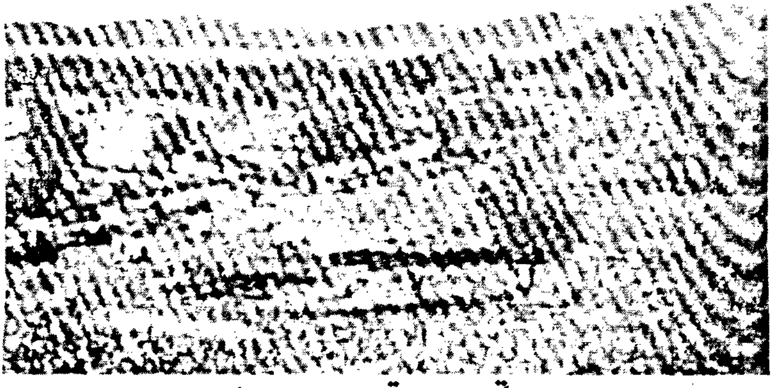

کاندھی واہی، سیہون تحصیل میں قبل از تاریخ زمانہ کی ایک بستی کے آثار

نسبت سے کہیں زیادہ اور مستقل نہ ہوتی تو اِس کی ضرورت نہیں پیش آ سکتی تھی۔

اِن تعمیرات کی منصوبہ بندی پر غور کرنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ انتظامات اُسی صورت میں ضروری تھے کہ علاقہ میں بارش کثرت سے ہوتی تھی یا کم ازکم باقاعدگی سے ضرور ہوتی تھی۔ لیکن یہ مفروضہ شبہ سے بالاتر نہیں ہے۔ جنوبی ہند میں ایک مرہٹہ کسان آج بھی پانی کی آمد اور اخراج کے راستوں کو پہاڑی علاقہ میں ایسے ہی پشتوں سے بند کرتا ہوا نظر آئیگا حالانکہ اُس کی تعمیر میں کوئی نفاست نہیں مگر مقصد صرف یہ ہے کہ پانی کے ساتھ بہتی ہوئی مٹی کو روکا جائے۔ اور یہ کام وہ اِس یقین کے ساتھ انجام دیتا ہے کہ بارش باقاعدہ ہوگی، جس کا موجود اوسط بیس انچ ہے، سندھ کے کوہستان میں یہ اوسط زیادہ سے زیادہ سات انچ ہوتا ہے اور بیس انچ کا اوسط شاید دس سال میں ایک بار ہوتا ہوگا جبکہ دو تین سال یہ اوسط دو یا تین انچ سے تجاوز نہیں کرتا۔

سندھ اور بلوچستان میں جو چٹانیں تشکیل ارضی کے قدیم ترین عہد سے تعلق رکھتی ہیں وہ درجہ حرارت میں انتہائی کمی وزیادتی کی وجہ سے تیزی کے ساتھ زوال پذیر ہوگئی ہیں، بہ نسبت جنوبی ہند کے، جہاں درجہ حرارت کی کمی وزیادتی میں اعتدال ہے۔ علاوہ وہ ازیں کھیرتھر پر شدید طوفان پیدا ہوتے ہیں گو وہ مختصر ہی کیوں نہ ہوں لیکن بارش کے پانی سے ڈھلوانوں پر ایک بھورے سیلاب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جس کے راستہ میں جیسے ہی کوئی رکاوٹ آتی ہے اُسی جگہ مٹی جمع ہونے لگتی ہے، چنانچہ گبر بندوں کا بھاری بھرکم وجود خاص طور پر ایسے بند جو آبی گذرگاہوں پر پانی کے بہاؤ کو زمین کے گہرے کٹاؤ اور شگافوں کی طرف موڑنے کے لئے تعمیر کئے گئے ہیں، ماحول کے حقائق کے عین مطابق ہے، سندھ کے پہاڑی علاقہ میں کھیتوں کو محفوظ رکھنے کے لئے جو بند مٹی سے تعمیر کئے جاتے ہیں، وہ تقریباً یقینی طور پر ایسے طوفان سے ٹوٹ جاتے ہیں۔

اب ہم خود سے یہ سوال کر سکتے ہیں، اگر موجودہ زمانہ کے انجینئر گبر بندوں کو مرمت کر کے اِن کی ابتدائی اصلی حالت پر لے آتے اور پھر ان کی دیکھ بھال ہوتی رہتی اور

پہاڑی مٹی پانی کے بہاؤ کے ساتھ جمع بھی ہوتی رہتی، تب کیا یہ ممکن تھا کہ موجودہ موسمی حالات کے تحت ایک سمجھدار اور جفاکش زراعت پیشہ برادری بھی اتنی فصل اُگانے میں کامیاب ہوجاتی کہ وہ اُس آبادی کے لیئے کافی ہوسکتی جو عہد قدیم میں یہاں موجود تھی؟ میرا خیال ہے کہ اِس کا سیدھا راستہ جواب "ہرگز نہیں" ہوسکتا ہے۔ چنانچہ دریں حالات جس عارضی نتیجہ پر ہمیں پہنچنا چاہیئے وہ وہیلر (Wheelerr) کے الفاظ میں یہی ہوگا کہ "بارش اُس زمانہ میں آجکل کی نسبت سے بہت زیادہ ہوتی تھی اِس کے ساتھ ہی اتنی غیر یقینی بھی کہ پانی کو ذخیرہ کرنے کی صورت پیش آتی تھی۔ ١٦

سندھ کے کوہستانی علائقہ میں تاریخ سے قبل کے زمانہ کی آبادیوں کے جو آثار موجود ہیں۔ وہ اِس موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالتے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ گبر بندہی بہت کم ہیں، جبکہ آبادیوں کی تعداد جواب تک دریافت ہوچکی ہے وہ ثابت کرتی ہے کہ کانسی کے عہد میں اِس علائقہ کے اندر جس قدر گنجان آبادی تھی وہ موجودہ زمانہ سے بہت زیادہ تھی۔ اِن جگھوں کے آس پاس کا علائقہ اِس قدر ناہموار اور دشوار ہے کہ بندوں اور پشتوں کی مدد کے بغیر زراعت تقریباً ناممکن ہوگی۔ خواہ بارش موجودہ زمانہ سے بھی کہیں زیادہ کیوں نہ ہوتی ہو۔ ایسی صورت میں ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ اِس علائقہ میں آباد قدیم قومیں خاص طور پر گلّہ بان تھیں لیکن خانہ بدوش نہیں تھیں اور یہ لوگ اپنی ضرورت کے لئے اجناس دوسرے علاقوں سے حاصل کرتے تھے۔ ان کی بڑی بڑی آبادیاں زیادہ پانی کے چشموں کے پاس واقع تھیں جو آج بھی سینکڑوں ایکڑ زمین کو سیراب کرتے ہیں۔ باقی تقریباً تمام آبادیاں بہتے ہوئے پانی کے قریب تھیں۔

مسٹر این جی مجمدار (N.G Majumdar) کا شمار اُن محققوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اِس موضوع پر تحقیق کی ابتدا کی۔ موصوف اُس تجارتی شاہراہ سے گذرے جو کوہستان میں منچھر جھیل کے قریب سے شروع ہوتی ہے اور جنوب کی سمت بڑھتے ہوئے اُس مقام تک پہنچتی ہے جہاں باران ندی پہاڑی علائقہ سے نکل کر میدان میں داخل ہوتی

ہے۔ گویا تقریباً ستر میل طویل ہے اور اِس کا بیان ہم پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔ اُنہوں نے دیکھا کہ اِس شاہراہ پر جہاں جہاں پڑاؤ کے مقامات ہیں اُن کے قریب تاریخی زمانہ سے قبل کی آبادیوں کے کھنڈرات موجود ہیں، یعنی ہر بار پندرہ میل کے بعد ایک آبادی موجود ہے۔ انگریزی حکومت نے گذشتہ صدی کے پانچویں عشرے میں جب اِس راستہ کی تجدید اصلاح کی تو ہر ایک پڑاؤ پر "لانڈھی (Landhi) تعمیر کی۔ ۱۷ یہ تعمیرات ایسے مقامات پر تیار کی گئیں۔ جہاں انسانی ضرورت کے لئے پانی موجود تھا اور یقیناً قدیم باشندوں نے بھی اِسی سبب سے اِن مقامات کو اپنے قیام کے لئے منتخب کیا تھا۔ مزید وہ مقامات بھی جو چھوٹے چشموں اور ایسے آبی ذخیرون کے پاس موجود ہیں۔ جن میں سال کے سال پانی رہتا ہے۔ اِن میں ایک قدیم آبادی جو کوہ تراش بُٹھی (Koh Trash Buthi) کے نام سے مشہور ہے بہتے ہوئے پانی سے چند گزوں کے فاصلہ پر آباد تھی۔

یہ جگہ دوسرے مقامات سے ممتاز ہے کیونکہ اِس کا محل وقوع ایسا ہے کہ اِسے دفاع کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے تا کہ بلوچستان اور سندھ کے درمیان ایک اہم شاہراہ کی حفاظت کی جا سکے۔ اِس شاہراہ کا بیان ہم آگے چل کر پیش کریں گے۔ عین ممکن ہے کہ مجمدارنے علی مراد (Ali Murad) کے مقام پر جو خود بھی تاریخی زمانہ سے قبل کی ایک دفاعی چوکی ہے۔ ایسا قدیم کنواں دریافت کیا تھا جیسا کوہ تراش کے مقام پر بھی نکل آیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُس زمانہ میں لوگ کسی ایسے تالاب سے پانی کی ضرورت پوری کرتے ہوں جو اُن دو گبر بندوں کے درمیان واقع تھا جو مورچہ بند پہاڑی کو دوسرے بلند مقام سے ملاتے ہیں۔ ۱۸

قدیم آبادیوں کا محل وقوع یہ ظاہر کرتا ہے کہ شاید زمانۂ قدیم میں ایک اور چشمہ بھی یہاں موجود ہوگا جو کافی مدّت پہلے خشک ہو چکا ہے۔ ایسے واقعات سندھ کے پہاڑی علاقہ میں دوسرے مقامات پر بھی ہو چکے ہیں جہاں زلزلہ کی وجہ سے چشمے خشک ہو گئے، ۱۹ بہر نوع حقیقت کچھ بھی ہو، کوہ تراش کے مقام پر کوٹ کے ساتھ خاصی بڑی آبادی موجود تھی، اور کسی

خطرے کے وقت مقامی باشندے اِس میں اپنے مویشی وغیرہ جمع کر لیتے ہوں گے۔ آبادی کے مخصوص مقام سے ذرا نیچے کُھلی ہوئی جگہ میں بھی مکانات کے نشانات ملتے ہیں یہ مکانات اُن لمبے لمبے گبر بندوں کے قریب ہیں جو کِھیر تھر سلسلہ کوہ کے دامن میں ڈھلوان پر تعمیر کئے گئے تھے۔[۲۰]

مجمدار کی مہم کا تعلق وادیٔ سندھ یا ہڑپہ تہذیب کی وسعتوں کا اندازہ کرنے سے تھا جو اُس وقت کی معلومات کے مطابق موہن جودڑو، ہڑاپہ اور اِن کے نواحی میدان کی ایک دو قدیم بستیوں تک محدود تھی، لیکن وہ باقیات جو موہن جودڑو سے دستیاب ہوئیں پہاڑی علاقہ کے مختلف مقامات سے بھی ملنا شروع ہوئیں۔ تب یہ خیال پیدا ہوا کہ اِن کے مابین گہرا تمدنی تعلق موجود ہے، لیکن پہاڑیوں پر قدیم آبادیوں کے کھنڈرات سے گلی ظروف کے ایسے ٹکڑے بھی برآمد ہوئے جن کا تعلق ایک جداگانہ تہذیب سے نظر آیا۔ آمری (Amri) کے مقام پر زمینی تہوں کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوگیا ہے کہ اِن باقیات کا تعلق موہن جودڑو سے بھی زیادہ قدیم تہذیب سے ہے۔ آمری دریائے سندھ سے قریب لکی پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، اِس مقام پر یہ نادر ظروف زمین کی کھدائی کے بعد زیادہ گہرائی سے دستیاب ہوئے۔ اس نئی دریافت کے بعد فوراً ہی مجمدار کو دوسرے پہاڑی قدیم مقامات نے ایسے ہی ظروف آمری اور وادیٔ سندھ سے دریافت شدہ ظروف کے ساتھ ملے جُلے ہوئے نظر آئے۔[۲۱] اور چند مقامات پر صرف آمری یا صرف انڈس قسم کے ظروف ملے، یہ مذکورہ مقامات جہاں ایک یا دوسری قسم کے ظروف ملے یا دونوں قسم کے ملے جُلے ظروف پائے گئے، محلِ وقوع کے اعتبار سے بے ترتیب ہیں۔ مجمدار کو بہت مختصر مدت اِس تحقیق کے لئے ملی۔ چنانچہ جتنا مواد اُسے دستیاب ہوسکا اُس کی مدد سے اُس نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ایسے ظروف جن کی زمین لال اور اُن پر سیاہ نقش و نگار ہوں، طویل مدّت تک اِس علاقہ میں استعمال ہوتے رہے جب کے آمری سے دریافت شدہ ظروف کا تعلق وادی سندھ تہذیب سے بھی زیادہ قدیم تہذیب سے ہے۔ مجمدار کا خیال ہے کہ وادی

سندھ کے تمدن کے ضمن میں آمری سے دریافت شدہ باقیات کی حیثیت سلسلہ تحقیق کے اندر ایک رخنہ اندازی جیسی ہے اور اُس نے سر اوریل کی مکران میں کلی (Kulli) اور مہی (Mehi) کے مقامات سے دریافت شدہ باقیات کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے جن سے آمری باقیات بڑی دور تک مشابہ ہیں۔ کلی اور مہی علی الترتیب مکران اور جھلاواں میں واقع ہیں۔ مزید براں آمری کے ظروف جھلاوان (Jhaawan) میں نال (Nal) اور نندرا (Nundara) کے مقامات سے دریافت شدہ کلی ظروف سے بھی کسی حد تک ملتے جلتے ہیں۔۲۲

مجمدار کی تحریر کے بعد اِن باقیات کا تقابلی جائزہ لیا جا چکا ہے جس کی روشنی میں ازسرنو درجہ بندی ضروری سمجھی گئی، اِس کے مطابق جہاں تک مماثلت کا تعلق ہے آمری کے گلی ظروف بلاشبہ، نندرا ظروف سے ملتے جلتے ہیں اور کلی، میہی باقیات سے اُن کا واسطہ نہیں ہے۔ کلی اور میہی جیسے ظروف کی مثالیں مغربی سندھ کی قدیم آبادیوں کے آثار سے دریافت شدہ ظروف سے البتہ ملتی ہیں۔۲۳ اور اُن ظروف کے ٹکروں سے بھی مشابہ ہیں جن پر نقش و نگار کا ایک مخصوص طرز ملتا ہے جسے توگو (Togau) کہتے ہیں۔ اِس قسم کے ظروف دور دور تک کوئٹہ سے مکران اور گاج وادی سندھ سے آمری تک کسی زمانہ میں عام طور پر مستعمل تھے۔۲۴ اس طرح رفتہ رفتہ جو باقیات ہاتھ لگتی ہیں اُن سے بلوچستان اور سندھ کے سرحدی علاقوں میں آباد زراعت پیشہ برادریوں کے رہن سہن کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ موجودہ زمانہ کے علم آثاریات نے اتنی ترقی کی ہے کہ اِن کے علاوہ دوسرے تمدنی ادوار کے ظروف کو الگ الگ پہچان سکے۔ خواہ اُن باقیات کی مدد سے جو اِس وقت موجود ہیں یا آئندہ دستیاب ہوں گی۔ آئندہ چل کر نئی اور باریک سے باریک مماثلت کو بھی تلاش کرلیا جائیگا، چنانچہ اِن ظروف کے بارے میں ایک عمومی نظریہ تو قائم کیا جاسکتا ہے لیکن اِن کے بارے میں مستقل نظریہ اُس شہادت کی بنا پر قائم کرنا جو ۱۹۶۱ء میں ہمارے سامنے ہے مناسب نہ ہوگا۔

زمانہ تاریخ سے پہلے جو تہذیبیں دریائے سندھ کے مغربی پہاڑی علاقہ میں گذر چکی ہیں، مندرجہ ذیل سطور میں اُن کے متعلق جو حوالہ پیش کیا جا رہا ہے جو خاص طور پر اُن قدیم آبادیوں کے متعلق ہے اور سندھ بلوچستان سرحد کے آس پاس قائم تھیں۔ اِسی طرح اُن کی عام خصوصیات کا بیان پیش کیا جائیگا، جسے گلی ظروف کا تفصیلی جائزہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ جہاں جہاں گلی ظروف کسی تمدّنی امتیاز کے حامل نظر آئیں گے، وہاں ضرور کچھ نتائج نافذ کرنے کی کوشش کرونگا۔ مجھے یہ احساس ہے کہ یہ نتائج تحریر کرنے کے فوراً بعد ہی غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں کیونکہ یقیناً کوئی نئی شہادت دستیاب ہو چکی ہوگی۔

سندھ اور بلوچستان کی مشترکہ سرحد کے آس پاس قدیم آبادیوں کے جو آثار موجود ہیں اُن کے مشاہدے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر چھوٹے دیہات تھے جن میں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے تھے جو مویشی پال کر بسر اوقات کرتے تھے۔ اِن میں جو مکانات تھے وہ مستطیل شکل کے تھے مگر چھوٹے، بنیاد اور اُس پر دو یا تین سلسلے اچھے پتھروں کے ہوئے تھے باقی ڈھانچہ پتھر کے چھوٹے بڑے ٹکروں کو مٹی کے گارے سے چنائے کر کے بنایا جاتا ہوگا۔ جبکہ مکان کا اندرونی ڈھانچہ لکڑی کا ہوگا۔ ہمارا خیال اِس بات پر مبنی ہے کہ یہ سامان اِس وقت بھی اِس علائقہ میں دستیاب ہے۔ تقریباً ہمیشہ ہی مکانات کی جگہ ایسی لکڑی کے سیاہ ٹکروں کی موجودگی سے شناخت کرلی گئی جیسی چھت کے لئے کڑیوں میں استعمال ہوتی ہے۔

کچھ دیہاتوں میں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے، قریب قریب بنائے گئے ہیں اور اکثر ایسے بلند مقام پر واقع ہیں جو مسلسل رہائش کی وجہ سے اونچا ہو گیا ہو۔ اور اُس سے بھی زیادہ طویل عرصہ تک خالی رہنے کی وجہ سے مٹی پتھر کے ایک چھوٹی دار ڈھیر کی شکل میں بدل گیا ہو، دوسری جگہ مکانات الگ الگ بنے ہوئے ہیں اور زمین کے خاصے بڑے ٹکڑے میں پھیلے ہوئے ہیں جن سے ایک پُر اَمن چرواہوں کے معاشرے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے دیہات کی عمدہ مثال کندھی واہی (Kandhi Wahi) ہے۔ یہاں سلسلہ

کھیر تھر کی ایک بلند وادی میں ہمیں ایسی آبادی کے آثار ملتے ہیں جس کا مرکزی حصہ زیادہ آباد تھا۔ یہ ایک چھوٹی پہاڑی پر چار دیواری کے اندر واقع تھا۔ یہ علاقہ پکائی ہوئی مٹی کی گرد اور گلی ظروف کے ٹکروں کی وجہ سے سُرخ نظر آتا ہے۔ تصور ہوتا ہے کہ یہاں دیہات کا مکھی اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہوگا۔ اِس کے چاروں طرف تقریباً ایک چوتھائی میل کے اندر الگ الگ یا جتھے کی شکل میں مکانات پھیلے ہوئے ہیں جن کے کھنڈرات میں مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے اور چقماق کے ورق بکھرے ہوئے ہیں۔

چقماق کے یہ ٹکڑے یقیناً اُن چٹانوں سے توڑے گئے ہوں گے جو ذرا فاصلہ پر پہاڑوں میں موجود ہیں، اور یہاں پتھر توڑنے والوں کے مکانات کی بنیادیں مٹی اور پتھر کے نیچے ملتی ہیں، پتھر توڑنے کی جگہ سے قریب ایک چشمہ ہے جس کے پانی کو نیچے میدان میں کھیتوں تک لیجانے کے لئے جو نالی بنائی گئی ہے، وہ آبادی کے وسط سے گذرتی ہے۔ مسٹر فیڈن ایک ماہر ارضیات جس نے تقریباً اسی برس پہلے اِس جگہ کا مشاہدہ کیا تھا یہ کہتا کہ چشمہ پہلے زمانہ میں کثیر مقدار میں پانی دیتا تھا۔ ۲۵ جبکہ آجکل اِس میں پانی کی مقدار کم ہے، بہرنوع میں نے کندھی واہی میں گیہوں کی کاشت کا جب مشاہدہ کیا تو اِس نتیجہ پر پہنچا کہ کُل پیداوار ایک خاندان کے لئے بھی ناکافی ہے نیز یہ کہ ۱۹۴۲ء میں وہاں کوئی مستقل آبادی نہیں تھی۔ ۲۶ اِس قسم کی منتشر مکانات کی ایک بڑی آبادی بندھنی ندی (Bandhni Nai) کے کنارے پر واقع ہے۔ اِس میں بھی مکھی کے مکانات چبوترہ پر موجود ہیں اور چقماق توڑنے کا مقام بھی البتہ آبپاشی کا نظام بہتر ہے اور یہ مقام کندھی واہی کی نسبت زیادہ دلکش ہے۔ ۲۷

اِن آبادیوں کے مقابل قصبات کی آبادیاں ہیں جہاں رہائشی مکانات کی اکثریت جتھوں کی شکل میں ہے۔ اِن میں بڑی آبادیاں ڈمب بُھٹی (Damib Buthi)، تونگ (Taung)، نئینگ (Naig) اور کائی (Kai) ہیں۔ ہر ایک آبادی کے نزدیک کثیر پانی کا چشمہ موجود ہے جو اِس زمانہ میں دو تین سو ایکڑ زمین کو سیراب کرتا ہے۔ تونگ

میری(Miri)، تونگ(Toung) محال کوہستان میں

چشمہ رتن شاہ(Ratan Shah)، تونگ کے مقام پر مورچہ بندی کے نشانات

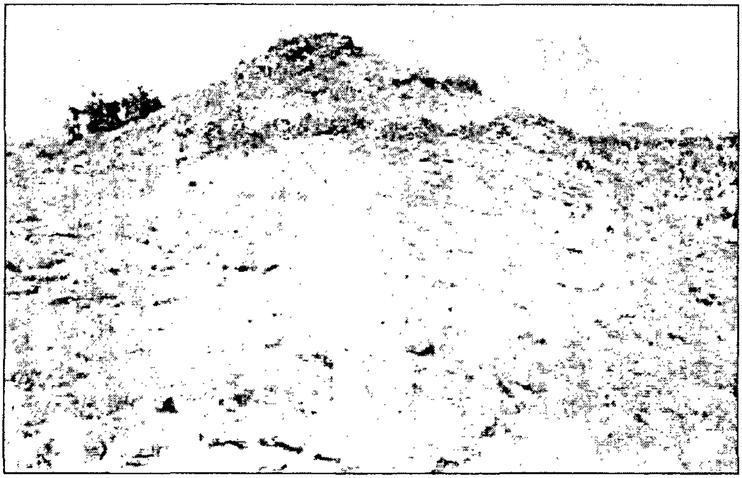

لنڈی بٹھی(Lundi/ Buthi)نیئنگ(Naing) تعلقہ سہون کے نزدیک

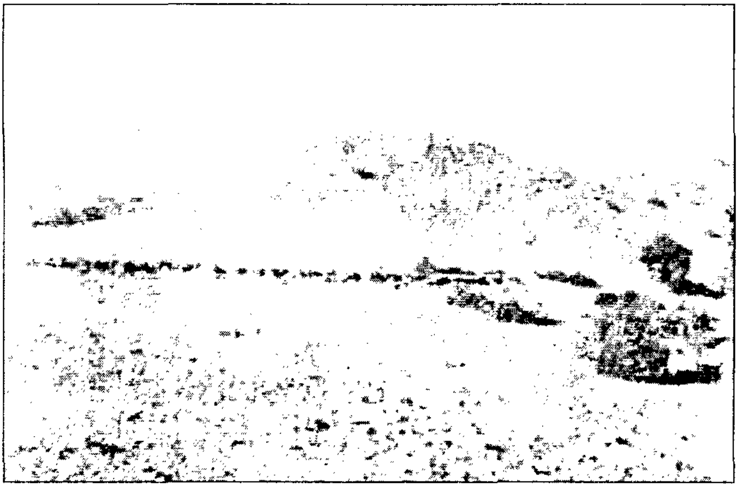

کائی بُٹھی(Kai Buthi)تعلقہ سہون

اورنئینگ میں چشمہ کے دہانے کو پشتہ دے کر پانی کے مخرج کو بند کیا گیا ہے۔ اِن کے نزدیک نواحی بستیوں کے آثار بھی موجود ہیں۔ کائی کے مقام پر ایک مسطح چوٹی کی پہاڑی کو جو اطراف سے کٹی پھٹی ہوئی ہے اور قصبہ کی آبادی سے چند سو گز کے فاصلہ پر ہے چار دیواری سے ایک حفاظتی چوکی میں تبدیل کیا گیا تھا جیسا کہ ہم کوہ تراش بُٹھی میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خطرے کے موقع پر اِسے استعمال کیا جاتا تھا اور کائی وادی کے باشندے اِس میں پناہ لیتے تھے۔ یہ عمل تاریخی زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، لیکن کانسی عہد کے ظروف گلی کے ٹکڑے بھی خاصی مقدار میں موجود ہیں۔

اِن چاروں مقامات پر مکھی کی رہائش گاہ کے چبوترے یکساں خصوصیات کے حامل ہیں۔ تونگ میں "میریؔ (Miri)، نئنگ میں لکھمیر جی ماڑی، اور دمب بُٹھی (Dumb Buthi) میدانی سطح سے تقریباً ساٹھ فٹ بلند ہیں۔ کائی وادی میں بُٹھی (Buthi) اتنی بلند نہیں ہے، لیکن اِس کا مجموعی رقبہ بھی دوسروں کے برابر ہے۔ تونگ اور نئنگ انسان کی کاریگری کے ممتاز نمونے کہے جاسکتے ہیں۔ یہاں فرش پر جو اُلٹے سیدھے بڑے بڑے پتھر لگے ہوئے ہیں، اُن کے درمیان انسانی ہاتھ کے چنے ہوئے سلسلے صاف نظر آجاتے ہیں، مقامی روایت کے مطابق میریؔ اور لکھمیر جی ماڑی عہد عتیق کے حکمرانوں کے قلعے تھے۔ جو پہریداروں کی چوکی، ملازمین کے مکانات اور اصطبل وغیرہ کی درمیان ایک بلند پوزیشن رکھتے تھے۔

۱۹۳۵ء کے زلزلہ کے وقت تک قلات میں خوبصورت "میریؔ" ☆ کی جو صورت تھی وہ مندرجہ بالا سطور مین بیان کی گئی۔ ایسا ہی قدیم ایک اور مقام بھی ہے جو لُنڈی بُٹھی کہلاتا ہے اور نئنگ سے جنوب مشرق میں تقریباً ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اِس شہر کی ابتدائی شکل کا اندازہ لگانا زیادہ آسان ہے یہ چوٹی دار ٹیلہ پتھر کی تین فصیلوں سے گھرا ہوا ہے جن میں سے ایک دوسری پر بنائی گئی ہے۔ اور چوٹی پر ایک عمارت کے آثار ہیں، اِس کا

☆ ''میری'' بلوچی زبان میں قلعے یا چھوٹے قلعے کو کہتے ہیں (ادارہ)

مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے یہ عمارت عبادت گاہ ہوگی، جیسے میسوپوٹامیہ کے اہرامی شکل کے عبادت گاہ ہوتے ہیں۔ جن کے اوپر کی منزل اپنی نچلی منزل سے چھوٹی ہوتی تھی اور ممکن ہے کہ توتک میری اور ننگ میں لکھمیر جی ماڑی کی عمارات بھی شاہی قلعہ کے بجائے ایسے ہی مندر ہوں۔ حالانکہ کثیر مقدار میں مختلف قسم کی ٹوٹ پھوٹ جو وہاں جمع ہے یہ بتاتی ہے کہ یہ آبادی کا مرکزی حصہ تھا، لُنڈی بُٹھی کے نیچے چٹان کا بڑا فراش ضرور آباد ہوگا۔ کیونکہ یہاں مکانات کی بوسیدہ کڑیوں، ظروف کے ٹکروں اور چقماق کے ٹکروں کے ڈھیر پائے جاتے ہیں، اور اِس مقام کا عام منظر ڈمب بُٹھی سے ملتا جلتا ہے۔

مقامی باشندوں میں یہ مشہور ہے کہ لُنڈی بُٹھی کی دیواریں حفاظتی فصیلوں کا کام دیتی تھیں اور ایسے ہی دوسرے مقامات بھی خطرے کے وقت ننگ کے باشندوں کیلئے پناہ گاہوں کا کام دیتے تھے۔ اِس وقت تک جو باقیات اِن مقامات سے دریافت ہوئیں ہیں اُن سے سندھ اور بلوچستان کی مشترکہ سرحد کے آس پاس اُس قدیم زمانہ کے باشندوں کے معیارِ تہذیب کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ تانبے کے استعمال سے واقف تھے۔ لیکن اِس دھات کو وہ لوگ زیادہ تر جسمانی زیب و زینت کی اشیاء مثلاً بالوں کے کلپ، انگوٹھیاں اور ہار وغیرہ کے لئے استعمال کرتے تھے، اوزاروں کے لئے نہیں۔ ممکن ہے مزید کھدائی کے بعد تانبے کی کُلہاڑیاں اور دوسرے اوزار بھی مل جائیں۔ مسٹر ہارگریوز ''نال'' کے مقام پر ایسے ہی اوزاروں کے دو مجموعے دریافت کر چکے ہیں، لیکن اکثر و بیشتر وہ اوزار جنھیں کاٹنے کے لئے یا کھودنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا، چقماق اور دوسرے پتھر سے بنائے جاتے تھے۔ بہت سے اوزار مثلاً چاقو، کھرچے چُھرے وغیرہ دستکاری کے عمدہ نمونے ہیں۔[۳۰] اِس زمانہ کے کچھ صناع قیمتی پتھروں پر بھی کام کرتے تھے جن کے نمونے دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُن میں سوراخ بنانے اور پالش کرنے کے ماہر تھے۔

اِس تمدن کی بہترین نشانی بہر طور ظروف گلی کی باقیات ہیں۔ آمری کے کمہار انتہائی عمدہ اور نرم مٹی استعمال کرتے تھے جو گلابی یا ہلکے لال رنگ کی ہوتی تھی۔ ظروف کی سطح عام

طور پر بادامی یا سبزی مائل ہوتی تھی۔ برتن کے گلے یا مُنہ کے چاروں طرف گلابی یا لال رنگ کی پٹی وہ لوگ بناتے تھے اور اِس پٹی پر سیاہ یا کتھئی رنگ میں نقش ونگار بناتے تھے۔ جتنے بھی نقش ونگار ہیں، وہ تقریباً محفوظ قسم کے ہیں جن کے زاویوں کو نقوش سے بھرنا آمری کے ظروف کی خصوصیت شمار ہوتا ہے۔ دوسرے نقوش میں ہیروں کی شکل جنھیں ایک دوسرے کے کونہ سے کونا ملا کر بنایا جاتا تھا شامل ہیں اِسی طرح زنجیر کی کڑیوں کی شکل بھی اِس میں شامل ہے۔ اِس وقت آمری کے ظروف کے ٹکروں پر کسی جانور یا انسان کی تصویر نہیں ملی۔ اور چند اشکال جو پتوں اور درختون سے مشابہ نظر آتی ہیں وہ شاید اتفاق ہیں۔ اِس قوم کے کمہاروں نے اپنا طرز فطری شکلوں کی مدد کے بغیر خود ہی ایجاد کیا، بہرصورت ایسے مقامات جہاں سے آمری قسم سے تعلق رکھنے والے ظروف کے ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں۔ اُن میں چند مقامات ایسے بھی ہیں جہاں ایک دیگر تمدّن سے تعلق رکھنے واے برتنوں کے ٹکڑے حاصل ہوئے۔ اِن پر جانوروں، پتوں اور پھولوں کے نقوش ملتے ہیں۔ ۳۱ پہاڑی بکرا آج بھی سلسلہ کھیرتھر اور نواحی پہاڑی علائقہ میں عام ہے اور اِسی طرح جھلاوان اور مکران میں بھی جہاں کانسی عہد کے زرعی تمدّن پروان چڑھے، سندھ بلوچستان سرحد کے قریب قدیم آثاروں سے ظروف گلی کی ایسی باقیات بھی حاصل ہوئی ہیں جن میں نال، کلی میہی اور وادیٔ سندھ کے تمدن کے ساتھ آمری تمدّن کے برتنوں کی آمیزش ہے۔ یہ آبادیوں کے اندر بھی دریافت ہوئے ہیں۔ ۳۲ اور دوسری جگہوں پر ملے جُلے ڈھیروں کی شکل میں بھی۔ ۳۳ کچھ مخلوط مقامات پر ایسے ظروف گلی بھی ملے ہیں جن کے نقش ونگار مٹی کو اُبھار کر یا کھود کر بنائے گئے ہیں۔ اِس کی اہمیت پر آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے۔

آمری قوم اپنے مُردوں کو کس طرح ٹھکانے لگاتی تھی اِس کے متعلق ہمارے پاس صرف وہ معلومات ہیں جو مجمدار نے ڈمب بُٹھی میں تحقیق کے دوران حاصل کیں۔ اِس طریقہ تدفین کو جزوی کہا جاسکتا ہے، مُردے کی راکھ کو پتھر کی بنی ہوئی قبروں میں ظروف اور دوسری استعمالی اشیاء کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا۔ اِس قبرستان میں نال کے قبرستان سے

جسے ہارگریوز نے کھدائی کر کے دریافت کیا تھا اتنی مماثلت ہے کہ ہم بلا جھجک یہ کہہ سکتے ہیں کہ دونوں جگہ کے لوگ تمدنی اعتبار سے ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے تھے۔

ابھی تک کوئی چیز ایسی حاصل نہیں ہوسکی جس سے آمری کے باشندوں کے مذہبی عقائد پر روشنی پڑتی۔ منچھر جھیل کے شمالی میدان میں واقع لاکھیو (Lakhio) کے مقام پر جو تمدن سندھ سے تعلق رکھنے والا ایک مقام ہے اور اسی طرح آمری علائقہ کی شمالی مشرقی سرحد کے قریب دیوی ماتا کی مورتیاں دریافت کی گئی ہیں۔۳۶ ایسی ہی مورتیاں کلّی میہی ۳۷ تمدن کی خصوصیات شمار ہوتی ہیں جس کا مخصوص علائقہ جنوبی مغربی جھلاوان اور مکران کا مشرقی حصہ ہے۔ اس میں نال کے تمدن سے تعلق رکھنے والے مقامات کے آثار بھی ہیں، یہ کہا جاسکتا ہے کہ آمری لوگوں کی مغربی سرحد اور یہ علائقے تمدنی ترقی میں شانہ بشانہ آگے بڑھ رہے تھے۔ چنانچہ جب تک کوئی براہ راست تعلق رکھنے والی شہادت حاصل نہ ہو، ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ آمری کے لوگوں کے مذہبی عقائد اُن کے مندرجہ بالا پڑوسیوں سے ملتے جُلتے تھے۔

کیا آمری کے لوگوں کا کوئی صدر مقام تھا۔ اور اگر تھا تو یہ کہاں تھا؟ میں نہیں سمجھتا کہ اِن لوگوں کا صدر مقام کوئی موہن جو دڑو جیسا بڑا شہر تھا۔ بلکہ بڑا دیہات یا چند ایسے دیہاتوں کا مجموعہ جہاں نواحی بستیوں کے باشندے خرید و فروخت کے لئے آتے تھے۔ آمری علائقہ اجتماعی طور پر منظم آبادی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ یہاں بلند وادیاں ہیں جن کے بیچ میں پہاڑی سلسلے جگہ جگہ حائل ہیں اور کچھ زمین کے قطعات جو سندھ کے میدانوں سے مل جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِس علائقہ میں مغرب کی طرف سے کثرت آبادی کی وجہ سے آہستہ آہستہ لوگ داخل ہوتے رہے، جہاں موسم کی تبدیلیوں نے لوگوں کو نئے علائقہ کی طرف ہجرت پر مجبور کردیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آمری تمدن سندھ کے میدانون تک نہیں پہنچا۔ وہاں ابھی تک اِس تمدن کے کوئی آثار نہیں ملے۔ نہ کسی الگ مقام پر اور نہ ایسے مقام کی نچلی سطح پر جیسے چانہوں دڑو (Chanhu Daro)۔ حقیقت

یہ ہے کہ مغرب کی طرف سے پیش قدمی کرنے والے چرواہوں کے لئے سندھ کے گرد آلود میدان باعث دلچسپی نہیں ہو سکتے، اُن لوگوں کی نظر میں "مٹھودریا" اپنے سالانہ سیلابی موسم کی وجہ سے باعثِ خوشحالی نہیں۔ باعث تباہی ہوگا۔ چنانچہ وہ پہاڑی کے دامن اور کچھو (Kacho) پر ہی قانع رہے۔ اور اپنی بستیاں ایسی جگہوں پر بساتے رہے جہاں سندھ کا پانی نہیں پہنچ سکتا۔ اور ایسی پہاڑیاں جن سے وہ مانوس تھے اور جن میں چشمے بھی موجود تھے اِن لوگوں کو زیادہ بھلے معلوم ہوتے تھے۔ اِس دور کے ہزار سال بعد بلوچی قوم جو خود بھی گلّہ بان تھے مشرق کی سمت بڑھتے ہوئے کچھو میں آکر اسی لئے ٹھہر گئے کہ اُنھیں مویشیوں کی چراگاہیں ایسے سرسبز اور زرخیز میدانوں سے بہتر معلوم ہوئیں جہاں آئے دن سیلابوں کا پانی بھرتا رہتا تھا، لیکن جب یہی قوم گلّہ بانی سے زراعت کی طرف مائل ہوئی تب پورے سندھ میں جم کر رہنے لگی۔

مندرجہ بالا پس منظر کے ساتھ مشترکہ سرحد پر جو آبادیاں تھیں، وہ اِس سے زیادہ اور کچھ ظاہر نہیں کرتیں کہ علاقہ پر مکمل طور پر قبضہ مقصود تھا۔ آگے چل کر سندھ و بلوچستان کے درمیان باہمی رابطے کے راستے جیسے جیسے اہمیت اختیار کرتے گئے اِن کی اہمیت بھی بڑھتی گئی اور پھر یہاں دونوں ممالک کا تجارتی مال بدلا جانے لگا۔

ایک صدی قبل کوہستان سندھ میں قدیم آثاریات کی طرف جب برطانوی افسران متوجہ ہوئے تو اُنھیں معلوم ہوا کہ مقامی باشندے اِن آبادیوں کی تعمیر کو "وڈواز (Wudwas)" سے منسوب کرتے ہیں۔ بارٹل فریئر (Barttle Frere) لکھتا ہے کہ یہ نام "بڑے" یا "قدیم" لوگوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اِس طبقہ کے بچے کھچے لوگوں کو محمد بن قاسم نے ختم کر دیا تھا، فریئر کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اِس قوم کا دارالخلافہ "حب سرونا (Habb Sarona)" تھا، جو بیلا (Bela) سے بھی زیادہ قدیم تھا۔ گو بیلا کو اپنی تین ہزار سالہ پُرانی تاریخ پر فخر ہے، یہ لوگ کندراج (Kundraj) کے مقام پر واقع سیسہ کی کانوں کو بھی استعمال کرتے تھے۔[۳۹]

سرونا کا میدان حب ندی کی وادی کے قریب مغرب میں واقع ہے اور اس کا محل وقوع ۲۶ ڈگری دس فٹ اور ۲۶ ڈگری ۲۰ عرض البلد کے درمیان ہے، فریئر کی دریافت سے تقریباً پچاس سال بعد ہیوز بلر نے حب ندی کے نصف راستہ کے قریب پہلی مرتبہ وہ گبر بند دریافت کئے جو اس ضمن میں اچھے نمونے شمار ہوتے ہیں اور اس علاقہ کی ایک خصوصیت ہیں۔ سرونا میدان کا جنوبی حصہ تقریباً سات میل چوڑا ہے، اور جنوبی جھلاوان کے علاقہ میں زرعی زمین کا ایک بڑا اور مسلسل قطعہ ہے۔ اس کا رقبہ شاید پچاس ہزار ایکڑ پر مشتمل ہوگا۔ جس میں سرسبز گھاس، جھاڑیاں اور درخت پھیلے ہوئے ہیں۔[۴۰] اگر یہ درست ہے کہ زمانہ قدیم میں یہاں کثرت سے بارش ہوتی تھی تو یقیناً یہ حصہ زراعت کا بڑا مرکز ہوگا جو خوشحال بھی تھا۔ اور قدیم باشندوں نے احمد بند جیسی تعمیرات کے ذریعہ اس کی زرخیزی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ یہ بند آدھا میل لمبا ہے اسی قسم کی دوسری تعمیر پیر مناغر بند (Pri Munaghara) ہے جس کے اندر بارش کے پانی سے بہہ کر آنے والی مٹی کا ذخیرہ ہیوز بلر کے بیان کے مطابق تیس فٹ گہری تہہ کی شکل میں موجود ہے۔ وادی کے اندر کئی مقامات پر اور اسی طرح نواحی علاقہ میں ہیوز بلر کو قدیم آبادیوں کے آثار ملے۔ مکانات کا طرز وہی پتھر کے بند ڈھانچوں سے مشابہ تھا، جو جنوبی کوہستان کی آبادیوں کی خصوصیت ہے، ان سے مختلف ایسی گول عمارات کے آثار بھی موصوف نے دریافت کئے جو اُس کے خیال کے مطابق زرتشتیوں (Zorastrians) کے مندر ہو سکتے ہیں۔ یا گنبدِ خاموش (Tower of Silence)۔ شاید اسی وجہ سے ہیوز بلر نے گبر بندوں کی تعمیر کو فارسی زرتشتیوں سے منسوب کر دیا۔ اُس وقت یعنی آج سے ایک سو سال پہلے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ تاریخ سے بھی پہلے قدیم زمانہ میں یہاں ایک مختلف تمدن کی فرمانروائی تھی۔ سوائے اُن مقامی روایات کے جو فریئر کے افسران نے جمع کی تھیں۔ چنانچہ ہیوز بلر کو پختہ یقین ہو گیا کہ ان بندوں کی تعمیر زرتشتوں، ہندوستان کے بودھوں اور عربوں میں سے کسی ایک کا کارنامہ ہے کیونکہ اُس کے نزدیک یہی اقوام ایسی ماہرانہ تعمیرات کی صلاحیت

رکھتی تھیں۔ یہ فطری امر تھا کہ جو مقامات کم مشہور تھے اُن کے بارے میں اُس نے صرف سرسری جائزہ پیش کر دیا، مثلاً بہت سے ٹیلوں پر گلی ظروف کے ٹکروں کی مقدار موجود ہے۔ لیکن اِن کا تعلق قدیم باشندوں سے بھی ہوسکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کیونکہ اُس زمانہ قدیم میں جب بیرونی حملوں اور یلغاروں کا سامنا ہوتا تھا تو ایک ہی بلند مقام کو مختلف اوقات میں تعمیر کیا جاتا تھا۔ اِس وجہ سے کہ یہ مقام اپنے بلند محل وقوع کی بدولت زیادہ تحفظ فراہم کرتا تھا۔[۴۱] یہ قدیم ٹیلے آنیوالے تحقیق کی توجہ کا مرکز بنے۔ فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر اسٹین ہارگریوز اور مجمدار آگے بڑھے، جن کی تحقیق کا مرکز تاریخ سے پہلے کا سندھ اور بلوچستان کا تمدن تھا اِن لوگوں نے ہیوز بُلر کے مقالہ کی اشاعت کے بیس سال بعد اپنا کام شروع کیا۔[۴۲]

گلی ظروف کی درجہ بندی ہونے تک جو مختصر تفصیل اِن ٹیلوں کے بارے میں دی گئی ہے وہ درجنوں مقامات کے لئے درست قرار دی جاسکتی ہے اور سرونا کے میدان میں آثار قدیم فریئر کی تحریر کردہ اِس روایت کی تصدیق کرتے نظر آتے ہیں کہ عہد قدیم کے باشندوں کا مرکزی شہر "حب سرونا" تھا۔

اگر یہ فرض کرتے ہیں کہ اِسی قدیم نسل کے لوگوں نے آبپاشی اور زمین کو بچانے کے لئے احمد بند اور پیر مناغر بند جیسی تعمیرات کو مکمل کیا، تو تصور پیدا ہوتا ہے کہ یہ طویل میدان کسی زمانہ میں مکئی کے کھیتوں سے بھرا ہوا ہوگا اور جگہ جگہ آبادیاں موجود ہوں گی اور اِنھیں میں کسی جگہ ایسی منڈی بھی ہوگی جہاں کم ترقی یافتہ نواحی علاقہ کے لوگ اپنی ضرورت کا سامان خریدنے آتے ہوں گے۔ مشرق کی طرف چھوٹے چھوٹے زراعتی قطعات تھے، ہیوز بُلر نے حب ندی کے ساتھ ساتھ کوٹیرو (Kotiro) اور دوسرے مقامات پر گبر بندوں کی موجودگی ذکر کیا ہے۔ اور اِسی طرح حب ندی کے مشرقی کنارے پر بہلور (Bahlur) کی کشادہ وادی میں بھی جو سلسلہ کھیرتھر اور سندھ کی موجودہ سرحد کے ساتھ واقع ہے۔

کوتیرو کی اصطلاح مقامی باشندے اپنے پیش اور قدیم باشندوں کے کھنڈرات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ موجودہ مقام کے لئے یہ اہم اضافہ ہے کہ اِس کے ساتھ "ور کی لوک" (War-ke-Log) یعنی بڑے یا قدیم لوگ، یا وڈواس (Wadwas) کے معنوں میں استعمال ہوسکتا ہے۔[۴۳]

سیسہ کی کانیں جو ''وڈواس'' قوم استعمال کرتی تھی کنراچ وادی میں واقع ہیں، یہ سرونا وادی سے تیں میل مغرب میں واقع ہے، گزیٹیر آف لسبیلہ میں اُس جگہ کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں سیسہ پایا جاتا ہے۔ اور کنراچ کوٹ کے مقام پر ایک قدیم آبادی کا ذکر بھی موجود ہے۔[۴۴] یہ جگہ وادی سندھ اور پہاڑی علاقوں کے قدیم تمدّن کے حوالہ کہ وجہ سے مخصوص توجہ کی مستحق ہوجاتی ہے اور یہ کہ یہاں تانبہ بھی کثیر مقدار میں موجود ہے، کنراچ وادی کا راستہ دشوار گذار ہے کیونکہ کنکریلی پتھریلی پہاڑیاں چاروں طرف موجود ہیں۔ لیکن دوراستے موجود ہیں جو باوجود اپنے پیچ وخم اور نشیب وفراز کے ہلکے لدے ہوئے اونٹوں کے لئے مناسب ہیں، یہ راستے سرونا جاتے ہیں اور پب (Pab) کے پہاڑی سلسلہ زئی (Zai) اور برور (Baror) دروں کے ذریعہ راستہ طے کرتے ہیں۔ اِن راستوں کی موجود قیاس کے مطابق پہاڑی علائقہ کے باشندوں کی ضرورت کے لئے یہاں سے دھات بھیجی جاتی تھی، اور ممکن ہے وہاں سے سندھ کے میدانوں تک بھی جاتی ہو۔

سرونا وادی کو موجود سندھ کے پہاڑی علائقہ کے درمیان ذرائع آمدورفت خاصے اچھے تھے۔ بہرنوع قدیم تمدّن کا جائزہ لیتے ہوئے۔ موجودہ زمانہ کی ملکی سرحدوں کا ذکر غیرضروری معلوم ہوتا ہے، قدیم باشندوں کے لئے کھیرتھر پہاڑی سلسلہ ایک قدرتی رکاوٹ تھا جس کو عبور کرنا آسان نہیں تھا۔ جبکہ جھلاوان کے باشندوں کے لئے یہ پہاڑی سلسلہ کے مشرقی کڑی کی حیثیت رکھتا تھا جسے پار کرنا اُن کے لئے زیادہ آسان تھا کیونکہ یہ سلسلہ بلندی کے اعتبار سے اُن کے لئے کم تھا۔ منچھر جھیل کے بالکل مقابل یہ صورت حال زیادہ واضح ہے۔ جہاں قریب قریب کئی درّے واقع ہیں جنھیں ہم پہلے باب میں بیان کرچکے

ہیں۔ اِن سب کی بلندی سطح سمندر سے تین ہزار فٹ سے زیادہ نہیں ہے۔ سرونا کا میدان ہی سطح سمندر سے ایک ہزار فٹ بلند ہے اور یہاں سے دو راستے سندھ کے پہاڑی علاقہ میں داخل ہوتے ہیں۔

شمال میں کُھڈ (Khude) کا پہاڑی سلسلہ وادی حب سے گذرتے ہوئے ترپوری لک (Trepori Lak) پہاڑی کی شکل میں اور بھی نیچا ہوگیا ہے اور مقابل سمت میں مسافری لک (Musaferi Lak) پہاڑی کی شکل میں کھیرتھر کی ذیلی پہاڑیوں سے مل جاتا ہے۔ یہ راستہ اوپر لوئی ندی (Loi Nadi) کی وادی میں داخل ہوجاتا ہے اور گاڑ (Garre) کے درّہ سے کھیرتھر کو عبور کرنے کے بعد یہ منچھر کی طرف انگئی ندی کے ساتھ ساتھ نیچے چلا جاتا ہے۔ آجکل یہی راستہ زیادہ استعمال ہوتا ہے جس کے ذریعہ سامان اور آدمیوں کی آمد ورفت سندھ اور بلوچستان کے درمیان ہوتی ہے۔

دوسرا راستہ سندھ کوہستان کے جنوبی حصہ سے ملتا ہے۔ یہ زیادہ آسان اور سیدھا ہے یہ سرونا وادی سے سرونا ندی کے ساتھ ساتھ گذرتا ہے اور آری پیر (Ari Pir) پہنچ کر حب ندی کو عبور کرتا ہے، جس کے بائیں کنارے ہوتا ہوا دیوانہ (Divana) اور درّے جی (Durre Ji) سے گذرتا ہے، یہاں کے بعد حب کی معاون ندی کو پار کرکے بیلی تھاپ (Beli Thap) پہنچتا ہے، اور ایک کم بلند اور چوڑی پہاڑی کو جو گز (Gaz) کے نام سے مشہور ہے عبور کرتا ہے اور تونگ کے نزدیک بارن نائے کی بالائی وادی میں داخل ہوجاتا ہے۔ شمالی راستہ کی طرح یہ راستہ بھی جھلاواں سے زیریں سندھ کے علاقہ میں سامان تجارت سے لدے ہوئے اونٹوں اور مسافروں کی مشہور گذرگاہ ہے، اور سندھ میں یہ راستہ "پش واٹ" (Pish Wat) کے نام سے مشہور ہے۔[۴۵]

اگر کوئی جنس جو قدیم زمانہ کی معیشت میں یقینی طور پر اہمیت کی حامل کہی جاسکتی ہے، وہ پیش (Pish) ہے۔ کوئی متبادل شے ایسی نہیں جو پیش جیسے ریشے کی چٹائیاں بنا سکے۔ موجودہ سندھ کے مقامات کی چھتوں کے لئے یہ ایک ضروری خام مال ہے، جس پر کچی مٹی

لادی جاتی ہے، میدانوں کے سرکنڈے اور گھاس اِن کے گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ یقیناً موہن جودڑو اور دیگر سندھی قدیم آبادیوں کے مکانات کی چھتیں اِنھیں چٹائیوں سے بنے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ چٹائیاں مقامی طور پر بُنی جاتی تھیں جبکہ پتیاں جھلاوان سے آتی تھیں۔ ۴۶

اِس طرح جہاں جہاں آمری تمدن سے تعلق رکھنے والی بستیاں موجود ہیں۔ وہاں پورے علاقہ میں آمد و رفت کے لئے اور اونٹوں کے قافلہ کے لئے آسان راستے موجود ہیں، اِس کے علاوہ مختلف سمتوں میں بہت سے چھوٹے چھوٹے راستے بھی موجود ہیں، لیکن سرونا کے مغرب اور جنوب مغربی علاقے کو جو راستے جاتے ہیں وہ قدرے مشکل ہیں۔

مجموعی حیثیت سے جو تصویر ہمارے سامنے آتی ہے اُس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ قدیم باشندے عملی لوگ تھے، جو اپنے وطن کی دشواریوں کے باوجود اِس سے محبت رکھتے تھے اور اِس سے اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے بہترین ذہانت استعمال کرتے تھے، وہ اپنے پڑوسی ممالک سے تجارت کے روابط رکھتے تھے، خاص طور پر میدانی علاقے کے لوگوں کے ساتھ۔ لیکن اُن لوگوں کے تمدن سے متاثر ہونے کے لئے تیار نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی اعتبار سے اِن لوگوں کو اپنے اوپر اعتماد تھا۔ حالانکہ مادی اعتبار سے یہ دوسروں کی مدد کی ضرورت رکھتے تھے۔ اناج کی ضرورت یہ لوگ میدانوں سے پوری کرتے ہوں گے، شاید منچھر جھیل کے علاقے سے جس کے عوض یہ لوگ اون، بکری کے بال اور پیش اُنھیں دیتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ اشیاء بلند پہاڑی علاقے میں ہی ملتی ہیں۔

اِس طرح اپنی زرعی اور انجینئرنگ کی مہارت کی وجہ سے یہ قدیم لوگ اپنے زمانہ کے خانہ بدوشوں سے ممتاز ہیں، لیکن وسائل معیشت کے اعتبار سے دونوں ایک ہی سطح پر نظر آتے ہیں، کیونکہ پانچ ہزار سال کے عرصہ میں ذرائع پیداوار اور ذرائع نقل و حمل میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی، قدیم زمانہ میں آب و ہوا زیادہ نم ہوگی۔ لیکن پہاڑی علاقہ کے صاف پانی، سرسبز گھاس اور عمدہ ہوا میں میدانی علاقہ سے جو تضاد آج پایا جاتا ہے یہ اُس زمانہ میں بھی موجود

ہوگا۔ آمری لوگوں کا انجام کیا ہوا؟ ہماری تحقیق کی ابتداء پہاڑی علائقہ میں اُن مقامات سے ہونی چاہیے جہاں آمری اور ہڑپہ تمدّن کے مخلوط آثار پائے جاتے ہیں اور وہ آبادیاں بھی توجہ کی مستحق ہیں جو دوہری آبادی رکھتی تھیں اور تین اقسام کی تحقیق چاہتی ہیں، یعنی۔

1. آمری (Amri) اور لوہری (Lohri) کی کھدائی میں واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف نہیں۔
2. ڈمب بٹھی (Dumb Phithi) اور ڈلھ (Dalh) میں آبادی کے دو واضح طور پر جداگانہ حصّے۔
3. پئی جو کوٹیرو (Pai-Jo-Kotiro)، تو نگ اور ننگ اس مختلف قسم کی اور مخلوط باقیات۔

یہ ضروری ہے کہ پہلے سندھ کے میدان سے تعلق رکھنے والی ہڑاپہ تہذیب کا جائزہ لیا جائے۔

تشریحات باب پانچواں

1. کتاب کے مصنف کا مقالہ جو ۱۹۴۱ء میں جرنل آف دی سندھ ہسٹوریکل سوسائٹی میں شائع ہوا، جلد ششم نمبر۲ صفحہ ۱۰۷۔

2. مجھے ۱۹۴۱ء میں پہلی باران کے متعلق معلومات حاصل ہوئیں۔یہ معلومات کیپٹن ریڈ ڈک (Reid Diek) کی توسط سے مجھ تک پہنچیں جنہوں نے یہ نمونے ڈرگ روڈ کے جنوب میں ایک برساتی نالے کے کنارے سے حاصل کئے تھے،بحوالہ جے-ایس-ایچ-ایس جلد ششم نمبر۲،صفحہ ۱۰۸،اور کرنل ڈی ایچ گورڈن کی کتاب "دی اسٹون انڈسٹریز آف دی ہولوسین اِن انڈیا اینڈ پاکستان،اور "اینشی اینٹ انڈیا" ۱۹۵۰ء صفحہ ۶۴۔

3. آریان "انڈیکا" باب ۲۴،اور باب ۲۹ نیز "اناباسس" ششم ۔۲۳۔

4. آریان "اناباسس"،ششم ۲۲۔۲۶۔

5. آریان۔"اناباسس" ششم-۲۵-۲۶۔

6. مکران سے گذرنے کے لئے سکندر نے جو راستہ اختیار کیا اُس کا تعین سر اوریل اسٹین نے کیا۔دیکھو "جیوگرافیکل جرنل،سی II "نومبر،دسمبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۹۳۔تاریخی دور سے قبل کے نوادرات کے لئے جوکولوا علاقہ سے دستیاب ہوسکیں۔دیکھئے۔"میموائرس آف دی جیولوجیکل سروے آف انڈیا" نمبر ۲۳ اور "این آرکیولوجیکل ٹور اِن گیڈروسیا ۱۹۲۸"ء۔

7. معلوم ہوتا ہے کہ بارٹل فریئر کے وقت میں لوگ اِن تعمیرات کو "وڈوا" سے منسوب کرتے تھے۔صفحہ ۶۳۔

8. آرکیولوجیکل سروے آف انڈیا کی سالانہ رپورٹ ۱۹۰۳-۴ (کلکتہ ۱۹۰۶ء) "گبربند" اِن بلوچستان" مصنف آر،ھیوز بلر اور سر پی۔سائکس کی "ہسٹری

آف پرشیا" ۱۷۸، فٹ نوٹ

9. لس بیلہ گزیٹیر۔ صفحہ ۴۴-۱۷۶، مکران گزیٹیر۔ صفحہ ۳۰۴۔

10. یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ڈیوڈورس سائکولس کے بیان کے مطابق اوریتائی لوگ اپنے مُردوں کو کھلا چھوڑ دیتے تھے۔

11. اے-آر-اے-ایس-آئی ۴-۱۹۰۳ء " گبر بند اِن بلوچستان " مصنف ہیوز بُلر۔

12. ایم-اے-ایس-آئی نمبر ۳۵، "ایکس کیویشنز اِن بلوچستان" ۱۹۲۵ء (کلکتہ ۱۹۲۹ء)

13. ایم-اے-ایس-آئی نمبر ۴۳۔ "این آرکیولوجیکل ٹور اِن گیڈروسیا" ۱۹۲۸ء مصنف سر اوریل اسٹائن (کلکتہ ۱۹۳۱ء) پگوٹ کی "پری ہسٹورک انڈیا" صفحات ۶۹-۷۰ (پلیکان ۱۹۵۰ء)۔

14. جے-ایس-ایچ-ایس۔ جلد ہفتم صفحہ ۳-۶۱۔

15. ایم-اے-ایس-آئی نمبر ۴۳، "این آرکیولوجیکل ٹور اِن گیڈروسیا" منصف سر اوریل اسٹین-صفحہ ۲۴-۲۵۔

16. سر مورٹیمر وہیلر "دی انڈس سوی لائزیشن" صفحہ ۷۔

17. ایم-اے-ایس-آئی نمبر ۴۸۔ "ایکس پلوریشنز اِن سندھ" مصنف این-جی-مجمدار باب ۷۔۸

18. ایم-اے-ایس-آئی نمبر ۴۸ "ایکس پلوریشنز اِن سندھ" مصنف این جی مجمدار صفحہ ۱۴۴۔

19. بلینڈفورڈ "جیولوجی آف ویسٹرن سندھ" صفحہ ۱۱۴۔ فٹ نوٹ۔

20. جے-ایس-ایچ-ایس۔ جلد ہفتم۔ حصہ ۳ صفحہ ۶۰۔۶۱۔

21. ہوسکتا ہے کہ لال زمین پر کالے نقش ونگار والے ظروف کو آنیوالے تحقیق کسی دوسرے تمدن سے منسوب کریں۔ یہ ظروف این-جی مجمدار کی دریافت ہیں، جس نے سندھ کے پہاڑی علاقہ سے انھیں حاصل کیا، اور "انڈس" کے نام سے

ان کی درجہ بندی کی۔

22. مجمدار۔صفحہ ۱۵۰۔

23. نغگ کے مقام پر : "اینشی اینٹ انڈیا" جنوری ۱۹۴۹ء فردر ایکس پلو ریشنز ان سندھ "۱۹۳۸ء۔

24. " آرٹ اینڈ لیٹری " (رائل انڈیا، پاکستان اینڈ سیلون سوسائٹی، لندن) نمبر ۱۴، ۱۹۵۰ء صفحہ ۵۴۔

25. بلینڈفورڈ "جیولوجی آف ویسٹرن سندھ "صفحہ ۱۱۴۔

26. جے۔ایس۔ایچ۔ایس۔جلد ۷ پارٹ ۳ صفحہ ۶۳۔

27. مجمدار۔صفحہ ۱۲۰۔۱۲۲۔

28. جے۔ایس۔ایچ۔ایس۔جلد ۷۔پارٹ ۳۔صفحہ ۶۴۔۶۵۔

29. تانبے کے بسو لیعارف کا تھانہ اور عثمان بُٹھی سے حاصل ہوئے، مجمدار، صفحہ ۱۳۶۔۱۳۷۔۱۴۱۔

30. چورو (Chauro) سے مجھے چقماق کا بنا ہوا ایک چاقو ملا جس کی لمبائی پانچ انچ سے زیادہ تھی (میوزم آف دی سندھ ہسٹوریکل سوسائٹی)۔

31. کرچات اور شاہ جوکوٹیرو کے مقام پر مجمدار صفحہ ۱۲۹۔۱۳۱۔۱۳۷۔۱۳۹۔

32. ڈمب بُٹھی کے مقام پر مجمدار صفحہ ۱۱۵۔

33. نغگ اور تونگ کے مقام پر۔ "جے۔ایس۔ایچ۔ایس" جلد ۵۔پارٹ ۲۔جلد ۷۔ پارٹ ۳۔

34. مجمدار۔صفحہ ۱۱۵۔۱۱۷۔

35. ایم۔اے۔ایس۔آئی نمبر ۳۵۔ "ایکس کیویشنز ان بلوچستان "۱۹۲۵ء مصنف ایچ۔ ہارگریوز۔

36. مجمدار صفحہ ۶۸ پلیٹ ۳۴۔تصویر ۶۔

37. ایم-اے-ایس آئی نمبر ۴۳ "این آرکیولوجیکل ٹور اِن گیدروسیا" منصف سرادریل اسٹائن۔

38. تھرڑی گجو دریائی مٹی کے میدان میں واقع نہیں ہے۔ "آمری" تہذیب کے زمانہ میں یہ شاید ساحل سمندر پر تھا۔

39. جرنل آف دی بمبئی برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی-جلد ۵ (۱۸۵۷ء) صفحہ ۳۴۹۔۳۶۲

40. جھلاواں گزیٹیر، صفحہ ۲۲۷۔

41. اے-آر-اے-ایس-آئی۔ ۱۹۳۴ء گبر بند اِن بلوچستان "ہیوز بلر، صفحہ ۲۰۰۔

42. یاد رہے کہ ہیوز بلر نے سب سے پہلے نال کے مقام پر آثاریات اور باقیات دریافت کیں۔حوالہ اے-آر-اے-ایس-آئی ۵ ۱۹۰۴ء اے نیوٹائپ آف پوٹری فردم بلوچستان۔

43. بحوالہ نقشہ۔سروے آف انڈیا۔شیٹ ۳۶۸۔ایک انچ برابر دو میل۔

44. گزیٹیر آف لسبیلہ، صفحہ ۱۷۵۔

45. جھلواں گزیٹیر صفحہ ۳۲۲۔لسبیلہ گزیٹیر صفحہ ۲۲۵-۲۲۷ ۔ جے-ایس-ایچ-ایس۔جلد ۵ صفحہ ۱۰۲-۱۰۳۔

46. مجمدار۔صفحہ ۱۵۳۔ جے-ایس-ایچ-ایس جلد ۵ نمبر ۲۔صفحہ ۱۰۲۔جھلواں گزیٹیر۔ صفحہ ۱۳-۳۲۳۔لسبیلہ گزیٹیر۔صفحہ ۱۲۸-۱۲۹-۱۳۳-۲۲۶۔

باب چھٹا

وادیٔ سندھ کی تہذیب ماحول اور آب وہوا

وادیٔ سندھ کی عظیم الشان تہذیب کا بیان شروع کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کے جغرافیائی ماحول پر ایک نظر ڈالیں کیونکہ اِس ضمن میں چند سخت غلط فہمیاں پائی جاتی ہین۔ ہم اپنا بیاں ضروری اعداد وشمار سے شروع کرتے ہیں، تقریباً تین لاکھ مربع میل کے علائقہ میں جس کا نصف دریائے مٹی کا وہ میدان ہے جسے دریائے سندھ اور چند چھوٹے دریاؤں نے جو وادی گنگا اور سندھ کے درمیان بہتے ہیں تعمیر کیا ہے جہاں ایک عظیم تہذیب نے جنم لیا، جو اپنی باقیات اور آثار بات کی یکسانیت کی وجہ سے ممتاز ہے۔ یہ تہذیب جو شہری حیثیت کا تھا، اور اِن کی سلطنت کا انتظام شاید دو مرکزی شہروں سے وابستہ تھا، جو ایک دوسرے سے ۳۵۰ میل کے فاصلہ پر واقع تھے۔ ہر ایک شہر تقریباً ایک میل مربع میں پھیلا ہوا تھا، چھوٹے قصبے اور دیہات میدانوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اِس قدیم تہذیب کے دریافت ہونے کے پہلے ۳۵ سال کے اندر تقریباً نوے (۹۰) آثار جو اِس تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں دریافت کئے جا چکے تھے۔[۲] گویا اوسطً تین ہزار مربع میل کے درمیان ایک قدیم بستی تھی۔ اس اعتبار سے کہ ہم اِس تہذیب کا دائرہ وسعت اوپر بیان کر چکے ہیں۔☆

☆ سندھو تہذیب کے اب تک ایک ہزار (۱۰۰۰) سے زائد قدیم شہر دریافت کئے جا چکے ہیں جو کہ ایک لاکھ مربع میل (One laeac Sq mile) کے علائقے میں پھیلے ہوئے، یہ تہذیب اپنے مرکز (Indus vally) سے نکل کر برصغیر کے ایک بہت بڑے علائقے میں توسیع حاصل کر سکی، گجرات، راجستھان، کچھ، سندھ، پورا پنجاب دہلی کے گردونواح، اُتر پردیش جنوبی ہندستان اور جنوبی انغانستان کے بہت سے علائقے سندھو شہنشاہیت (Indus Civilization) میں شامل رہے ہیں، ہندستان کا ایک قدیم نام انڈیا بھی انڈس (سندھ) سے مشتق ہے اور یہ عظیم الشان (Great Indus Impire) کی ایک بہت بڑی دلیل ہے اس وجہ سے ماہر قدیم آثاریات نے اسے سندھو شہنشاہیت (Indus Empire) قرار دیا ہے، سندھو مہریں (Indus seal) ناپ تول کا مساوی نظام (Uniform system of measurement) عام گھریلو استعمال کے مٹی کی ظروف پر بنے ہوئے نقش ونگار میں یکسانیت (Homegenity of art art and craft) شہری منصوبہ بندی اور عمارت سازی کا فن، نکاسی آب اور دوسری کئی طرح کی چیزیں اس منظم سلطنت کا نظام بتاتی ہے جو کہ

یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ دوسری آبادیاں بھی اُس زمانہ میں موجود تھیں، جن میں سے کچھ موجود دیہاتوں اور شہروں کے نیچے دفن ہوں گے۔ بہت سی سیلابوں اور ریت کی نذر ہوگئی ہوں گی یا دریاؤں نے اُن کے بنیادوں کو کاٹ کر بہادیا ہوگا، اور بہت تفصیلی جائزے سے بچ رہی ہوں گی۔ مزید یہ کہ یہ قیاس بھی غلط نہ ہوگا کہ شہروں اور دیہاتوں میں آباد لوگوں کے علاوہ بھی، شہریوں کی ایک کثیر تعداد ایسی ہوگی جو خانہ بدوش تھے، اور جھاڑیوں اور چٹانوں کی بنی ہوئی جھونپڑیوں میں رہتے تھے، لیکن اُن حالات پر غور کرنے سے پہلے جن کے متعلق کوئی دستاویزی تفصیلات موجود نہیں ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ مصدقہ شہادتوں سے کیا نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں؟ وادیءِ سندھ کے تہذیب زمانہ کے متعلق بھی اور دورِ جدید کے بارے میں بھی۔

اندازہ ہے کہ دونوں شہر یعنی ہڑپہ اور موہن جودڑو اپنے وتر کے اعتبار سے تقریباً تین میل تھے۔[۳] موہن جودڑو کی کھدائی نے ثابت کردیا ہے کہ یہ شہر گنجان آبادی رکھتا تھا، بالخصوص اپنے آخری دور میں۔ اِس دور میں ایک مکان کو کئی حصّوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔[۴] ابتدائی تہوں میں ایک مکان زمینی منزل کا رقبہ ۳۰x۲۷ فٹ تھا۔ ڈاکٹر میکے (Dr. Mackay) کا خیال ہے کہ عام طور پر تمام عمارتیں دو اور تین منزلہ تھیں۔[۵]

اگر سرکاری عمارت کی ایک معقول تعداد کو الگ کردیا جائے تو شہر کے آخری دور سے قبل جس میں معمول سے زیادہ گنجان آبادی ہوگئی تھی۔ اِس شہر کی آبادی کا کیا اندازہ قائم کیا جاسکتا ہے، ہمارے پاس شمالی مغربی سندھ کے ایک ایسے شہر کے اعداد و شمار موجود ہیں، جو

ایک سخت گیر اصول وضوابط پر سندھو سماج ایک کاروباری سماج تھا، جس کا بیوپار مشرق سے غرب تک پھیلا ہوا تھا، جنوبی عراق کے شہر اُر، فلیکا، بحرین، ایران روس اور مشرقی یورپ تک اس کی مصنوعات کی مانگ تھی اور اس کے نام کا دور دور شہرہ تھا، یہ عظیم الشان شہنشاہیت ایک ہزار سال تک قائم رہی اور اس کے عروج کا سورج نصف النہار پر پانچ صدیوں تک چمکتا اور دمکتا رہا ایک تحقیق کے مطابق ۱۹۰۰ ق.م میں ہونے والی بارش کی تباہ کاریوں اور سیلاب نے اس کی مرکزی حکومت کو تباہ و برباد کردیا مگر یہ سندھو تہذیب اپنے بنیار میں ختم ہونے کی بجائے اس کے مرکزی صوبے کے لوگ جنوبی صوبے گجرا، راجستھان کی طرف اور گنگا جمنا کی وادیوں میں پھیل گئے جہاں ان کی بستیاں پہلے ہی قائم تھیں۔ ایک طرح سے یہ اس عظیم تہذیب کا زوال تھا جو قدرتی آفات کے سبب ہوا، اگر یہ شہنشاہیت قائم رہتی تو یہ دنیا کی سب سے بڑی عوامی شہنشاہیت ثابت ہوتی۔ (ادارہ)

رقبہ اور آبادی کے اعتبار سے تقریباً ویسا ہی ہے جیسا موہن جو دڑو تھا، یہ شہر شکار پور (Shihkarpur) ہے۔

پوسٹنس (Postans) نے شکار پور کا جائزہ لے کر جو اعداد و شمار پیش کئے اُن کے مطابق اِس شہر کی مجموعی گولائی تین میل تھی، اور بڑا چھت والا بازار آدھ میل لمبا تھا، اور صحیح مردم شماری کے مطابق اِس میں بائیس ہزار آدمی رہتے تھے، یہ ۴۱-۱۸۴۰ء کا واقعہ ہے، وہ اِس کے بعد سندھ کے شہر کے اندرونی حالات اور خصوصیات بیان کرتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اِس شہر کے رہائشی مکانات پر اور بھی کمرے بنے ہوئے تھے، کمرے چھوٹے اور گھٹے ہوئے تھے، مکانوں کے درمیان راستہ تنگ تھا، جس میں مشکل سے ایک بار بردار اونٹ چل سکتا تھا۔[۶] اگر کسی نے پوسٹنس کے مشاہدے کے ایک سو سال بعد شکار پور اور لاڑکانہ شہروں کے پُرانے علاقوں کو دیکھا جائے۔ تو وہ اِس نظریہ سے متفق ہونا ہوگا کہ وہ تنگی کے ساتھ رہائش کی ایک بہترین مثال ہیں۔

بہرنوع، ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ پوسٹنس کے اعداد و شمار میں کسی حد تک غلطی کا امکان ممکن ہے، شہر کے بڑے آدمیوں نے اپنے حرم کے متعلق اُسے صحیح اطلاعات فراہم نہ کی ہوں۔[۷] چنانچہ شکار پور کی آبادی بائیس ہزار نہیں بلکہ ۱۹۴۱ء میں تیس ہزار ہوگی۔ اور ہمیں یہ بھی فرض کر لینا چاہئے کہ موہن جو دڑو کے تین میل کے احاطہ میں شکار پور سے زیادہ آدمی آباد تھے، اِس لحاظ سے پینتیس ۳۵ ہزار نفوس وہاں رہتے تھے، اِس طرح تاریخی زمانہ سے پہلے وادیٔ سندھ سلطنت کے دو بڑے شہروں کی مجموعی آبادی ستر ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اب یہ غور کرنا چاہئے کہ دونوں شہروں کی مجموعی آبادی کا ملک کی کُل آبادی سے کیا تناسب تھا؟ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد میں صوبہ سندھ کی آبادی کے تیسواں حصہ آباد تھا، بشرطیکہ کراچی کی آبادی کو اِس سے الگ کر دیا جائے۔[۸] اور لاہور کی آبادی کُل پنجاب کی آبادی کا پچاسواں حصہ تھی، چونکہ دونوں صوبوں میں آبپاشی کا نظام اور زراعت بہت ترقی یافتہ شکل میں آبکل موجود ہے، لہٰذا وادیٔ سندھ کے شہروں کی مجموعی آبادی کے تناسب کو ہم زیادہ شمار

کریں گے، بالغرض ملک کی مجموعی آبادی کا پچیسواں حصہ اِن دونوں شہروں میں آباد تھا تو سَندھ کے میدانوں میں پھیلی ہوئی سلطنت کی مجموعی آبادی تقریباً ساڑھے سترہ لاکھ ہوگی، گویا دس آدمی فی مربع میل کے اوسط سے آباد تھے۔

اِسی طرح ذرائع معیشت کے لئے بھی حساب لگانے کی خاطر ہم کچھ پورے پورے اعداد فرض کرتے ہیں۔۹ وادیٔ سَندھ کے قدرتی وسائل اور حالات کے سلسلہ میں اِس موضوع پر لکھنے والے غلط فہمیوں کا شکار رہیں، اور ایک نے دوسرے کی تائید کرتے ہوئے کچھ نئی اور کچھ پرانی غلطیوں کو حقیقت کا درجہ دیدیا ہے، اِن غلطیوں کی رو سے سَندھ کو دریائی مٹی کے میدان کے بجائے "صحرائے سندھ" کا نام دیدیا گیا ہے، جیسے ایک ریتیلا بنجر علاقہ ہو جو صرف دورِ جدید کے نظام آبپاشی کے بل بوتے پر پیداوار کے قابل ہے۔۱۰ اِسی طرح لاڑکانہ کے نواحی علاقہ کو بیابان سے تعبیر کرنے کے بعد کلّر کی زمینوں کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے جیسا کہ علاقے کی امتیازی خصوصیت یہی ہے۔۱۱ اگر کوئی شخص بیراج کی نہروں کی تعمیر سے پہلے لاڑکانہ میں رہ چکا ہے تو یہ بات اُسے خاص طور پر یاد ہوگی کہ حدِ نظر تک دھان کے کھیت پھیلے ہوئے ہوتے تھے، جن کی سرسبزی خوشگوار اور حد سے کچھ زیادہ ہی تھی، یہ تصویر کشی بہر نوع اگست کے مہینہ سے تعلق رکھتی ہے۔۱۲ جہاں تک جدید نظام آبپاشی کے برپا کردہ انقلاب کا تعلق ہے، بیراج کی نہروں نے گھاڑ واہ کے چاول پیدا کرنے والے علاقے میں عملاً کوئی بہتری کی شکل پیدا نہیں کی، کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اِس میں بہتری کی گنجائش ہی نہیں تھی، یہ "باغِ سَندھ" کل کی بات نہیں، بلکہ لفٹنٹ جیمز نے ۱۸۲۷ء میں جب اِس علاقے کی تعریف میں صفحات کو سیاہ کیا، اُس سے عرصہ دراز قبل سے اِس علاقے کی یہی حالت رہی ہے۔۱۳

وسط جون سے وسط ستمبر تک دریائے سندھ میں پانی کی کثرت کا کیا حال رہتا ہے، اِس کا اندازہ کوئی مشکل سے ہی لگا سکتا ہے، یہ سمجھ لیجئے کہ موسم سرما میں جتنا پانی بہتا ہے اُس سے بیس اور چالیس گنا پانی زیادہ ہو جاتا ہے، جسے موسم بہار کی سالانہ طغیانی کہا جاتا

ہے۔۱۴؎ مزید براں جب قدیم حالات کا ذکر کیا جاتا ہے تو سکھر اور روہڑی کو ایسے مقامات قرار دینا کہ جہاں دریائے سندھ کے بہاؤ کا راستہ تبدیل نہیں ہوسکتا غلط ہے، یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ ۱۷۵۸ء سے کچھ عرصہ قبل تک دریائے سندھ حیدرآباد سے پندرہ میل مشرق میں بہتا تھا، گویا اپنے موجودہ راستے سے تقریباً بیس میل دور۔ یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ سکھر اور روہڑی کے درمیان اپنے بہاؤ کے راستے کو قدیم زمانے کی سندھ کے اتنا عرصہ بعد تک اس نے برقرار رکھا ہوگا۔۱۵؎ گذشتہ بیس صدیوں میں دریائے سندھ کے بہاؤ میں جو تبدیلیاں آئی ہیں اُن کے پیشِ نظر یہ بات نہایت اہم ہے کہ موہن جودڑو کا شہر ایک ہزار سال کے طویل عرصہ تک مسلسل خوشحالی سے ہمکنار رہا، گویا اِس شہر کے ایک حصّہ میں ایک سے زیادہ مرتبہ سندھ کا سیلابی پانی کثیر مقدار میں داخل ہوا جس کی تباہی کے بعد شہر کو دوبارہ پہلے جیسے منصوبہ کے مطابق تعمیر کیا گیا، کیونکہ دریائے سندھ میں پانی کی مقامی قلت اِس علاقہ کے لئے بربادی کا پیغام لاتی ہے، عارضی کثریت اِس کا سبب نہیں بنتی۔ کیا سہون (Sehwan) کے علاوہ کسی دوسرے سندھی شہر کو اتنی طویل مدّت کی عمر حاصل ہوئی جتنی موہن جودڑو کو؟ یہ مشکوک ہے! دوسری تمام آبادیاں جن کا ذکر دسویں صدی عیسوی کے عرب جغرافیہ دانوں نے کیا ہے آج نظر نہیں آتیں یا کھنڈرات میں تبدیل ہوچکی ہیں۔ دراصل دریائے سندھ کے بہاؤ کی تبدیلی نے شہروں کو متروک بنادیا، اِسی طرح زمانہ قدیم سے اُنیسویں صدی تک بہت سے نئے شہروں کو پیدا کردیا۔۱۶؎

یہاں یہ دلیل معقولیت کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہے کہ زمانہ قدیم میں بہتر موسمی حالات ہونے کے متعلق جو کچھ کہا جاتا رہا ہے۔ حقیقت میں اُن سے بھی عمدہ آب وہوا اِس علاقہ میں تھی۔ یہاں کے باشندے صرف بارانی پانی کی مدد سے اتنی پیداوار حاصل کرلیتے تھے کہ اگر چند سال کے لئے دریائے سندھ کا پانی اُن کا ساتھ نہ بھی دے تو پس انداز کیا ہوا ذخیرہ کافی ہوجاتا تھا۔ اِس حد تک پروفیسر پگوٹ (Piggot) کے بیان سے ہم اتفاق کرتے ہیں۔ سندھو کی سلطنت کے متعلق جو اندازے اُس کی باقیات اور آثار سے ہم نے

قائم کئے ہیں اُن کے پیشِ نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ موجودہ موسمی حالات کے تحت علائقہ میں ایسی سلطنت کا قیام ممکن نہیں۔ ۱۷

پختہ اینٹیں، جو سندھ کے باشندے ہر جگہ اپنی عمارات کی تعمیر کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اِس بات کا ثبوت ہیں کہ اُن کے زمانہ میں موسم جس قدر نم تھا وہ اُن کے جانشینوں کو حاصل نہیں ہوا۔ ۱۸ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں، کہ کثیر مقدار میں پختہ اینٹیں تیار کرنے کے لئے اُن لوگوں کو جتنی لکڑی کی ضرورت پیش آئی ہوگی وہ موجودہ پیداوار سے کہیں زیادہ ہوگی۔ ۱۹ سندھ میں موجودہ موسمی حالات کے تحت بھی لکڑی کی افراط ہے، پنجاب کی سرحد سے لیکر نیچے سندھ ڈیلٹا تک دریائی جنگلات اتنے گنجان ہیں کہ کروڑوں اینٹیں تیار کی جاسکتی ہیں، سندھ ریلوے کے انجنوں کے لئے ۴-۱۹۰۳ء میں اِن جنگلات سے ایک کروڑ مکعب فٹ لکڑی حاصل کی گئی۔ ۲۰ جبکہ مقامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ستر لاکھ بیس ہزار مکعب فٹ حاصل ہوسکی۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دورِ جدید کی طرح موہن جودڑو کے زمانہ میں بھی عمارتی لکڑی کی کثیر مقدار ہمالیہ کے زیریں پہاڑوں سے دریاؤں کے ذریعہ بہا کر نیچے پہنچائی جاتی تھی۔ ۲۱

زمانہ قدیم میں موسم کے زیادہ نمدار ہونے کی ایک دلیل یہ بھی پیش کی جاتی ہے کہ وہ لوگ کچھ مُہروں پر ایک جانور کی تصویر دیتے تھے جس کی ہڈیاں یہاں بھی یہاں ایک یا دوسرے مقام سے دستیاب ہوئی ہیں، پروفیسر پگوٹ صاحب کہتے ہیں کہ "اِن سے پتہ چلتا ہے کہ موسمی حالات گینڈے اور چیتے جیسے جانوروں کے لئے سازگار تھے۔ نیز بھینسوں اور ہاتھیوں کے لئے بھی۔ اِن میں سے کوئی بھی جنگلی جانور کی حیثیت میں آجکل سندھ میں نہیں پایا جاتا (سوائے چیتے کے جو کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے)۔ ۲۲

کسی خطے میں جنگلی جانوروں کی موجودگی کا جہاں تک تعلق ہے اُس کے اسباب میں علائقہ کے اِنسانوں کا اِن جانوروں کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے وہ اہمیت کا حامل ہے۔ سندھ میں آخری چیتا ۱۸۸۶ء میں بندوق کی گولی کا نشانہ بنا۔ اِس سے پچاس سال قبل

بالائی سندھ میں جب برطانوی باشندوں نے رہائش اختیار کی تو یہ درندہ علاقہ میں عام طور پر پایا جاتا تھا۔ گینڈا ابھی سندھ میں کوئی عجوبہ نہیں تھا۔ ۱۳۳۳ء میں مراکش کے سیّاح ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں سندھ کے علاقہ سے گذرنے کے حالات میں اِس جانور سے دو موقعوں پر مُٹھ بھیڑ کا ذکر کیا ہے۔ پہلی مرتبہ دریائے سندھ کی ترائی میں جہاں سرکنڈے کا گھنا جنگل پیدا ہوگیا تھا، اُس نے جو تفصیلات بیان کی ہیں اُنھیں پڑھنے کے بعد کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ یہ گینڈا ہی تھا۔ ۲۴ یہ بھی واضح ہے کہ اُس زمانہ میں سندھ کے موسمی حالات تقریباً ایسے ہی تھے جیسے آج ہیں۔ ستمبر کے آخری ایام میں جب یہ سیّاح سہون میں تھا تو موسم اتنا گرم اور خشک تھا کہ وہ اور اُس کے ساتھی پانی سے تر کرنے کے بعد کپڑوں کو اپنے ننگے شانوں اور کمر پر رکھتے رہے تاکہ سخت گرمی کو برداشت کرسکیں۔ ۲۵

اِس سے بھی تین سو سال پہلے البیرونی اِس علاقہ میں وارد ہوا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ہندوستان میں گینڈا عام طور پر پایا جاتا ہے خاص طور پر گنگا کے کنارے۔ اُس نے بھی یہ بیان کیا ہے کہ ہندوستانی گینڈا افریقی گینڈے سے مختلف نسل کا ہے۔ ۲۶

اِس میں شک نہیں کہ بھینس کو پالتو بنالیا گیا ہے لیکن آج بھی یہ جانور سندھ کے مرطوب جنگلات میں دریائے سندھ کے ڈیلٹا اور چاول پیدا کرنے والے علاقوں میں کثرت سے ملتا ہے۔ ۲۷

یہ تسلیم کہ جنگلی ہاتھی سندھ کی موجودہ نباتاتی پیداوار سے خوراک حاصل نہیں کرسکتے (سوائے اُس کے جو کھیتوں میں اُگائی جاتی ہے) لیکن اِس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اگر آب و ہوا زیادہ نم ہوتی تو نباتات بھی اِس زمین میں ویسی ہی ہوسکتی جیسی اُن علاقوں میں ہوتی ہے۔ جہاں جنگلی ہاتھی رہتے ہیں۔ کیا یہ کہنا زیادہ درست نہ ہوگا کہ ہاتھی کی جو صحیح تصاویر موہن جو ڈرو کی مُہروں پر نظر آتی ہیں وہ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ یہ لوگ پالتو ہاتھیوں سے خوب واقف تھے؟ جو ہاتھی مشہور مُہر کے اوپر بنایا گیا ہے۔ اُس کی کمر پر بیٹھنے کے لئے کپڑا پڑا ہوا ہے۔ ۲۸

چنانچہ جانوروں کے وجود کو اگر بطور شہادت پیش کیا جائے تو اُس کا بغور مشاہدہ یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اِس شہادت میں بہت اہمیت نہیں ہے، لہٰذا یہ مفروضہ کہ سندھ کی آب و ہوا تاریخ سے قبل کے زمانہ میں آج کی نسبت سے زیادہ نم تھی صرف اِس بنیاد پر قائم رہ سکتا ہے کہ عمارتی سامان جو سندھ قدیم کے قصبوں اور شہروں میں استعمال کیا گیا ہے یہ ثابت کرتا ہے کہ آب و ہوا زیادہ نم تھی، نیز ایک ہزار سال کے طویل عرصہ کے دوران موہن جو دڑو مسلسل آباد رہا اور جس کی مثال سندھ کے کسی دوسرے شہر میں نہیں ملتی۔ اور شاید ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ سندھ کے کوہستانی علاقہ میں اور میدانوں میں اِس زمانہ میں ایک جیسی ہی آب و ہوا تھی۔ سر مورٹیمر وہیلر کے نظریہ کو ہم یکسر مسترد کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "شہروں کا صرف موجود ہونا اِس بات کے ساتھ مشروط ہے کہ مقامی نواحی علاقہ زرخیز ہو جو علاقہ کی موجودہ طبعی حالت کے برعکس معلوم ہوتا ہے، اِس نظریہ کو رد کرنے کے لئے یہ وہ مثالیں ہی کافی ہیں کہ جب انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا تو علاقہ انتہائی پسماندہ تھا اور آب و ہوا بھی موجودہ زمانہ سے کوئی بہتر نہیں تھی۔ اُس وقت لاڑکانہ کی آبادی بارہ ہزار[30] اور شکار پور کی بائیس ہزار تھی۔

اِس مفروضہ پر غور کرنے سے پہلے کہ آب و ہوا قدیم زمانہ میں مختلف تھی۔ ہمیں اُس زمانہ کے سندھ کی زرعی معیشت کو اِس پس منظر میں دیکھنا چاہے کہ دریائے سندھ کا طرز عمل کیسا رہا ہے۔

تیسرے باب میں دریائے سندھ کی وادئ زیریں کی جو کیفیت قدیم زمانہ میں تھی وہ بیان کی جا چکی ہے۔[32] ماہرین نے یہ معلومات کا خزانہ ہندوستانی دریاؤں کی طبعی حالت پر زندگی بھر کی تحقیق کے بعد حاصل کیا ہے۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ دریائے سندھ اور اُس کے آس پاس بہنے والے موسمی نالوں اور ندیوں کا نواحی علاقہ بڑے چھوٹے جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ علاقے گو زرخیز تھے لیکن دو وجوہات کی بدولت کاشتکاری کے لئے موزوں نہیں تھے۔ اوّل یہ کہ اِن علاقوں میں سیلاب کی کثرت تھی جنھیں روکنا اِنسان کے بس کی بات

نہیں تھی، دوم یہ کہ مناسب اوزاروں کی عدم موجودگی میں علائقہ کو خود رو گنجان درختوں اور جھاڑیوں سے صاف کرنا ممکن نہیں تھا۔ البتہ اِن جنگلات سے ملحق جو علائقہ تھے ہمارا خیال ہے۔ وہاں ہڑاپہ تہذیب کے زمانہ میں کاشت کی جاتی تھی اور یقیناً دریائے سندھ کی کچو زمین میں بھی۔

ظاہر ہے کہ کاشتکاری کے لئے ہر اعتبار سے سازگار موسم جو قدیم زمانہ والوں کو حاصل ہوگا وہ فصل ربیع کا تھا، نیز جو طریقہ فصل کی پرورش کا سب سے زیادہ مستعمل تھا، وہ ''سیلابی'' تھا، یعنی جو علاقے سیلاب سے زیر آب آجاتے یا جنھیں قدرتی آبی گذرگاہوں (اور آجکل) نہروں کے ذریعہ پانی سے بھر دیا جاتا تھا، اُن میں پانی نکل جانے کے بعد فصل بوئی جاتی تھی اور مارچ اور اپریل میں کاٹی جاتی تھی ۳۴۔

دریائی کچو میں تو زمین پر ہل چلانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی (میں موجودہ طریقہ کی طرف اشارہ کرر ہا ہوں) یہاں اور دوسری جگہوں میں نہ کھاد بکھیرا جاتا ہے اور نہ وقتاً فوقتاً پانی دیا جاتا ہے، ربیع کی فصل کو بہر نوع بارش مدد پہنچاتی ہے جو جدید موسمی حالات میں اوائل جنوری میں ہوتی ہے۔

اِس طرح مکمل عمل کے لئے کم سے کم پیشہ ورانہ مہارت، محنت اور اوزاروں کی مدد کی ضرورت پڑتی تھی لہٰذا یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ گندم اور جو دونوں ہی فصل ربیع سے تعلق رکھنے والی اجناس ہیں اور ہڑاپہ شہروں کی باقیات میں شامل ہیں۔ ۳۵

اِس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ اُس زمانہ میں خریف کی فصل بھی بوئی جاتی تھی، ہمیں جس جنس سے سب سے زیادہ دلچسپی ہے وہ کپاس ہے۔ موہن جو دڑو سے سوتی کپڑوں کے جو ٹکڑے حاصل ہوئے ہیں اُن سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ علاقے میں کپاس کی کاشت بھی ہوتی تھی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ قدیم سندھ اور ہڑاپہ کے آس پاس تِلوں کی کاشت بھی ہوتی تھی کیونکہ قدیم باقیات میں اِس کے دانے بھی شناخت کئے گئے ہیں۔ دورِ جدید میں عام طور پر سندھ میں تِلوں کی کاشت ہوتی ہے۔

فصل خریف کا جو طریقہ دریائے سندھ اور سیلابی گذرگاہوں کے نزدیک مُروّج ہے اُس کو دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ قدیم زمانہ میں بھی کم و بیش یہی طریقہ رہا ہوگا۔ زمین کا ایک قطعہ جسے کاشت کے لئے موزوں سمجھا جاتا ہے، مٹی کے پشتوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے اِس میں پانی داخل ہونے کے لئے کچھ جگہ پشتہ کے اندر چھوڑ دی جاتی ہے، جیسے ہی سندھ میں پانی چڑھنا شروع ہوتا ہے ضروری مقدار میں پانی لے لیا جاتا ہے، اور پھر اِس راستہ کو بند کر دیا جاتا ہے۔ زمین کو جوت کر تخم پاشی کر دی جاتی ہے، اِس وقت تک دریا میں عام طغیانی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پُشتے کو دیکھ بھال سے صحیح حالت میں رکھا جاتا ہے اور صرف ضرورت کے وقت ہی پانی زمین میں داخل ہونے دیا جاتا ہے۔ اگر حالات ٹھیک رہے تو دریا کا پانی اُترنے کے وقت تک فصل پروان چڑھ جاتی ہے اور ایک ماہ کے بعد کاٹ لی جاتی ہے۔ یہ عمل خطرات سے کتنا قریب ہے، اِس کا اندازہ آپ کو ہو گیا ہوگا۔ طغیانی بہت زیادہ بھی ہو سکتی ہے، کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ پودے پانی میں ڈوب جائیں یا پُشتے ہی پانی کے ریلے کے ساتھ بہہ جائیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پانی بہاؤ کا دوسرا راستہ اختیار کر لے اور ایک زمین اُس سے قطعاً محروم رہ جائے، خریف کی فصل کے لئے سب سے موزوں علاقے وہی ہو سکتے ہیں جو مستقل قسم کی سیلابی گذرگاہوں کے قرب و جوار میں ہوں اور جہاں پانی کو کسان مرضی کے مطابق کنٹرول کر سکے۔ یعنی جہاں یہ ممکن ہو کہ راستہ گہرا کھود کر پانی کو نکالا یا داخل کیا جا سکے۔

ڈول، ڈھیکلی اور شدوف کا جو طریقہ پانی کو کھیتوں تک لے جانے کے لئے مروج ہے اُس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم سندھ کے باشندے پانی کو بلندی پر منتقل کرنے کے طریقے سے واقف تھے۔ لیکن پھر بھی یہ طریقہ کاشتکاری کے لئے اتنی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

موجودہ معلومات کے مطابق قدیم سندھ کی زراعت میں دھات کے جو اوزار استعمال کئے جاتے تھے۔ وہ کلہاڑی اور شاید درانتی ہیں۔ پتھر کے بنے ہوئے ایسے پھل جو

دونوں طرف ڈھلوان تیز دھار رکھتے تھے ڈاکٹر میکے کے مطابق ہل کی پھالی ہو سکتے ہیں۔ [۳۸] سب سے زیادہ ضروری اوزار جس سے زمین کھودی جاسکتی ہے۔ بیلچہ اور پھاوڑہ ہے [۳۹] وہ شاید لکڑی کا بنایا جاتا ہوگا، چونکہ کلہاڑی تانبے کی بنائی جاتی تھی اِس وجہ سے جنگل صاف کرنے کے لئے یہ لوگ اس میں آگ لگاتے ہوں گے مزید براں کھدائی کے اوزار صرف لکڑی کے ہونے کی وجہ سے اِن لوگوں نے اچھی نہریں تعمیر نہیں کی ہوں گی۔ اِن کوتاہیوں کی بدولت ظاہر ہے کہ کوئی ایسی نشانی باقی نہیں رہ سکتی تھی جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم لوگ اپنے کھیتوں میں کس طریقے پر عمل کرتے تھے۔

سرمورٹیمر وہیلر نے موہن جودڑو میں تحقیقات کے بعد اُس قدیم سندھو سلطنت کے نظام معیشت پر کچھ روشنی ڈالی ہے۔ موہن جودڑو کے مرکزی چبوترے پر جو فصل سے گھرا ہوا تھا۔ گندم کے ایک بڑے گودام کے آثار پائے گئے ہیں۔ اِس سے قبل ایسا ہی گودام ہڑاپہ میں بھی شناخت کیا چکا ہے غالب گمان یہ ہے کہ کم از کم زمین کی مال گذاری فصل کے ایک حصّہ کی شکل میں وصول کی جاتی تھی اور سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اِس جنس کی شکل میں ہی ادا کی جاتی تھیں۔ [۴۰] ایسے زمانہ میں جب سکہ مروّج نہیں تھا یہ نظام ناگزیر تھا، یہ طریقہ تالپور حکمرانوں کے دور میں بھی اور ابتدائی برطانوی تسلّط کے وقت بھی کسی حد تک جاری رہا۔ [۴۱]

ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ سرکاری گندم کے لئے گودام اِس وجہ سے بھی اہمیت کے حامل تھے کہ اگر کسی موسم میں دریائے سندھ کی بے وفائی سے پانی کم ملا اور فصل خراب ہوئی یا پانی کی زیادتی نے فصل کو تباہ کر دیا تو محفوظ ذخیرے سے شہریوں کو اناج تقسیم کیا جاسکتا تھا۔ اضافہ کے بعد موہن جودڑو کے گندم گودام کے فرش کا رقبہ بارہ ہزار مربع فٹ ہے، اگر گہرائی دس فٹ فرض کر لی جائے تو گودام میں پچانوے ہزار بُشل (تقریباً ۷۵ ہزار من) گیہوں رکھنے کی گنجائش تھی، چونکہ ہمارے مفروضہ مطابق موہن جودڑو کی آبادی پینتیس ۳۵ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ اِس لئے یہ گودام جبکہ پوری طرح گندم بھرا ہوا ہو تمام آبادی کو دوسو پونڈ گندم فی کس کے حساب سے تقسیم کر سکتا تھا۔ [۴۲]

ہڑاپہ میں یہ گودام فصلی چبوترے سے باہر دو سو گز کے فاصلہ پر واقع ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دونوں شہروں کے جو بڑے حصّے ابھی کُھدائی سے بچ گئے ہیں اپنے اندر دریافت شدہ گوداموں سے بھی بڑے گوداموں کو چھپائے ہوئے ہوں، دریں اثناء ہم ڈاکٹر میکے کے اِس نظر کا یہ جائزہ لے سکتے ہیں کہ وادیٔ سندھ کے قدیم باشندوں نے خشک سالی کے لئے کوئی حفاظتی تیاریاں نہیں کی تھیں اور اِسے وہ ایک دلیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اُس وقت تمام علاقہ میں کثرت سے بارش ہوتی تھی۔ ڈاکٹر میکے کا اشارہ اِس طرف ہے کہ اُس زمانہ کی کوئی نہر یا آبپاشی کے ذرائع دریافت نہیں ہوئے ہیں۔ سر وہیلر نے بجا طور پر یہ واضح کیا ہے کہ اگر ایسے ذرائع اُس زمانہ میں موجود بھی ہوتے تو تین چار ہزار سال کے عرصہ میں دریائے سندھ جو مٹی اپنے میدان میں پھیلاتا رہا ہے اُس سے اِن کے نشانات معدوم ہو گئے ہونگے۔ مزید براں جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں یہ یقین کرنے کا مضبوط جواز موجود ہے کہ اُن لوگوں کے پاس بڑے پیمانہ پر زمین کھودنے کے اوزار موجود نہیں تھے۔ لہٰذا ہم ڈاکٹر میکے کی منطق کی رو سے یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ گندم کی بڑی ذخیرہ گاہیں جو ڈاکٹر میکے کی تحریر کے وقت تک شناخت نہیں کی گئی تھیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ تاریخ سے قبل کے زمانہ میں اِس علاقہ میں کثیر بارش کا نظریہ باطل ہے۔ یہ ضرور ہے کہ گندم کی اہمیت ایک مبادلاتی جنس کی حیثیت سے ہماری دلیل کے کمزور کرتی ہے پھر بھی اِس حقیقت کو ضرور سامنے رکھنا ہوگا کہ ہڑاپہ میں ایسے ہی گودام کا فصیل سے باہر کافی فاصلہ پر واقع ہونا اُسے سرکاری مال گودام کے درجہ سے گرا دیتا ہے۔ کیونکہ وادیٔ سندھ جیسی سلطنت اور نظامِ حکومت کا ایک تصور جو ہمارے پاس ہے اُس کے اعتبار سے سرکاری مال گودام کا یا ایسے ہی اہمیت کے دوسرے ادارے کو فصیل سے محفوظ چبوترے پر ہونا چاہیئے تھا۔ جیسا کہ موہن جو دڑو میں ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ہڑاپہ میں بھی فصیل کے اندر ہی ایسا گودام موجود ہو اور اینٹ چوروں کی مسلسل لوٹ مار کی وجہ سے اِس عمارت کی شناخت نہ ہو سکی ہو۔[۳۴] ممکن ہے دریائے راوی

کے پُرانے راستے کے قریب شہریوں کا اپنا اجتماعی گودام موجود ہو، جہاں لوگ فاضل غلّہ خواہ کھیتوں کی پیداوار کا یا اپنی اُجرت کا جمع کرتے ہوں۔ تاکہ مستقبل میں ضرورت کے وقت استعمال کر سکیں۔ اِسے وزن کرنے کا عمل نیز میونسپل کلرکوں کے تحت ایسا نظام جو کہ جمع کئے ہوئے غلّے کی رسید اور انفرادی حسابات اور کھاتے رکھنا یہ سب کچھ اُن وادیءِ سندھ نے شہروں کے طرزِ زندگی سے بعید نہیں معلوم ہوتا بلکہ اُن کی شہری تنظیم کا جو خاکہ تحقیق کے بعد ہم نے تیار کیا ہے اُس کے مطابق ہی معلوم ہوتا ہے۔[45]

جو اضلاع اِن شہروں سے دور تھے وہاں کے باشندے مقامی پیداوار سے کام چلاتے ہوں گے یا اُس غلّہ سے جو اُنھیں دیگر اشیاء کے تبادلے میں حاصل ہوتا ہوگا۔ شاید اِس غلّہ کی کثیر مقدار دریائے سندھ کے پانی کی مدد کے بغیر ہی پیدا کی جاتی تھی۔ اگر مشرقی بلوچستان اور سندھ کے سرحدی علائقہ میں باقاعدگی سے زیادہ بارش ہو تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مغربی پہاڑیوں کی ندیوں میں بھی پانی کی کثرت اور بہاؤ میں باقاعدگی پیدا ہو جائیگی، اِن میں سے سب سے بڑی ندی ''گاج'' ہے جس سے نواحی پہاڑی علائقہ میں "کاچھو" کی زمین کو آج بھی آبپاشی کے لئے برائے نام پانی ملتا ہے اور اِس کی مخصوص طغیانی کے بعد جس سے میدانی بند بہہ جاتے ہیں۔ سیلابی طریقہ کو کاشتکاری کے لئے اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس علائقے میں جیسا کہ توقع کی جاسکتی تھی۔ متعدد قدیم بستیوں کے آثار دریافت ہوئے ہیں، کھینجی نئے (Khenji Nai) پر واقع لالن جی ماڑی (Lalan ji Mari) کی قدیم بستی کو لیجئے ان کے آثاروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بڑی آبادی تھی اور لازمی طور پر نواحی زمینوں میں آج سے زیادہ کاشتکاری کی جاتی تھی۔

ہم اکثر یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ موجودہ دور کے سندھ میں صرف بارش کے پانی پر بہت کاشتکاری ہوتی ہے۔ تھر کے علائقے میں جہاں انسانی نظام آبپاشی کا وجود نہیں ہر سال فصلیں پیدا کی جاتی ہیں، یہ ضرور ہے کہ فصلوں کا اچھا برا ہونا بڑی حد تک بارش کی کمی یا زیادتی پر منحصر ہے۔ اِس علائقے میں وادیءِ سندھ یا مغربی کوہستان کی بہ نسبت، بارش کثر

ت سے اور با قاعدہ ہوتی ہے، پھر بھی وادیٔ سندھ اور مغربی پہاڑی علاقہ کے درمیان او رجنوبی کوہستان کے کناروں پر جو کا چھوکی زمین ہے اُس میں بارانی کاشتکاری کے لئے مستقل انتظام مٹی کے مضبوط بندوں کی شکل میں موجود ہے، ایک اجنبی جس کا قیام اتفاق سے ایسے زمانہ میں ہو جب دو یا تین سال تک بارش اوسط سے بھی کم رہے تو وہ یہی خیال کر یگا کہ اِن بہت سے بندوں کی تعمیر کے وقت جو بارانی کیفیت تھی وہ بدل کر بدتر ہوگئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ سندھ میں بارش کی کمی اور زیادتی کا تعلق ایک پچیس سالہ دور سے ہے۔ تقریباً ایک سو سال کا با قاعدہ مشاہدہ اِس حقیقت کے ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، پچیس سال کے اِس دور میں چھ یا سات سال کثرتِ باراں کے ہوتے ہیں اور کسان پشتے باندھ کر اپنے کھیتوں میں فصل اُگا سکتا ہے۔ اگر دو یا تین سال مسلسل اچھی بارش کے مل جائیں تو وہ بہت عمدہ پیداوار حاصل کر سکتا ہے۔

چنانچہ بارانی خریف کا جہاں تک تعلق ہے۔ مجموعی طور پر بارش کی زیادتی اور با قاعدگی پر منحصر ہے اور اِس کی وجہ سے کاشتکاری میں وسعت ہو سکتی ہے، لیکن سندھ کے میدان میں ربیع کی فصل صرف بارش کی مدد سے پیدا نہیں کی جا سکتی۔ ہاں بلند علاقوں میں اور بلوچستان میں گندم ضرور پیدا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں کاشتکاری کے طریقے بالکل سیدھے سادے ہیں اور قدیم زمانہ سے اِس وقت تک اُن میں شاید ہی کوئی تبدیلی پیدا ہوئی ہو۔

جن شہادتوں کا ہم نے جائزہ لیا اُن کی بنیا پر یہ نظریہ قائم کیا گیا ہے کہ وادیٔ سندھ کو قدیم زمانہ میں بہتر موسمی حالات میسر تھے اور اِس نظریہ کو ماہرین موسمیات کی طرف سے بھی حمایت حاصل ہوئی۔ ایک مفروضہ یہ ہے کہ شمالی اوقیانوس کی بارانی پٹی نے جنوب کی سمت رُخ اختیار کر لیا ہے اور شمالی افریقہ اور شمالی مغربی ہندوستان سے گذرتی ہے۔ یہ مفروضہ مصر اور میسوپوٹامیہ ۴۸ میں قدیم تہذیبوں کے آثار کی شہادت سے غلط معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ اعتماد کے قابل یہ نظریہ معلوم ہوتا ہے کہ بحیرہ عرب سے اُٹھنے والی جنوبی مغربی مان سون قدیم زمانہ میں شمال اور مغرب کے علاقوں میں زیادہ دور تک پہنچتی تھی لیکن اب اتنی دور نہیں پہنچتی۔

بس پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ سندھ میں تھر ریگستان کی شمالی پٹی میں جوریت کی پہاڑیاں موجود ہیں اُن کا منظر یہ ظاہر کرتا ہے کہ مانسون قدیم زمانہ میں زیادہ قوت کے ساتھ جاری تھی، لیکن اب اُس کا دور کم ہو گیا ہے۔۴۹ زیادہ قوت کے ساتھ بائیں ہاتھ پر اِس کے کناروں کی ہوائیں ممکن ہے موجودہ خط سے مغرب کی طرف شدت سے پہنچتی ہوں۔۵۰ اِس کے نتیجے میں گو یقین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن ممکن ہے کہ جن علائقوں پر یہ محیط ہوتی تھیں اُن میں بارش کثرت سے ہوتی ہو۔ اِس کے برعکس سر جان مارشل (Sir John Marshall) سے ریورٹی کی کتاب "مہران آف سندھ" سے جو حوالے دیئے ہیں، مجھے اُن میں بارش کی کثرت یا قلت کا کوئی ذکر نہیں مل سکا۔ یہ تمام حوالہ جات اُن تبدیلیوں سے تعلق رکھتے ہیں جو دریاؤں کے راستوں میں تبدیلی یا زلزلوں کی وجہ سے مخصوص علائقوں میں واقع ہوئیں۔

اِس سلسلہ میں ماہرین موسمیات نے جو مفروضے پیش کئے ہیں۔ سر مورٹیمر وہیلر نے اُنھیں اُلٹ کر بیان کیا ہے اور میرے خیال میں یہی درست بھی ہے۔ کہ موسم کے حالات میں قدیم زمانہ سے اب تک جو ابتری پیدا ہوئی وہ حقیقت ہو سکتی ہے۔۵۱ لیکن اِس کا سبب خود انسانی عمل ہے۔ سر وہیلر نے آر-بی وہائٹ ہیڈ (R.B White Head) کے حوالے سے سوالک (Siwalik) کے پہاڑی جنگلات کی مثال پیش کی ہے جنھیں انسانی استعمال نے ختم کر دیا۔ شمالی مغربی سرحدی علائقوں کے باشندوں میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے، کہ پہلے جتنے جنگلات اِن علائقوں میں موجود تھے اب وہ برائے نام رہ گئے ہیں۔ اِن روایات کی روشنی میں حقیقت حال کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی زمانہ میں کچھ برطانوی سیاحوں نے بھی چند علائقوں کے متعلق جو تفصیلات چھوڑی ہیں اُن سے مذکورہ روایات درست معلوم ہوتی ہیں۔ جنگلات کی یہ تباہی اِس سبب سے معلوم ہوتی ہے کہ اضافہ آبادی کے ساتھ مویشیوں اور خاص طور پر بکریوں کی زیادتی ہوئی جنہوں نے دور دور تک اُگنے والی نباتات کو سر نکالتے ہی چر لیا۔۴۸ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے

شہروں کی تعمیر میں جو پختہ اینٹیں استعمال ہوئیں اُنھیں تیار کرنے میں چونکہ میدانی جنگلات کی لکڑیاں استعمال کی گئی ہوں گی۔ اِس لئے جنگلات ختم ہو گئے۔ جس کی وجہ سے علائقہ میں رطوبت بتدریج کم ہوگئی۔ اِسے ایک غیر اہم دلیل قرار دے کر رد کیا جا سکتا ہے۔۵۲ سندھ کے علائقہ میں جس طرح دوسری آفتوں کا سبب دریائے سندھ کے راستہ کی تبدیلی میں تلاش کیا جاتا ہے اُسی طرح کیا موسمی تبدیلی کا سبب بھی اِس میں تلاش نہیں کیا جانا چاہئے؟ اِس صورت میں راستے کی تبدیلی کو ہماری معلوم تبدیلیوں کی نسبت سے کہیں زیادہ انقلابی یا انتہائی ہونا چاہئے۔لیکن بنیادی طور پر یہ ناممکن نہیں ہے۔

موہن جودڑو (Moen-Jo-Daro)، لوہم جودڑو (Laham-jo-Daro) چانہوں جودڑو (Chanhu -Jo-Daro) بلکہ کوٹ آسور (Kot Asur) اور ڈی جی ٹکری (Digi-Ji-Takri) کا وجود ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ وادی سندھ کی اِن بستیوں کے زمانہ میں دریائے سندھ کا بڑا چشمہ جو ضروری نہیں ایک پاٹ کی شکل میں ہی بہتا ہو۔ کسی جگہ اپنی موجودہ وادی میں روہڑی پہاڑیوں اور سلسلہ کھیرتھر کے درمیان بہتا تھا۔ اپنے بہاؤ کے اِس حصہ میں داخل ہونے کے لئے دریا کو لازماً بکھر کی تنگ نائے سے گذرنا پڑا ہوگا۔لیکن اِس کے بعد یہ سکھر کی پہاڑیوں کے شمال سے گذرا ہوگا۔لیکن اگر اِس مقام سے پہلے دریا کا مرکزی دھارا بائیں ہاتھ کی طرف کھسک گیا ہوگا تو اُس کا لازمی نتیجہ کیا ہوا ہوگا؟ دریا یقیناً روہڑی کی پہاڑیوں کے مشرق میں چلا گیا ہوگا۔اور اپنی خاص وادی میں اُس وقت تک داخل نہیں ہوا ہوگا جب تک کہ چانہوں جودڑو کے عرض البلد سے نچلی سطح کے مقام پر نہ پہنچ جائے۔اِس طرح تقریباً ڈیڑھ سو میل وادیٔ سندھ اپنے دریا سے محروم رہے گی۔

یہ انقلاب دونوں مقامات مذکورہ کے درمیان واقع علائقہ کے لئے تباہی کا پیغام ہو گا۔لیکن موہن جودڑو کی خوش حالی اِس سے بھی کم تر تبدیلی سے ختم ہوسکتی تھی۔ ہمیں یقین ہے کہ جب موہن جودڑو اپنے عروج پر تھا تو دریائے سندھ اِس شہر سے آج کی نسبت بہت

کم فاصلہ پر بہتا تھا، اور موہن جودڑو کی طویل عمر اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ دریائے سندھ نے طویل مدّت تک بہاؤ کا یہ راستہ برقرار رکھا۔

اور ظاہر ہے کہ اس عرصہ میں دریائے سندھ معمول کے مطابق اپنے بہاؤ کے راستہ کو مٹی سے بلند کرتا رہا ہوگا تا آنکہ وہ وقت آپہنچا جب یہ بلندی راستہ کی تبدیلی کا سبب بن جاتی ہے۔ اِس کے نتیجہ میں جو تبدیلی رونما ہوئی وہ موہن جودڑو سے کافی پہلے ہی کس مقام پر واقع ہوئی ہوگی اور دریا اِس حد تک مشرق کی طرف ہٹ گیا ہوگا کہ خیر پور میرواہ (Mir wah) کے قریب پہنچ گیا ہوگا اِس طرح موہن جودڑو کے مقابل دریا کے موڑ سے شہر کا فاصلہ تیس میل ہوگا۔ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ ایسی تبدیلی کے بعد ایک قطرہ آب بھی پرانے راستے سے نہیں گذریگا۔ سالانہ طغیانی کے موقع پر پرُانے آبی راستے سے بھی کچھ دور تک پانی گذرے گا۔ لیکن ایسی صورت میں اگر کشادہ آبی راستے سے پانی کی ایک مختصر مقدار گذری بھی تو یہ خاص چشمہ کی سیلابی زرخیزی کے مقابلہ میں کوئی خاص فائدہ مند قرار نہیں دی جا سکتی اور یہ خاص چشمہ ہی تھا جس پر موہن جودڑو کی زراعتی خوشحالی کا دارومدار ہوگا، اور اگر دریائے سندھ بیس میل سے زیادہ کی نشیب کی طرف کھسک گیا ہوگا تب اِس کا سیلابی پانی موہن جودڑو کے نواحی میدانوں تک پہنچتا ہی نہیں ہوگا۔

یہ میں بیان کر چکا ہوں کہ سالانہ طغیانی کے زمانہ میں جب پانی دریا کے کناروں سے نکل کر معمول کے مطابق دور دور تک پھیل جاتا ہے تو جہاں تک اِس کی پہنچ ہے وہاں کی زمین جھاڑیوں اور پودوں سے بھر جاتی ہے۔ اِس جنگل کے گھنے ہونے کے انحصار زمین میں پانی کی مقدار پر ہے۔ یہ دریائی مٹی سے پروان چڑھتے تھے، بڑھتے ہی رہتے تھے اور انسانی عمل اِن کی بڑھوتری کو روک نہیں سکتا تھا۔ یہ جنگلات جیسے آج بھی بارش کے محتاج نہیں ہیں۔ لیکن اِن کی موجودگی نے بارشوں کی کثرت اور باقاعدگی کو برقرار رکھنے میں ضرور مدد دی ہوگی اور جیسا کہ دوسری شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اُس زمانہ میں بارش کی کثرت تھی۔ اگر ہم اِسی مفروضہ کو قبول کر لیتے ہیں کہ دریائے سندھ نے کافی مشرق کی

طرف بہاؤ کا راستہ اختیار کرنے کی وجہ سے شمالی مغربی سندھ کا بڑا علاقہ چھوڑ دیا ہوگا تو ظاہر ہے اِس علاقہ میں سیلابی پانی کی قلت سے نباتاتی پیداوار پر اثر پڑا ہوگا اور وہ کم ہوتے ہوتے صحرائی جھاڑیوں کی شکل میں رہ گئی ہوگی اور اُس کی باقاعدگی پر کافی اثر پڑا ہوگا۔ ایسی حالت میں کہ جنوبی مغربی مانسون کی شدت میں کمی واقع ہوگئی ہو۔ مذکورہ مقامی کیفیت کا اثر تقابلی طور پر زیادہ اہم نہیں۔ اور تھر کی ریت کی پہاڑیوں کی صورت کے مطالعہ کے ضمن میں اُنھیں بطور شہادت ہم پیش کر چکے اور بتا چکے ہیں کہ مانسون کمزور پڑ گئی تھی۔ لیکن اِس سے اُس مدّت کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا جو اِس انقلاب کے لئے ضروری ہوئی ہوگی۔

وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانہ میں اِس ملک کی جو حالت ہمارے مفروضہ کے مطابق ہوگی اُس کی طرف آیئے۔ ہم یہ توقع کر سکتے ہیں کہ منچھر جھیل کے آس پاس ایک اہم زرعی خطّہ موجود ہوگا، جس کے متعلق گذشتہ صفحات میں ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ یہ ایسا نشیب ہے جس میں دریائے سندھ کے دائیں کنارے کا سیلابی پانی داخل ہوتا ہے اور پہاڑی علاقہ کے بڑے حصّہ کا بارانی پانی بھی بہہ کر یہاں آتا ہے۔ اِس دوہرے سیراب کی بدولت جو عموماً جولائی اور اگست میں نظر آتا ہے، جھیل کا پانی شمال اور مشرق کی سمت میلوں لمبے چوڑے علاقے میں پھیل جاتا ہے۔ یہ پانی اڑل ندی کے ذریعہ اُس وقت جب دریائے سندھ کی سطح گرتی ہے باہر نکلنا شروع ہوتا ہے اور اِس طرح ایک وسیع قطعہ زمین ربیع کی فصل کے لئے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی وادیٔ سندھ اور کئی بستیوں کے آثار پائے گئے ہیں یعنی لاکھیو (Lakhiyo) لوہڑی (Lohri) اور شاید بوبک (Bubak) ۵۴۔ شاید یہی وہ مقام ہے جہاں وادیٔ سندھ کی عوام اور اُن کے پڑوسی پہاڑی لوگوں کے درمیان رابطہ قائم ہوتا تھا۔ پہاڑی باشندے اپنے اناج کی ضرورت منچھر کے زرخیز علاقہ سے پوری کرتے ہوں گی۔

اس جھیل کی پسگردائی میں جو قبل از تاریخ کی بستیاں موجود ہیں، ان کی خاص خاصیت یہ ہے کہ وہ تمام کم بلندی پر ہیں۔ مجمدار نے لال چھتو (Lal Chhato) اور

ترہنی (Trihni) دڑوں کو ۸ دسمبر کو دیکھا تو یہ منچھر کی سطح سے صرف ۸ فوٹ بلند تھا۔ اور پیر مشاق (Pir Mashak) (شاہ حسن) کی اونچائی بھی تقریباً یہی تھی۔ آبکلانی کی موسم میں ان قدیم بستیوں کا کافی حصہ پانی کے نیچے آجاتا ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ روہندو (Rohindo) اور مادی بت (Made But) تو مکمل طور پر ڈوب جاتا ہوگا۔ پیر لوہری (Pir Lohri) اور پیر لاکھیو (Pir Lakhio) نامی قدیم بستیاں تو منچھر کی موسم سرما کی حد سے کوئی چار میل کی دوری پر ہیں اور پسگر دائی والے میدانوں سے اور بھی نچلی سطح رکھتے ہیں، لیکن لوہری تو کم از کم آبکلانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ۵۵

یہاں کی قدیم بستیوں کے سلسلہ میں ایک خاص بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ ان کی سطح جھیل کے علائقہ سے بہت کم بلند تھی، مجمدار نے اپنے دورے میں دیکھا کہ لال چھتو (Lal Chatto)، ترہنی (Trihini) منچھر کی سطح سے صرف آٹھ فٹ بلند ہیں، یہ آٹھ دسمبر کا ہے شاید اور پیر مشاق (Pir Mashak)، شاہ حسن (Shah Hasan) بھی اسی قدر بلند تھا، پانی بھر جانے کے بعد یہ مقامات زیرآب آجائیں گے۔ روہندو (Rohindo) اور ماڑی بت (Made But) تو مکمل طور پر پانی کے نیچے ہوں گے۔ پیر لوہری (Pir Lohri) اور پیر لاکھیو (Pir Lakhiyo) جھیل کی سرمائی حد سے چار میل کے فاصلہ پر ہیں اور سطح کے اعتبار سے اور بھی نیچے ہیں، پیر لوہری پانی بھرنے کی صورت میں زیرآب آجانا چاہیے۔ ۵۵

مجمدار کا خیال ہے کہ اس مقام پر سندھ جس راستے سے آجکل بہتا ہے کانسی کے دور میں مزید فاصلہ پر مشرق کی سمت بہتا ہوگا اور منچھر میں پانی صرف پہاڑی ندیوں کے ذریعہ پہنچتا تھا۔ چنانچہ یہ جھیل جتنی وسیع آجکل ہے اس سے کم اس زمانہ میں ہوگی۔ ۵۶ اگر یہی حقیقت ہے تو مذکورہ تمام مقامات جو محل وقوع کے اعتبار سے قطعاً غیرموزوں نظر آتے ہیں اُس وقت بہت اچھی طرح شدید سیلاب کے زمانہ میں بھی پانی کی سطح سے کافی بلند رہتے ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مٹی کے پشتوں سے ان مقامات کو محفوظ کر دیا گیا ہو جو مسلسل

سیلابی پانی کی آمد سے آہستہ آہستہ بہہ گئے اور آبادی کا علاقہ بھی اپنی بلندی کھوتے کھوتے آسپاس کی زمین کے برابر رہ گیا جواب سال کے بیشتر حصہ میں پانی سے ڈھکے رہتے ہیں۔

ایک دلچسپ امکان جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مجمدار نے بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ شاید لال چھتو (Lal Chhatto) اور پیر مشاق قدیم زمانہ میں دیہات تھے اور یہاں کے باشندوں نے زمین میں لکڑی کی بلیاں گاڑ کر زمین سے اپنی جھونپڑیوں کی سطح کو بلند کیا ہوا تھا تاکہ پانی سے محفوظ رہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی موہانہ قوم کے لوگ اِسی طرح جھونپڑیاں بناتے ہیں۔ یہ لوگ جھیل کے مچھیرے اور شکاری ہیں۔ ۵۷

یہ نظریہ اِس بات سے بھی مطابقت رکھتا ہے کہ یہاں کسی قسم کا تعمیراتی سامان مثلاً پتھر اور اینٹ وغیرہ کا نشان نہیں مل سکا، لیکن کھدائی کرنے سے گلی ظروف اور گھریلو استعمال کی دوسری اشیاء برآمد ہوئیں ہیں، جو خالص دریائی مٹی کی تہ کے نیچے دفن تھیں۔ یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ موجودہ حالات میں اِس قسم کی جھونپڑیاں بھی یہاں نہیں بنائی جا سکتیں۔ لوہری (Lohri) کے مقام پر ایسے مکانات کے آثار دریافت ہوئے ہیں جن کی بنیادوں میں پتھر استعمال کیا گیا تھا۔ اگر اُس زمانہ میں جھیل میں سیلابی پانی کی سطح موجودہ زمانہ سے بہت نیچے نہ ہوتی تو ایسے مکانات کی تعمیر ممکن نہیں تھی۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مشاق اور لال چھتو کی پانی سے گھری ہوئی آبادیوں سے دریافت شدہ گلی ظروف بہ ظاہر اُن سے بہ مشابہ ہیں جو جھکر (Jhukar) اور لوہم جو دڑو (Lohum Jo Dard) مقامات سے برآمد ہوئے اور کھدائی کرنے والے محققین کے خیال کے مطابق اِن کا تعلق وادیٔ سندھ کی تہذیب کے آخری دور سے ہے۔ ۵۸ بعد کی تحقیقات بالخصوص چانہوں جو دڑو کے مقام سے ملنے والے باقیات کو دیکھتے ہوئے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ظروف اُن لوگوں کی تخلیق ہیں جنہوں نے وادیٔ سندھ تہذیب کے زوال کے بعد اِن مقامات میں بودوباش اختیار کی۔ پروفیسر پگوٹ (Piggot) نے اِن ظروف کے متعلق لکھا ہے کہ "ہڑپہ اور کلی کے نقش و نگار کا اختلاط

اِن میں پایا جاتا ہے اِس کے ساتھ ہی آمری طرز کا تاثر بھی ملتا ہے۔ دوسری اشیاء جو چانہوں جودڑو کی اُس زمینی تہ سے برآمد ہوئیں جو جُھکر (Jhukar) کے برابر ہے، قدیم سندھ اور مشرقی بلوچستان میں بنی ہوئی اشیاء سے بالکل مختلف ہیں اور اگر مشابہت رکھتی ہیں تو اُن قدیم لوگوں کی تخلیقات سے جو مزید مغرب کے علائقوں میں آباد تھے۔ مجموعی طور پر یہ باقیات جو تاثر پیدا کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ اِن کو بنانے والے سفر کے لئے ہلکے پھلکے سامان بناتے تھے۔ شاید یہ لوگ فاتح کی حیثیت سے علاقہ میں داخل ہوئے۔

جب ہم جملہ شہادتوں کو جمع کرتے ہیں تو چند باتیں واضح ہو کر سامنے آتی ہیں۔ موہن جودڑو اپنے آخری ایام میں بہت گنجان آبادی کا شہر تھا۔ اضافہ آبادی کی وجہ شاید یہ تھی کہ بہت سے لوگ نقل مکانی کر کے شہر میں آ گئے تھے۔ یہ لوگ ممکن ہے وسطی بلوچستان ۶۰ سے یہاں آئے ہوں یا سندھ کے چھوٹے اور ایسے شہروں سے جن کے دفاع کرنا مشکل ہو۔ سندھ کے جو قصبے اِن لوگوں نے خالی کئے اُن پر مغربی بلوچستان یا اُس سے بھی آگے مغربی علاقہ کے حملہ آواروں نے قبضہ کر لیا، نو وارد قوم نے آمری اور وادیٔ سندھ کی بہت سی دستکاریوں کو جو اُنھیں اچھی معلوم ہوئیں اختیار کیا۔ ۶۱ یہ ہمارا خیال ہے کہ مقامی باشندے بغیر لڑے بھڑے آسانی سے مغلوب ہو گئے تھے، اور آنیوالوں نے مفتوح قوم کی تمدّنی ترقیات کو حسد کی نظر سے نہیں دیکھا۔

موہن جودڑو ریاست جو زیریں وادی سندھ میں قائم تھی اُس کے زوال کا خاص سبب کیا تھا اور یہ انقلاب کس طرح آیا؟ کیا مغربی خونخوار قوم کی جسمانی قوت اور اسلحہ کی برتری اِس کا سبب تھا اور یہ کہ اِس سے پہلے ہی یہاں کے باشندوں کی تعداد اور فنون زوال پذیر تھے؟ ممکن ہے یہ معقول وجہ ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اِس سے بہتر تصویر وادیٔ سندھ کی قوم کے زوال کی ہمارے سامنے آتی ہے اگر ہم ایک دوسری دلیل سے کام لیں۔

جیسا پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ فرض کیجیئے کہ دریائے سندھ نے سکھر سے اوپر اپنا راستہ تبدیل کر لیا اور نتیجہ یہ ہوا کہ اِس مقام اور سیہون کے درمیان کا تمام علاقہ سالانہ سیلابی

پانی سے محروم ہو گیا۔ جس راستے کو دریا نے چھوڑا اُس میں کبھی کبھار عارضی طور پر پانی بہنے لگا۔ اِس علاقہ کے جنوب میں رہنے والوں پر اِس آفت کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہوگا۔ یہ لوگ دارالخلافہ میں داخل ہونا شروع کر دیتے ہیں (شاید یہاں کے پروہت بادشاہ کے تقدس کی وجہ سے) اُنھیں یقین ہے کہ یہاں اُنھیں روزی ملتی رہیگی۔ ایسی زراعت کو ترقی دینے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے جس کا انحصار ندیوں اور بارانی پانی پر ہے، اِس کے ساتھ ہی ہر جگہ سے غلّہ حاصل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے اور یقیناً خدا کے سامنے اجتماعی دعائیں بھی کی جاتی رہی ہوں گی۔ کہ وہ عذاب کو دور کر دے لیکن اِن تمام باتوں سے کوئی فائدہ نہ ہو سکا، اب پہاڑی علاقے کی ندیوں اور کچھ زمین کی اہمیت حالات کے پیش نظر بڑھ جاتی ہے، جو لوگ وہاں جگہ حاصل کر سکے وہ خوش قسمت شمار ہوتے ہیں، کیونکہ وہ دریائے سندھ اور اُس کی بے وفائی سے آزاد ہو جاتے ہیں، یہ خبریں آہستہ آہستہ پہاڑی علاقہ میں پھیل جاتی ہیں، اب سندھ کی چراگاہیں اُس قوم کی ملکیت بن سکتی ہیں جو جرئت کا مظاہرہ کرے اور اِس موقع سے ایک قوم فائدہ اُٹھاتی ہے، مغربی نیم مہذب قوم یہاں قافلہ در قافلہ داخل ہونے لگتی ہے اور خالی پڑی ہوئی بستیوں میں اپنے بے ڈھنگے جھونپڑے بنا لیتی ہے اور وہ زمین جو مقامی کسان کو نا قابل زراعت معلوم ہوتی ہے وہ نئی قوم کے چرواہوں کے لئے کافی وسیلہ معاش کی حامل ثابت ہوتی ہے کیونکہ وہ تو پہلے ہی سخت کوشی کے عادی ہیں۔ اِسی اثناء میں موہن جو دڑو کے باشندے مجبوراً شمال مشرق کی سمت ہجرت کرتے رہتے ہین جہاں دریائے سندھ پُرانے راستہ پر قائم ہے۔ صرف کمزور لوگ شہر میں باقی رہ جاتے ہیں، اور جب سخت جان نو وارد، لوٹ مار کے بھوکے، شہر پر آخری حملہ کرتے ہیں تو پہلی ہی کوشش میں شہر کے دفاع کو توڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ مندرجہ بالا خاکہ جو زیریں وادی سندھ کی قدیم تاریخ کے متعلق پیش کیا گیا اِس میں کافی جوڑ توڑ اور خیال آرائی نظر آتی ہے مگر مجھے امید ہے کہ پڑھنے والے یہ ضرور تسلیم کریں گے کہ جو آثاریات کے شواہد قلیل تعداد میں ہمارے پاس موجود ہیں یا

سندھ کی وہ طبعی حالت جو ہماری معلومات کے مطابق ہے یہ خاکہ اُس سے تضاد نہیں رکھتا۔ وادیٔ سندھ پر ایسے لوگوں کا غلبہ اور بالآخر ایک منظم تہذیب کی اِن کے ہاتھوں تباہی جنہوں نے خود اپنے وجود کے متعلق صرف چند نشانیاں ہی چھوڑی ہیں زیادہ حقیقت کے مطابق ہو جاتا ہے۔

اگر یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جائے کہ اِس غلبہ سے پہلے اِس متمدن قوم پر کوئی قدرتی آفت نازل ہوئی تھی۔

دوسرے حقائق اِس کے بعد اپنے اپنے مقام پر درست معلوم ہوتے ہیں۔ دیہاتوں کے آثار جو منچھر ۶۳ جھیل کے کنارے دریافت ہوئے یقیناً اُس زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو وادیٔ سندھ تہذیب کے زوال پر یا اُس کے فوراً بعد شروع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مچھلی پکڑنا زمانہ قدیم سے ہی یہاں کے باشندوں کا پیشہ رہا ہوگا، لیکن ہڑپہ اور آمری کے کھنڈرات کسی بھی ذخیرہ آب سے خاصے فاصلہ پر ہیں۔ ظاہر بہ ظاہر جو وجہ سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ بعد کو آنیوالے لوگوں کے وقت میں جو جھیل میں مچھلیاں پکڑ کر بسر اوقات کرتے تھے، جھیل کافی چھوٹی ہو چکی تھی، جس کا سبب یہی ہوسکتا ہے کہ یہ دریائے سندھ کے پانی سے محروم ہوگئی تھی۔ کیونکہ دریا اِس کے قریب پہنچنے سے کافی پہلے ہی اپنا راستہ تبدیل کر چکا تھا۔ ۶۴

مزید یہ کہ اگر اِس قدرتی آفت کو ہم تسلیم کر کے اپنی تحقیق میں آگے بڑھتے ہیں تو منچھر کے جنوب اور مغرب میں جو آثاریات دریافت ہوئے ہیں، اُن کے متعلق حیرت انگیز طور پر تسلی بخش نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں اور وادی سندھ کی جو قدیم آبادیاں ۶۶ آمری قوم کی بستیوں کے نواح میں کہیں ہیں کہیں اُن کے درمیان ۶۷ اور کبھی اِس طرح خلط ملط کہ اُنھیں الگ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ پائی جاتی ہیں اُن کا عقدہ بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے۔ ۶۸

جہاں تک زمین کی تہوں پر تحقیق کا تعلق ہے خود آمری میں، لوہری میں اور غازی شاہ

میں یہ بات صاف صاف طور پر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ وادی سندھ کی قوم نے اِن بستیوں میں اُس وقت بود و باش اختیار کی جبکہ آمری قوم کو یہ بستیاں چھوڑے ہوئے طویل مدت گذر چکی تھی۔ اِسی شہادت کی بنا پر ماہرین آثاریات یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ آمری تمدن وادیٔ سندھ کی عظیم تہذیب سے بھی پہلے اپنی بہار دکھا چکا تھا۔ اگر یہ نظریہ تسلیم کرلیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے مقامات پر دونوں قوموں کے درمیان اتصال کی جو مثالیں ملتی ہیں اُن کا جواز کیا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ آمری کے بعد موہن جودڑو کے مستقبل کے معمار وادی سندھ میں جنوبی بلوچستان کے راستے داخل ہوئے اور اُن کی مدنی ترقی کے لئے یہ آمری مقامات درمیانی منازل کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور اگر وادیٔ سندھ کی قوم کسی دوسری جگہ سے وارد ہوئی تو کیا یہ حقیقت ہے کہ میدانوں میں اپنے مراکز قائم کر لینے کے بعد اُنھوں نے پہاڑی کے دامن میں نوآبادیاں قائم کیں؟ صورتحال کچھ بھی رہی ہو معلوم یہ ہوتا ہے کہ دونوں قومیں ایک عرصہ تک ساتھ رہیں لیکن اُن کے باہمی تعلقات کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے، مجموعی طور پر شہادت کی موجودگی یا یوں کہیے کہ اِس کے برخلاف کسی شہادت کا نہ ملنا۔۶۹ اِس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ باہمی رواداری کے اصول پر اُن لوگوں کا عمل تھا لیکن روابط اتنے مظبوط نہیں تھے کہ وہ ایک دوسرے کے تمدن پر اثر انداز ہوسکتے۔

اِس میں شبہہ نہیں کہ دونوں قوموں کے درمیان اجناس کا تبادلہ ہوتا تھا، اور یہ دیکھتے ہوئے کہ وادیٔ سندھ سلطنت برتر قوت کی مالک تھی خیال پیدا ہوتا ہے کہ آمری قوم اُسے خراج ادا کرتی ہوگی۔۷۰ ظاہر ہوتا ہے کہ وادی سندھ کی قوم نے پھوسی درے (Phusi Pass) کی حفاظت کے لئے علی مراد کی فوجی چوکی تعمیر کی تھی۔ یہ درّہ وسطی بلوچستان اور سندھ کو ملانے والے اہم شاہراہ پر واقع ہے۔ لیکن جنوبی پہاڑیوں میں اِن کی جو بستیاں تھیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کھلے دیہات تھے۔ سرداروں کے مضبوط گڑھ نہیں تھے۔ کس بات نے اِن لوگوں کو آمادہ کیا کہ وہ اِس پہاڑی علائقہ میں آمری قوم کے ساتھ شریک

ہوں۔ بلکہ اِس علاقے میں اُنھیں آبادیاں قائم کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ شمال سے جنوب کی طرف جو شاہراہ پہاڑی علاقہ سے گذرتی ہے اس سے آمری بستیوں کا سلسلہ مکمل نہ ہوتا اور ادھورا رہ جاتا اگر وادیء سندھ کی قوم کی قدیم بستیاں کرچات (Karchat) اور شاہ جو کوٹیرو (Shah jo Kotiro) اِن کے درمیان موجود نہ ہوتے۔ اِس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ دونوں قومیں ایک ساتھ رہتی تھیں۔ یہ شاہراہ دریائے سندھ کے مغرب میں بالائی اور زیریں سندھ کے درمیان ایک اہم رابطہ کا کام دیتی ہوگی۔ کیا یہ فرض کرنا درست ہوگا کہ وادیء سندھ کی قوم کے زمانہ میں کسی سمندری بندرگاہ تک رسل و رسائل کا اطمینان بخش سلسلہ قائم تھا یا پھر مغرب کی طرف کسی اہم بڑی تجارتی شاہراہ تک اُن کا رابطہ قائم تھا اگر مذکورہ بالا قدیم بستیوں کے جنوب میں وادیء سندھ کی چھوٹی سی آبادی ڈیسوی (Desvi) پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دو راستوں کے نقطہ اتصال پر واقع تھی۔ ایک راستہ تھرڑی گجو (Tharirri Gujo) کو جاتا ہے اور دوسرا عاملانو (Amilano) سے گذر کر پبونی ناکا (Puboni Naka) سے ہوتے ہوئے لسبیلہ کے میدانوں اور آگے تک چلا جاتا ہے۔ ا؎

چنانچہ جن مقامات کا ذکر کیا گیا دو طرفہ تجارت کی بدولت وجود میں آئے ہوں گے۔ لیکن ایک اور امکان بھی ہے جو نہ صرف اِن مقامات کے لئے بلکہ سندھ کے سرحدی پہاڑی علاقہ کے دیگر قدیم مقامات کے لئے جواز بن سکتا ہے، آمری قوم کی بستیوں کے ساتھ اِن کے مختلف روابط کو واضح کر سکتا ہے، وہ یہ کہ دریائے سندھ کی آبی گذرگاہ کی تبدیلی سے جب وادیٔ سندھ کی تہذیب پہلی بار زوال پذیر ہوئی اور اُس قوم کے لوگ اپنی میدانی آبادیوں کو ترک کر کے پہاڑی علاقہ میں سکونت اختیار کرنے لگے تو یہ اُن کی پڑوسی آمری قوم کی مہمان نوازی کی بدولت ممکن ہوا۔ ڈمب بٹھی (Dumb Bathi) اور ڈھلھ (Dalh) میں ان لوگوں نے آمری قوم کی آبادی کے ساتھ ساتھ اپنے مکانات تعمیر کئے تو نگ اور نئینگ میں یہ نظر آتا ہے کہ آمریوں کی آبادی کے اندر ہی اِن لوگوں کو قبول کر لیا گیا ۲؎۔

کرچات اور شاہ جو کوٹیرو میں اِن لوگوں نے آمری بستیوں کے درمیان اپنے الگ دیہات آباد کیئے ۔ اِن تمام مقامات پر تمام سال پانی دستیاب ہے اور کچھ کاشتکاری بھی ہوتی ہے، کم ازکم نو وارد اگر محنت کرنے کے لئے تیار تھے تو یہاں اُنھیں پیٹ بھر کھانا میسر آسکتا تھا بشرطیکہ وہ آمری قوم کے ساتھ اپنی نئی حیثیت کو پہچانتے ہوئے رہنے پر بھی تیار ہوتے۔

پہاڑی علاقہ کی طرف نقل مکانی کا یہ عمل شمال کی طرف سے بالائی سندھ پر حملہ کی صورت میں بھی ظاہر ہوسکتا ہے۔ اُس صورت میں دریائے سندھ کے بہاؤ کی مفروضہ قدرتی آفت کو درمیان میں لانے کی ضرورت نہیں، یا وادی سندھ کی وہ آبادیاں جو آمری آبادیوں کے درمیان پائی گئی ہیں صرف ایک محدود پیمانہ پر کی گئی تھی۔ ایک نو آبادیاتی نظام قائم کرنے کی کوشش ہوسکتی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آگے چل کر ایسی شہادتیں دستیاب ہوجائیں جن سے یہ ثابت ہو کہ وہ قوم جو اچانک سندھ کے میدانوں میں ایک ترقی یافتہ تہذیب سے حامل نمودار ہوتی نظر آتی ہے کسی اور جگہ تمدّنی ترقی کے یہ منازل طے کرچکی تھی۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہ مفروضہ باطل قرار پائے گا کہ وادی سندھ کی قوم نے جب سندھ کی طرف پیش قدمی شروع کی تو پہاڑی علاقہ ان کے جو آثار ہیں وہ ان کے سفر کی آخری منزلیں اور قیام گاہیں تھیں ۔۲ے

موہن جودڑو کے آخری ایام کا جو خیالی ڈرامہ میں نے پیش کیا اُس میں خاتمہ سے پہلا منظر یہ تھا کہ شہر کی آبادی کی اکثریت شمال مشرق کی طرف اُس علاقہ میں منتقل ہونے لگتی ہے جہاں ابھی تک دریائے سندھ اپنے راستہ پر قائم ہے، میرے اِس مفروضہ کے متعلق جو رائے بھی قائم کی جائے۔ ہمیں کم ازکم یہ تو معلوم ہی کرنا چاہیئے کہ موہن جودڑو کے ہزاروں باشندوں کا کیا حشر ہوا؟ آیا اُن کی سلطنت کی تباہی یک لخت واقع ہوئی یا بتدریج۔۳ے اور اِس کا سبب قدرتی آفت تھی یا انسانی دشمنوں کا حملہ۔ کھدائی کے بعد جو انسانی ڈھانچے یہاں سے ملے اُن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خاتمہ مکمل ہونے کے وقت جو بدقسمت اپنے گھروں سے چمٹے رہے اور پوری آبادی جب شہر چھوڑ کر گئی تو اُس کے ساتھ نہ گئے۔ اور آخر

وقت تک حملہ آواروں کا مقابلہ کرنے والی قوم کے جو کمزور اور زخمی پیچھے رہ گئے یہ اُن کے ڈھانچے ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ فرضی نقل مکانی جو میں نے پیش کی ہے اُس کی تائید میں کوئی براہ راست شہادت موجود نہیں ہے۔ لیکن انسانی بود و باش کی کثیر تعداد نشانیاں اور چقماق کے اوزار عین اُس علاقہ میں پائے گئے ہیں جہاں سے میرے مفروضہ کے مطابق شمالی مغربی سندھ کے علاقہ کو چھوڑ کر دریائے سندھ نے بہنا شروع کیا ہوگا۔ اور یہ حقیقت کہ اکثر مقامات بڑے پیمانہ پر انسانوں کی عارضی قیام گاہیں معلوم ہوتی ہیں، میرے نظریہ کی تائید میں پیش کی جا سکتیں ہیں۔ حالانکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ رینی نالا (Raini Nala) جب اِس علاقہ کو سیلاب زدہ کرتا ہوگا تو وہاں کے لوگ عارضی پناہ کے لئے یہاں آجاتے ہوں گے۔ اور یہی وجہ ہے کہ کثیر مقدار میں مٹی کے برتنوں کے ٹکڑے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن جگہ جگہ چقماق کے ٹکڑے بھی گلی ظروف کے ساتھ ملتے ہیں اور ریت کی پہاڑیوں اور ٹیلوں پر دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اِس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ اِن مقامات پر قیام کرنے والوں سے بہر نوع قدیم باشندے بھی شامل ہیں۔ مذکورہ مقامات میں سے اکثر چقماق کی چٹان والی پہاڑیوں سے پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہیں۔[۴۲]

اِس علاقہ میں ایک مقام جہاں طویل عرصہ تک انسانی بود و باش کے آثار ملتے ہیں، ڈرب ڈیتھری (Drib Dethri) ہے۔ ظاہر میں یہ ایک تنہا سو فٹ بلند پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جس کی بالائی سطح تقریباً چوتھائی میل میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بھی گلی ظروف کے ٹکروں سے ڈھکی ہوئی ہے، مغرب کی سمت میں یہ ٹکڑے ریت کی حالیہ یورش سے دب گئے ہیں۔ یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ گو ڈرب ڈیتھری کی بالائی سطح ایک ریت کی پہاڑی معلوم ہوتی ہے لیکن اِس کے نیچے ایک بڑا قصبہ دفن ہے۔ اِس سے جنوب مشرق کی سمت جو میدان ملحق ہے اُس میں سطح زمین سے تقریباً چار فٹ نیچے ایک پختہ اینٹوں کا کنواں دریافت ہوا تھا۔ کنویں کا قطر تقریباً پانچ فٹ ہے لیکن اینٹوں کی ہر ایک تہہ میں نو اینٹیں لگی ہوئی ہیں، جو یکساں

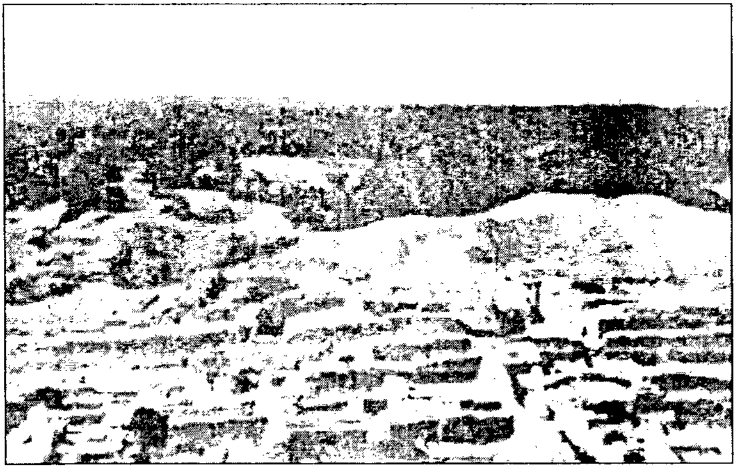

اسٹوپا(Stupa) سے مغرب کی سمت رخ کرنے پر موہن جو دڑو کا منظر

تھیر مرڑو: تعلقہ روہڑی کے نزدیک وادیٔ سندھ کی تہذیب کے دوَر کی آبادی کے آثار

سائیز کی نہیں ہیں اور کنویں کے وتر کے ساتھ لمبائی میں جمائی گئی ہیں جو موڑ دار خاکہ پیش کرتی ہیں۔ اِس کا طریقۂ تعمیر اُن تمام کنوؤں سے بالکل مختلف ہے جو موہن جو دڑو میں دریافت کئے گئے ہیں۔

مزید شہادت کے بغیر ڈرب ڈیتھری کی قدامت کا تعین مشکل ہے۔ امید کرنی چاہئے کہ بالاخر یہاں کھُدائی کا کام شروع کیا جائیگا۔ رینی ندی کی وادی کے جنوب مغرب میں تقریباً پچاس میل نیچے ایک دوسری قدیم آبادی کے آثار ہیں جسے وادیٔ سندھ تہذیب سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ یہ ایک کم بلند ٹیلہ ہے۔ اِس کا رقبہ ایک ایکڑ ہوگا اور سطح پر قدیم باقیات کے مخصوص نشان ہیں۔ اِن میں چقماق کے ٹکڑے اور سوراخ دار گلی ظروف شامل ہیں کھدائی سے پختہ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک دیوار جو کسی عمارت کا حصہ ہے، ظاہر ہوئی ہے، یہ جگہ جو تھیڑ (Ther) کے نام سے مشہور ہے ممڑو (Mamro) سے تین میل مشرق میں واقع ہے اور رینی ندی میں گرنے والے ایک برساتی نالے کے کنارے پر ہے۔ ٦ے ممڑو سے متصل زمین کے دو الگ الگ قطعات آس پاس کی سطح سے بلند ہیں جن پر برتنوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے ہیں۔ قدیم آبی گذرگاہوں کا یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے ہاکڑا کی شاخیں جو وسیع بیابانی علاقے سے گذرتی ہوئی آتی ہیں اور دریائے نارا سے اُس کی تنگ وادی میں متصل ہونے کے لئے جمع ہوتی ہیں۔

دریائے سندھ کے مشرق میں میدان کے بالائی حصہ میں ایک اور قدیم بستی ہے جو اپنے زمانہ میں ایک اہم مقام شمار ہوتی ہوگی اور غالب گمان یہ ہے کہ ہڑاپہ تہذیب سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ روہڑی سے ڈھائی میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ دریائے نارا میں پانی پہنچانے والی نہر کی کھدائی کے دوران اِس کے آثار سامنے آئے تھے۔ اِس واقعہ کو ایک سو سال سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، یہ بستی دس یا بارہ فٹ زمین کے نیچے دفن ہے۔ طول البلدی رُخ پر تقریباً پانچ سو گز کے فاصلہ کے اندر پختہ اینٹوں کے مقامات کی بنیادیں ظاہر ہیں۔ ایک بڑا کنواں جو چار فٹ سے بھی زیادہ چوڑا ہے مزید بارہ فٹ گہرائی تک کھودا

گیا تھا۔ پتھروں سے مضبوط بنائی ہوئی ایک دیوار بھی دریافت کی گئی تھی اور منقولہ اشیاء میں گلی ظروف، مٹی کے کھلونوں کی بڑی تعداد اور پتھر کے اوزان حاصل ہوئے تھے۔ ۷۷

جنوب کی سمت وادیٔ نارا میں تقریباً ڈھائی سو میل کے بعد جہاں یہ آبی گذرگاہ پھر ہاکڑا (Hakra) کے نام سے پکاری جاتی ہے۔ ہم بڑی تہذیب سے تعلق رکھنے والی ایک قدیم بستی کے آثار پاتے ہیں جو گاڑھو بھڑو (Garho Bhiro) کے نام سے مشہور ہے، یہ مٹھی (Mithi) تعلقہ میں نوہٹو (Nohto) کے نزدیک واقع ہے۔ گذشتہ صفحات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ۷۸ کہ ریت کی پہاڑیاں جو زیریں سندھ میں تھر کے مغربی کنارے پر ہیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جیسے سطح میدانی زمین پر یک لخت اُبھر آئی ہیں۔ جیسے ساحل سمندر پر چٹانیں۔ موضع نوہٹو کے قریب دو ٹیلے ہیں، ایک ریت کے ڈھیر پر ہے اور میدان کی طرف جھکا ہوا، دوسرا اِسی میدان میں ایک فرلانگ کے فاصلہ پر کھڑا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جنگل کے سمندر میں کوئی جزیرہ۔ ٹیلے کے ساتھ ریت کی ڈھیروں کا ایک سلسلہ ہے جس سے مورچہ بندی کے ایسے آثار صاف عیاں ہیں جو دورِ جدید سے تعلق رکھتے ہیں۔ لیکن گلی ظروف کے جو ٹکڑے بکھرے ہوئے ہیں اُنھیں دیکھ کر وہ مخصوص طرز یاد آجاتا ہے جو مغربی سندھ میں قبل از تاریخ مروج تھا۔ برتن کا ایک ٹکڑا جو رنگین ہے شاید جھکر (Jhukar) کے گلی ظروف سے تعلق رکھتا ہے، گاڑھو بھڑو کا جزیرہ نما مقام میدان سے پچیس فٹ بلند ہے اور پانچ یا چھ ایکٹر زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ اپنے نام کی مناسبت سے یہ مٹی کے پختہ پلاسٹر کی ریت اور گلی ظروف کے ٹکروں کی وجہ سے سُرخ نظر آتا ہے۔

سطحی باقیات زیادہ تر سندھو تہذیب سے تعلق رکھنے والی نظر آتی ہیں۔ توجہ کے قابل سوراخ دار برتنوں کی مختلف اقسام اور اُن کی بھتات ہے۔ مٹی کی روغن کی ہوئی چوڑیاں، چقماق کے ٹکڑے، نیم قیمتی پتھر کے ریزے، تانبے کے پن اور پگھلائی ہوئی دھات کے چھوٹے لوندے (Lumps) جن پر کام نہیں کیا جاسکا بھی باقیات میں شامل ہیں۔ منقش ظروف کے ٹکروں پر تاڑ کی پتیوں کے نقش بنے ہوئے ہیں۔ ایسے برتنوں کی بھی خاصی

مقدار موجود ہے، جن پر نقش و نگار کھدے ہوئے ہیں۔ ایسے ہی برتن دوسرے مقام پر جو اِس سے ملحق ہے اور جزیرہ نما معلوم ہوتا ہے، پائے گئے ہیں اِن میں سے اکثر گہرے سلیٹی رنگ کے ہیں اور جھانگر (Jhangar) کے ظروف سے مشابہ ہیں۔ ۹ے

موجودہ معلومات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ موضع نہؔٹو وادیٔ سندھ تہذیب سے تعلق رکھنے والی ایسی بستی آباد تھی جسے چانہوں دڑو جیسے وادی سندھ کی قوم کے بعد جھکر (Jhukar) اور جھانگر (Jhanger) کے لوگوں نے بھی بود و باش کے لئے استعمال کیا۔ اِس کی ظاہری بناوٹ باعثِ دلچسپی ہے۔ اگر میجر ریورٹی کا نظریہ درست مان لیا جائے تو اُس کا فاصلہ کسی طرح پچاس میل سے کم نہیں ہے اور کھلے سمندر سے تقریباً ایک سو میل۔ جہاں تک تاریخ سے پہلے زمانہ میں خطِ ساحل اور اُس کے تعلق سے موضع نہؔٹو کا محل وقوع نظر آتا ہے۔ اِس کے بارے میں عاجلانہ نظریہ قائم کرنا اُس وقت تک مناسب نہ ہوگا جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ پتھر کے زمانہ میں ہاکڑا کے اگلے میدان میں دوسری کوئی بستی موجود نہ تھی۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ نہؔٹو سے آٹھ میل سمندر کی طرف چل کر نوکوٹ (Naokot) کے مقام پر ایسے کھنڈرات پائے گئے ہیں جن کا تعلق گوتم بدھ کے زمانہ سے بتایا جاتا ہے اور یہ مقام اِس آبی گذرگاہ کے دائیں کنارے پر دریائی مٹی کے میدان میں واقع ہے۔ ۸۰ے چند میل اور آگے چل کر ہم ڈھورو پران (Dhoro Puran) اور ہاکڑا کے سنگم پر پہنچ جاتے ہیں۔

اگر نہؔٹو کی بستی اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے جب دریائے سندھ کی اصل گذرگاہ ہاکڑا ہی تھی یا سندھ کے پانی کی کثیر مقدار اِسی راستہ سے گذرتی تھی، تو ممکن ہے کہ موہن جودڑو سلطنت کے لئے اِس کی اہمیت ایک دریائی بندرگاہ کی حیثیت سے رہی ہو۔ البتہ یہ حیرت کی بات ہے کہ امکانی طور پر تو ذرائع آمد و رفت اور نقل و حمل آبی گذرگاہیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن اُس تہذیب کی باقیات میں کشتی کی مثالیں بہت ہی کم ہیں۔ جو نمونے دریافت بھی ہوئے ہیں وہ ایسی کشتیاں ہیں کہ سمندر میں کام نہیں دے سکتیں، صرف جھیلوں اور دریاؤں

مین استعمال ہوتی ہوں گی۔ مزید شہادت جب تک میسر نہ ہو یہ مناسب ہوگا کہ ہم وادیء سندھ کی قوم کو بحر نورد قوم نہ سمجھیں۔ اگر اُن کی کچھ تجارت سمندر کے راستے سے ہوئی تھی تو یہ دوسری قوم کے ہاتھوں میں تھی۔ ایسی آبی گذرگاہ جیسی نارا، ہاکڑا کہ اُس کے بہاؤ کا راستہ پائیدار تھا، کشتی رانی کے لئے کچھ زیادہ مہارت کا تقاضہ نہیں کرتی، اِس میں شبہ کی گنجائش برائے نام ہے، کہ چقماق کے ٹکڑے جو گاڑھو بھڑو سے پائے گئے یا وہ چٹان جس سے اُنھیں کاٹا گیا۔ دوسو پچاس میل شمال میں روہڑی کے مقام سے دریا کے راستے لائے گئے ہوں گے۔ جبکہ اِس کا امکان نظر نہیں آتا کہ مغرب کی سمت تقریباً سوا سو میل کے فاصلہ پر واقع چقماق چٹانوں یا ٹکڑوں کو خشکی کے راستے یہاں لایا گیا ہوگا۔ اِس بات کی شہادت موجود ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں نارا-ہاکڑا کی آبی گذرگاہ کو عمارتی پتھر روہڑی سے لانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ خواہ یہ عمل صرف ایک ایسے ہی سال میں ممکن ہوا جب سیلابی پانی کی اِس گذرگاہ میں بہتات تھی۔ ۸۱ے

دوسری جگہ وادیء سندھ تہذیب کے زمانہ میں یقیناً ساحل سمندر پر یا اُس کے نزدیک واقع تھی وہ قلعہ بند تھرو گوجو (Tharro Gujo) ہے۔ یہ ٹھٹہ سے دس میل مغرب میں ہے۔ بہرنوع بنیادی طور پر یہ ایک آمری بستی ہے اور وادی سندھ تہذیب کی باقیات جو یہاں دستیاب ہوئیں وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ۸۲ے

وادیء سندھ کی سلطنت کے جنوبی حصّے کا جائزہ لینے سے ہم چند نتائج ضرور اخذ کرتے ہیں لیکن بہت سے گوشے لاعلمی کے اندھیرے میں رہ جاتے ہیں، جن کے متعلق بلاخوف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ ایسی قیاس آرائی اُس وقت کارآمد ہوسکتی ہے جب اُس کے ساتھ کچھ شہادت بھی موجود ہو، لیکن جہاں تک میری خیال آرائی کا تعلق ہے مجھے خوب احساس ہے کہ اِس طرح متبادل نظریے بھی پیش کئے جائیں گے اور نئی دریافت ممکن ہے کہ میرے نظریہ کو قطعاً غلط ثابت کردے۔

چنانچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم زمانہ میں جنوبی مغربی مان سون ہوائیں زیادہ قوت سے

چلتی تھیں اور یہ کہ اِس کا امکان ہے کہ یہ ہوائیں مغرب اور شمالی مغربی سندھ تک اپنا اثر رکھتی ہوں۔ یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ زیریں وادیٔ سندھ میں بارش کچھ زیادہ ہوتی تھی۔ اور با قاعدگی کے ساتھ۔ لیکن آج کی نسبت اتنا زیادہ فرق نہیں تھا جتنا اکثر بیان کیا جاتا ہے۔ غلّے کی بڑے پیمانہ پر ذخیرہ اندروزی کسی حد تک یہ ثابت کرتی ہے کہ سندھ کے سیلابی پانی پر زراعت کا انحصار نہیں تھا۔ سلطنت قدیم وادیٔ سندھ تہذیب عروج کے زمانہ میں دریائے سندھ شمالی مغربی میدان سے بہتا تھا جیسا کہ آجکل۔ وہ لوگ اتنے بیوقوف نہیں تھے کہ اپنے دارالخلافہ کو بالکل دریا کے کنارے آباد کرتے جہاں دریا کے کٹاؤ سے شہر کے تباہ ہونے کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا۔ اِس کے برعکس وہ وقتاً فوقتاً سیلابی پانی کے شہر میں داخل ہونے سے خوف زدہ بھی نہیں تھے۔ وہ مقامات جہاں موہن جودڑو اور دوسری بستیاں آباد تھیں۔ اور ہر سیلاب کے بعد از سرِ نو تعمیر کی گئیں۔ اپنے محلِ وقوع کے اعتبار سے اُن لوگوں کو بہتر نظر آیا۔ کیونکہ اِن کے نواح میں دریا کی شاخیں اور سیلابی پانی کی ایسی گذرگاہیں تھیں جن میں تمام سال پانی موجود رہتا تھا لیکن خطرناک حد تک نہیں بڑھتا تھا۔

گھگر اور بالائی ہاکڑا کے کنارے جو وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانہ کی بستیاں دریافت ہوئی ہیں اُن سے یہ بات مزید واضح ہو جاتی ہے۔ لیکن چونکہ انتہائی بالائی حصہ میں ایسی جگہ یہ بستیاں ہیں جہاں برفانی دریائے ستلج کا زائد پانی گھگر میں داخل ہوتا رہتا ہوگا۔ ۸۳ اور اِسی طرح یہ بھی امکان ہے کہ دریائے جمنا بھی اپنا زائد پانی وادیٔ چٹانگ میں پھینکتی رہتی ہوگی۔ متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ اِن دریاؤں کے طاس میں بھی آج کی بنسبت اُس زمانہ میں زیادہ بارش ہوتی تھی۔ بلاشبہ قدیم بستیوں کے اِس بڑے گروپ کو شمال مشرقی سندھ میں رینی ندی کی وادی میں بستیوں سے ملانے والا دریائے ہاکڑا ہی تھا۔ لیکن درمیان میں وہ علاقہ ہے جسے ریورٹی نے وضاحت کے ساتھ متعین کیا ہے۔ جس میں "دریائے مہران" کے ناقابلِ اعتماد بہاؤ نے سطحِ زمین پر بھی اپنے واضح نشانات چھوڑ دیئے ہیں۔

یہی وہ علاقہ ہے جس میں دریائے سندھ کے بہاؤ میں معمولی سی تبدیلی یعنی بائیں

ہاتھ کی طرف تھوڑا سا موڑ اُس کی آبی گذرگاہ کو مکمل طور پر بدل دے گا اور یہ تبدیلی میرے نقطہ نظر سے شمالی مغربی سندھ کی وادی سندھ کی تہذیب کے زمانہ کی تباہی کا باعث بن گئی ہوگی۔ کیونکہ سندھ کے پانی کے مقدار اعلیٰ دریائے نارا اور زیریں ہاکڑا میں داخل ہوگئی ہوگی۔ شاید ہاکڑا کے کنارے نہوجیسی بستی ایسی ہی تبدیلی گذرگاہ کے نتیجہ میں آباد ہوئی۔ حالانکہ یہ بھی ممکن ہے کہ جب دریائے سندھ اپنے مغربی راستہ پر ہی قائم رہا ہوتب بھی سیلابی پانی کی کثیر مقدار نارا دریا سے باقاعدگی کے ساتھ گذرتی ہو۔ جس سے میدانِ سندھ کا یہ انتہائی جنوبی مشرقی گوشہ ایک سرسبز وشاداب خطہ بن گیا ہو۔

بہرنوع ہمیں اِس امکان کو بھی مسترد نہیں کرنا چاہئے کہ دریائے سندھ دو شاخوں میں تقسیم ہوکر بہتا رہا ہوگا جو ایک دوسرے سے بہت فاصلہ پر تھیں۔ اور اِس طرح یہ دریا صوبہ سندھ کے خاصے بڑے علاقہ میں اپنا سفر پورا کرتا تھا۔ حالانکہ اِس کا امکان نہیں ہے کہ دونوں شاخوں میں تمام سال پانی موجود رہتا ہوگا۔

آخر میں یہ کہونگا کہ اِس قدیم قوم کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے جو صفحہ ہستی سے مٹ گئی، ہمیں قدیم بستیوں کی مزید کھدائی کا انتظار کرنا ہوگا۔ لیکن وادیٔ سندھ کی تہذیب اور اُس کی معیشت کی ایک وسیع یا خیالی تصویر بنانے کے لئے ہمیں دریائے سندھ کی طبعی حالت کے متعلق اپنی تمام تر معلومات سے کام لینا ہوگا۔ سائنسی مطالعہ اور مشاہدہ سے جو سبق ہم نے حاصل کیا اور جو عملی تجربہ نے ہمیں سکھایا اگر اُسے احتیاط کے ساتھ کام میں لایا جائے تو وادی سندھ تہذیب زمانہ کی قدامت اور ماحول کے متعلق نتائج اخذ کرنے میں غلطیوں کا امکان کم ہوجائیگا۔

تشریحات باب چھٹا

1. اگر پنجاب بلوچستان، سندھ، کاٹھیاواڑ، گجرات اور اُتر پردیش میں دریافت شدہ قدیم بستیوں میں سے ایسی بستیوں کے چاروں طرف ایک لائن کھینچ دی جائے جو صرف اُن بستیوں کو ملاتی ہو جو مذکورہ علاقوں کی بیرونی حدود پر واقع ہیں تو جتنا خطہ زمین اِس طرح گھر جائیگا وہ تقریباً پانچ لاکھ مربع میل ہوگا۔ لیکن ست کا جن دور کی قدیم بستی و ادی سندھ کہ تہذیبی دور کی انتظامی دور سے باہر ایک تجارتی مرکز معلوم ہوتا ہے اور اِس کا مکان بھی نظر نہیں آتا کہ مغربی راجپوتانہ اور مشرقی سندھ کا صحرائے تھر جو تقریباً ایک لاکھ مربع میل میں پھیلا ہوا ہے۔ وادیء سندھ کی قوم کے قبضہ میں ہو۔

2. تعداد سال بہ سال بڑھ رہی ہے، سر مورٹیمر وہیلر کی فہرست ۱۹۵۳ء (دی انڈس سولائزیشن۔ صفحہ ۹۶۔۹۵) میں تریسٹھ آثار قدیمہ شامل ہیں بمعہ اُن پچیس مقامات کے جو اُسی وقت کے قریب بیکانیر میں دریافت ہوئے۔ لیکن فہرست میں صرف دو شامل ہیں، فہرست کے متعلق کہا گیا ہے کہ صرف گلی ظروف کی شہادت والے مقامات اِس میں شامل کیئے گئے ہیں اور مشکوک آثار کو چھوڑ دیا گیا ہے۔

سندھ کے آثار قدیمہ سے جن مقامات کو شامل نہیں کیا گیا، اُس میں وادیء سندھ کی تہذیب کی خصوصیات کا حامل لاکھیو (مجمد ا رصفحہ ۶۷۔۶۸) عاملانو (مجمد ا رصفحہ ۱۴۳، پکوٹ صفحہ ۱۷۳، ۲۱۲) یہ اُس صورت میں کہ فہرست میں تیسرے نمبر پر جو مقام اللہ ڈینو کے نام سے ہے۔ اور جو وہیلر کے صفحہ ۳ کے نقشہ پر اُسی محل وقوع میں دکھلایا گیا ہے جو فی الحقیقت عاملانو کا ہے۔ صرف نام غلط طرح لکھ دیا گیا۔ (اِسی طرح سرسری طور پر یہ واضح کردینا بھی ضروری ہے کہ ڈی۔جی۔ ٹکری بمعنی چھوٹی پہاڑی، کوٹ ڈجی جی ٹکری، لکھا گیا ہے) پئی جو کوٹیرو، راجو ڈیرو، اور نئیگ (اینشینٹ انڈیا نمبر ۵- جنوری ۱۹۴۹ء) ٹونگ تھیرٹ، نوہٹو اور دوسرے مقامات جو جرنل آف سندھ ہسٹوریکل سوسائٹی جلد پنجم نمبر ۲۔ (۱۹۴۱) جلد ہفتم صفحہ ۵۹-۶۹۔ (۱۹۴۴) اور جلد ہشتم نمبر 1 (۱۹۴۲) میں دیئے گئے ہیں شامل ہیں۔

۱۹۵۳ء میں دی انڈس سولائیزیشن کی اشاعت کے بعد کاٹھیاواڑ میں اِس تہذیب سے تعلق رکھنے والی کئی بستیاں دریافت ہوئی ہیں۔ رنگپور کے آثار کو بہت عرصہ پہلے ۱۹۳۴ء میں ایم-ایس واٹس نے شناخت کیا تھا (ایم-اے-ایس-آئی ۳۵-۱۹۳۴-صفحہ ۸-۳۴) چنانچہ اسے میک کاؤن کی فہرست میں جو ہڑاپہ کے آثار سے متعلق تھی۔ "اینشینٹ انڈیا نمبر ۳-صفحہ ۱۲۹ پر شامل کیا گیا تھا۔ (ضمیمہ B وہیلرز رپورٹ آن ہڑاپہ ۱۹۴۶) لیکن شاید ۱۹۴۷ء میں رنگپور میں کھدائی کے بعد ایچ-جی ڈکشت کی رپورٹ کی بنا پر یہ تمام وہیلر کی ۱۹۵۳ء کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا، ڈکشت کی رپورٹ کے لئے دیکھئے۔ ''بلیٹن آف دی دکن کالج ریسرچ انسٹی ٹیوٹ۔ جلد ۱۱ صفحہ ۲ تا ۵۵'' پگوٹ نے ۱۹۵۰ء میں "پری ہسٹورک انڈیا، صفحہ ۱۴۷ پر اِس کا ذکر کیا تھا۔ اِس شہر کے وادیء سندھ تہذیب سے تعلق کو از سرنو- ایس-آر- راؤ نے ۵۴-۱۹۵۳ء میں ثابت کر دیا تھا، (انڈین آرکیولوجی ۵۴-۱۹۵۳-صفحہ ۷)

وادیء سندھ تہذیب سے تعلق رکھنے والے دوسرے مقامات گجرات میں مزید اور تاپتی کے دہانوں کے پاس اور ایک مقام ''اوکھیلنا'' اُتر پردیش میں میرٹھ سے نو میل مغرب۔ سندھ اور بلوچستان میں جن نئے مقامات کا اضافہ کرتا ہے وہ جو 'ڈیرجودڑو' (جیکب آباد سے ۱۸ میل شمال مغرب میں) جو چھوٹی بستی سے اور کوٹ ڈجی کے فوراً مغرب میں واقع ہے۔ یہ مقام ڈجی۔ جی۔ ٹکری سے بالکل الگ ایک بستی ہے۔ اسی طرح وہ مقامات جو ۱۹۵۷ء میں مس بی۔ ڈی۔ کارڈی نے دریافت کئے۔ یعنی ہر باب درے سے نیچے ابتدائی پہاڑیوں میں اور کچھی میں کوٹڑا کے نزدیک جو درۂ مُلا کے دروازہ پر ہے، اسی طرح درۂ مُلا کے اندر تقریباً نصب فاصلہ طے کرنے کے بعد ''جہان'' نامی قدیم بستی اور جھلاواں میں اور ناچ کے قریب دو بستیوں کے آثار۔

(انڈین آرکیولوجی ۵۸۔ ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۴۔۱۲: سر ایم وہیلر کی ''ارلی انڈیا یا پاکستان صفحہ ۸۔۹۲: اِلسٹریٹیڈ لنڈن نیوز ۲۴ مئی ۱۹۵۸ء، اور پاکستان نیوز، ۱۲۹ کتوبر ۱۹۵۷ء، اور ۱۱ مارچ ۱۹۵۸ء)

3. سر موریمر وہیلر ''دی انڈس سولائزیشن (۱۹۵۳ء) ص ۱۵

4. ڈاکٹر ای میکے ''ارلی انڈس سولائزیشن (دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۸ء) پلیٹ ۳۴

5. میکے۔ ''ارلی انڈس سوی لائزیشن صفحہ ۲۵۔۲۶'' دیوار کی موٹائی سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا اُس کی صحت مشتبہ ہے کیونکہ مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ گرمی کے موسم میں ٹھنڈک کے لئے دیوار موٹی کی گئی ہو۔

6. ''پرنسل آبزرویشنز آن سندھ'' کیپٹن ٹی پوسٹنس صفحہ ۳۲۔۳۴۔ رچرڈ برٹن نے ۱۸۵۱ء میں شکارپور کی آبادی کا تخمینہ ۲۴۰۰۰ لگایا تھا۔ (سندھ اینڈ دی ریسز ویٹ اِن ہیبٹ دی ویلی آف دی انڈس، صفحہ ۱۰)

7. ممکن ہے اس سے کچھ اثرات مرتب ہوئے ہوں، لیکن ۱۸۵۱ء کی مردم شماری کے مطابق سندھ میں عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ تھی بہ نسبت ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے، دیکھئے ''سنسس آف انڈیا ۱۹۴۱ء، جلد ۱۲، سندھ صفحہ ۱۷ اور گوشوارہ ۲، صفحہ ۷۔

8. سندھ خیرپور اسٹیٹ کے ساتھ۔ میں نے اپنی طرف سے کراچی کو اس بیان میں شامل نہیں کیا، کیونکہ یہ شہر اپنی نوعیت کے اعتبار سے صوبائی نہیں ہے۔ ''سنسس آف انڈیا، ۱۹۴۱ء، جلد ۵ اور ۱۲، میں نے ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے کام نہیں لیا کیونکہ ۱۹۴۷ء میں اور اس کے بعد انتقال آبادی کی وجہ سے یہ اعداد و شمار غلط ہو گئے ہیں۔

9. برطانوی تسلط سے پہلے سندھ کی آبادی کا اندازہ دس لاکھ تھا، یعنی ۲۰ نفوس فی مربع میل۔ (پرسنل آبزرویشن آن سندھ، کیپٹن ٹی پوسٹانس، صفحہ ۶۹)

10. اسٹوارٹ پگوٹ ''پری ہیسٹورک انڈیا، ۱۹۵۰ء، صفحہ ۶۶۔۶۷۔۱۳۳: وہیلر کی

مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۵، پروفیسر پگوٹ ''اینٹی تھیسس، صفحہ ۱۳۳''۔ آج پنجاب ایشیا میں سب زیادہ مکئی پیدا کرنے والا علائقہ ہے لیکن سندھ ریگستان ہے جسے عمدہ نظام آبپاشی سے کارآمد بنالیا گیا ہے'' یہ نظریہ غلط فہمی کا باعث ہے۔ پنجاب سب سے زیادہ غلّہ پیدا کرنے والا علائقہ محض اردمحض اچھے نظام آبپاشی کی بدولت ہے۔ جیسا نظام سندھ میں ہے۔ ''ریگستان سندھ'' کا غلط تصور جائزے کی خامی کی بدولت ہے یا پھر ریگستان کے متعلق تصور قائم کرلیا گیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ غلط فہمی اصلاح کی کوششوں کے باوجود دور نہیں ہوگی۔ دیکھئے ''ارلی کینال اریگیشن اِن سندھ ۱۹۳۷ء'' جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس جلد تین، پارٹ ا، صفحہ ۱۴۔

11. پگوٹ کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۶۷: وہیلر کی مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۵: سرجان مارشل نے ''موہن جودڑو اینڈ دی انڈس سولائزیشن، جلد اول صفحہ ا'' پر یہ تحریر کیا کہ سندھ کے سب سے زیادہ زرخیز علائقہ میں موہن جودڑو زمین کے ایک بنجر ٹکڑے پر واقع ہے۔

12. اس کتاب کا مصنف ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۰ء تک لاڑکانہ کا اسسٹنٹ کلکٹر تھا۔

13. ایس۔ آر۔ بی۔ جی جلد ۱۷، نیو سیریز ۱۸۵۵ء، پارٹ ۲ ''رپورٹ آف دی پرگنہ آف چاندکا اِن اپر سندھ'' صفحہ ۱۳۔۱۷۔۱۴۔ دیکھئے: میسن کی کتاب ''نیریٹو آف ویریس جرنیز'' نمبر ا، صفحہ ۴۶۱۔

14. پگوٹ مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۷۰، دریائے سندھ میں قلتِ آب کے زمانہ میں مقدار بیس ہزار مکعب فٹ فی سکنڈ ریکارڈ کی گئی ہے۔ سرکلاڈ انگلس نے زیادہ سے زیادہ اخراج سات لاکھ تیس ہزار کیوسک شمار کیا ہے۔ ''گزیٹیئر آف سندھ، صفحہ ۱۲'' ''دی بی ہیویز اینڈ کنٹرول آف ریورز اینڈ کینالس'' مصنفہ سرکلاڈ انگلس صفحہ ۱۸۳۔

15. پگوٹ، مذکورہ کتاب: ہیگ۔ آئی۔ ڈی۔ سی صفحہ ۳۰ کے مقابل نقشہ اور صفحہ

۱۱۸۔۱۱۹۔دریائے سندھ کا بہاؤ اور سکھر کا محل وقوع، بحوالہ اسی کتاب کے باب ۳، صفحہ ۳۳۔۳۲۔باب ۷، صفحہ ۱۶۸۔

16. یعنی نصر پور، جو اٹھارویں صدی کے ابتدائی نصف میں وسطی سندھ کی بڑی تجارتی منڈی تھا۔لیکن ۱۷۵۸ء میں دریائے سندھ کے راستہ کی تبدیلی سے ختم ہو گیا اور اپنی پہلی حیثیت کبھی حاصل نہ کر سکا۔

17. پگوٹ۔مذکورہ کتاب، صفحہ ۱۳۴۔

18. اس کے بارے میں بھی سر جان مارشل کا انتباہ قابل ذکر ہے۔(مذکورہ کتاب جلد اول صفحہ ۲) ہم دیکھتے ہیں کہ کیپٹن کربی نے ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ روہڑی کے مقام پر اتفاقیہ جوہڑاپہ بستی دریافت کی اس کے متعلق ''بمبے ٹائمز'' نے یہی نتائج اخذ کی ہیں۔

''جرنل آف دی بمبے برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' جلد پنجم (۱۸۵۷ء) صفحہ ۲۷۳۔

19. پگوٹ کی مذکورہ کتاب: سر وہیلر نے بظاہر اس خیال کی تائید کی ہے، وہ مزید لکھتے ہیں ''دریا کے کنارے پر یا نزدیک جو مقامات تھے، اُنھیں آسانی کے ساتھ دریا کے راستے لکڑی پہنچائی جا سکتی تھی۔اُس وقت بھی اور آج بھی، یہ لکڑی ہمالیہ پہاڑ کے جنگلات سے آتی ہوگی''۔(دی انڈس سولائزیشن صفحہ ۵) مگر صورت کچھ بھی ہو، یہ لکڑی سندھ میں اینٹ کے بھٹوں میں جلانے کے لئے یقیناً مہنگی ہوگی جو عموماً مقامی ببول، کانڈی، اور ایسی ہی لکڑیاں استعمال کرتے ہیں۔اور وادیٔ سندھ تہذیب کے زمانہ میں بھی یہی طریقہ مروج ہوگا''۔

20. گزیٹیئر آف سندھ، ۱۹۰۷ء صفحہ ۲۷۔سندھ گورنمنٹ کے جنگلات میں صرف یہی کچھ پیدا ہوتا تھا، اس میں وہ وسیع جنگلات شامل نہیں ہیں جو سرکاری تحویل میں نہیں تھے۔

21. پروفیسر پگوٹ نے لکھا ہے (مذکورہ کتاب، صفحہ ۱۳۵) ''شیشم اب بھی سندھ میں پیدا

ہوتی

ہے'' حالانکہ ۱۸۴۸ء، میں سرجن جی۔ای۔اسٹاکس نے لکھا تھا'' یہ سندھ کی بہترین لکڑی ہے اور لاڑکانہ اور سہون میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے'' (ایس۔ آر۔ بی۔جی نمبر ۱۷، نیو سیریز) پارٹ ۲، صفحہ ۵۹۶۔ عام طور پر یہ لکڑی بدیسی شمار ہوتی ہے۔ (گزیٹیئر آف سندھ، ۱۹۰۷ء صفحہ ۴۵)۔

22. پگوٹ، مذکورہ کتاب بحوالہ وہیلر ''پودوں کی بہت اقسامِ اُگتی تھیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنگلات یا خود اور درختوں کے جھنڈ اب اس بنجر علاقہ میں ایسے مختلف النوع نہیں ہیں'' (دی انڈس سولائزیشن، صفحہ ۶۳) سندھ میں آج بھی کافی جنگلات اور نشیبی نباتات ہے اور یہ موہن جودڑو کے نزدیک بھی ایسی ہی ملکی جیسی دوسرے علاقوں میں۔

23. ''گزیٹیئر آف سندھ، صفحہ ۲۸ ''ڈرائی لیوز فروم ینگ ایجپٹ'' مصنفہ ای۔بی۔ ایسٹوک ۱۸۲۹ء، صفحہ ۱۶۵۔

24. ''وائے جز ڈی ابن بطوطہ'' ترجمہ سی۔ڈیفریمری اینڈ بی۔آر۔سینگوئی نیٹی (پیرس ۱۸۵۵ء) جلد سوم، صفحہ ۱۰۰، گینڈے کے لئے عام عربی لفظ ''کرکون'' استعمال کیا گیا ہے۔

25. مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۱۰۴، ہیگ نے اپنے مقالہ ''ابن بطوطہ اِن سندھ'' میں بجا طور پر تحریر کیا ہے کہ یہ تفصیلات ۱۰ مئی سے شروع ہونے والے چالیہو (چلّے) سے مطابقت رکھتی ہیں۔ لیکن عارضی گرمی کی لو سندھ میں اُس موسم میں بھی آجاتی ہے جسے میں نے بیان کیا ہے، سہون خاص طور پر گرم ہے اور سیاح حال ہی میں معتدل آب رہو کے علاقہ سے وارد ہوا تھا۔

26. ایم۔رینا ڈرپن کتاب (پیرس ۱۸۴۵ء)، صفحہ ۸۶۔۱۰۹، پر لکھتا ہے کہ البیرونی نے ہندوستانی گینڈے کو ''کندہ'' لکھا ہے اور یہ لفظ اُس نے سنسکرت سے مستعمار لیا ہے جس میں اِسے ''گنڈ'' کہا جاتا ہے تو ''کرکرن'' سے کسی قدر

مختلف ہے۔

27. گزیٹیئر آف سندھ، صفحہ ۲۵۲۔

28. میکے۔ ''ارلی انڈس سولائزیشن'' پلیٹ ۱۷، نمبر ۷، اور صفحہ ۶۳۔۱۰۷، بحوالہ پگوٹ صفحہ ۱۵۷ سرجان مارشل (مذکورہ کتاب، جلد اول، صفحہ ۲)، اِس شہادت کے متعلق پھر بہت احتیاط کا ن مظاہرہ کرتے ہیں۔

29. ''دی ارلیر پری ہسٹورک سولائزیشنز اِن سندھ، صفحہ ۵۵۔۵۶'' سرجان مارشل مذکورہ کتاب جلد اول، صفحہ ۲۔۳۔

30. وہیلر۔ ''دی انڈس سوی لائزیشن، صفحہ ۶، اِس علاقہ کو اگر اکتوبر اور جون کے درمیان کسی وقت دیکھا جائے تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے جولائی سے ستمبر تک یہاں کا منظر کس قدر سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔

31. جیمس: رپورٹ آن دی پرگنہ آف چندوکا وغیرہ، ایس۔آر۔بی۔جی ۱۷، نیو سیریز، پارٹ ۲، صفحہ ۲۷۔

32. اِسی دستاویز کے حوالہ سے ''دی پلینس آف سندھ''، صفحہ ۲۷۔۲۸۔

33. ''انڈین انجینئر نگ'' مصنفہ ڈبلیو۔ایل۔اسٹرینج، صفحہ ۱۴۹۔

34. کاشتکاری کے موجودہ طریقے جو سندھ میں مروج ہیں اُن کے لئے دیکھئے: ''گزیٹیئر ۱۹۰۷ء''، صفحہ ۲۳۶۔۲۳۷ اور جو طریقے برطانوی فتوحات کے وقت اختیار کئے جاتے تھے اُس کیلئے دیکھئے: ''بلیو بک۔رپورٹ آن دی ایڈمنسٹریشن آن سندھ'' ۱۹۵۷ء، صفحہ ۷۹۔۸۳۔

35. وہیلر ''دی انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۶۲۔

36. میکے ''ارلی انڈس سولائزیشنز'' صفحہ ۸۲، پگوٹ ''پری ہسٹورک انڈیا'' صفحہ ۱۵۵۔

37. وہیلر ''دی انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۷۹۔

38. میکے ''ارلی انڈس سولائزیشنز'' صفحہ ۱۳۲۔ میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں

اس قسم کی افادیت کا قائل نہیں ہوں۔ مارشل مذکورہ کتاب جلد اوّل، صفحہ ۲۷، ڈی۔ڈی۔کوسامبی نے بجا طور پر یہ اشارہ کیا ہے کہ ہڑاپہ کی دیہی معیشت نہری آبپاشی پر نہیں "دم" کے استعمال پر منحصر تھی اور ہل پر نہیں بلکہ میخ دار میٹرے کے استعمال پر مبنی تھی۔ (این انٹروڈکشن ٹو دی اسٹڈی آف انڈین ہسٹری، بمبئی ۱۹۵۶ء، بحوالہ "اینٹی کوئٹی" جلد ۳۲، نمبر ۱۲۵، مارچ ۱۹۵۸ء)۔

39. سندھی پہاوڑے کا منہ اُس کے ہتھے سے ساٹھ اور ستر ڈگری کے زاویہ پر نصب کیا جاتا ہے، اسے سندھی زبان میں "کوڈر" کہتے ہیں۔

40. وہیلر: مذکورہ بالا کتاب، صفحہ ۲۱۔۲۴۔۳۱۔۳۳۔

41. "پارلیمنٹری پیپرس ریلیٹنگ ٹو سندھ" ۱۹۵۴ء، صفحہ ۶۸۔۷۰۔۷۱۔۷۲۔۷۳۔ ۱۰۲۔

42. سرسری طور پر حساب یہ ہے کہ ایک لاکھ دس ہزار مکعب فٹ میں پچانوے ہزار سات سو آٹھ بُشل غلّہ سماتا ہے اور ۲ء۷۳ بُشل فی کس کے حساب سے پینتیس ہزار افراد کے لئے کافی ہوسکتا ہے یعنی ۴ء۲۱۸ پونڈ فی کس۔

43. میکے: "ارلی انڈس سوی لائزیشنز" صفحہ ۱۳۳، وہیلر: "دی انڈس سولائزیشن"، صفحہ ۶۲ اور مقدم الزکر کا باب ا، صفحہ ا۔

44. وہیلر: مذکورہ کتاب، صفحہ ۲۰۔

45. غلّہ کی کھتیاں ہڑاپہ کے مقام پر مرکزی چبوترے اور غلّہ گودام کے درمیان واقع ہیں۔ ممکن ہے انھیں دوسری ذخیرہ گاہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو۔ (شمالی میرے پر)

46. گزیٹیئر آف سندھ، صفحہ ۶۔۲۳۱۔

47. سر ایم وہیلر نے امریکی انڈین قوم کی مثال پیش کرتے ہوئے سیلابی کاشتکاری کے طریقہ کی وضاحت کی ہے (دی انڈس سوی لائزیشن، صفحہ ۷)۔ سندھ میں بڑے اطمینان و آسانی سے اِس طریقہ کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اکثر ایسا

ہوتا ہے کہ جن کھیتوں کو پشتوں سے گھیرا جاتا ہے اُن کا منہ ڈھلان کی طرف کھلا ہوا چھوڑ دیا جاتا ہے تا کہ پانی جو ڈھلوانوں سے بہتا ہوا آئے اُسے واصل کیا جا سکے۔

48. سرجان مارشل ''موہن جو دڑو اینڈ دی انڈس سوی لائزیشن'' جلد اول، صفحہ ۳۔۵ اور فٹ نوٹ۔

49. اِسی کتاب کا باب ۲، صفحہ ۸۔۹۔

50. اِسی کتاب کا باب ا، صفحہ ۲۔

51. وہیلر: ''دی انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۶۔۸۔

52. وہیلر: ''دی انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۷۔۸، اِسی باب کا صفحہ ۳۷ بھی دیکھیے۔ سر وہیلر نے جو بحث اِس ضمن میں کی ہے وہی ہے جو اُس نے اپنی کتاب ''ارلی انڈیا اینڈ پاکستان'' ۱۹۵۰ء، صفحہ ۱۱۲۔۱۱۳۔ پیش کرنے سے گریز کیا ہے، اِسے پڑھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے دریائے سندھ کے مصدقہ حیات بخش اثرات کو پیش نظر نہیں رکھا۔ کیونکہ جو تباہ کاری یہ دریا پھیلتا اُسے خود ہی اتنے تھوڑے وقت میں دور کردیتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ انسان عمل سے کہیں زیادہ شدید یہ عمل کرتا ہے اور دریائی جنگلات پر اِس کا اثر دیکھنے کے قابل ہے۔ (اِسی کتاب کا باب ۳، صفحہ ۱۷)۔ دریا کی تباہ کاری کا عمل انسان اور بکریوں کی پھیلائی ہوئی تباہی سے بالکل مختلف مسئلہ ہے۔ جو تباہی انسان اور بھیڑ بکریاں پھیلاتی ہیں وہ معمولی بارش سے پودوں کو جو قوتِ خود افزائی حاصل ہوتی ہے اس سے برابر نہیں ہوسکتی۔

جب تک دریائے سندھ نے اپنا آبی راستہ موہن جو دڑو کے قریب برقرار رکھا تو ایندھن کے لئے کافی مقدار میں لکڑی آسانی سے ملتی رہی ہوگی اور اُنھیں یہ لکڑی دور دراز کے مقامات سے منگوانے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہوگی۔

53. مٹی بہانے والے دریاؤں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ جتنا زیادہ عرصہ وہ ایک ہی راستہ بہتے رہتے ہیں اتنا ہی خطرہ اُن کے راستہ میں انقلابی تبدیلی پیدا ہونے کا بڑھتا رہتا ہے۔ سندھ جیسے دریا کے پانی کو پشتے باندھ کر مقید رکھنے کا طریقہ اس کے بیسن میں مٹی کا ذخیرہ جمع ہونے کے عمل کو تیز کر دیتا ہے اور سر کلاڈ ہیگلس جو دریائے سندھ کے متعلق معلومات میں ایک امام کی حیثیت رکھتے ہیں کہتے ہیں کہ اس بات کا خطرہ ہی نہیں بلکہ یقین ہے کہ صوبہ سندھ میں یہ دریا اپنی آبی گذرگاہ کو چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کر لیگا۔ اور یہ صورت قریبی زمانہ میں ہی پیدا ہونے والی ہے۔ بہتر ہے ایسی آفت کو روکنے کا مناسب انتظام کیا جائے۔ (دی بی ہیوی اینڈ کنٹرول آف ریورز اینڈ کنیالس، صفحہ ۲۰۴) اسی کتاب کے باب ۷، صفحہ ۱۰۴ پر دریائے سندھ کے بہاؤ کی تبدیلی اور اس کے اثرات کے متعلق ارسٹو بکس اور اسٹرابو کے حوالے دیئے گئے ہیں۔

54. ایک خاصہ اہم شہر ہے، جو نواحی میدان سے اپنی بلندی کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی قبل تاریخ کی بستی کے اوپر پر آباد ہے۔

55. مجومدار، صفحہ ۶۰-۶۸، پلیٹ ۴، ای۔ بی۔ سی۔

56. ایضاً، صفحہ ۶۴۔

57. ایضاً، صفحہ ۶۵، خلاصتہ التاریخ جو سترھویں صدی عیسوی کے آخری سالوں میں لکھی گئی۔ منچھر جھیل کے بارے میں کہتی ہے "بہت سے مچھیروں نے اس پر جیٹی (پلیٹ فارم) نما چبوترہ بنالیا ہے۔ وہ وہاں رہتے بھی ہیں اور مچھلیاں بھی پکڑتے ہیں' وغیرہ اور "آرائش محفل" ترجمہ ایچ۔ کورٹ، صفحہ ۱۱۸، (کلکتہ، ۱۸۸۲ء)۔

58. مجمدار، صفحہ ۶۲-۶۳۔

59. پگوٹ، مذکورہ کتاب، صفحہ ۲۲۳۔

60. پگوٹ مذکورہ کتاب، صفحہ ۲۲۱-۲۲۳۔

61. وہ نقش ونگار جو گلی ظروف کی آرائش کے لئے استعمال کرتے تھے۔ پگوٹ، مذکورہ

کتاب، صفحہ ۲۲۳۔۲۲۴۔

62. دستے کے سوراخ والی کلہاڑی جو چن ہوڈ میں جھکر دور سے مطابقت رکھنے والی زمینی تہہ سے برآمد ہوگی اور دوسری کلہاڑی جو موہن جو دڑو کی نچلی تہہ سے برآمد ہوئی۔ دونوں وادیء سندھ تہذیب کے زمانہ کی الخصوص کلہاڑیوں سے بہت اعلیٰ معیار کی ہیں۔ پگوٹ۔ مذکورہ کتاب، صفحہ ۲۲۲۔۲۲۵۔۲۲۸۔

63. اِسی کتاب کا صفحہ ۸۲ ''آخری جو ظروف ماشک اور لال چٹو سے دستیاب ہوئے ''آمری'' طرز سے ملتے جلتے ہیں، اور یہ ایک معقول قیاس ہوگا کہ جھیل کے کنارے رہنے والے قدیم باشندے اُن لوگوں سے تعلق رکھتے تھے جو نواحی علاقہ میں آباد تھے۔

64. دریا کے اوپر کی طرف شاید کافی فاصلہ پر کیونکہ خاص خاص راستے جن کے ذریعہ منچھر میں پانی پہنچتا ہے وہ لاڑکانہ اور کاشمور کے درمیان سے شروع ہوتے ہیں۔ مطابق باب ۳، صفحہ ۲۶۔

65. اِسی کتاب کے باب ۵، صفحہ ۶۱ کے مطابق۔ یہاں بیان یہ تسلیم کرتا ہے کہ وہ مقامات سے ملنے والے ظروف اور دوسری باقیات کی جو درجہ بندی مجمدار نے ابتدا میں کی تھی وہ پگوٹ اور دوسرے ماہرین کے دوبارہ جائزے کے بعد درست ثابت ہوئی۔

66. ڈامب بتھی، ڈھال۔

67. کرچٹ۔ شاہ جو کوئیرو۔

68. نانگ۔ ٹونگ۔ پائے جو کوٹیرو۔

69. کانڈھی ورہی کے خاص آثار جل کر تباہ ہوگئے ہیں۔ لیکن اِس کے لئے وادیء سندھ کی تہذیب کے زمانہ کے باسیوں کو ذمہ دار ٹھرانے کا کوئی جواز نہیں۔

70. وہیلر، ''دی انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۵۲۔

71. امیلانو کے لئے مجمدار کے بیان کو دیکھئے صفحہ ۱۲۳۔ جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس۔

ششم نمبر۲، صفحہ ۱۰۹۔ پگوٹ، مذکورہ کتاب، صفحہ ۱۷۳۔

72. اسی طرح گجے ندی کے کھادر اور کچھو میں جو قدیم مواصفات ہیں ''انیشی اینٹ انڈیا'' نمبر ۵ جنوری ۱۹۲۹ء۔

72A. اس جگہ میں نے مضمون کو اُسی حالت میں پیش کر دیا ہے جیسا ۵۲۔۱۹۵۳ء میں تحریر کے وقت تھا۔

اُس وقت سے متعدد دریافتیں ہو چکی ہیں (دیکھئے تشریح ۲) لیکن وادیء سندھ کے تہذیب کی ابتدا کے بارے میں ہماری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ کاٹھیاواڑ اور گجرات میں ساحل سمندر سے نزدیک وادیء سندھ کی تہذیب کی بستیوں کے آثار کا پتہ چلنے کے بعد سر مورٹیمر وہیلر کے الفاظ ہیں ''خیالات فطرتی طور پر میسوپوٹامیہ کی طرف منتقل ہوتے ہیں کہ شاید وہی اِس تہذیب کا منبع ہے'' لیکن وہ لکھتے ہیں ''نہ تو اِن کے گلی ظروف اور نہ اوزار ایسے ہیں کہ دن کی ساخت سے کسی بیرونی ذریعہ کا ذرا سا بھی گمان نظر نہیں آتا ہے۔ اِن کے گلی ظروف اپنی ممتاز انفرادیت کے باوجود، عام طور پر اُن گلی ظروف سے مشابہ ہیں جو بلوچ پہاڑیوں کے دامن میں رہنے والی دیہاتی برادریاں اور سمیری قوم کے لوگ استعمال کرتے تھے''۔ اور اس طرح وادیء سندھ کے ظروف کی وہ خاص خاص باتیں بیان کرتے ہیں جن کی وجہ سے یہ میسوپوٹامیہ کے طرز سے الگ نظر آتے ہیں۔

دریائے سندھ کے مشرق جہاں روہڑی کا پہاڑی سلسلہ کم بلند ہے کوٹ ڈجی کے آثار ہیں۔ یہاں ایک چھوٹی سی قدیم بستی کے نیچے ڈاکٹر ایف۔ اے خان نے ایسی قلعہ بند آبادی کا پتہ چلایا جس کا تعلق وادئ سندھ تہذیب سے بھی پرانی تہذیب سے ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب وادیء سندھ کی قوم نے اس قدیم خرابے پر اپنی بستی تعمیر کی تو یہ آگ لگنے سے تباہ ہو چکا تھا۔ اِس تباہ شدہ مقام سے جو گلی ظروف کے باقیات حاصل ہوئے وہ نہ آمری اور گلی تمدن سے

مشابہ ہیں اور نہ جنوبی بلوچستان کی دوسری باقیات سے۔ البتہ زھوب کی وادی میں پیریانی غنڈائی کی باقیات سے کچھ ملتے جلتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ۱۹۲۶ء میں ہڑاپہ کی فصیل کے نیچے کھدائی سے بھی پیریانو طرز کے برتنوں کے ٹکڑے حاصل ہوئے تھے۔ کچھ ایسے ظروف جن کا طرز کوٹ ڈجی سے مشابہ تھا اُن کے ساتھ ہڑاپہ نقوش کے ظروف بھی تھے ڈاکٹر خان کے الفاظ یہ ہیں ''ممکن ہے کہ کوٹ ڈجی والے آبی وقت وادیٔ سندھ کے تمدن کے عناصر کی تشکیل کر رہے ہوں۔ یا پھر یہ صورت ہوسکتی ہے کہ وہ پہلے ہی وادیء سندھ کے ترقی پذیر تمدن سے روابط رکھتے تھے اور اُن سے کچھ عناصر مستعار لے رہے تھے، یہی قیاس غالب معلوم ہوتا ہے''۔

افغانستان کے قندھار صوبہ میں دریائے غنداب کے متوازی ایک وادی میں مُندی گاک کی قدیم بستی کے آثار ہیں۔ کوٹ ڈجی کے آثار اِن سے بہت مماثلت رکھتے ہیں۔ ایسی جگہ ایم۔ جین میری کسال کی نگرانی میں جو کھدائی کی گئی تو آبادی کی دسویں تہ پر یہ انکشاف ہوا کہ آبادی ایک گاؤں کے معیار سے یک لخت ایک فصیل والے شہر میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔ گاؤں کے باقیات میں گلی ظروف کے ٹکڑے بھی شامل ہیں جو کوئٹہ طرز سے ملتے جلتے ہیں۔ شہر کے آثار میں سب سے اہم فصیل ہے جو ایسے چوکور پتھروں سے تعمیر کی گئی ہے جنھیں صفائی سے تراشا نہیں گیا اور چنائی میں مٹی کا گارا استعمال کیا گیا ہے۔ کچی اینٹیں پتھروں کے اوپر استعمال کی گئی ہیں اور فصیل میں چوکور بُرجیاں بنائی گئی ہیں۔ حفاظتی تعمیرات کا یہ طرز ابتدائی کوٹ ڈجی کی تعمیرات سے بڑی حد تک مشابہ ہے۔ ہر دو مقامات پر گلی ظروف کی باقیات میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ دونوں وادیء سندھ تہذیب کے نقوش موجود ہیں۔ اِسی طرح مُندی گاک سے پتھر کے مجسمے کا سر بھی ملا۔ اِس کا تعلق شہر کی ابتدائی تہوں سے ہے۔ یہ سر موہن جو دڑو سے دریافت شدہ مشہور ''پروہت

بادشاہ'' کے مجسمے سے بے حد مشابہ ہے۔ دوسری باقیات ڈھوب سے دریافت شدہ اشیاء سے مماثلت رکھتی ہیں۔ لیکن اہم کمال نے موسہ اور دوسری ایرانی بستیوں سے دریافت شدہ باقیات سے بھی اِنھیں ملتا جلتا پایا ہے۔

چنانچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مندی گاک اور کوٹ ڈجی کے باشندوں کے درمیان روابط قائم تھے۔ اور اِن دونوں کے درمیان ایک ایسا تمدن عنصر بھی پایا جاتا ہے جو قابلِ شناخت نہیں ہے۔ یہ پیش نظر رہے کہ دونوں مقامات کے درمیان سیدھا فاصلہ تین سو پچاس میل ہے۔ یہ فاصلہ اتنا طویل نہیں کہ دوقومیں آپس میں ایسے قریبی روابط قائم رکھ لیں جیسے کہ موہن جودڑو اور ہڑاپہ کے درمیان آسانی سے قائم ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ اِن دونوں کے درمیان آمدورفت کے لئے خود دریائے سندھ ایک رابطہ موجود ہے۔ جبکہ مُندی گاک اور کوٹ ڈجی کے درمیان نہ صرف یہ کہ دریا حائل ہیں بلکہ پہاڑی سلسلوں کی رکاوٹیں بھی موجود ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ قندھار سے بالائی سندھ کے ملانے والے راستہ کے آسپاس قدیم بستیوں کے کچھ اور آثار دریافت ہوں جن سے مندی گاک کوٹ ڈجی قوم کی نشانیاں ہاتھ لگیں۔ اِس کتاب کے تحریر کرنے کے وقت جو علاقے اِن راستوں سے ملحق ہیں وہ ڈھوپ۔ کوئٹہ اور ٹوگاؤ ہیں جن میں مذکورہ طرز زندگی کی نشانیاں ملی ہیں۔ اور یہ باقیات اُس راستہ سے دریافت نہیں ہوئیں جو درۂ بولان سے گذرتا ہے بلکہ اُس راستہ سے جو کوئٹہ سے قلات اور وہاں سے مُلا درہ سے ہوتا ہوا کچھی جاتا ہے۔ اسی راستہ پر درۂ سے تقریباً آدھی مسافت طے کرنے کے بعد جہاں یہ راستہ میدان میں داخل ہوتا ہے۔ وادیٔ سندھ تہذیب کی بستیوں کے آثار حال ہی میں دریافت ہوئے ہیں۔ لیکن اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وادیٔ سندھ کے لوگ اِس راستہ سے میدانی علاقوں میں نوآبادیاں قائم کرنے کے لئے داخل ہوئے ہوں گے۔ بلکہ کچھی کے وسط مغرب اور شمال میں قدیم ٹیلوں کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اِس طرح چھال گری کے قریب بھی ایسے ٹیلوں کا

ازسرنو جائزہ لینا چاہئے اور خود درۂ بولان میں تحقیق کی ضرورت ہے۔ (مثال کے طور پر بی بی نانی کے نواح میں) اِس طرح ممکن ہے مفید نتائج برآمد ہوں۔

بہرنوع میرا قیاس یہی ہے کہ وادیٔ سندھ میں لینے والی قوم شمال کے راستے سندھ میں وارد ہو کر پھیل گئی۔ یعنی کچھی کے راستے سے۔ یہ لوگ مغرب سے نہیں آئے۔ اور یہ کہ جھلاواں میں جو وادیٔ سندھ کی آبادیاں تھیں جیسے اورناج وادیٔ سرونا کے اندر جو قدیم آثار ہیں اُن کی شناخت ابھی باقی ہے۔ یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وادیٔ سندھ کی قوم نے سندھ سے آکر یہاں نوآبادیاں قائم کیں نہ کہ یہاں سے سندھ میں داخل ہو کر۔

(سر ایم وہیلر۔ ''ارلی انڈیا اینڈ پاکستان'' صفحہ ۱۰۰۔۱۱۔۱۰۷۔ ''آرٹس ایشیاٹک ۱۹۵۴ء، ۱۔۳، صفحہ ۱۶۳۔۱۷۸ ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف پاکستان'' جلد دوم، ڈھاکہ ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱، ''الٹرینڈ لندن نیوز'' مئی ۷۔۱۹۵۵ء مئی ۲۴۔۱۹۵۸ء۔ ''پاکستان نیوز'' اکتوبر ۲۶۔۱۹۵۷ء۔ مارچ ۱۱ اور یکم جولائی ۱۹۵۸ء۔ سرونا کے لئے دیکھئے مندرجہ بالا باب ۵، صفحہ ۶۳۔۶۴)

73. وہیلر ''دی انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۹۱۔۹۲۔ پلیٹ ۱۲۴ے۔

74. جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس، جلد ۸، حصہ اول، صفحہ ۵۲۔۵۳۔

75. یہ مقام یارولونڈ اور صاحب خان لونڈ کے درمیان واقع ہے۔

76. جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس، جلد ۸، صفحہ ۵۰۔۵۱۔

77. کیپٹن جے۔ ایچ۔ کربی جن کے سراِس دریافت کے سہرہ ہے ایک ''کوزہ'' کے متعلق بیان کرتے ہیں۔ ''جرنل آف دی بمبئی برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی'' جلد ۵، (۱۹۵۷ء) صفحہ ۱۷۴۔۲۷۲۔۲۷۳۔

78. مندرجہ بالا، باب ۱، صفحہ ۲۔

79. جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس، جلد ۸، صفحہ ۵۹۔۶۰۔

80. اس کا صفحہ ۶۱۔

A80. یہاں بھی مضمون وہی ہے جیسا کہ ۵۲-۱۹۵۳ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد کاٹھیاواڑ اور گجرات میں ساحل سمندر کے نزدیک وادیء سندھ کی تہذیب کی قدیم بستیاں دریافت ہوئی ہیں جو خاص طور پر ایک اہم مقام پر وسیع پیمانہ پر کھدائی۔ اِس مقام کا نام لوتھل ہے۔ اِس بات کا کافی ثبوت پہنچاتی ہیں کہ وادیء سندھ تہذیب کے جنوبی علاقہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے سمندر میں جہاز رانی کے لئے جہاز بنائے جن کے ذریعہ فارس اور دوسرے مقامات کے ساتھ تجارت کی جاتی تھی۔

سر مورٹیمر وہیلر نے اُس ادارۂ جہاز رانی کا حوالہ دیا ہے جو قدیم زمانہ کی ہندوستانی تجارت کے ساتھ بہت سے زمانوں میں وابستہ رہا ہے۔ اور ڈاکٹر آر۔ کے مکرجی نے اپنی کتاب ''انڈین شپنگ'' میں اِس ضمن میں متعدد شہادتوں پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اِس طرح ''سپار کا جکہ'' کتاب دس۔ نمبر ۴۶۳۔ (ایڈیٹر ای۔ بی۔ کاول، جلد چہارم، صفحہ ۸۷-۸۸) نے ایک بحری کپتان کے متعلق تفصیلات پیش کی ہیں۔ یہ شخص بھروکاچا سے تعلق رکھتا تھا) اسٹرابو نے برگوسا اِس مقام کے لئے استعمال کیا ہے۔ لازمی زمانہ بروچ کہلاتا ہے) اِس مقام کے قریب ہی ایک قدیم وادئ سندھ دور کا شہر دریافت ہوا ہے۔

لوتھل سندھ کے لئے ایک بندرگاہ کا کام انجام دیتا ہوگا۔ یہ خارج از بحث ہے۔ اور سندھ میں ایسے بندرگاہ کے کوئی آثار بھی دریافت نہیں ہوئے۔ مگر اس کی وجوہات بھی کم و بیش وہی ہوسکتی ہیں جو باربری کون جیسی اہم بستی کے متعلق ہیں کہ جس کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں چل سکا۔ ممکن ہے دریائے سندھ کے پانی نے دس شہر کی زمیں اور آثار کو کاٹ کر بہا دیا ہو۔

نہرنوع یہ ممکن کہ ہے وادیء سندھ تھذیب کے صوبہ سندھ کے حکمران تقریباً اُسی حیثیت کے مالک تھے جس کا کالی کٹ کا حکمران زمورین اور ساحل مالابار کے دوسرے حکمران واسکوڈی گاما کی آمد کے وقت تھے۔ یعنی بحری

تجارت کی سرپرستی کرنے والے کیونکہ اُن کی خوش حالی اِس تجارت کی بدولت تھی۔ حالانکہ اِس تجارت میں بیشتر جہاز بیرونی ممالک کو استعمال ہوتے تھے۔ عرب (پندرھویں صدی میں) ملایائی اور موپلے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موپلے اُن غیرملکیوں کی نسل سے تعلق رکھتے تھے جو کالی کٹ میں آباد ہوگئے تھے۔ اِس کے علاوہ مشرقی اور مغربی تجارت سے تعلق رکھنے والے دوسرے غیرملکی۔

(لوتھل کے لئے دیکھئے: 'السٹرٹیڈ لندن نیوز۔ جلد ۲۳۸، نمبر ۶۳۴۳ اور ۶۳۴۴، فروری ۲۵ اور مارچ ۴، ۱۹۶۱ء) باب ''نیولائٹ آن دی انڈس ویلی سوی لائزیشن''۔

81. جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس، جلد ۸، صفحہ ۵۸۔۵۹۔

82. مجمدار صفحہ ۲۰۔۲۲، جے۔ ایس۔ ایچ۔ ایس، جلد ۶، صفحہ ۱۰۹۔۱۱۰، پگوٹ، صفحہ ۷۷۔۷۸۔

83. اسٹائن کو دیکھئے: ''دی جوگرافیکل جرنل (اپریل ۱۹۲۲ء) اور وہیلر ''انڈس سولائزیشن'' صفحہ ۹۶۔

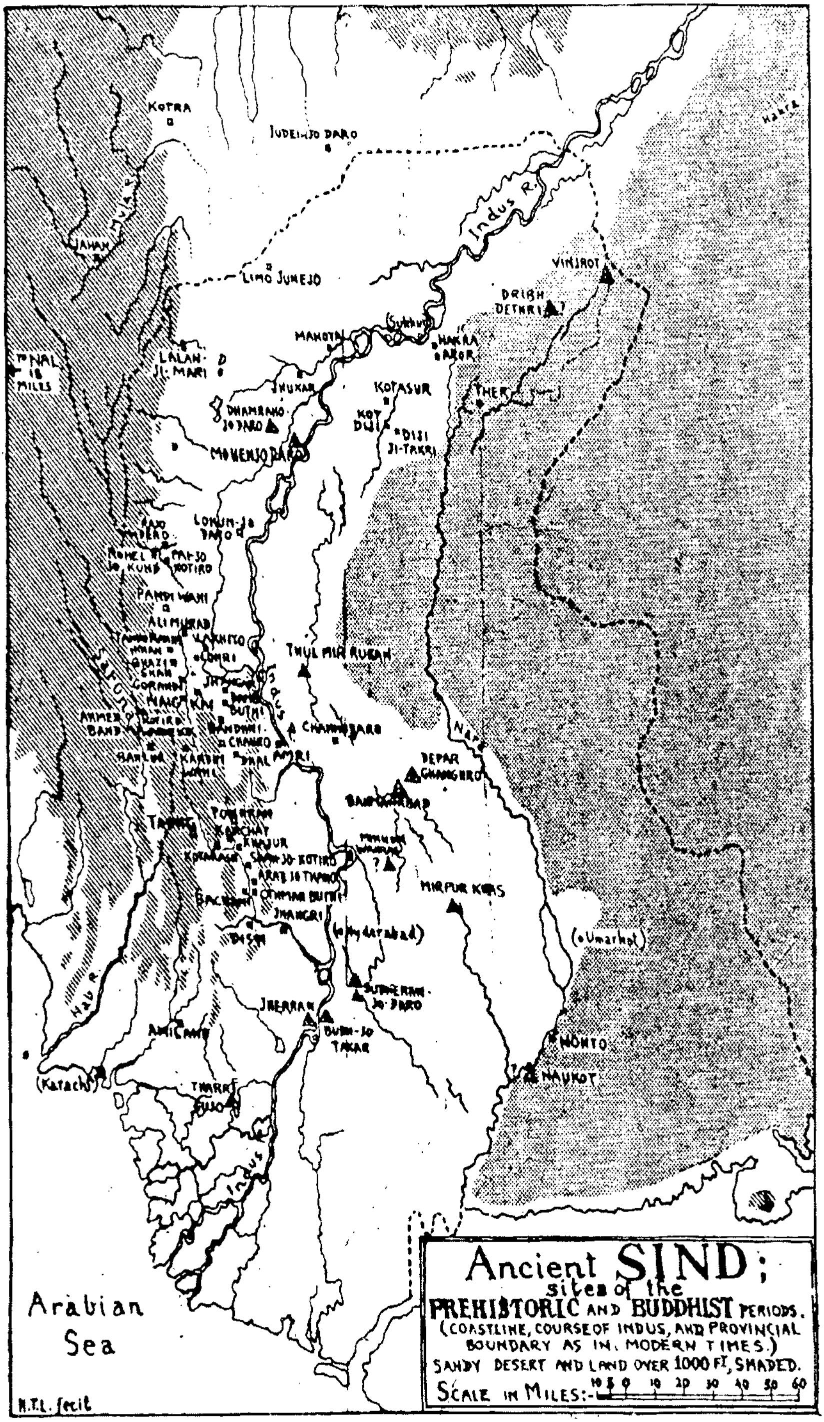
Ancient SIND;
sites of the
PREHISTORIC AND BUDDHIST PERIODS.
(COASTLINE, COURSE OF INDUS, AND PROVINCIAL BOUNDARY AS IN MODERN TIMES.)
SANDY DESERT AND LAND OVER 1000 FT, SHADED.
SCALE IN MILES:- 10 5 0 10 20 30 40 50 60
Arabian Sea
Indus R.
Indus
Hab R.
Nara
Hakra
KOTRA
JUDEIRJO DARO
LIMO JUNEJO
VIJNOT
MAHOTA
KOTASUR
MOHENJO DARO
THUL MIR RUKAN
AMRI
MIRPUR KHAS
(Hyderabad)
(Umarkot)
(Karachi)
JHERRAN
NAUKOT
H.T.L. fecit

باب ساتواں

ماضی بعید کے تاریخی دور کا سندھ

سندھو تہذیب کے خاتمہ کے بعد ایک ہزار سال تک سندھ میں کیا ہوتا رہا اِس کے بارے میں ہمیں کچھ علم نہیں ہے رگ وید (Rig Veda) کے اشلوک متعدد بار سندھ کا نام لیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور اِسی طرح پنجاب کے دوسرے دریاؤں کے نام بھی اِس کتاب میں ایک نہ ایک جگہ موجود ہیں [1] لیکن ایسی تفصیل کسی جگہ نہیں ملتی جس سے زیریں سندھ کے اُس وقت کے حالات پر روشنی پڑ سکے۔ بجائے خود یہی بات مشتبہ ہے کہ رگ وید عہد کے آریہ لوگ سمندر سے واقف بھی تھے یا نہیں [2] جہاں تک اِس کے بعد کی کتابوں کا تعلق ہے، مہابھارت (Mahabharata) کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔ اِس کتاب میں دروپدی (Daru Padi) نے سندھ کو ایک دولتمند ملک کے نام سے بیان کیا ہے، لیکن اِس گفتگو کے سیاق وسباق کے پیش نظر اُس کا بیان کسی تاریخی اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا [3] دوسری کتاب " گوتم بدھ کے اقوال " ہے اِس میں سوویر دیس کی راجدھانی کے نام روریکا (Rorika) لکھا ہے [4] اور جٹکا میں اِس راجدہانی کو رورو کہا گیا ہے، جواز موجود رہے کہ یہ نام الور کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو عام طور پر اروڑ (Aror) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سنکسرت کی کتابوں میں 'سوویر' عام طور پر سندھو (Sindho) یا سندھارا کے ساتھ مذکور ہے، مثال کے طور پر وشنوپُران کو دیکھئے، اِس میں ملک کے صوبوں کے نام عام طور پر اُس قبیلہ یا قبائل کے نام پر دیئے گئے ہیں جو وہاں آباد تھے۔ یہ دونوں بھی اُس فہرست میں شامل ہیں جو مستیہ پوران میں موجود ہے اور اُن علائقوں کے نام پیش کرتی ہے جن سے دریائے سندھ گذرتا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ فہرست جغرافیائی ترتیب کے مطابق نہیں بنائی گئی۔ [5]

قدیم فارسی ادبیات میں بھی سندھ کے بارے میں چند حوالے ملتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بندہش میں سندھ کے آخری حصہ کا وہ نام مرقوم ہے جو اولین مسلم جغرافیہ دانوں نے اسے دیا تھا، ''اچھا دریا مشرق میں بہتا ہے اور سندھ کی سرزمین سے گذرتا ہے اور ہندوستان کے ملک میں سمندر میں داخل ہوتا ہے اور وہاں لوگ اِسے مہرا کے نام سے پکارتے ہیں۔[۸]

اِس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سنسکرت (Sanskrit) پالی (Pali) اور پہلوی (Pahelvi) زبانوں میں سندھ کے بارے میں جو کچھ مواد ملتا ہے وہ جغرافیائی اعتبار سے برائے نام ہے۔ سکندر اعظم کی مہمات میں جو جغرافیہ دان اور مؤرخ شامل تھے ان کے بیانات میں ایک بار پھر اس ملک کا نام ایسی عمومیت کے ساتھ نظر آتا ہے جو غیر فطری معلوم ہوتی ہے، بہرنوع فارس کے بادشاہ دارا ہشٹاسپس ایک بحری افسر نے اِس ملک کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کی ہیں، اِس کا نام اسکائی لکس ہے اور یہ برِکوچک کا رہنے والا تھا، یہ شخص کشتیوں کا ایک بیڑہ تیار کر کے دریائے کابل پر واقع کاسپی روس سے روانہ ہوا، اور دریائے سندھ کے راستے سمندر تک پہنچا، یہ بیڑہ ڈھائی سال کے بحری سفر کے بعد مصر میں وارد ہوا۔[۹] یہ اہم مشاہداتی سفر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۵۱۶ تا ۵۱۸ قبل مسیح میں واقع ہوا اور گمان غالب یہ ہے کہ وادی سندھ پر ایرانی تسلط کے فوراً بعد نہ کہ ذرا پہلے یہ واقعہ پیش آیا۔[۱۰]

اسکائی لیکس کی تحریر تو معدوم ہو چکی ہے لیکن یہ نظر آتا ہے کہ یونانی جغرافیہ دان ہیکاٹیوس (Hekataeus) نے اِس سے استفادہ کیا ہے اور خود اِس یونانی کی تحریریں بھی چند اوراق کی شکل میں باقی ہیں۔ اِس نے اوپیائی نام کے ایک قبیلہ کا تذکرہ کیا ہے جو اُس زمانہ میں دریائے سندھ کے کنارے آباد تھا۔ اِن لوگوں نے ایک شاہی قلعہ تعمیر کیا ہوا تھا۔ اور اِن کے ملک کی سرحد کے پار ریگستان پھیلا ہوا تھا جو ہندوستان سے جا ملتا تھا۔[۱۱] ہیروڈوٹس نے بھی اِس بحری سفر کا حوالہ دیا ہے، اُس نے لکھا کہ "انڈیا" ایرانی سلطنت کا

بیسواں صوبہ بن گیا۔ یہ سلطنت کا سب سے زیادہ دولتمند اور گنجان آباد صوبہ تھا۔۱۲ حالانکہ ممکن ہے کہ اِس صوبہ میں سندھ کے بالائی اور زیریں دونوں حصّے شامل ہوں لیکن دارا کے کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں جس صوبہ کو "ہند" کہا گیا ہے وہ اُسی علاقہ کا نام ہے جو آجکل سندھ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ اِسی بادشاہ کا مفتوحہ تھا، جبکہ گندھارا اور مغربی پنجاب کے صوبے جوٹھٹا گوش کہلاتے تھے اُس کے پیش رُو شہنشاہ کیمی سس کے زمانہ میں ہی سلطنت ایران میں شامل تھے۔۱۳ ڈاکٹر ونسنٹ اسمتھ بھی ریورٹی کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ اِس زمانہ میں دریائے سندھ اور اُس کے معاون دریا چونکہ موجودہ راستے سے مختلف بہاؤ کا راستہ رکھتے تھے۔ اِس لئے پنجاب اور سندھ کے وسیع علاقے جو آج ویران ہیں اُس وقت زرخیز اور خوشحال تھے۔

پہلا یونانی مصنف جس کا بیان "ہند" کے بارے میں خصوصاً قابل توجہ ہے کتیشیاس ہے اُس کے ہم عصر مصنفین نے بھی اور اِس زمانہ کے واقعہ نگارون نے بھی اُس کے بیانات پر کڑی نکتہ چینی کی ہے اُس نے خیالی قصّے کہانیوں کو تنقیدی نظر سے دیکھے بغیر کچھ اِس طرح اپنی تحریرون میں شامل کرلیا ہے جیسے اُسے صرف عجیب وغریب باتوں سے ہی دلچسپی ہوا اور یہ چیز اس لئے بھی قابل گرفت ہے کہ وہ خود سائنس سے تعلق رکھنے والا آدمی تھا۔۱۵ معلوم ہوتا ہے کہ کتیشیاس کو یہ بدنامی اِس لئے حاصل ہوئی کہ اُس کی تحریریں اقتباسات اور حوالہ جات کی شکل میں ہی موجود ہیں اور لکھنے والوں نے زیادہ تر ایسی تحریروں کو پیش کردیا ہے جو بے سروپا واقعات پر مشتمل ہیں۔ لیکن جیسا کہ لاسین (Lassen) اور دوسرے ناقدین نے اظہار کیا ہے کہ اِس کی تحریریں جو سطحی طور پر دروغ بیانی سے پُر معلوم ہوتی ہیں حقیقت میں ایسی نہیں ہیں بلکہ غور کرنے پر اُن میں سچائی جھلکتی ہے۔ ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ کتیشیاس نے ہندوستان کے بارے میں جو کچھ بھی تحریر کیا ہے وہ اُس کے لئے اپنے مشاہدے کا نتیجہ نہیں بلکہ جو معلومات اُسے ایرانیوں سے حاصل ہوئیں وہ اُس نے پیش کی ہیں اور مبالغہ آمیزی ایرانی قوم کی گھُٹی میں پڑی ہے۔

چنانچہ اِن بیانات سے اگر مبالغہ آمیزی اور خیالی واقعات کو نکال دیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ دریائے سندھ ایک وسیع پاٹ کا دریا تھا، جس کے کناروں پر گھاس اور سرکنڈوں کا گھنا جنگل تھا، اِس میں کثرت سے مگرمچھ رہتے تھے اور جو مویشی اور اونٹ پانی پینے کے لئے دریا کے کنارے پر آتے تھے تو یہ مگرمچھ اُن کا شکار کرتے تھے۔

ملک میں بارش نہیں ہوتی تھی۔ اِس کے دریا اِسے سیراب کرتے تھے۔ ریت کی آندھیوں کا بھی اُس نے ذکر کیا ہے اور اِس عجوبہ کا بھی کہ کثیر تعداد میں مُردہ مچھلیاں ساحل سمندر پر جمع ہوجاتی ہیں۔ کتیشیاس نے یہ صحیح بیان کیا ہے کہ لاکھ اُسی درخت سے یعنی ببول سے حاصل ہوتی ہے جس سے عربی گوند پیدا ہوتا ہے۔ اُس نے کپاس کا ذکر بھی کیا۔ مخصوص جانوروں میں بالائی سندھ کے دُنبے جن کے پیچھے موٹی چکری ہوتی ہے مذکور کیئے گئے ہیں۔ اور ایک سینگ والے جنگلی گدھے سے اُس کی مُراد شاید گینڈا ہے۔

جہاں تک نوعِ انسانی کا تعلق ہے تو اِس ملک میں رہنے والی خالص نسلیں اور اُن کی وحشیانہ عادتیں اُس نے مہابھارت اور سنسکرت کی دوسری کتابوں سے حاصل کی ہیں۔ اُسے کسی اختراع کے لئے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ اِس کے برعکس اُس کا یہ بیان کہ ہندوستان میں گورے رنگ کے لوگ بھی موجود ہیں مگر اُن کی تعداد بہت کم ہے بالکل درست ہے اِس کی تحریروں میں ایک ایسی قوم کے لوگوں کا بھی ذکر ملیگا جو جھیل کے کنارے آباد ہیں۔ کشتی رانی کے ماہر ہیں بہترین تیرانداز ہیں اور باز سے شکار کرتے ہیں، اُس نے لکھا کہ یہ قوم ہند کے وسط میں آباد ہے۔ ظاہر ہے کہ ہند سے مُراد وادیٔ سندھ ہے۔ چنانچہ موہانا قوم جو منچھر جھیل کے کنارے آج بھی آباد ہے اُس کے آباؤاجداد کے متعلق یہ کچھ مشہور ہے جو اِس یونانی نے سُنا۔ البتہ یہ بیان کہ یہ لوگ انتہائی چھوٹے قد کے بونے ہیں اور جھیل میں تیل بھی پیدا ہوتا ہے صریحاً غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ تیل شاید اُس مچھلی سے حاصل کیا جاتا تھا جو جھیل میں پیدا ہوتی تھی۔

اِس کے علاوہ شمالی علاقہ میں اِس کے بیان کے مطابق ایسے لوگ آباد تھے جن کی

خوراک صرف دودھ تھا ایسے لوگ آج بھی سندھ ڈیلٹے میں جتوں کی شکل میں موجود ہیں جو اپنے اونٹوں کے دودھ کو بطور غذا استعمال کرتے ہیں۔ اِس طرح کتیشیاس کی تحریروں میں حماقت آمیزی کے ساتھ سندھ کی حقیقی تصویر بھی نظر آئیگی۔

مغرب کو ہندوستان کے متعلق سب سے پہلے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اُن فوجی جرنلوں اور دوسرے لوگوں کی تحریروں سے جو سکندر اعظم کے حملہ کے وقت اُس کے ساتھ تھے۔ یہ تحریریں جن میں خاص طور پر ارسطوبلس، ٹالمی، سوٹر اور نیرکس کی تحریریں شامل ہیں اِسی صورت میں باقی ہیں، جیسے ہیکاٹیس اور کتیشیاس کی تحریریں۔ یعنی وہ اقتباسات اور حوالے جو آنیوالے یونانی اور رومن مصنفین نے اپنی کتابوں میں پیش کئے۔ اِس ملک اور یہاں کے باشندوں کی جو تصویر اِن لوگوں نے پیش کی ہے وہ کئی اعتبار سے بہت مکمل ہے پھر بھی اِن تحریروں میں جغرافیائی معلومات کا فقدان ہے اِس خلاء کو پُر کرنے کے لئے بعد کے زمانہ کے علماء کو بہت محنت کرنی پڑی۔

اِس زمانہ کی قابل اعتماد جغرافیائی تحقیق میں اسٹربوا (Strabo) کا نام سرفہرست ہے۔ سن عیسوی کے ابتدائی بیس سالوں کے دوران یہ کتاب لکھی گئی۔ اِس نے صرف اُن شہادتوں پر انحصار کیا ہے جن کی صحت مشتبہ نہیں تھی۔ اِن کے علاوہ ایسے بیانات اور دستاویزات کا بھی محتاط طور پر مطالعہ کیا اور اُن سے استفادہ کیا جو اُس کے ہاتھ لگے۔ اور ہر معاملہ پر اپنا تبصرہ بھی اُس نے شامل کر دیا ہے۔

آب وہوا کے متعلق اُس کا بیان خاص طور پر دلچسپی کا باعث ہے۔ ارسطوبلس جسے وہ سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ذریعہ اطلاع سمجھتا ہے کہتا ہے کہ میدانی اور پہاڑی علائقوں کی آب وہوا میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ۳۲۶ قبل مسیح جب سکندر اعظم پہاڑی علائقوں سے گذرا خاص طور پر زیادہ بارش کا سال معلوم ہوتا ہے۔ ارسطوبلس کہتا ہے کہ جب وہ ٹیکسلا سے روانہ ہو گئے تو مسلسل بارش ہوتی رہی اور وسط ستمبر تک جاری رہی۔ برعکس اِس کے وہ کہتا ہے کہ میدانی علائقہ یعنی جنوبی پنجاب اور سندھ بارش سے محروم ہیں۔ البتہ چڑھتے

ہوئے دریاؤں کی طغیانی سے تمام علاقہ میں پانی پھیل جاتا ہے اُس نے خاص طور پر یہ بیان کیا ہے دریائے جہلم، چناب اور سندھ سے اُن لوگوں کو گذرنا پڑا اور بعض اوقات کافی عرصہ ایک جگہ رُکنا پڑا۔ چنانچہ اکتوبر سے جولائی تک دس مہینے کی مدت اِس سفر میں صرف ہوگئی۔ لیکن اِس عرصہ میں ایک دفعہ بھی بارش نہیں ہوئی۔ اُس وقت بھی نہیں جب مشرقی ہوا زوروں پر تھی اور دریاؤں میں طغیانی کی وجہ سے میدانی علاقہ پانی سے ڈھکا ہوا تھا، نیرکس نے بھی اِس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے جو باتیں تحریر کی ہیں وہ دوسروں کی زبانی سُن کر نقل کی ہیں اور ایک عمومی حالت کو پیش کیا ہے لیکن اُس کا اپنا مشاہدہ ایسا نہیں ہے وہ کہتا ہے کہ موسم گرما کے دوران میدانی علاقہ میں بارش ہوتی ہے۔ لیکن موسم سرما میں نہیں ہوتی۔ اِس کے علاوہ باقی تمام باتیں وہی ہیں جو ارسطوبلس نے بیان کی ہیں۔ ۲۵

زیریں سندھ کی وادی اور مصر کے درمیان مماثلت پر اِن قرونِ اولیٰ کے محققین کی نظر بھی پڑی چنانچہ نیرکس پر بھی یہ انکشاف ہوا کہ ہندوستان کے شمالی مغربی میدان دریا کی جمع کی ہوئی مٹی سے بنے ہیں۔ گویا اِنھیں دریا کی اولاد ۲۶ کہا جا سکتا ہے۔ اور اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دریا نہ ہوتے تو یہ علاقہ بالکل غیر آباد ہوتا۔ ۲۷ اِس بیان سے بھی ہمیں یہی اشارہ ملتا ہے کہ زیریں میدانی علاقہ میں بارش باقاعدگی کے ساتھ نہیں ہوتی تھی۔

دو ممتاز ماہرین سیلاب، اور اُس کے جو اثرات علاقہ پر مرتب ہوتے ہیں اِن کے بارے میں متفقہ رائے رکھتے ہیں، ہم نے اپنے زمانہ میں بھی کچھ ایسے ہی حالات کا مشاہدہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۲ء میں دریائے سندھ کی طغیانی نے سکھر کے بالائی علاقہ میں حفاظتی پشتوں کو توڑ دیا اور دائیں کنارے سے سیلاب کا پانی اُمڈ کر وسیع علاقہ میں پھیل گیا، "شہر جو بلندیوں پر آباد تھے جزیرے معلوم ہوتے تھے، زمین جب نیم خشک ہو جاتی ہے تو بیج بکھیر دیا جاتا ہے، معمولی مزدور آسانی سے کھیت تیار کر دیتا ہے، بہر حال فصل اچھی ہوتی ہے اور خوب پیداوار ہوتی ہے۔ ۲۸ سیلاب کے زمانہ میں سندھ کی ایک اور تصویر بھی نیرکس

نے پیش کی ہے جو موجودہ زمانہ کے مشاہدات کے عین مطابق ہے، یعنی سانپ اور دوسرے کیڑے ایسی آبادیوں میں گھس آتے ہیں جو بلندیوں پر واقع ہیں کیونکہ سیلاب کے بڑھتے ہوئے پانی سے محفوظ رہنے کا ایک یہی طریقہ ہے، وہ لکھتا ہے کہ "اِس وجہ سے آبادیوں کے لوگ اپنے سونے کے مقامات کو زمین سے بلند کر لیتے ہیں۔[۲۹]

یونانی باشندے دریاؤں سے خاص طور پر دلچسپی رکھتے تھے۔ اور سیلاب کے زمانہ میں دریائے سندھ اور اُس کے معاون دریاؤں کی چوڑائی دیکھ کر وہ بہت متاثر ہوئے تھے، لہٰذا جو اندازے لمبائی چوڑائی کے اِن لوگوں نے بیان کئے ہیں وہ مبالغہ آمیزی سے پاک نہیں ہیں۔ اسٹرابو نے تو سکندر اعظم کے ہمراہیوں کی مبالغہ آمیزی پر کڑی تنقید کی ہے۔ اس نے دریائے سندھ کی وسعت کا جو اندازہ اُس وقت پیش کیا ہے۔ جبکہ معاون دریا اُس سے مل چکے ہیں وہ بھی خاصا درست ہے، وہ کہتا ہے کہ "چوڑائی زیادہ سے زیادہ پچاس اسٹیڈیا (Stadia) (ناپ کا پیمانہ) اور کم سے کم سات ہے۔[۳۱] یہ حقیقت کے مطابق ہے کیونکہ طغیانی کی زیادتی اور پانی کی انتہائی کمی کے زمانہ میں علی الترتیب یہی پیمائش ہوتی ہے۔

پنجاب کے دریاؤں کے سنگم کے بارے میں یونان کے ممتاز محققین نے جو اطلاعات بہم پہنچائی ہیں وہ ہمارے موجودہ مشاہدے کے مطابق ہیں۔ اِس سے ہمیں اُن کے بیانات کی صداقت کا یقین ہوتا ہے۔ ایسے سنگم کا خاص مقام تو ممکن ہے اتنا زمانہ گذرنے کے بعد تبدیل ہو چکا ہو۔ بہر نوع سنگم کے موجودہ مقامات اکثر و بیشتر حالات میں آجکل جس جگہ واقع ہیں سکندر اعظم کے زمانہ میں اِس سے مزید بہاؤ کے اوپر کی طرف واقع ہوں گے۔ کیونکہ دریاؤں کے آخری حصہ میں زمین کی سطح اُن کی مٹی جمع ہونے کی وجہ سے مسلسل بلند ہوتی رہی ہے۔ اِس طرح سمندر کی طرف سندھ کے ڈیلٹا میں نئی زمین شامل ہونے کی وجہ سے دریا کی لمبائی میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا رہا ہے چنانچہ میدانی علاقہ میں داخلہ کے بعد سے اِن تمام دریاؤں کے آبی راستوں میں وقتاً فوقتاً تبدیلی ہوتی رہی ہے۔

ارسطوبلس کی بیان کردہ تفصیلات میں جنھیں اسٹرابو نے اپنی تحریروں میں پیش کیا ہے

ایک دریائے سندھ کے آبی راستہ کی تباہ کن تبدیلی بھی ہے۔'' وہ کہتا ہے کہ جب اندرون ملک اُسے کچھ خدمات انجام دینے کے لئے جانا پڑا تو اُس نے ملک کا وسیع علاقہ ایسا بھی دیکھا جس کے ایک ہزار شہر بمعہ دیہاتی آبادیوں کے خالی پڑے تھے۔ کیونکہ دریائے سندھ نے اپنا خاص آبی راستہ ترک کر کے بائیں طرف ایک ایسی گذرگاہ کو اختیار کر لیا تھا جو زیادہ گہری تھی اور اُس میں ایسے جوش وخروش کے ساتھ داخل ہو رہا تھا کہ دائیں طرف کا تمام علاقہ پانی سے محروم ہو گیا تھا، یہ علاقہ نہ صرف نئی آبی گذرگاہ سے بلند تھا۔۳۳ بلکہ سندھ کی سیلابی سطح سے بھی کافی بلند تھا۔ بدقسمتی سے ہمیں یہ خبر نہیں دی گئی کہ یہ تباہ کن تبدیلی کس جگہ واقع ہوئی اور نہ یہ کہ تبدیلی اُسی زمانہ میں واقع ہوئی تھی یا اُس سے بھی پہلے کسی زمانہ میں، ممکن ہے کہ یہ تبدیلی دریائے سندھ اور پنج ند (Panj Nad) کے اتصال کے فوراً بعد کسی جگہ واقع ہوئی ہو۔ سکندر اعظم نے اِسی مقام پر کریٹرس (Craterus) کو دریا کے بائیں کنارے پر منتقل ہونے کا حکم دیا تھا۔ کیونکہ بھاری اسلحہ سے لیس فوج کے لئے اِس طرف سے پیش قدمی کرنا نسبتاً آسان تھا۔۳۴ پنج ند سے روہڑی تک کا فضائی فاصلہ ایک سو پچاس میل ہے اور دریائے سندھ کے اتنے حصّہ میں آبی گذرگاہ کی انقلابی تبدیلی کا امکان ہے۔ اور کشمور سے آگے ہم دیکھتے ہیں کہ دریا کہ پُرانے متروک راستہ کا نشان موجودہ راستہ سے بہت دور ہٹ گیا ہے اور دائیں طرف ہے یہ راستہ تعلقہ کشمور، کندھ کوٹ، مشرقی شکارپور اور سکھر سے گذرتا ہے۔

یہ علاقہ بہر نوع شاید موسیقانوس (Musikanus) قبیلہ کے زیر نگیں تھا جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ بے حد خوش حال تھے۔ اِس کے علاوہ دوسری عام شہادتیں موجود ہیں کہ دریائے سندھ کشمور سے ذرا پہلے اپنے موجودہ راستہ سے بہت دور نہیں بہتا ہوگا۔ جیسا کہ آگے چل کر ظاہر ہوگا اگر یونانی واقعات نگاروں کے بیانات کو سامنے رکھ کر زیریں سندھ کے موجودہ نقشہ کا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہوگا کہ اُس وقت دریائے سندھ روہڑی کی پہاڑیوں کے مشرق میں نہیں بہتا تھا۔ حالانکہ یہ مفروضہ عام ہے۔

ارسطوبلس نے جس ویران علاقہ کا ذکر کیا ہے وہ شاید بالائی سندھ کی موجودہ جنوبی سرحد کے آس پاس ہوگا۔۳۵ آج بھی ایک مسافر اگر بغور مشاہدہ کرے تو مشرق اور شمال مشرق کا تمام علاقہ وہی منظر پیش کرتا ہے یعنی بھاولپور میں دریائے ہاکڑا کے خشک آبی راستہ کے ساتھ زمانہ قدیم کی خوشحال آبادیوں کے آثار ملتے ہیں۔ اِس علاقہ سے آبادی کا انخلاء بھی تقریباً انھیں وجوہات کی بدولت تھا۔ دریائے ستلج نے اُس آبی راستہ میں پانی پھینکنا بند کر دیا تھا جو دریائے ہاکڑا سے ملتا تھا اور مزید مغرب کی سمت نیا آبی راستہ اختیار کرلیا تھا۔۳۶

سکندرِ اعظم کے ساتھ آنیوالوں نے دریائے ستلج کا ذکر نہیں کیا۔ مشرق کی سمت اُن کی پیش قدمی دریائے بیاس کے کنارے پر ختم ہوگئی تھی۔ بادشاہ سکندرِ اعظم نے راجہ پورس اور دوسرے لوگوں سے دریا پار کے ممالک کے بارے میں معلومات حاصل کی تھیں۔ اُسے معلوم ہوا ہوگا کہ اپنی منزل کو حاصل کرنے کے لئے اُسے ایک اور بڑے دریا کو عبور کرنا ہوگا۔ یہ منزل وادی گنگا تھی۔ بہر نوع وہ تقریر جو اُس نے اپنی فوج کے سامنے کی اِن مشکلات کو نظر انداز کرتی ہے اور بہت معمولی طور پر پیش کرتی ہے اُس نے فوج کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ گنگا کی وادی بہت دور نہیں ہے۔ سکندرِ اعظم کے دریائی بیڑے کا جب بیان سامنے آتا ہے تو یہ توقع ہوتی ہے کہ دریائے ستلج کے سندھ کے ساتھ اتصال کا تذکرہ ملیگا لیکن جو بیان ملتا ہے وہ دریائے بیاس کے چناب کے ساتھ اتصال سے متعلق ہے اور یہ کہ جہلم اور راوی پہلے ہی چناب میں شامل ہو چکے ہیں۔ لیکن اِس جگہ چناب کے دریائے سندھ میں گرنے کا ذکر نہیں۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ کسی زمانہ میں دریائے بیاس دریائے ستلج کا معاون نہیں تھا بلکہ دونوں دریا الگ الگ چناب سے ملتے تھے۔ چونکہ سکندری مورخین نے ستلج کا کوئی ذکر نہیں کیا، لہٰذا ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ یا تو یہ دریا سندھ میں شامل نہیں ہوتا تھا اور الگ کسی دوسرے راستے سے گذرتا تھا یعنی دریائے ہاکڑا کے راستے سے یا دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ یہ دریائے بیاس سے ایسے مقام پر ملتا تھا۔ جو اُس مقام سے کافی

فاصلہ پر آگے چل کر واقع تھا، جہاں سکندر اعظم کی فوج پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی، اور متحدہ دریا کا نام چناب میں شامل ہونے تک بیاس ہی تھا، یونانیوں نے چناب کا ذکر بھی کیا ہے۔

دوسری صورت کا قوی امکان ہے حالانکہ منفی شہادت پر کسی نظریہ کی بنیاد رکھنا غلطیوں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ ایک عظیم دریا جو سندھ کے متحدہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ ہی بہتا ہوا سمندر تک جاتا ہو اور جس کا آبی راستہ تقریباً پچاس میل کے فاصلہ پر واقع ہو۔ اگر واقعی موجود تھا، تو سکندر اُس سے بے خبر کیسے رہا۔ سندھ کی مہمات کے دوران اِس کا کھوج لگانے کے لئے یونانیوں کو بہت مواقع حاصل تھے، اور اُس کے مورخین لازماً ایسے دریا کا ذکر کرتے۔

یونانیوں کا بیان کردہ ہائی فاسس (Hy Phasis) سے ملتا ہے۔ یونانی دریائے بیاس کو ہائی فاسس کہتے ہیں۔ اِس نظریہ پر صرف یہی اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ دریا جو چناب سے ملتا تھا ستلج اور بیاس کا متحدہ چشمہ تھا تو اُسے چھوٹے دریا کے نام سے موسوم کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن اعتراض کرنیوالے ماضی قریب کے تاریخی دور کی اِس حقیقت کو سامنے نہیں رکھتے کہ دریائے بیاس دریائے ستلج میں شامل نہیں ہوا بلکہ ستلج نے بیاس کے پُرانے متروکہ آبی راستہ پر قبضہ جمالیا اور یہ ملاپ دونوں دریاؤں کے لئے نیک فال ثابت نہیں ہوا یوں متحدہ چشمہ بن کر کسی کا نام بھی باقی نہیں رہا، مقامی باشندے اِسے گھارا کے نام سے پکارتے ہیں۔ ستلج کے نام سے نہیں۔[۳۹] سندھ کے اِس آخری سنگم سے کچھ اوپر سے سکندر خود بھی دریا کے راستے سمندر تک پہنچا، اور بیان میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ ڈیلٹا تک دو الگ الگ دریا بہتے تھے۔ آریان (Arrian) بیان کرتا ہے کہ اِس مقام سے (یعنی پنجند کے دریائے سندھ سے اتصال کا مقام) آگے بلا شبہ دریائے سندھ ایک سو اسٹیڈس تک پھیل گیا ہے (چوڑا ہو گیا ہے)[۴۰] اور شاید اِس سے بھی زیادہ قبل اس کے کہ یہ مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر ڈیلٹا بنائے اور یہاں یہ دریا کم اور جھیل جیسا زیادہ نظر آتا ہے۔ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ بادشاہ کا دریائی سفر مسلسل نہیں تھا۔ بلکہ جگہ جگہ اُسے ٹھہرنا پڑا، جبکہ فوجی

دستے خشکی پر مقامی حکمرانوں کے خلاف کارروائی کرتے تھے یا شہر اور بحری اڈے تعمیر کرتے تھے۔ جہلم، چناب اور سندھ کے راستے ڈیلٹا تک کا یہ بحری سفر نو ماہ سے کم نہیں تھا۔ [۲۰]

وہ ۳۲۶ قبل مسیح کے موسم خزاں کے آخری ایام میں روانہ ہوا جبکہ دریاؤں میں پانی کی مقدار بتدریج کم ہو رہی ہوگی مالی قبیلہ کے خلاف اُس کی فوجی کارروائی موسم سرما کا واقعہ ہے اور اوکے کیانس (Okykanus) اور سامبس (Sambus) کے خلاف آنیوالے موسم بہار میں کارروائیاں کی گئیں۔ صرف سفر کے آخری حصہ میں جب وہ میوسی کانس قبیلہ کے علاقہ سے روانہ ہوا اور پٹالہ پہنچا تو دریائے سندھ اپنی پوری طغیانی پر تھا۔

ہمارے مقصد کے لئے اِسے افسوسناک قرار دیا جا سکتا ہے کہ اُس زمانہ کے واقعات میں لکھنے والوں نے جغرافیائی حقائق کو نظر انداز کر دیا۔ اور دونوں مرحلوں میں ایسا ہی کیا، یعنی بالائی اور وسطی سندھ سے گذرنے کے حالات میں بھی یہ غلطی نظر آتی ہے۔ اُن کے بیانات کی قلت کے کئی اسباب معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ دریائے سندھ کے زیریں حصہ کی وادی کے یہ میدان منظر کے اعتبار سے گذرے ہوئے علاقہ کی نسبت روکھے پھیکے تھے، جو لوگ دریا کے راستہ سفر کریں اُن کے لئے یہ بے رنگی اور بھی زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ہر روز سوائے دور تک پھیلے ہوئے پانی کے اور کیا نظر آ سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دونوں کناروں کے وہ جنگلات جن کے درخت نصف بلندی تک پانی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ اور اُن سے آگے گرد و غبار کی موٹی چادر منظر کو چھپا لیتی ہے۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ بہاؤ کی سمت بھی دریائے سندھ میں مقامی کشتیوں کے ذریعہ سفر کرنا بہت ہوشیاری اور مہارت کا کام ہے۔ کیونکہ اِس میں جگہ جگہ گرداب ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے درخت اِس کے اندر بہتے ہوئے آ جاتے ہیں، اور دریا کے اندر ریت کے ٹیلوں پر ٹھہر جاتے ہیں۔ یہ کشتی رانی کے لئے سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ نیرکس اور دوسرے باعلم لوگ جو بادشاہ کے لشکر کے ساتھ تھے ایسے سفر سے ملک کی سطحی حالت کا صحیح اندازہ قائم نہیں کر سکتے تھے۔

وہ فوجی دستے جو دونوں کناروں پر خشکی کے راستے پیش قدمی کر رہے تھے بلا شبہ

گردونواح کا مشاہدہ آسانی کے ساتھ کرسکتے تھے، لیکن سیلاب کے زمانہ میں اُن کا راستہ بھی پیچ وخم سے بھرا ہوا ہوگا اور جگہ جگہ سیلابی پانی کی گذرگاہوں کو عبور کرنے کا مسئلہ پیش آتا ہوگا۔ اِن مشکلات کے ساتھ ہی یہ خیال بھی رکھنا پڑتا ہوگا کہ اِن کی پیش قدمی بادشاہ کی روانگی اور پڑاؤ کے مطابق ہو۔ چنانچہ ایسے حالات میں فوجی جرنل علاقہ کے عام حالات اور ظاہری صورت کے علاوہ دوسری تفصیلات ضابطہ تحریر میں نہیں لاسکے۔

بالائی سندھ میں کسی مقام پر میوسی کانس قبیلہ کا دارالخلافہ تھا، افسوس اِس کے بارے میں بھی تفصیلی معلومات نہیں ملتیں۔ ۴۳ حالانکہ یہاں فوج نے طویل قیام کیا، یہ علاقہ سب سے زیادہ خوش حال تھا، سکندر اعظم کو بتایا گیا تاکہ اُس کی آمد سے پہلے یہ خطہ زمین ایسا ہی تھا، آریان زور دے کر بیان کرتا ہے کہ بادشاہ نے اِس ملک اور درالخلافہ کو بہت پسند کیا تھا۔ شہر میں فصیل والا قلعہ تھا جسے بادشاہ نے مستحکم کیا اور وہاں فوجی دستے تعینات کردیئے۔ وہ سمجھتا تھا کہ نواحی قبیلوں کو زیر کرنے کے لئے یہ مقام زبردست فوجی اہمیت کا حامل تھا۔ شاید اِسی مقام سے اُس نے کریٹرس کو ایک ڈویژن فوج کے ساتھ بہت سے ہاتھی دے کر ایران کی طرف روانہ کیا تھا۔ یہ فوج آرکیوسا (Arachosia) اور زرنگیین قبائل کے ملک سے گذری یعنی کچھی، درہ بولان، درہ مولا (Mula) اور ہلمند کے راستے سے ایران پہنچی۔ ۴۴

جب تک دوسری حتمی شہادت اِس کے خلاف نہ ملے ہمیں الور کو ہی میوسی کانس کا دارالخلافہ سمجھنا چاہیئے۔ موجودہ روہڑی شہر سے پانچ میل جنوب مشرق میں چونے کی پہاڑیوں کے کنارے پر آج بھی اِس شہر کے کھنڈرات نظر آتے ہیں اور نیچے میدان تک پھیلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اِن کھنڈرات سے پہاڑیوں کے درمیان وہ تنگ راستہ نظر آتا ہے جس سے دریائے سندھ کی کوئی شاخ ضرور بہتی ہوگی اور اُس زمانہ میں ضرور ایسا ہی ہوگا جس کی وجہ سے یہ شہر شمال کی سمت قدرتی طور پر محفوظ ہوگا۔ ۴۶ میوسی کانس کی غیرمعمولی خوشحالی اِس بات کا ثبوت ہے کہ ملک میں پانی کی افراط تھی اور یہ قیاس حقیقت

سے قریب تر معلوم ہوتا ہے کہ واہندہ، ریٖنی اور دوسری سیلابی گذر گاہیں جن کے خشک راستے الور کے شمال اور مشرق میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ اُس زمانہ میں پانی سے پُر رہتے ہوں گے طغیانی کے پانی کو ملک کے وسیع علاقہ میں پہنچاتے ہوں گے۔

یہ سوال لامحالہ سامنے آتا ہے کہ مقدونیہ کا بحری بیڑہ جس راستہ سے گذرا، دریائے سندھ کی وہ آبی گذر گاہ کس جگہ واقع تھی؟ یہ بات قابل یقین معلوم نہیں ہوتی کہ اگر دریائی بیڑے کے سامنے اچانک وہ تنگ مقام آجاتا جو روہڑی اور سکھر کی پہاڑیوں کے درمیان واقع ہے تو ایسی زبردست مشکل کا واقعہ نگار کوئی بھی ذکر نہ کرتے۔ لہٰذا ہم اِس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ دریائے سندھ اُس زمانہ میں یا سکھر کی پہاڑیوں کے شمال میں بہتا تھا یا روہڑی پہاڑی سلسلہ کے مشرق میں۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں موخر الذکر صورت کا امکان کمزور ہے اور جب ہم پٹالہ کی جائے وقوع پر بحث کریں گے تو یہ بات اور بھی واضح ہو جائیگی۔

بہر نوع ہم اِس بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ دریا سکھر کی پہاڑیوں کے شمال میں اُس جگہ سے کچھ بہت زیادہ دور مغرب میں نہیں بہتا تھا جو مندرجہ بالا نظریہ کے مطابق ہم نے فرض کرلیا ہے، او کے کانس اور سامبس دونوں مخالف صوبے، جنھیں سکندر اعظم نے بعد میں فتح کرلیا تھا۔ یقیناً میوسی کانس کے مغرب میں واقع ہوں گے کیونکہ سکندر نے سامبس کو "پہاڑی قبائل کا گورنر" مقرر کردیا تھا، اگر اِن دونوں کے خلاف پیش قدمی کرنے کے لئے آبی راستہ موجود ہوتا تو سکندر اِسی کو ترجیح دیتا جو ہر اعتبار سے آسان اور چھوٹا ہوتا، لیکن یہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا کہ اُس نے پہلے اوکس کانس کے خلاف خشکی سے فوج روانہ کی اور اُس کے شہروں کو فتح کرنے کے بعد گورنر کو قید کرلیا۔[۴۷] اور وہاں سے براہ راست سامبس پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہوا، لیکن یہ سمجھنا کہ دونوں سرداروں کے صوبوں سے دریائے سندھ کی کوئی شاخ نہیں گذرتی تھی غلط ہوگا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ اُس موسم میں وہ شاخ جہاز رانی کے قابل نہ ہو، شاید ۳۲۵ قبل مسیح کو موسم بہار تھا۔

جہاں تک بیانات کا تعلق ہے ہمارے پاس کچھ ثبوت موجود ہیں کہ دریائے سندھ کے دونوں کناروں سے شاخیں نکلتی تھیں ، میگاس تھینیز (Magasthones) جس نے سکندر اعظم کے حملہ کے بیس یا تیس سال بعد ہی ہندوستان میں سفر کیا اور چندر گپت (Chandra gupta) کے دربار میں ایک طویل عرصہ تک وہ موجود رہا۔ اُس نے معلومات کا خاصہ ذخیرہ چھوڑا ہے۔ اُس کا واضح بیان ہے کہ دریائے سندھ نے ایک بہت بڑا جزیرہ بنالیا تھا جو پراسیاں (Prasiane) کہلاتا تھا ، اور دوسرا چھوٹا جزیرہ پٹالہ (Patale) کے نام سے مشہور تھا۔ اِن میں بڑے جزیرے کے محل وقوع کے متعلق کوئنٹس کریٹکس کا بیان ہماری رہنمائی کرتا ہے، وہ کہتا ہے "میوسی کانیس کو زیر کرنے کے بعد سکندر نے اُن کے دارالسلطنت میں اپنی فوج کو مقرر کر دیا۔ اور اِس کے بعد پراستھا (Prastha) قبیلہ کے ملک میں اُس نے پیش قدمی کی۔ پورتی کانس (Porticanus) اِن کا راجہ تھا۔ ۴۹ے یہ صاف ظاہر ہے کہ اُس کی مراد او کے کانس کے گورنر سے ہے اور قبیلہ کا نام سنسکرت کے لفظ "پرستھا (Prastha) سے مُشتق ہے جس کے معنی میں ہموار میدان۔ اِس علاقہ کو پرارجنا (Prarjuna) کہا جا سکتا ہے جو الہ آباد کی برج پر کندہ ہے۔ پلائنی (Pliny) نے جزیرے کا ذکر کرتے ہوئے اُسے پراسیپاب کے نام سے مذکور کیا ہے، ٹالمی نے دریائے سندھ سے نکلنے والی بہت سی شاخوں کو بیان کیا ہے۔ ۵۰ے اِن میں سے ایک شاخ آربٹیا (Arbita) پہاڑ کی طرف جاتی تھی۔ ہم آگے چل کر یہ دیکھیں گے کہ اُس کی مُراد سندھ کی پہاڑیوں سے تھی۔ ۵۱ے

بعد کے زمانہ کے اِن مورخین نے بلا شبہ اپنے زمانہ کی معلومات کو اپنے بیانات کی بنیاد بنایا ہوگا لیکن زیادہ تر مواد اِن لوگوں نے میگاس تھینسز اور سکندر کے ساتھیوں کی تحریروں سے لیا ہے، اگر ڈیلٹا سے پہلے دریائے سندھ کی ایسی شاخیں موجود تھیں جبکہ سکندر نے دریائی بیڑے سے سفر کیا تو پھر کیا وجہ ہے کہ آریان اور دوسرے لوگوں نے اِس کا ذکر نہیں کیا؟ اِس کا جواب یہ ہے اگر سندھ کی کوئی شاخ میوسی کانس کی راج دہانی سے پہلے ہی سر

چشمہ سے نکلتی تھی تو وہ یونانیوں کے علم میں نہیں آئی ہوگی کیونکہ جس موسم میں سکندر کا دریائی بیڑا روانہ ہوا اُس موسم میں یہ شاخ خشک ہوگی۔ سکھر بیراج اور اُنہی کی نہریں تعمیر ہونے سے پہلے جس شخص کو موسم سرما میں دریائے سندھ کے ذریعہ سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہو وہ بخوبی جانتا ہے کہ گھارا اور غربی نارا جیسی نہریں پہلے سندھ کی قدرتی شاخیں ہی تھیں جو دریا کے سر چشمے سے جاری ہونے والے ایسے ضمنی چشموں سے نکلتی تھیں جو مسلسل جُدا ہوتے اور پھر بڑھ کے چشمہ سے ملتے رہتے ہیں، ایسے ضمنی چشموں کا مخرج بہت واضح نہیں ہوتا۔

اوگزی کانس (Oxykanus) اور سامبس (Sambus) کے خلاف مہمات ختم کرنے کے بعد جس دریائی پڑاؤ پر سکندر واپس آیا، وہاں سے بحری سفر کا دوسرا مرحلہ اُس وقت شروع ہوا جب سیلاب کا زمانہ شروع ہو چکا تھا اور گردونواح کے علاقوں میں پانی پھیل چکا تھا۔ لہٰذا کوئی حیرت نہیں کہ دائیں کنارے سے نکلنے والی کسی ایسی شاخ کا ذکر موجود نہیں جو اُس علاقہ میں ہو کر گذرتی تھی جس سے وہ ابھی واپس آیا تھا۔ آریان کے مطابق دریائی بیڑا تین مرحلوں سے گذرا۔ ہر مرحلہ پر قیام ضروری تھا تاکہ جو فوجی دستے دائیں بائیں خشکی پر خدمات انجام دے رہے تھے وہ ساتھ رہ سکیں اور پیچھے نہ رہ جائیں۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ سفر کا ہر مرحلہ مختصر تھا۔ اِس وقت سکندر کو جو اطلاعات ملیں اُن کا تقاضہ تھا کہ وہ پٹالہ کی طرف اپنی پیش قدمی کی رفتار کو تیز تر کر دے۔۵۲ چنانچہ یہ نتیجہ اخذ کرنا درست ہوگا کہ سفر کا آخری مرحلہ تیز کشتی کے ایک دن کے مسافت سے زیادہ نہیں تھا۔

آریان کے بیان کے مطابق دریائے سندھ جس راس مقام سے دو شاخوں میں منقسم ہو کر ڈیلٹا بناتا ہے اُس کے قریب ہی پٹالہ شہر آباد تھا اور یہ کہ سمندر تک دونوں شاخیں سندھ کے نام سے ہی پکاری جاتی تھیں۔۵۳ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے آس پاس کا علاقہ اتنا سرسبز و شاداب نہیں تھا جتنا کہ میوسی کانس کا علاقہ تھا۔

سکندر نے یہاں قلعہ بندی کو مستحکم بنانے کے بعد اپنی فوج کے آدمیوں کو ملحقہ علاقہ میں روانہ کیا، ''یہ علاقہ بے آب تھا'' اور اِن فوجیوں کے سپرد یہ خدمت کی گئی تھی کہ وہ جگہ

جگہ کنویں کھود کر علاقہ کو انسانوں کے رہنے کے قابل بنائیں۔ اِن فوجی دستوں پر وحشی قبائل نے حملہ کیا لیکن شکست کھانے کے بعد یہ لوگ "ریگستان کی طرف بھاگ گئے "اسٹرابو (Strabo) نے ارسطوبلس (Aristobulans) کا بیان نقل کیا ہے کہ دریائی بیڑا ماہ جولائی کے قریب پٹالہ پہنچا۔ ۵۴ ہمیں اِس بیان کو درست سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے، اِس ماہ میں دریائے سندھ میں پانی کی مقدار اپنے عروج پر ہوگی اور بہ ظاہر یہ بیان کہ شہر کے آس پاس کا علاقہ "بے آب" تھا غلط معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اِس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ دریا عام حالات میں کناروں سے باہر نہیں بہے گا۔ سیلابی پانی جو کناروں سے نکلتا ہے وہ عموماً اِس کے بالائی حصہ میں بہتا ہے جہاں پانی کی مقدار بہت ہوتی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیریں حصہ میں پانی کی مقدار کم ہو جاتی ہے جس کے لئے کناروں سے باہر نکل کر بہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

یہ کہا جاتا ہے کہ آریاں (Arrian) ۵۵ کے بیان کردہ حالات اُس صورت میں مطابق حقیقت قرار پا سکتے ہیں جبکہ دریائے سندھ کا آبی راستہ تقریباً وہی ہو جو دریائے نارا (Nara) کا ہے۔ اور ڈیلٹا سے قبل اُس کا انقسام تقریباً جمڑاؤ ہیڈ (Jam rao Head) یا مٹھڑاؤ (Mithrao) کے قریب واقع ہوا ہو۔ اِس طرح نارا اور ہاکڑا آخری حصہ آریان کے بیان کردہ خیال کے مطابق شاخ بن جاتا ہے جبکہ دائیں شاخ اندازاً جنوب اور جنوب مغرب میں حیدرآباد کی سمت چلی جاتی ہے اور پٹالہ تھر کے ریگستان کے قریب واقع ہوگا۔ چنانچہ اِس کے گردونواح میں برائے نام قابل زراعت زمین ہوگی۔

لیکن وسطی اور زیریں سندھ کی زمینی سطح میں ماضی میں بہاؤ کے جو نقوش نشیب و فراز کی شکل میں موجود ہیں وہ اِس نظریہ کو باطل کر دیتے ہیں۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ دریائے سندھ کا آبی راستہ وسطی میدان میں تقریباً وہی تھا جو نارا کا ہے اور ریگستان پار کرنے کے بعد بھی کسی مقام پر بھی دو شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا تو ایسی صورت میں دائیں شاخ اور اِسی طرح سے بائیں شاخ، دونوں ہی رن کچھ میں گریں گی۔ ۵۶ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا

ہے اِس علاقہ کا ڈھال شروع سے آخر تک جنوب سے مشرق کی سمت ہے، چنانچہ اگر مقامی نشیب وفراز مغرب کی سمت دریا میں کچھ موڑ پیدا بھی کر دیں۔ اِسکے بہاؤ کا مرکزی خط بہر حال زمین کے ڈھلوان کے مطابق ہی ہوگا۔

چنانچہ جنوبی مشرقی سندھ کی ارضی ہیئیت جو سطحی نشیب وفراز سے ظاہر ہوتی ہے اگر زمانہ کے پیمانہ سے ناپی جائے تو سکندر اعظم کا واقعہ کسی بہت پہلے زمانہ کا واقعہ بن جاتا ہے۔ ارضی ہیئیت سے یہ بھی بالکل واضح ہے کہ آریان کے بیان کے مطابق دریائے سندھ کا دو شاخوں میں منقسم ہونا یعنی ''دائیں شاخ جنوب مغرب کی طرف مُڑ گئی تھی اور براہ راست مان سون کی زد میں تھی۔ شہداد پور (Shahdad Pur) کے مشرق میں ہو ہی نہیں سکتا۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ اِس شہر کے شمال مغرب میں کسی مقام پر تھا۔۵۷ میرے خیال کے مطابق پٹالہ جس جگہ مغرب میں پھیلا ہوا ریگستان تقریباً بیس میل ہونا چاہیئے۔ یعنی نواب شاہ تعلقہ کے جنوب میں۔ لیکن درحقیقت ہم جس یونانی لفظ کا ترجمہ ریگستان کرتے ہیں اُس کا مطلب صرف ریت کے بیابانی یا ویران علاقہ کے نہیں ہیں۔ بلکہ آریان یہی لفظ پنجاب کے دریاؤں کے درمیان واقع بھنگر زمین کے لئے بھی استعمال کرتا ہے۔۵۵ دریائی مٹی سے بنی ہوئی یہ سخت زمین آب پاشی کے بعد آجکل قابل کاشت بنائی گئی ہے اور ایسی بنجر زمین جس میں سندھ کا سیلابی پانی داخل نہ ہوسکتا ہو ممکن ہے کہ پٹالہ کے آس پاس موجود ہو۔

اِس بات پر یقین کرنے کی دوسری وجہ بھی موجود ہے کہ دریائے سندھ ہمارے معلوم مقام سے بھی کچھ اوپر شمال میں ہی دو شاخوں میں منقسم ہو جاتا تھا۔ مغربی شاخ جس کی تفصیلات ہمارے پاس بہتر انداز میں موجود ہیں زیادہ طویل تھی اور کریٹس (Craetus) اس شاخ سے سکندری بیڑے کے سفر کی روداد کافی وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔۵۸ روانگی سے " تیسرے دن " جبکہ وہ پینتالیس میل کا سفر طے کر چکا تھا اُسے مقامی باشندوں نے بتایا کہ وہ کھارے پانی میں پہنچنے والا ہے اور یہ تیسرا ہی دن تھا کہ

سکندر کو موجذر کے اثرات سے سابقہ پڑا۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ سفر اُن ایام میں کیا گیا جب دریائے سندھ میں سیلاب تھا اور اُس وقت دریا کا دھارا آٹھ فٹ فی سکنڈ کی رفتار سے بڑھ رہا ہوگا یعنی پانچ میل فی گھنٹہ سے بھی زیادہ، چنانچہ تین دن کی مسافت (اگر رات کے وقت آرام کیا جائے) دوسو میل کا فاصلہ طے کرے گی۔ ۳۲۵ قبل مسیح میں دریائے سندھ کے ڈیلٹا کی سمندری حد کیا تھی اِس کے بارے میں ہماری معلومات نہایت ناکافی ہیں۔ حالانکہ میں یہ ثابت کرونگا کہ کسی حد تک آریان کا بیان اِس سمت میں ہماری رہنمائی کرتا ہے۔ دریں اثناء یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہم دریائے سندھ کے عمل کے متعلق جو کچھ جانتے ہیں اُس سے یہ واضح ہے کہ یہ حد موجود ساحل سمندر سے بہت پیچھے ہوگی۔

ڈیلٹا کے رقبہ کا اندازہ اُس زمانہ کے لکھنے والوں نے مختلف طرح پیش کیا ہے۔ ارسطوبلس کا خیال ہے کہ دونوں شاخوں کے دہانے ایک دوسرے سے ایک ہزار اسٹیڈس کے فاصلہ پر ہے۔ نیرکس نے اِس فاصلہ کو اور بھی زیادہ یقینی اٹھارہ سو اسٹیڈس یا شمار کیا ہے۔ جبکہ اونیسی کریٹس (Onesicractus) کہتا ہے کہ دونوں شاخوں کے دہانے کے اور اُن کے درمیان ساحل کی لمبائی دو ہزار اسٹیڈس یا تھی۔۵۹ اِن میں سب سے پہلے اندازے کو درست قرار دیا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ زیریں وادیءسندھ کے اُس عرض کے مطابق ہے جو مغربی پہاڑی علاقہ اور مشرقی ریگستان کے نیچے بلند زمین کے درمیان واقع ہے۔

لیکن یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ دونوں دہانوں کے درمیان فاصلہ کے متعلق جو اندازے یونانیوں نے پیش کئے ہیں اُن کی بنیاد کسی مصدقہ پیمائش پر نہیں بلکہ مقامی باشندوں کے بیانات پر معلوم ہوتی ہے وہ لوگ اگر چاہتے تو دونوں شاخوں کی لمبائی کا حساب اپنے اور اپنے ساتھیوں کے مشاہدے سے لگا سکتے تھے۔ مگر یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُن میں سے کسی نے بھی خشکی یا سمندر کے راستے ایک دہانے سے دوسرے دہانے تک سفر کر کے فاصلہ کا حساب لگایا ہو۔ دوسری طرف ہمیں یہ معلوم ہے کہ پٹالہ کے حکمران نے سکندر کو جو کچھ معلومات بہم پہنچائیں اُن کی بنیاد پر وہ یہ سمجھتا تھا کہ ڈیلٹا کی وسعت مصری ڈیلٹا سے بھی زیادہ ہے۔۶۰

ہم اعتماد کے ساتھ یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ نہ صرف بائیں شاخ بلکہ دائیں شاخ بھی حیدر آباد گنجو ٹکر (Ganjo Takar) کے موجودہ جائے وقوع سے مشرق میں بہتی تھیں۔ ۶۱ دائیں شاخ کا عام رُخ اندرون ملک کافی فاصلہ سے ہی جنوب مغرب کی طرف ہوگا جیسا کہ آریان نے رقم کیا ہے کہ دریائی بیڑے کی روانگی کے دوسرے دن ہی اُسے اُن ہواؤں کا سامنا کرنا پڑا جو بہاؤ کے مخالف چل رہی تھیں۔ ۶۲ یقیناً یہ جنوبی مغربی مان سون ہوں گی جن کی شدت کو اِن لوگوں نے دریا کے چوڑے حصّہ میں پہنچ کر پوری طرح محسوس کیا، کیونکہ یہاں سمندر کا پانی بھی چڑھاؤ پر ہوگا۔ وہ " کینال " جس کے اندر تلاطم سے بچنے کے لئے یہ لوگ لنگر انداز ہوئے کوئی کھاڑی یا چھوٹا دریا ہوگا۔

مقامی باشندوں نے جنھیں پکڑ کر اِس خدمت پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ دریا میں بیڑے کی راہنمائی کریں۔ سکندر کو بتایا کہ ابھی اُسے ایک جزیرہ پر دوبارہ ٹھہرنا پڑیگا۔ تب اُس کے بعد دریا کا دہانہ آئیگا۔ اُس نے اپنے فوجیوں کو جگہ کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ کیا۔ اُنھوں نے علاقہ کا جائزہ لینے کے بعد اطلاع دی کہ یہ جزیرہ جو کلوٹا کے نام سے مشہور ہے۔ وسیع ہے اِس میں پانی موجود ہے اور جہازوں کے لنگر انداز ہونے کی جگہ بھی۔ چنانچہ اُس نے راہبروں کے مشورہ پر عمل کیا۔ اِس کے بعد وہ تیز رفتار جہاز لیکر خود بھی آگے تک مشاہدہ کرنے کے لئے نکل گیا " تقریباً دوسو اسٹیڈ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک دوسرے جزیرے پر وارد ہوا جو خاصہ کُھلے سمندر میں تھا۔ بادشاہ (سکندر) نے واپس پہنچ کر بیڑے کو روانگی کا حکم دیا اور اُسے جزیرہ کلوٹا کے قریب لے آیا۔ دوسرے دن بیڑا روانہ ہوا۔ اور اُس جزیرے پر پہنچ گیا جو کُھلے سمندر میں واقع تھا۔ یہ تفصیلات میرے خیال کے مطابق اُس محل وقوع کی نشاندہی کرتی ہیں جہاں پر تمام واقعات پیش آئے۔

یقینی طور پر ایک جزیرہ جس کے متعلق یہ کہا جائے کہ خاصہ آگے کُھلے سمندر میں واقع ہے پائیدار اور مستقل زمین رکھتا ہوگا اور کیچڑ اور ریت کے بہت سے چھوٹے بلند مقامات اور ٹیلے جو دریا کے دہانہ پر ساحل سمندر کے قریب بن جاتے ہیں جنھیں چھوٹی چھوٹی

کھاڑیاں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں جزیرہ نہیں کہلا سکتا۔ علاوہ ازیں سکندر کے زمانہ میں ہمارے علم واطلاع کے مطابق ڈیلٹا کی حدود مکلی (Makli) پہاڑ اور پیر پٹھو (Pir Patho) سے آگے نہیں بڑھی ہوں گی۔ میرا مطلب ڈیلٹا کے مغربی حصّہ سے ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ پیر پٹھو سے گیارہ میل جنوب مشرق میں اور تقریباً ۶۷ طول البلدی خط پر ایک تنہا پہاڑی واقع ہے، یہ ڈیڑھ میل لمبی اور آدھ میل چوڑی ہے اور میدان کی سطح سے پچھتر فٹ بلند ہے یہ پہاڑی ابھن شاہ (Abhan Shah) کے نام سے مشہور ہے۔[۶۴] مجھے یقین ہے کہ یہی وہ کھلے سمندر والا جزیرہ تھا جس پر سکندر اعظم نے قیام کیا۔

کلوٹا اِس مقام سے شمال مشرق میں ہوگا۔ یعنی میر پور بٹھورو سے کسی قدر جنوب میں۔ بیان میں ایسی کوئی بات موجود نہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ ایک سپاٹ میدان کے علاوہ جسے دریا نے منقسم ہو کر احاطہ میں لے لیا ہو کوئی دوسری شکل رکھتا تھا۔ اِس کے اندر جہازوں کے لنگر انداز ہونے کی جگہ وہ کھاڑیاں ہی ہوسکتی ہیں جو ہوا سے محفوظ ہوں گی اور پانی کی تیز لہریں وہاں نہ پہنچتی ہوں گی۔ جہاں تک صاف پانی کا تعلق ہے۔ سیلاب کے موسم میں یہ وافر مقدار میں موجود ہوگا۔

سکندر اِس تحقیقاتی مہم کے بعد پٹالہ واپس آگیا اور پھر بائیں یا مشرقی شاخ کی تحقیق کے لئے روانہ ہوا۔ اِس کا بیان نسبتاً سرسری ہے۔ بتایا گیا ہے کہ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک بڑی جھیل پر وارد ہوئے[۶۵] جو دریا کے دہانے پر واقع تھی۔ اور دریا کے پھیلنے اور منقسم ہونے کی وجہ سے بن گئی تھی۔ ممکن ہے قریبی علاقہ کا پانی بہہ کر اِس میں جمع ہو گیا ہو جس کی وجہ سے یہ بڑی بڑی سمندری مچھلیاں موجود تھیں جو بحیرا اجین (Aegean) میں پائے جانے والی مچھیلوں سے بڑی تھیں۔ سکندر نے راہبروں کی ہدایت کے مطابق بیڑے کو جھیل کے ایک مقام پر لنگر انداز کر دیا اور خود کشتی میں کچھ ملاحوں کو ساتھ لے کر کھلے سمندر میں نکل گیا۔ یہ ذکر نہیں ملتا کہ آیا جھیل سے آگے دریا کی چوڑائی کم ہوگئی یا نہیں اور یہ کہ جھیل کا پانی کھارا تھا یا میٹھا۔ بہر نوع جیسا کہ مشاہدہ میں آچکا ہے دریائے سندھ سیلاب کے زمانہ

میں اس قدر کثیر مقدار میں پانی خارج کرتا ہے کہ سمندر سے اِتصال کے بعد بھی سطح پر کافی فاصلہ تک میٹھا پانی ملتا ہے۔

اِس مقام پر آریان (Arian) ایک عجیب واقعہ نقل کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جھیل کے ساحل پر اُترنے کے بعد سکندر کچھ سواروں کو ساتھ لے کر ساحل کے ساتھ تین دن کی مسافت تک چلا گیا تاکہ یہ مشاہدہ کر سکے کہ ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنے کے لیئے یہ کیسا علاقہ ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ جگہ جگہ کنویں کھودے جائیں تاکہ ملاحوں کے لئے آسانی کے ساتھ پانی دستیاب ہو سکے۔ کہا جاتا ہے کہ پٹالہ واپس پہنچ کر بھی اُس نے فوجی دستے روانہ کئے تاکہ اِس کام کو انجام دے سکیں۔ جنرل ہیگ نے اِس واقعہ کو احمقانہ فرضی کہانی قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ سیلاب کے زمانہ میں ڈیلٹا میں خشکی پر اس طرح چلنا پھرنا ناممکن ہے اور ایسے موسم میں کنویں کھدوانا بالکل غیر ضروری اقدام نظر آتا ہے۔ خصوصاً اُس صورت میں کہ دریا کا پانی اُترنے کے بعد بھی اُن میں میٹھا پانی باقی رہنا ممکن نہ ہوتا، معلوم ہوتا ہے کہ سکندر اعظم کی بے مثال دور اندیشی کی شہرت کے لئے یہ کہانی گھڑ لی گئی ہے، پھر بھی اِس قسم کی خوشامدانہ حرکت کی آریان سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ ٦٦

اسٹرابو کے بیان کے مطابق اونیسی کریٹس نے ساحلی علاقہ کو نشیبی اور دلدلی علاقہ لکھا ہے جس میں درخت اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں خاص طور پر دریائی شاخوں کے دہانوں کے قریب۔ یہاں کیچڑ، چڑھتے ہوئے سمندر کے پانی اور تیز ہواؤں کی بھرمار تھی۔ ٦٧

خوش قسمتی سے نیرکس نے اپنے دریائی سفر کا جو حال تحریر کیا وہ محفوظ ہے اور آریان اُسی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اِس میں سندھ اور بلوچستان کے ساحل کی سطحی تفصیلات درج ہیں لیکن جو معنی اِن تفصیلات سے اخذ کئے جاتے ہیں اُن میں اختلاف کی اُلجھن پیدا ہو جاتی ہے اور پہلی مشکل آغازِ سفر کے مقام کے متعلق ہے۔

سکندر نے بحری سفر کی جملہ تیاریاں اِس منصوبہ کے تحت کی تھیں کہ بیڑا دریائے سندھ کے مشرقی دہانے سے روانہ ہوگا۔ کیونکہ تحقیق کے بعد وہ اِس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ دونوں

مقامات میں یہ آسان تر ہوگا۔ اُس نے جھیل کے کنارے ایک بحری اڈہ تعمیر کیا تھا۔ ایک اسلحہ خانہ تیار کیا تھا اور وہاں ایک فوجی دستے کو تعینات کر دیا تھا۔ پھر بھی حالانکہ نیرکس یہ بیان کرتا ہے کہ وہ ایک بحری اڈے سے روانہ ہوا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ بحری اڈہ نہیں تھا جسے بادشاہ نے اِسی مقصد کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ نیرکس نے خود بھی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ دریا کے مشرقی اور مغربی دہانوں کا درمیانی فاصلہ اٹھارہ سو اسٹیڈس تھا۔ ۶۸ یہ اندازہ قابل تسلیم ہے کم از کم اِس وجہ سے کہ دریا کے مشرقی دہانے سے روانہ ہونے کی صورت میں وہ ساحلی سفر پر مغربی دہانے سے بھی گذرا ہوگا۔

ہمیں معلوم ہے کہ نیرکس نے بحری بیڑے کے کُل اختیارات کتنے شدید احساس ذمہ داری کے ساتھ قبول کئے تھے ۶۹ اور سکندر اعظم کی دِلی خواہش تھی کہ یہ مہم کامیاب ہو جس کا عملی اظہار نہ صرف بیڑے کی روانگی کی تیاریوں سے ہوتا ہے بلکہ اُس کے سفر کے دوران بھی۔ حالانکہ وہ خود بہت سی مشکلات کا سامنا کر رہا تھا۔ اگر امیر البحر نے بادشاہ کے منصوبے میں اپنے اختیارات سے کوئی تبدیلی کی تھی تو اِس کے لئے ضرور کوئی مجبوری ہوگی۔

اسٹرابو بیان کرتا ہے کہ نیرکس کی روانگی خود اُس کے اپنے الفاظ میں عجلت کے ساتھ پیش آئی۔ کیونکہ مقامی باشندوں میں انتقامی جذبات پیدا ہو گئے تھے۔ کیونکہ بادشاہ (سکندر) کی روانگی نے اُن کے حوصلے بلند کر دیئے تھے۔ اُن لوگوں نے حملہ بھی کیا اور کوشش کی کہ وہ اِن لوگوں کو نکال باہر کریں۔ ۷۰ قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو نیرکس جھیل کے کنارے نئے تعمیر کردہ بحری اڈے پر یعنی مشرقی شاخ میں نہیں تھا۔ کیونکہ اگر بیڑا اسی مقام پر موجود ہوتا تو وہ بلا تاخیر روانہ ہو جاتا اور مقامی بغاوت کو دبانے کا معاملہ وائسرائے پیتھن (Peithon) کے سپرد کر دیتا۔ ۷۱ دریائے سندھ میں پھر اوپر کی طرف واپس جانا جبکہ پانی بتدریج کم ہو رہا ہوگا اور وہاں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا سراسر حماقت تھی۔ اُس کو بادشاہ کی ہدایت تھی کہ وہ نہایت تفصیل کے ساتھ ساحل کا جائزہ لے تاکہ سمندر سے ملحق سلطنت کے صوبوں کے درمیان باقاعدہ رابطہ اور آمد و رفت

کی سہولت پیدا کی جا سکے۔ چنانچہ وہ کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔۲ے

لہٰذا ہمیں یہ فرض کرنا چاہیئے کہ اِس موقع پر نیرکس پٹالہ میں مقیم تھا۔ مشرقی شاخ کا جائزہ لینے سے پہلے سکندر نے ہفائیشن (Haphaestion) کو حکم دیا تھا کہ بحری اڈے کی حفاظت کے لئے ضروری اقدامات کئے جائیں، اور جہازوں کے لئے گودیاں تعمیر کی جائیں، کیونکہ وہ پٹالہ شہر کے قریب نئی جہازوں کا ایک بیڑا چھوڑنا چاہتا تھا۔ جہاں دریائے سندھ دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتا ہے، مجھے یہ امکان نظر آتا ہے کہ جھیل پر بحری اڈہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوا تھا۔ جہاز پٹالہ میں ہی لنگر انداز تھے کہ یہ یک لخت ایسا واقعہ رونما ہوا جس نے منصوبے کو یکسر بدل ڈالا۔ اگر مقامی باشندوں کے جذبہ انتقام سے زیادہ کوئی بات نہ کی ہوتی تو نیرکس مشرقی شاخ سے ہی روانہ ہوتا کیونکہ سکندر نے اِسی راستہ سے روانگی کے لئے تیاریاں کی تھیں۔

ہم صرف یہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ سیلاب ختم ہونے پر سندھ کی مشرقی شاخ میں اتنا پانی باقی نہیں رہ گیا تھا کہ جہاز گذر سکیں، سیلاب کے ختم ہونے کا زمانہ ہی وہ وقت ہوتا ہے جب یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریائے سندھ فیصلہ کرتا ہے کہ کس شاخ سے تعلق منقطع کرے گا اور کس شاخ کو اختیار کریگا۔ کیونکہ آنیوالے موسم میں پانی کی کمی کے باعث یہ دریا دونوں شاخوں کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔۳ے سکندر کا سفر جائزہ سیلاب کے زمانہ میں شروع ہوا اور نیرکس کی روانگی کے وقت سیلابی موسم میں ختم ہو چکا تھا۔ اِس مختصر سی مدت میں چند عمومی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں۔ آج بھی سندھ کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہم ایک تصویر اپنے دماغ میں قائم کر سکتے ہیں۔ سکندر کی روانگی کے بعد مقامی راہبر جنہوں نے اُسے دونوں شاخوں کی سیر کرائی تھی نیرکس کے سامنے آتے ہیں اور کچھ اِس طرح کلام کرتے ہیں "ہم آپ کے بادشاہ کے سامنے تو خاموش رہے۔ کیونکہ وہ دیوتاؤں میں ایک دیوتا ہے۔ لیکن آپ کے سامنے اظہار خیال کی جرئت کرر ہے ہیں تا کہ بعد میں آپ ہمیں موردِ الزام نہ ٹھہرائیں کہ مشرقی شاخ جس سے روانہ ہونے کی آپ تیاری کرر ہے ہیں تقریباً ایک مہینہ میں خشک ہو جائے گی"۔

اپنے دریائی سفر کے متعلق نیرکس کا بیان جو آریان نے نقل کیا ہے یہ ہے "اُس بحری اڈے سے روانہ ہوا جو دریائے سندھ کے کنارے پر تھا۔۴ے اور تین مختصر مرحلوں میں سمندر میں داخل ہوا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ مغربی شاخ میں آگے چل کر کسی جگہ ایک بحری اڈہ جو اس نے خود قائم کیا ہوگا اُس کا نقطہ آغاز ٹھہرا۔ لیکن سکندر اعظم کے ساتھ اپنی عقیدتمندی نیز اِس خیال سے اُس نے بڑی محبت اور محنت کے ساتھ نیرکس کے سفر کے انتظامات کئے تھے۔ اور اُس پر اعتماد کرتا تھا۔ اُس اظہار حقیقت سے گریز کیا۔

نیرکس نے اپنے بیان میں کلوٹا (Killuta) یا اُس دوسرے جزیرہ کا کہیں بھی نام نہیں دیا جو سکندر نے مغربی شاخ میں جہاز رانی کرتے ہوئے پایا تھا۔ حالانکہ کئی دوسرے نئے نام ملتے ہیں، اِسے بھول نہیں کہا جا سکتا۔ مندرجہ بالا نظریہ اِس کا تسلی بخش جواب مہیا کر دیتا ہے۔ لیکن قیاس آرائی میں حد سے تجاوز کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مان سون میں عارضی وقفہ کے دوران نیرکس نے اپنے سفر کا آغاز کیا۔۵ے سیلاب تقریباً ختم ہو چکا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ جس آبی راستہ سے سکندر سمندر تک پہنچا تھا، نیرکس اُس سے نہیں گذرا بلکہ دوسرے راستہ سے شاید اِس لئے کہ وہ راستہ کسی وجہ سے اُسے مشکل یا پرخطر نظر آیا۔۶ے چنانچہ جو آبی راستہ اُس نے اختیار کیا آگے چل کر بند نظر آیا کیونکہ اُس کے راستے میں کیچڑ اور مٹی کی ایک دیوار حائل ہوگئی تھی اور سمندر تک پہنچنے کے لئے ملاحوں کو یہ پُشتہ کاٹ کر ایک نہر نکالنی پڑی۔۷ے جب سمندر میں پانی چڑھنے لگا تو یہ نہر یقیناً مزید چوڑی ہوگئی اور جہاز آسانی کے ساتھ سمندر میں داخل ہو گئے۔ یہ فرض کر لینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ یہ آبی راستہ کلوٹا جزیرہ کے ایک طرف کا راستہ تھا جس کے مقابل دوسری طرف کے آبی راستہ سے سکندر سمندر میں داخل ہوا تھا۔ اور چند وجوہات کی بنا پر جو میں آگے چل کر بیان کرونگا، نیرکس کا اختیار کردہ آبی راستہ جزیرہ کے بائیں سمت میں تھا۔ جبکہ سکندر نے دائیں ہاتھ والا راستہ اختیار کیا تھا۔ جو مغرب یا جنوب مغرب کی طرف جاتا تھا۔

اِس سفر کا جو حال آریان کے الفاظ میں موجود ہے پہلے اُس کا جائزہ لیں۔ بیڑے

نے اڈہ چھوڑنے کے بعد تین مختصر مرحلوں میں سمندر تک رسائی حاصل کی۔ دوسرے مرحلہ میں جو نقطہ آغاز سے صرف پندرہ میل کے فاصلہ پر تھا۔ اِن لوگوں نے سمندر کے ''مد'' کو دیکھا دریا کا پانی ''جُزر'' کے بعد کھارا تھا۔ یہ جگہ سمندر سے کُل تین یا چار میل دور بتلائی گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جوار بھاٹا کا اثر اِس فاصلہ سے بھی زیادہ دور اندر تک رہا ہوگا۔ حالانکہ دریا میں اگر پانی کے اخراج کی مقدار کثیر تھی۔ تو بالائی سطح کے پانی کو پھر بھی میٹھا ہونا چاہئے تھا۔ وہ تین مقامات جہاں بیڑے کو رُکنا پڑا یہ تھے، اسٹورا (Stoerra)، کومارا (Kaumara) اور کوریس ٹس (Koreestis)۔ اِن مقامات کی نشاندہی موجودہ زمانہ میں کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

نقطہ آغاز سے پہلے دن کی مسافت کے دوران نیرکس نے ایک بڑی نہر کا ذکر کیا ہے جہاں سمندر کے پانی کی چڑھائی کا اثر محسوس کیا گیا۔ وہ خود یا اُس کا ایڈیٹر آریان ایک لفظ استعمال کرتا ہے جس کا مطلب کھُدائی ہوسکتا ہے۔۸ے ممکن ہے ڈیلٹا کے آبی راستوں کی واضح شکل سے اِن لوگوں کو نہر کا دھوکہ ہو گیا ہو۔

جبکہ حقیقت یہ نہیں، وہ ڈیلٹا کے قدرتی نشیب، نالیاں اور شاخین تھیں، آج بھی سندھ کے ڈیلٹائی علاقہ میں انسان کی تعمیر کی ہوئی نہریں نہیں ہیں نہ یہ امکان ہے کہ ماضی میں کبھی ایسی نہریں یا نالیاں ہوں گی۔ کیونکہ سالانہ سیلاب کا پانی تمام علاقہ کو مکمل طور پر ڈھک لیتا ہے، لیکن آبی راستے متعدد ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اِن میں سے جو بہترین علاقہ تھا وہ نیرکس کی نظر سے نہیں گذرا کیونکہ جس راستہ کو اُس نے اختیار کیا وہ ابتداء میں ہی مٹی کے پشتہ سے بند تھا جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ روانگی کے مقام سے کھُلے سمندر کا کُل فاصلہ اٹھارہ میل ہے۔

کھُلے سمندر میں بھی پہلے دن کا سفر "یعنی سمندر میں داخلہ اور پھر دائیں ہاتھ مکمل گھومنا''۹ے" تقریباً ایکسو پچاس اسٹیڈس بیان کیا گیا ہے گویا ساڑھے سترہ میل جس کے بعد وہ ایک ریتیلے جزیرہ پر لنگر انداز ہوئے جو کروکالا (Karokala) کے نام سے مذکور

ہے۔ اٹھارویں صدی میں جن لوگوں نے آریان کے بیانات پر تبصرے کئے ہیں اُنہوں نے اِس نام کو ڈیلٹا کے مغربی ضلع کے نام سے مشابہ پا کر بہت اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ لیکن نام کی یکسانیت شاید اتفاقیہ ہے۔

سفر کا آئندہ مرحلہ البتہ ایسا ثابت ہوا جس سے گردنواح کے علاقہ کے بارے میں ایسی جغرافیائی معلومات حاصل ہوتی ہیں جن کی نشاندہی اور تعین کا امکان ہے۔ اِس کے بعد وہ روانہ ہوئے اِس طرح سے کہ وہ بلندیاں جنھیں اُنھوں نے ایروس (Eeros) کے نام سے بیان کیا ہے ان کے دائیں ہاتھ پر تھیں، اور بائیں ہاتھ پر ایک جزیرہ تھا جس کی زمین سمندر کی سطح کے برابر تھی۔ یہ جزیرہ چونکہ ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ اِس لئے ایک تنگ خلیج پیدا ہوگئی تھی۔ اِس خلیج سے گذرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ ٹھہرے جہاں جہاز حفاظت کے ساتھ لنگر انداز ہوسکتے تھے۔ نیرکس کو یہ بندرگاہ اتنا وسیع اور عمدہ معلوم ہوا کہ اُس نے اِس بندرگاہ کو سکندر کا نام دیا۔ اِس بندرگاہ کے بالکل سامنے تقریباً دو اسٹیڈس کے فاصلہ پر ایک جزیرہ ہے جو بیباکتا (Bibacta) کہلاتا تھا۔ لیکن اِس ضلع کا نام سنگادا (Sangada) ہے، جزیرہ جو سمندر کی طرف واقع ہے بندرگاہ کے قیام کا باعث ہے۔ ۸۰

بندرگاہ سکندر کو عام طور پر کراچی شمار کیا جاتا ہے۔ ایروس کی بلندیاں گِذری (Gizri) اور کلفٹن (Clifton) کی پہاڑی اور جزیرہ جس کی سطح سمندر کی سطح کے برابر تھی وہ کیاڑی (Kiamari) اور بیباکتا موجود منوڑا (Manora) ہے۔ ۸۱ میرے خیال میں یہ تعین قطعاً غلط ہے۔ جیسا کہ میں آریان کے بیان سے ثابت کرونگا اور اُن ارضی نشانات کا حوالہ دونگا جو اُس وقت سے آج تک بمشکل کسی تبدیلی سے دوچار ہوئے ہوں گے، نیز جو مختلف فاصلے نیرکس نے بیان کئے ہیں اُن کو بھی ملحوظ رکھونگا۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ۳۲۵ قبل مسیح ساحل سندھ جو دریائی ڈیلٹا کے مغربی حصہ سے ملحق تھا، اُس میں تشکیل ارضی کے اعتبار سے کن مقامات کو "بلندیوں" سے

تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اِس علاقہ کا ارضیائی نقشہ سامنے رکھیں تو ہماری نظر فوراً مکلی پہاڑیوں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ یہ مغربی سندھ کے چٹانی علاقہ سے بالکل الگ اُس کے جنوب میں کافی فاصلہ پر واقع ہیں ۸۲ اور موجودہ ڈیلٹا کے نکتہ آغاز سے ملی ہوئی ہیں۔ سفر کے کسی مرحلہ پر یہ پہاڑیاں ضرور نیرکس اور اُس کے ملاحوں کی نظروں کے سامنے رہی ہوں گی۔

موجودہ زمانہ میں مکلی پہاڑی سلسلہ کے شمالی کنارے کو دریائی مٹی سے بنی ہوئی تین میل چوڑی پٹی اُس چٹانی زمین سے جُدا کرتی ہے جو عام طور پر مغرب کی سمت کراچی اور راس موز (Cape Monze) تک چلی گئی ہے۔ انتہائی مغربی آبی راستہ جس سے دریائے سندھ دریا سمندر تک پہنچتا ہے اِسی خالی جگہ سے گذرا ہے، اور ترتیب کے لحاظ سے دوسرا ایسا مقام ہے جس سے دریا کا پانی گذر کر سمندر تک پہنچتا ہے، وہ مکلی پہاڑیاں یا پیر پٹھو پہاڑیوں کا جنوبی سرا ہے۔ یہ بلندیاں اور اُبھرتی ہوئی نواحی زمین میرے خیال کے مطابق جزیرہ " کلوٹا" کے شمال مغرب میں قریب ہی واقع ہوں گی اور اُس وقت کے ساحل پر سمندر تک اِن کا ایک حصّہ چلا گیا ہوگا، اِس کے سامنے ریت اور کیچڑ کا قدرتی پشتہ بن گیا ہوگا جس کی پوزیشن جوکرو کالا کی بیان کی گئی ہے۔ اِس نظریہ کے مطابق کروکالا جزیرہ کلوٹا کے ساحل کے سامنے جنوب کی طرف واقع ہوگا اور اُس آبی راستہ کے درمیان ہوگا جس سے نیرکس کا بیڑا باہر نکلا اور جن کا جائزہ سکندر بھی لے چکا تھا۔ جس جگہ جہاز لنگر انداز تھے وہاں سے ایک اندازہ قائم کرنے کے بعد نیرکس کا بیڑا دریائے سندھ کے دہانے کو پار کر گیا ہوگا۔ جبکہ سکندر وہاں سے گہرے سمندر میں واقع جزیرے تک گیا تھا جو میرے مفروضہ کے مطابق ابن شاہ تھا۔ لیکن نیرکس کے راستہ سے جوکرو کالا کے مغرب سے گھوم کر جاتا ہے یہ جزیرہ کئی میل بائیں طرف رہا ہوگا۔ چنانچہ نیرکس کے لئے اس جزیرے تک جانے کا کوئی موقع نہیں تھا۔

چنانچہ میرا یہ نظریہ ہے کہ نیرکس اپنے بیڑے کو ایک خاکنائے سے لیکر گذرا جو شمالی

مغربی سمت میں پھیلی ہوئی تھی۔ اِس کے دائیں طرف پیر پٹھو اور مکلی کی پہاڑیوں کا جنوبی رُخ تھا اور بائیں طرف کیچڑ اور ریت کا ایک پُشتہ تھا جو پہاڑیوں کے متوازی پڑا ہوا تھا اور اُس مقام تک پھیلا ہوا تھا جسے موضع گجو (Gujo) کے آس پاس قرار دیا جا سکتا ہے۔ اِس مقام پر شاید دریائے سندھ کی مغربی شاخ سے بہنے والا پانی ایک کھاڑی کی شکل میں جمع تھا جو ایروس کی بلندیوں کے شمال سے آتا تھا۔ اِس طرح درمیانی جگہ ایک وسیع اور محفوظ بندرگاہ بن گیا تھا جس کے دہانہ پر جزیرہ بیبا کتا تھا۔ اور یہ جزیرہ میرے خیال کے مطابق ایک چھوٹی سی چٹانی بلندی تھی جیسا کہ اِس علائقہ میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ اِس جزیرہ کو موجودہ ٹھرڑی گجو کہا جا سکتا ہے۔ یہ تھی بندرگاہ سکندر والی جائے وقوع۔ اِس جگہ جو دریائی مٹی کا میدان ہے وہ سطح سمندر سے برائے نام بلند ہے اور کوئی عجب نہیں کہ یہ گذشتہ بائیس صدیوں کی پیداوار ہو۔

میں اپنے بیان کو اِس مفروضہ پر آگے بڑھاؤں گا کہ بندرگاہ سکندر موضع گجو سے بہت دور واقع نہیں تھا۔ یہاں سے دس میل مغرب تک یعنی گھارو (Gharo) تک وہی سطح دریائی مٹی کا میدان پھیلا ہوا ہے جس پر جگہ جگہ مٹی کے ٹیلے اور ریت کی پہاڑیاں اُبھری ہوئی ہیں جن کی سطح سمندر سے اوسط بلندی بیس فٹ سے زائد نہیں۔ گھارو پہنچنے سے پہلے موجودہ بڑی سڑک شمال کی طرف مُڑ جاتی ہے اور سمندری کھاڑی کو پار کرتی ہے۔ یہ کھاڑی اور کلری (Kalri) نہر انڈس میں ڈیلٹا کی انتہائی مغربی قدیم آبی گذرگاہ کی یادگار ہے، اِس کے نزدیک ہی زمین بلند ہو جاتی ہے جس میں چونے کے پتھر نکلے ہوئے ہیں جو کوہستان کی ابتدائی پہاڑیاں ہیں۔

اِس جگہ سے گھارو کھاڑی کا دایاں کنارہ عام طور پر چٹانی ہے، اِس میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں پتھر یک لخت اُبھر کر بلند ہو گئے ہیں، بائیں کنارے پر دریا کی مٹی کا نشیبی میدان پھیلا ہوا ہے جو جنوب کی سمت میرپور ساکرو سے گذر کر ریتیلے پشتوں کی کثیر تعداد میں گم ہو جاتا ہے اور ایسے نشیب اور کیچڑ میں تبدیل ہو جاتا ہے جو سمندر کے چڑھتے ہوئے

پانی کی زد میں رہتا ہے۔

ڈیلٹا کا یہ مغربی حصہ ریورٹی کے خیال کے مطابق زمانہ قریب میں ہی وجود میں آیا ہے اور یہ بات بھی تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ گھارو سے تیس میل دور ابراہیم حیدری تک، گھارو، کدرو کھاڑی (Khadro Greeks) کی دائیں سمت جو اونچا پشتہ ہے وہ نیرکس کے زمانہ کے ساحل سمندر سے مشابہ ہے، ٹھٹھو اور گھارو کے درمیان شاید اُس میدان کے ایک حصہ میں سمندر موجود تھا جو اِن دونوں مقامات کو ملانے والی سڑک کے شمال میں واقع ہے اور جنوب مغرب میں کھلا سمندر ہوگا۔

اِس طرح تقریباً پچاس میل تک ساحل کا رُخ مشرق سے جنوب کی سمت ہوگا چنانچہ بندرگاہ سکندر میں نیرکس کے بیڑے کا قیام اس وقت تک رہا ہوگا جب تک جنوبی مغربی مان سون چلتی رہی۔ یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے۔

بندرگاہ سکندر سے روانہ ہونے کے بعد پہلا مرحلہ بہت مختصر تھا۔ یعنی ساٹھ اسٹیڈس۔ گویا دریائی بیڑا گھارو سے تین میل پہلے کسی مقام پر ٹھہرا ہوگا، یہاں ریتیلا ساحل تھا، اور قریب ہی ایک غیر آباد جزیرہ تھا جو دومائی (Domai) کہلاتا ہے، یہ جزیرہ چڑھتے ہوئے پانی کے لئے بلاشبہ ایک رکاوٹ بن کر بیڑے کے لئے بہت مفید خدمت انجام دے رہا ہوگا (سمندر یقیناً چڑھ رہا ہوگا کیونکہ مان سون اُسی وقت ختم ہوئی تھیں) ساحل پر پانی موجود نہیں تھا۔ لیکن تقریباً بیس اسٹیڈس خشکی کے اندر چل کر کچھ پانی اُنھیں دستیاب ہوا، علاقہ کی موجودہ حالت سے یہ بات مطابقت رکھتی ہے۔ تین سو اسٹیڈس کا فاصلہ طے کرنے کے بعد سارنگا (Saranga) کے مقام پر بیڑے کے سفر کا دوسرا مرحلہ ختم ہوا۔ ساحل کے قریب جہاز لنگر انداز ہوئے اور پانی حاصل کرنے کے لئے اُنھیں آٹھ اسٹیڈس خشکی میں اندر جانا پڑا۔ اِس کے بعد وہ سکالا (Sakala) نامی غیر آباد مقام پر پہنچے، جس کا احوال اِن الفاظ میں تحریر ہے۔ بیڑے کو دو چٹانوں کے درمیان سے گذرنا پڑا جو ایک دوسرے سے اِس قدر قریب تھیں کہ جہازوں کے چپو اُنھیں چھو رہے تھے۔ تین سو اسٹیڈس کی مسافت

کے بعد جہاز مورنتوبارا مقام پر لنگر انداز ہوئے۔

میرے خیال کے مطابق سارنگا اور سکالا علیٰ الترتیب واٹے جی (Wale ji) اور ابراہیم حیدری ہو سکتے ہیں۔ موخرالذکر مقام اِس ویران چٹانی ساحل کے آخری سرے پر واقع ہے اور موجودہ کھاڑی وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہاں ملیرندی کی پیدا کردہ گذری کھاڑی بھی اُس سے مل جاتی ہے۔ مورونتوبارالازماً کراچی (Karachi) کا بندرگاہ ہوگا۔

جوراستہ مندرجہ بالا سطور میں مذکور کیا گیا ہے اُس کے مطابق گجو سے کراچی بندر تک پچاس میل سے کچھ زیادہ فاصلہ ہوتا ہے۔ اِس میں ساحل کے قدرتی موڑ اور پھیر کا خیال کرتے ہوئے کچھ اضافہ کر لیجئے۔ نیرکس نے بندرگاہ سکندر سے مورونتوبارا تک چھ سو ساٹھ اسٹیڈس کا فاصلہ بیان کیا ہے یعنی تقریباً تہتر میل۔ یہ فاصلہ بیڑے نے تین مرحلوں میں طے کیا۔ فاصلہ کا یہ اندازہ جو تقریباً ۳۸ فیصد زیادتی کی طرف ہے ایک انوکھی بات شمار نہ کیا جانا چاہئے۔ حالات ہی ایسے تھے۔ کچھ مقامات جن کی نشان دہی ہم اعتماد کے ساتھ کر سکتے ہیں اُن کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بیڑے کو متعدد چکّر کاٹنے پڑے ہوں گے۔

ہنری کیپرٹ (Henry Kiepert) نے ایک صدی قبل پہلی بار مورونتوبارا کو کراچی کی شکل میں شناخت کیا۔ موصوف ایک جغرافیہ دان اور قدیم ہندوستان کے لئے نقشہ نویس تھا۔ میں بھی اِس سے متفق ہوں اور میرے دلائل درج ذیل ہیں۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بائیس سو سال پہلے کا ساحل موجودہ ساحل سے کسی حد تک مشابہ یا مختلف تھا۔ ہمیں چٹانی بلندیوں پر توجہ مرکوز کرنی ہوگی۔ جو آتش فشاں نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً ایک جیسی حالت میں برقرار رہی ہوں گی۔ حالانکہ اُن کی نسبت سے سطح سمندر میں تغیر واقع ہوا ہوگا۔

آریان کہتا ہے کہ مورونتوبارا میں لنگر انداز ہونے سے ذرا پہلے جہاز دو چٹانوں

کے درمیان سے گذرے، جو ایک دوسرے سے اتنی قریب تھیں کہ جہازوں کے چپو اُنھیں چھو رہے تھے، اور جب جہاز اِن کے درمیان سے گذر رہے تھے تو اُنھیں بڑی بڑی لہروں کا سامنا کرنا پڑا اور پانی کا بہاؤ بھی بہت تیز تھا۔ اِن وجوہات کی بدولت چٹانوں سے گذر کر آگے بڑھنا ایک اہم مہم معلوم ہوتی تھی۔

اب ایک بحری بیڑی کے لئے اُس ساحل سمندر سے گذرنا جو ابراہیم حیدری سے گذری اور آگے تک پھیلا ہوا ہو، دو ایسی مستقل نشانیاں جن کا ذکر مندرجہ بالا سطور میں کیا گیا، موجودہ اویسٹر چٹانوں (Oyster Rocks) کی شکل میں عین راستہ کے درمیان واقع ہوں گی۔ ان میں سے ایک کی چوٹی پھیلی ہوئی اور چپٹی ہے، جو تقریباً دو یا تین ایکٹر رقبہ رکھتی ہے اِس کے چاروں طرف سمندر کی تہ سے نکلی ہوئی چٹانیں ہیں جو پچاس فٹ بلند ہیں، دوسرا جزیرہ اہرام کی شکل کا ہے اور پہلے سے بھی زیادہ اونچا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسے چٹانی سلسلہ کے باقیات ہیں جو کسی زمانہ میں کلفٹن کو منوڑا سے ملاتا تھا اور پانی کے کٹاؤ سے دو جُدا جُدا جزیروں کی شکل میں باقی رہ گیا۔۸۴ ۱۸۳۲ء میں لفٹینٹ یو۔ کارلیس (Lt.U.Carless) نے کراچی بندر کا سروے کیا تھا۔ اُس وقت سے طبعی حالت میں برائے نام تبدیلی ہوئی ہوگی۔ لیکن یہ چٹانیں چونکہ ریت کے پتھر سے بنی ہیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ دونوں جزیروں کا درمیانی فاصلہ سکندر کے زمانہ کی نسبت کچھ زیادہ یعنی کشادہ ہو گیا ہوگا۔

دن بھر کی مسافت کے بعد جو اندازے کے مطابق پینتیس میل تھی، یونانی لنگر انداز ہونے کے لئے مناسب مقام کی تلاش میں تھے۔ فطری طور پر وہ منوڑا کی محفوظ جگہ میں پہنچنے کی تمنا رکھتے ہوں گے، چنانچہ وہ سیدھے جزیروں کے درمیان تنگ نائے سے آگے بڑھ گئے۔ شاید اِس موقع کے ساتھ کہ اِس تنگ راستہ سے نکلتے ہی اُنھیں لنگر انداز ہونے کی جگہ مل جائے گی۔ مغرب کی سمت باہر نکلنے کے بعد اُنھیں سمندر کے چڑھتے ہوئے پانی کا زور محسوس ہوا جبکہ حد نظر تک پانی کا ٹکڑا پھیلا ہوا نظر آیا۔ نیرکس اِس کے متعلق لکھتا ہے۔

"بندرگاہ وسیع تھا، دائرہ نما، گہرا اور سمندری لہروں سے محفوظ اور اِس میں داخلہ کا راستہ تنگ تھا" اگر مشرق کی طرف سے آئیں تو یہ بیان کراچی بندرگاہ کی موجودہ حالت سے مطابقت رکھتا ہے، بیان کا اگلہ حصہ اِس مطابقت کو اور بھی واضح کر دیتا ہے، آریان کہتا ہے "دوسرے دن جہاز روانہ ہوئے۔ ایک جزیرہ اُن کے بائیں ہاتھ پر سمندر کی سمت تھا اور ساحل سے اِس قدر نزدیک کہ جزیرے اور ساحل کے درمیان سمندر کا پانی ایک نہر کی شکل میں بہتا تھا۔ یہ آبی گذرگاہ ستر (۷۰) اسٹیڈس کے قریب طویل تھی۔ ساحل پر بہت سے یہ سایہ دار درخت تھے۔ اور جزیرہ مختلف قسم کی جھاڑیوں اور نباتات سے ڈھکا ہوا تھا۔ صبح کی سفیدی پھیلنے سے کچھ دیر بعد اُنھوں نے جزیرہ عبور کرلیا اور تنگ نائے سے گذر گئے وہ لوگ سمندر کے اُترتے ہوئے پانی میں جہازوں کو بڑھا رہے تھے۔

اِس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نیرکس کا بیڑا 'موروں توبارا' میں جس راستہ سے داخل ہوا تھا اُسی راستہ سے باہر نہیں نکلا، بلکہ بندرگاہ میں وہ آگے بڑھتا رہا جہاں اُسے دوسرا راستہ نظر آیا۔ اِس کے متعلق جو تفصیلات موجود ہیں وہ معمولی ردوبدل کے بعد بالائی بندرگاہ پر صادق آتی ہیں، جسے کبھی کبھی کراچی کی موجودہ بندرگاہ میں ویسٹ وہارف (West Wharf) بھی کہتے ہیں۔

منوڑا کا چٹانی جزیرہ ایک آٹھ میل لمبے ریت کے پشتہ کے ذریعہ خشکی سے ملا ہوا ہے جس کا رُخ شمال مغربی ہے۔ اِس کے بیچ بیچ میں گھنے درخت اور جھاڑیاں اُگے ہوئے ہیں اور جب سمندر کا پانی اُترتا ہے تو کیچڑ کے اُبھرے ہوئے ٹیلے اور پشتے جگہ جگہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ منوڑا سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر ایک چٹانی جزیرہ شمس پیر واقع ہے جو سطح سمندر سے بیس فٹ سے بھی زیادہ بلند ہے۔ اِس جزیرہ کے چاروں طرف جو ریتیلی زمین ہے اُس کے خشکی کی طرف والے سرے تک بڑی کھاڑی چلی گئی ہے کچھ دور اور آگے چل کر پانی کا ٹکڑا دوسرے جزیرے کے گرد گھومتا ہے۔ اِس جزیرہ کا نام نوانار (Nawanar) ہے۔[۸۵] اور اِس مقام پر اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط تک بندرگاہ کے بالائی حصّہ میں

داخلہ کا ایک اور راستہ تھا۔

یہ صاف ظاہر ہے کہ آٹھ میل لمبا ریت کا ٹکڑا جس کی پشت پر جھاڑیاں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی نشیبی زمین ہو، ساحل سمندر کا ایک مستقل نشان نہیں بن سکتی جیسا کہ منوڑا اور ویسٹر کی چٹانیں ہیں۔ بہرنوع شمس پیر اور نوآنار چٹانیں ہی ہیں۔ گو بہت بلند نہیں اور اُن کی نواحی کھاڑیاں گہری ہیں، جہاں تک نباتاتی پیداوار کا تعلق ہے۔ پلائینی لکھتا ہے کہ نیرکس اور اُس کے افسران نے خاص طور پر سمندری درختوں کا ذکر کیا ہے "جن کی پتیاں پانی کے اندر ہری رہتی ہیں لیکن جیسے ہی اُنھیں باہر نکالا جائے بہت جلد خشک ہو کر نمک بن جاتی ہیں۔۸۶ صاف ظاہر ہے کہ یہ درخت تمر کا ہے جو اُن لوگوں نے پہلے پہل ڈیلٹا کی کھاڑیوں میں دیکھا ہوگا۔ موروں تو بارا کی بندرگاہ سے باہر نکلتے ہی، جو "بہت سی گھنی پتیوں والے درخت" اُنھوں نے بیان کئے ہیں وہ اِس درخت کے علاوہ کچھ اور نہیں ہو سکتے حالانکہ شمس پیر پر آج بھی لئی (Lai) کھجور وغیرہ کے درخت دیکھے جا سکتے ہیں۔

نیرکس کے بیان سے موجودہ منظر کی مطابقت اتنی واضح ہے کہ مقام کی شناخت پر بس یہی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بیان کردہ نشانات اتنے طویل زمانہ تک تغیر و تبدل کے بغیر باقی نہیں رہ سکتے۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جا رہی ہے کہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی بلکہ جو بات واضح کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ چٹانی مقامات کی نشانیوں کے درمیان جو مستقل ہیں قدرتی عوامل ایسے تغیرات پیدا کرتے رہیں گے جو ایک مدت کے بعد خود کو دہراتے رہیں گے، جو عوامل یہاں کارفرما ہیں اُن میں کم از کم مٹی بہانے والے دریا کی تعمیری قوت شامل نہیں ہے۔

اتفاق یہ ہے کہ نیرکس کے سفر کا دوسرا قیام جس مقام پر ہوا اُسے ہم شناخت کر سکتے ہیں۔ اگر اِس مقام سے موروں تو بارا کی بندرگاہ تک واپس سفر کیا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ یہ کراچی کی بندرگاہ ہی ہو سکتی ہے، نیرکس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ موروں تو بارا کی بندرگاہ مقامی زبان میں "مائی کی جیٹی" کہلاتا تھا۔ کیونکہ پہلے یہاں ایک عورت کی

حکومت تھی "اِس نام کے ضمن میں ٹالیمی نے ہراکلیا والا مارشین (Marcian of Heraclea) اور امیانس مارسیلی نس (Ammianus Marcellinus) کو ساحل پر واقع بڑا بندرگاہ لکھا ہے جبکہ نیرکس کی بیان کردہ نالوں کی طویل فہرست کا ذکر نہیں کیا۔

موروں تو بارا بندرگاہ سے باہر نکلتے ہوئے نیرکس کا بیڑا جس ستر (۷۰) اسٹیڈس کے طویل تنگ نہر سے گذرا اُس کے متعلق میں نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ قدیم نوانار کی طرف سے بالائی بندرگاہ میں داخلہ کا دوسرا راستہ تھا۔ یا کراچی بندرگاہ کا غربی حصہ۔ دوسرا مرحلہ ایکسوبیس اسٹیڈس میں طویل تھا جس کے اختتام پر بیڑا دریائے ارابس (Arabus) کے دہانے میں لنگر انداز ہوا۔ یہاں ایک وسیع اور عمدہ بندرگاہ موجود تھا، پانی پینے کے قابل نہیں تھا، کیونکہ جو پانی دریا سے خارج ہورہا تھا اُس میں سمندر کے پانی کی آمیزش تھی، چالیس اسٹیڈس اندر خشکی میں ایک تالاب سے اُنھوں نے پینے کا پانی حاصل کیا" بندرگاہ کے قریب ایک بلند غیر آباد جزیرہ ہے جس کے چاروں طرف مختلف اقسام کی مچھلیاں پکڑی جاسکتی ہیں، اِس مقام تک ارابیتی (Arabiti) قبیلہ کے لوگ آباد تھے، ہندوستان کے انتہائی مغرب میں یہی قوم رہتی تھی۔ اِن سے آگے اورائتی (Oreiti) قوم کا علاقہ تھا۔

یونانیوں کا بیان کردہ دریائے ارابس بلاشبہ دریائے حب (Hab) ہے جو راس مونز (Cape Monze) کے دوسری طرف سمندر میں گرتا ہے۔ اور موجودہ صوبہ سندھ کی سرحد ہے، پانی کی قِلت کے زمانہ میں اِس دریا کا دہانہ آدھا میل چوڑا ہوتا ہے اور یہ چوڑائی ایک میل اوپر تک یکساں ہے۔ میلوں اندر تک جہاں سمندر کے مُد کا اثر بھی نہیں پہنچتا، اِس دریا کا پانی بے حد کھارا ہے اور یہ بات توجہ کے قابل ہے کہ تازہ ترین نقشہ میں میٹھے پانی کا جو نشان ہے وہ جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے مقام سے کم سے کم چار میل کے فاصلہ پر ہے۔

دریا کے دہانہ پر ایک بندرگاہ کھڑک (Kharak Bandar) بندر کے نام سے واقع تھا۔ یہ اٹھارویں صدی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے اِس میں کثیر مٹی اور کیچڑ مٹی جمع

ہو جانے کی وجہ سے اِسے ترک کر دیا گیا۔۹۰

دریا کے دہانہ سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر جزیرہ چرنا (Charna) واقع ہے، جو یک لخت سطح سمندر کی اعلیٰ بلندی سے چھ سو نوفٹ بلند ہے، یہ جزیرہ دریائے ارابس کے دہانہ میں لنگر انداز ہونے کے وقت کا اولین ارضی نشان ہے جو بحری بیڑے کے سامنے آیا اور جسے آریانؔ نے "بلند" کے لفظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔۹۱ اُس نے ایروسؔ کا ذکر کرتے ہوئے یہ لفظ استعمال نہیں کیا اور نہ ان چٹانوں کے لئے جو موروؔن تو بارا کے سامنے واقع تھیں۔ لہٰذا ہمیں کسی غیر معمولی بلندی کو تلاش کرنا ہوگا اور پورے ساحل پر کسی جگہ بھی دریا کے دہانہ کے قریب اِس مقام کے علاوہ ایسی بلندی نہیں ملیگی۔

یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ جب نیرکسؔ نے راسؔ مونز کا چکر کاٹا تو ایسے واضح ارضی نشان کا اُس نے کوئی ذکر نہیں کیا اور نہ ساحل کے بدلے ہوئے رُخ کے متعلق کچھ تحریر کیا جو راس سے گذرنے کے بعد مغرب سے شمال سمت اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن ہمیں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو بیان ہمارے پاس موجود ہے وہ آریانؔ کے الفاظ میں ہے گویا نیرکسؔ کی ترجمانی کرتا ہے لیکن اُس کے روزنامچے میں کیا درج ہوگا یہ ہمیں معلوم نہیں ہے۔

موروؔن تو بارا کے باہر سے ارابسؔ کے دہانہ میں لنگر انداز ہونے کے مقام تک کا فاصلہ ایکسو بیس اسٹیڈس بیان کیا گیا ہے یا تقریباً چودہ میل۔ ایک راستہ جونوا تارؔ کے پُرانے راستہ سے راسؔ مونز کے گرد ہوتا ہوا حب دریا کے دہانہ تک پہنچتا ہو تقریباً بیس میل ہوگا۔ چنانچہ جو شناخت میں پیش کر رہا ہوں اُس کے مطابق یہاں ہم نیرکسؔ کے اندازے کی غلطی کی ایک ایسی مثال پاتے ہیں جو دوسری جگہ نہیں ملتی۔

ساحل سمندر پر پگالہ (Pagala) جزیرہ (Beach) جہازوں کے لنگر انداز ہونے کے لئے مناسب شمار کیا گیا، بحری بیڑے کو دریائے ارابس کے دہانہ سے دوسو اسٹیڈس کا فاصلہ طے کرنا پڑا۔ یہاں کچھ آدمیوں کو پانی لینے خشکی پر بھیجا گیا۔ دوسرے دن سمندر کی طرف سے سخت ہوائیں چلنے لگیں۔

دو جنگی جہاز اور ایک ہلکا جہاز ہواؤں کی وجہ سے سمندر میں گم ہو گئے لیکن جہازوں کا عملہ تیر کر کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا کیونکہ وہ لوگ ساحل کے نزدیک ہی سفر کر رہے تھے، دن بھر کے سفر میں بیڑے نے چار سو اسٹیڈس کا فاصلہ طے کیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ شدید لہریں ساحل سے ٹکرا رہی ہیں اِس لئے وہ گہرے سمندر میں ہی لنگر انداز ہو گئے، اِس جگہ کا نام اُن لوگوں نے کابانا (Kabana) بیان کیا ہے۔ وہ یہاں سے نصف شب کے قریب ہی روانہ ہو گئے اور دو سو اسٹیڈس کے فاصلہ پر کوکالا پہنچے۔

مندرجہ بالا تینوں مرحلوں کا مجموعی فاصلہ آٹھ سو اسٹیڈس یا تقریباً چورانوے میل ہوتا ہے، یہ فاصلہ دریائے حب کے دہانہ سے سون میانی (Son Miani) تک کے فاصلہ سے دوگنا ہے۔ سون میانی ہمارے لئے دوسری ایسی جگہ ہے جن کا جائزہ لیکر یونانیوں کے سفر اور قیام کے مقامات تعین کرنے کی ہم کوشش کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ارضی نشانیوں کے اعتبار سے یہ جگہ ایسی پائیدار نشانیاں فراہم نہیں کرتی جیسی اِس سے قبل دریائے حب کے دہانہ پر ہم دیکھ چکے ہیں۔

دریائے حب کے اخراج سے بیس میل شمال تک ساحل سمندر چٹانی ہے جس کی پشت پر پہاڑیاں موجود ہیں اور تقریباً نصف فاصلہ پر ایک چھوٹا جزیرہ کائیو (Kaio) سطح سمندر سے ایک تیئس فٹ اُبھرا ہوا ہے۔ یہ جزیرہ ساحل سے تقریباً سوا میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے اِسے ایک غیر اہم ارضی نشان سمجھ کر نیرکس یا اُس کے ایڈیٹر آریان نے نظر انداز کر دیا ہے۔

پگالہ (Pagala) اور کابانا (Kabana) کے درمیان جو حادثہ پیش آیا وہ اِس غلط فہمی کی بنا پر کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مان سون ہوائیں اب شدت اختیار نہیں کریں گی۔ اور ساحل اِن ہواؤں کی زد سے محفوظ ہے چنانچہ وہ ساحل سے بہت نزدیک ہو گئے۔ اِس سے ہمارے اِس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ اُس وقت وہ لوگ جس ساحل سے گذر رہے تھے۔ اُس کا رُخ شمالی یا شمالی مغربی تھا جیسا کہ مذکورہ ساحل کا ہے۔

موجودہ ارضی سطحیات کے مطابق دوسرے مرحلہ میں کوکالا (Kokala) تک تئیس میل کا سفر خلیج سون میانی کے وسط میں پورا ہو جاتا ہے گویا بحری بیڑا میانی ہور (Miani Hor) کے گہرے پانی میں ہوگا، دونوں میں کوئی صورت ممکن نہیں۔ بیان میں ایک ویران اور خالی ساحل کا ذکر ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ کوکالا کے مقام پر جہاز سمندر میں لنگر انداز ہوئے جس کے معنی ہیں کہ یہ صرف عارضی قیام کا ایک مقام تھا۔ بندرگاہ جیسی کوئی بات اِس میں نہیں تھی۔ اب میانی ہور کو لیجئے۔ یہ مقام غیر معروف ہے۔ لیکن اِس ساحل کے دونوں طرف کافی فاصلہ تک ایسا وسیع قدرتی بندرگاہ مقامی کشتیوں کے لئے نظر نہیں آئیگا۔ اِس میں داخلے کا راستہ دو میل چوڑا ہے جس کے سامنے ریت کا ایک پشتہ حائل ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی یہ چوڑا ہو گیا ہے اور گھوم کر تیس میل تک کھلے سمندر کے متوازی چلا گیا ہے۔ ایک ریتیلا جزیرہ نما دونوں کے درمیان حائل ہے جس کی وجہ سے یہ سمندر سے محفوظ ہے۔ یہ جزیرہ نما ایک سے پانچ میل تک چوڑا ہے اور برار (Birar) کے نام سے مشہور ہے۔ اگر یہ منظر کسی صورت میں بھی نیرکس کے وقت میں موجود ہوتا تو آریان کے بیان میں اِسے ضرور جگہ ملتی۔ ۹۲

یہاں کی تمام زمین پانی کی پھلائی ہوئی مٹی سے بنی ہے۔ اور جزیرہ نما برار (Birar) میں ریت کے تودوں کے سوا کوئی ٹھوس چیز دیکھنے میں نہیں آتی۔ حالانکہ ایک جگہ تو یہ سطح سمندر سے پینتیس فٹ بلند ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ زمانہ قریب کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں۔ ہور سے شمال میں زمین کئی میل تک ریت کی پہاڑیوں کے جھنڈ سے ڈھکی ہوئی ہے جو شاید قدیم زمانہ کے ساحل سمندر کی نشاندہی کرتی ہے۔ اِس کے پیچھے تمام زمین نشیبی ہے شمال میں کافی دور لیاری (Liari) کے قریب بھی ہم دیکھتے ہیں کہ زمین سطح سمندر سے صرف اٹھائیس فٹ بلند ہے۔ ۹۳ ایک ماہر ارضیات کی درجہ بندی کے اعتبار سے اِس زمین کو "بہت نئی" کہا جائے۔ لیکن زمانہ تاریخ سے تعلق رکھنے والے جغرافیہ پر اِس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گڈانی (Gadani) کے نزدیک موجودہ ساحل سمندر کے شمال میں جو

چٹانیں الگ کھڑی ہوئی نظر آتی ہیں وہ قدیم ساحل سمندر شمار کی جاتی ہیں۔۹۴

واریڈن برگ (Vredenburg) نے اِنھیں ارضی تشکیل کے جس زمانہ سے منسوب کیا ہے وہ ارضیات کی رو سے بہت قدیم نہ سہی پھر بھی آج سے لاکھوں سال پہلے کا زمانہ ہے۔ لیکن میرے خیال کے مطابق جزیرہ نما برار (Birar) تاریخی اعتبار سے بھی زمانہ قریب کی تخلیق ہے۔ اور میں یہ کہونگا کہ ۳۲۵ قبل مسیح کا ساحل سمندر میانی ہور (Miani Hor) کے شمالی سرے پر تھا، اِس علاقہ میں کسی جگہ کوکالا (Kokala) واقع ہوگا، ممکن ہے کہ یہ گاگو (Gagu) سے تھوڑا مغرب میں واقع ہو جس کے متعلق لسبیلہ گزیٹیر یہ کہتا ہے کہ دریائے ہور (Hor) کنارے ایک قدیم بستی کے آثار پائے جاتے ہیں۔۹۵

اِس صورت میں بھی، دہانہ ارابس سے کوکالا تک آریان کے بیان کردہ تین سفری مرحلے، یعنی مجموعی آٹھ سو اسٹیڈس، اُس صحیح فاصلہ سے جو دہانہ حب سے مندرجہ بالا مقام تک ساٹھ میل ہوتا ہے۔ تقریباً ایک تہائی کے بقدر زیادہ ہے۔

اوراتی (oreiti) قبیلہ کے درالخلافہ سے کوکالا بہت دور نہیں تھا۔ اور یہ دارالخلافہ شاید لسبیلہ (Lasbela) ہی تھا یا اِس سے ملا ہوا کوئی مقام جہاں سکندر اعظم نے لیوناٹس (Leonnatus) کی سرکردگی میں ایک فوجی چھاونی قائم کی تھی۔ یقینی طور پر کوکالا خلیج سون میانی کے ساحل کے نقطہ مرکز پر واقع تھا۔ بہر حال یہ مقام دریائے پھور (Phor) کے ریگستانی بے آب ڈیلٹا جو سمندر اور ہاڑھو (Harho) پہاڑی سلسلہ کے جنوب میں واقع پہاڑوں کے درمیان منعقد ہے۔ آباد نہیں تھا۔ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اُس زمانہ میں یہ مقام ایک بندرگاہ تھا۔۹۶ کیونکہ اِسی مقام پر نیرکس نے اپنے نقصان خوردہ جہازوں کی مرمت کی تھی۔ میرے خیال میں یہ دلیل ناکافی ہے حقیقت یہ ہے کہ رسدگاہ تو لیوناٹس نے سکندر کے حکم کے مطابق قائم کی تھی اور نیرکس نے اپنے بیڑے کے آدمیوں کو یہاں اُتار کر اُن کے لئے خشکی پر ایک کیمپ قائم کر دیا تھا۔

علاوہ ازیں جہازوں کو درست کرنے اور سامان رسد حاصل کرنے کے ساتھ نیرکس نے بیڑے کے لئے لیوناٹس سے تازہ دم آدمیوں کو حاصل کیا اور اُن کے بدلے اُن لوگوں کو چھوڑ دیا جو بحری سفر کی صعوبت سے خستہ اور درماندہ ہو چکے تھے۔ اور پھر روانہ ہو گیا۔ اب ہوائیں تبدیل ہو کر موسم سرما کا رُخ اختیار کر چکی تھیں اور شمال مشرق کی سمت سے چل رہی تھیں۔ اِن ہواؤں کی مدد سے اُنھوں نے باآسانی پانچ سو اسٹیڈس طے کر لئے، اور ایک دریا کے دہانہ پر پہنچے جو سرمائی بارش کی وجہ سے طغیانی پر تھا۔ اِس کا نام ٹومے رس (Tomerus) تھا۔

مشاہدے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میانی ہور کا مغربی سرا سمندر اور پھور (Phor) ڈیلٹا سے ایک خاکنائے کی وجہ سے علیحدہ ہے لیکن ایسے آثار ملتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے زمانہ میں زمین کا یہ تنگ ٹکڑا درمیان میں حائل نہیں تھا۔ چنانچہ ہمارے مفروضہ کے مطابق اگر جزیرہ نما برار، ۳۲۵ قبل مسیح میں موجود نہیں تھا اور کوکالا، ہور کے شمالی ساحل پر یا اُس کے نزدیک آباد تھا، یعنی دہانہ سے تقریباً پچیس میل کے فاصلہ پر یعنی ارابس (دریائے حب) سے پینٹھ میل کے فاصلہ پر تو اُس صورت میں مذکورہ خاکنائے کے اوپر سے اور ساحل کے ساتھ ساتھ دریائے ہنگول (Hingol River) کے دہانہ تک بحری فاصلہ ستاون میل ہو گا ۹۷ جو کوکالا سے ٹومے رس دریا کے دہانے تک کے پانچسو اسٹیڈس کے تقریباً برابر ہے۔

اگلہ مرحلہ اُنھیں ساحل پر ایسے مقام تک لے آیا جس کا نام بغیر تبدیلی کے آج تک معروف ہے۔ یعنی مالنا (Malana) جسے آجکل راس مالن (Cape Malan) کہتے ہیں، یہ ایک ٹھوس زمینی قطع ہے جس میں سطح سمندر سے دو ہزار فٹ بلند پہاڑ ہیں۔ اِس راستہ کا فاصلہ تین سو اسٹیڈس بیان کیا گیا ہے جو پینتیس میل کے برابر ہوتا ہے، خط ساحل راس مالن تک کافی گھوم کھاتا ہے۔ پھر بھی اگر تمام نشانیوں کا خیال رکھا جائے تو جو فاصلہ بیان کیا گیا ہے وہ بحری بیڑے کو راس مالن سے چند میل آگے لے جائیگا، راس مالن کے مغرب

میں جو زمین ہے وہ سات میل کے بعد ایک کھاری جھیل "ہور بٹ (Hor Batt)" کے واقع ہونے سے باقی علائقہ سے کٹ گئی ہے، اِس چھوٹی جھیل میں ایک بڑا نالہ جو پہاڑوں کے درمیان تنگ راستہ سے آتا ہے شامل ہو گیا ہے، یہ وہ امکانی مقام ہے جہاں بیڑا لنگر انداز ہوا ہو گا۔ حالانکہ راس کے مشرق میں واقع خلیج میں بھی ساحل سے ایک میل دور بیڑے کے لنگر انداز ہونے کا امکان ہے۔ ۹۸

آریان کہتا ہے کہ اوراتی علائقہ مالنا (Malana) تک پھیلا ہوا تھا اور اِس مقام پر وہ اپنے بیان میں اُس فاصلہ کا ذکر کرتا ہے جو بیڑے نے اب تک طے کیا تھا۔ سفر جو ارابتی ساحل کے ساتھ طے کیا گیا وہ "تقریباً ایک ہزار اسٹیڈس" لکھا گیا ہے اور یہ مختلف مراحل کے مجموعی فاصلہ سے مطابقت رکھتا ہے حالانکہ کروکالا سے بندرگاہ سکندر تک اور سرنگا سے سکالا تک کے فاصلے مذکور نہیں ہیں۔ نو اسٹیڈس برابر ایک میل کے شمار کرنے سے یہ فاصلہ ایک سو گیارہ میل ہوتا ہے جو دریائے سندھ کے دہانہ نے جہاں سے بیڑا روانہ ہوا، دریائے ارابس کے دہانہ تک جو ارابتی ملک کی سرحد تھی شمار کیا گیا ہے۔

اب یہ سمجھئے کہ کروکالا پیر پٹھو سے چند میل جنوب مشرق میں واقع تھا اور بندرگاہ سکندر موضع گجو کے نزدیک۔ اور آریان کے اعداد و شمار کو تسلیم کرتے ہوئے یعنی پہلے مرحلہ کے سمندری سفر کے سترہ میل (ایک سو پچاس اسٹیڈس) اگر ایک راستہ کی شکل میں نقشہ پر منتقل کئے جائیں تو یہ شکل ہو گی۔ پیر پٹھو کے نزدیک تک سترہ میل۔ وہاں سے گجو تک چوبیس، پھر کراچی بندرگاہ کے زیریں حصہ تک تقریباً پچاس، وہاں سے کھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے نوانار تک آٹھ میل اور نوانار کے پُرانے راستہ سے راس مونز کا چکر کاٹ کر حب دریا کے زمانہ تک بیس میل، گویا مجموعی طور پر ایک سو اُنیس میل۔

اوریتائی قوم کا ساحل سولہ سو اسٹیڈس طویل تھا۔ یہ آریان کا بیان ہے جو ارابس دریا سے مالن تک کے مرحلہ وار فاصلوں کے مطابق ہے۔ اب یہ فرض کرتے ہوئے کہ کوکالا (Kokala) میانی ہور (Miani Hor) کے شمالی مغربی کنارے پر واقع تھا۔ حب

سے وہاں تک کا فاصلہ پینسٹھ میل ہوتا ہے، وہاں سے دریائے ہنگول تک اُس راستہ سے جو میں نے پیش کیا ہے ستاون میل، اِس کے بعد راس مالن کے سرے سے چند میل آگے پچیس میل اور شمار کر لیجیے، کُل مجموعہ ایکسو سینتالیس میل ہوا، آریان کا بیان کردہ مجموعی فاصلہ ایک سو ستتر میل ہوتا ہے۔

یہ مان لیا کہ فاصلہ ناپنے کے عمدہ آلات بھی موجود نہیں تھے اور یونانیوں کو ایسے پانی میں جہاز رانی کا تجربہ بھی نہیں تھا جو مدّ و جزر سے متاثر ہو۔ پھر بھی نیرکس کے بیان کردہ فاصلے اور مقامات مفروضہ میں جو غلطیاں نظر آتی ہیں وہ اُس کے بیان کردہ ساحلی حالات کی صحت کو کم نہیں کرتیں، یہ بھی امکان ہے کہ "اسٹیڈین" جو نیرکس نے استعمال کیا وہ ایک معمولی پیمانہ تھا جو چھ سو چھ انگریزی فٹ کے برابر ہوتا ہے۔

اِس طرح ساحل سندھ کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے بارے میں ہمارے پاس ارضی سطح کا وہ احوال موجود ہے جو ۳۲۵ قبل مسیح میں تھا، اور باقی ملک کے متعلق مبہم عمومی حالات کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ قسمت کے عجائبات میں ہی اِسے شمار کیا جا سکتا ہے کہ وہ جگہ جسے مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا تھا، دو ہزار ایک سو اڑسٹھ سال کے بعد صوبہ سندھ کا دارالخلافہ بننے کے لئے مقدر ہو چکی تھی۔ ۹۹

تشریحات باب ساتواں

1. رگوید سمہیتا۔ آٹھواں اشتکہ۔ تیسرا دھیائے۔ شکتہ ساتواں (دسویں کتاب کا پچھتر واں اشلوک بھی کہا جاتا ہے) ترجمہ ایچ۔ ایچ۔ ولسن۔ جلد ششم۔ صفحہ ۲۰۴۔
2. کیمبرج ہسٹری آف انڈیا۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۷۹-۸۰ نیز میکڈانل اور کیتھ کی "ویدک انڈس آف نیمس اینڈ سبجیکٹس" دوسری صفحہ ۴۳۲۔
3. مہابھارت۔ واناپاروا۔ ترجمہ پی سی رائے۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵۶۲۔
4. "سیکرڈ بکس آف دی بڈھسٹ" جلد سوم "ڈائی لاگس آف دی بدھا" ترجمہ ٹی، ڈبلیو رہائز ڈیوڈز سی۔ اے۔ ایف رہائز ڈیوڈز۔ صفحہ ۲۶۹-۲۷۰۔
5. "جٹاکہ" جلد سوم "ترجمہ ایچ۔ ٹی فرانس اور آر۔ اے۔ نیل صفحہ ۲۸۰۔
6. "وشنوپورن" ترجمہ ایچ۔ ایچ۔ ولسن۔ جلد دوم۔ صفحہ ۱۳۳۔ نیز مہابھارت ترجمہ پی۔ سی۔ رائے۔ جلد چہارم صفحہ ۲۳۔ فٹ نوٹ۔
7. بحوالہ البیرونی ترجمہ۔ ای ساشو۔ جلد اول صفحہ ۲۶۱۔
8. "دی بندا ہش" باب ۲۰۔ روایت ۹ ترجمہ ای۔ ڈبلیو ویلٹ۔ "سیکریڈ بکس آف دی ایسٹ" جلد پنجم صفحہ ۷۷۔
9. اِس کا صحیح محل وقوع یقینی طور پر شناخت نہیں ہو سکا۔ کہا گیا ہے کہ یہ شہر "پختون علاقہ میں تھا"
10. ایم۔ اے۔ ایس۔ آئی نمبر ۳۴ (۱۹۲۸) "اے نیوڈس کریشن آف ڈیریس فروم ہمدان" مصنف پروفیسر ای، ہرزفیلڈ
11. سی۔ ایچ۔ آئی۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۳۲-۳۳۷۔
12. ہیروڈوٹس، چہارم ۴۴۔

13. ایم-اے-ایس-آئی نمبر ۳۴۔صفحہ ۳۔
14. "ارلی ہسٹری آف انڈیا" ۱۹۰۷، زیرادارت ونسنٹ اسمتھ۔صفحہ ۳۴۔۳۵۔
15. "اینشی اینٹ انڈیا ایز ڈس کرائبڈ بائی کیشیا" مصنفہ جے۔ڈبلیو۔میک کرنڈل۔ ٹرب نر۔۱۸۸۲
16. میک کرنڈل مندرجہ بالا۔صفحہ ۶۵۔۹۱۔
17. ایضاً صفحہ ۷۔۱۰۔۵۷۔
18. ایضاً صفحہ ۱۳۔۳۳۔
19. ایضاً صفحہ ۲۳۔۵۴۔
20. ایضاً صفحہ ۱۷۔۲۶۔
21. ایضاً صفحہ ۱۳
22. ایضاً صفحہ ۱۶۔
23. "سینسز آف انڈیا" ۱۹۴۱۔جلد ۱۲۔سندھ۔صفحہ ۳۹۔
24. اسٹرابو نمبر ۱۵۔آئی۔ ۱۷۔ سال ۱۹۱۷ء بھی ویسا ہی تھا۔مطابق "انڈین اینٹی کیوٹی" ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۶۹۔
25. ایضاً صفحہ ۱۸۔
26. ایضاً صفحہ ۱۶۔
27. اِس ضمن میں جو اطلاعات فراہم کی گئیں اُن سے سکندر اعظم متاثر ہوا۔بحوالہ مندرجہ بالا کتاب صفحہ ۲۶۔اور صفحہ ۲۵۔
28. ایضاً صفحہ ۱۸
29. اسٹرابو کا حوالہ نمبر ۱۵۔آئی ۴۵۔
30. آریان "انابسیس" ششم ۴۔۱۴ آرین "انڈیکا" باب اور ۳۔۴۔
31. اسٹرابو۔۱۵۔آئی۔۳۲۔

32. "انابسیس" ششم۔ باب ۱۴۔ میرے خیال کے مطابق دریائے ہافاسس (Hyphasus) سے مُراد بیاس اور ستلج کا متحدہ چشمہ ہے جو آجکل (مقامی طور پر) گھارا (Ghara) کہلاتا ہے۔لیکن بہت سے ماہرین کا خیال ہے کہ اُس زمانہ میں بھی اور اُس کے بعد کافی عرصہ تک ستلج الگ راستہ پر بہتا رہا۔ بحوالہ مذکورہ کتاب، باب ۹، صفحہ ۱۶۳-۱۶۴۔

33. اسٹرابو، ۱۵۔ آئی -۱۹۔

34. "انابسیس" ۱۵، ۱۵۔

35. یہ ممکن ہے کہ مذکورہ تبدیلی کالا باغ اور جہلم کے ساتھ سنگم کے درمیان واقع ہوئی ہو۔ دیکھئے "مہران آف سندھ" صفحہ ۴۷۲۔ نوٹ ۵۴۴۔ سر ڈبلیو ٹارن (Sir W.Tarn) کا خیال ہے (الیگزنڈر دی گریٹ۔ جلد اول صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴) کہ اِس مشرقی بہاؤ نے دریائے سندھ کو ہاکڑا کے آبی راستہ میں لاڈالا۔ اور یہ بہتا ہوا (وادیءنارا سے) رن کچھ میں جاگرا "انابسیس" دیکھئے جلد دوم تتمیہ ۱۴، صفحہ ۲۸۵۔

36. سراوریل اسٹائن "جرنل آف دی رائل جیوگرافیکل سوسائٹی" نومبر دسمبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۹۳۔

37. "انابسیس" جلد ششم ۲۶ نیز "کرٹیس" کتاب ۹۔ باب ۲۔ کہا گیا ہے کہ متوقع دشمنوں کو سکندر نے حقیقت سمجھا۔ البتہ دریاؤں کی خطرناک تیز رفتاری سے متردد تھا، پھر بھی ستلج یا جمنا کا کوئی ذکر نہیں (میک کرنڈل "دی انویژن آف انڈیا" صفحہ ۲۲۲)۔

38. انابسیس ششم ۱۴۔

39. کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ستلج اور بیاس کا اتحاد ویدک زمانہ کی تاریخ کو بڑھا دیتا ہے لیکن یہ یقینی معلوم نہیں ہوتا کہ ایک اشلوک میں جس دریا کو وباس سے ملتے

ہوئے شاعرانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ ستلج ہی ہے۔ جیسا کہ ندی استی (Nadi astiati) ہے، بیاس کو "چھوتودری" (Chhutudari) اور ستلج کو "سوتو دری' بہت فرق ہے، (رگوید زیرا دارت آفریخت جلد دوم صفحہ ۲۴۹۔ اور جلد چہارم صفحہ ۲۳۲) نیز جے۔اے۔ایس بنگال" میں آر، ڈی اولڈہم کا مضمون۔ نیز "اینشی اینٹ انڈیا" (پولیمی) زیرادارت مجمدار، میک کرنڈل کے بعد۔ کلکتہ ۱۹۶۷ء صفحہ ۹۱، ۹۲۔

ٹاڈ کہتا ہے کہ جیسلمیر کی تاریخ میں جو ۱۷۰۲ء پر ختم ہوتی ہے۔ متحدہ چشمہ (گھارا) بیاس کے نام سے مشہور رہا ہے (انالس اینڈ اینٹی کوئٹیز آف راجستھان۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۶۲)۔

40. ای۔ جے چناک (E.J. Chinnock) نے آریان کی "انابسیس" کا ترجمہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اِن دونوں مقامات کے درمیان دریا کی لمبائی ایک سواسٹیڈس ہے یہ بالکل غلط ہے۔ حالانکہ چوڑائی کو مبالغہ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

41. بن بری "ہسٹری آف اینشی اینٹ جیوگرافی" جلد اوّل۔ صفحہ ۴۴۶۔ ۴۴۷۔

42. ارسطوبلس۔ بحوالہ اسٹرابو۔ ۱۵۔ آئی۔ ۱۷ آریان نے جہلم کے بلند کناروں کا ذکر کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ اُس وقت پانی کی سطح کافی گر گئی تھی۔ (انابسیس چہارم۔ ۳)۔

43. ہمیں بتایا گیا ہے کہ اونیسی کریٹس نے اِس علاقہ کا احوال تفصیل سے پیش کیا ہے۔ اِس میں شیشم کے درخت تھے (ارسطوبلس کے مطابق) ایک خودرو جنس جو گندم سے مشابہ تھی۔ اور ایک قسم کے انگور اسٹرابو۔ ۱۰۔ آئی۔ ۲۱۔ ۲۲۔ اونیسی ریٹس جو علاقہ کی تعریف میں رطب اللسان نظر آتا ہے، باقی بیان میں باشندوں کے عادات واطوار اور رسومات کا ذکر کیا ہے۔ (کتاب بحوالہ بالا۔ ۳۴)۔

44. انابسیس ششم، ۱۷۔

45. کوزنس (Cousens) "اینٹی کوئیٹیز آف سندھ "۷۶-۷۹۔ فی الحقیقت الور کے آثاریات کے بارے میں کوئی سنجیدہ تحقیقات نہیں کی گئی۔

46. نارا کو سکھر بیراج سے ملانے والی بڑی نہر کو کھدائی کے بعد مشرق کی طرف الور کے نشیب سے نکالا گیا ہے۔اِس سے قبل اروڑ واہ نامی ایک چھوٹی نہر جو فائف کی بیان کردہ پرانی (۱۸۵۹) نارا سے ملنے والی نہر کی تاریخ کو پیچھے ہٹا دیتی ہے۔مغرب کی سمت جاتی تھی اور اِسی نشیب سے گذرتی تھی۔ (گزیٹیر آف سندھ، صفحہ ۲۷۶)۔

47. انابسیس ششم ۔۱۶۔

48. میگھتینز کا ایک ورق۔پلائنی نے "ہست نات" جلد ششم۔صفحہ ۲۳ پر دیا ہے۔

49. کریٹس کتاب ۹۔باب ۸۔نیز اسٹرابو۔۱۵-آئی ۳۳۔

50. پلائنی-لب ششم-سی ۲۰، صفحہ ۲۳۔

51. پولیمی نے جو اصلاح استعمال کی ہے وہ سندھ کے سیلابی راستوں کی حالت کو بالکل صحیح بیان کرتی ہے۔(پولیمی-زیرادارت میک کرنڈل-صفحہ ۹۴)۔

52. انابسیس-ششم، ۱۷۔

53. ایضاً۔۱۸

54. اسٹرابو ۱۵-آئی-۱۷۔

55. میجر ریورٹی نے "مہران" صفحہ ۲۷۴ پر جو وضاحت پیش کی ہے وہ بحیثیت بیان کے نہیں بلکہ اخذ کردہ مطلب کی حیثیت سے ہے۔نوٹ ۵۴۶ اور صفحہ ۴۶۲۔ نوٹ ۵۳۰۔پٹالہ کے محل وقوع کے متعلق وہ جیمس میک مرڈو کے نظریہ سے متفق ہے ("ڈیز ائیشن آن دی ریور انڈس") جے-آر-اے-ایس- جلد دوم (۱۸۳۴) صفحہ ۳۸، ۳۹) کہ یہ بہمن آباد کے قریب تھا۔میرا خیال ہے کہ یہ

نظریہ کافی حد تک درست ہے لیکن وادی نارا میں سے گذر کر دریائے سندھ بہمن آباد پہنچتا ہوتا یہ طبعی طور پر غلط ہے۔

56. میک مرڈو کے مطابق پران (نارا) کی مغربی شاخ بہمن آباد سے بیس میل مشرق میں دوسری سے الگ ہو جاتی تھی۔ اور خدا آباد (Khudabad) اور ہالا کنڈی (Hala Kandi) کی طرف بہتی تھی۔ (ڈیز پٹشنز۔صفحہ ۲۴۔۲۵) میرے خیال میں یہ غلط ہے۔

57. وہ نقشہ جو "دی بی ہیویر اینڈ کنٹرول آف ریورز اینڈ کینالز" (سر۔سی، انگلش) صفحہ ۱۶۵ پر دیا ہوا ہے۔

58. کریٹس کتاب ۹۔باب ۹۔جو تفصیل آریان نے دی ہے (انا بسیس ششم، ۱۸) اُس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سفر میں کئی دن لگے۔

59. اسٹرابو، ۱۵۔آئی۔۳۳۔

60. انا بسیس ششم۔۱۷۔

61. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۱۸۔حالانکہ جو مقامات مذکور کیے گئے ہیں میں اُن سے متفق نہیں ہوں لیکن دریائے سندھ کے عام رجحان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا وہ درست ہے۔

62. انا بسیس۔ششم ۱۸۔

63. ایضاً۔۱۹۔

64. بلینڈفورڈ "جیولوجی آف ویسٹرن سندھ" صفحہ ۱۶۵۔

65. بدقسمتی سے زمانہ یا اندازے کی رو سے تعین مشکل ہے۔

66. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۲۲۔۲۳۔ڈین ولنسٹ کا بہر حال یہ خیال ہے کہ تین یوم کا سفر ساحلِ کچھ (Kuchh) پر مشرقی سمت میں تھے اور سکندر کا مقصد یہ تھا کہ خلیج فارس سے ہندوستان تک باقاعدہ بحری سفر کا راستہ تیار

کیا جائے۔ بشرطیکہ یہ راستہ محفوظ ہو، لیکن بیان کا عام تاثر یہ ہے کہ تمام تیاریاں نیرکس کے مغربی بحری سفر کے لئے تھیں۔ نیز الیگز نیڈر برنس کی کتاب "اے سپلیمنٹری میموائر آف اے میپ آف دی ایسٹرن برانچ آف دی انڈس "اختتامی نوٹ" پیرا نمبر۴ (بمبئی گورنمنٹ فائل ۶۳ ۷) ونسنٹ کی "دی وائج آف نیرکس وغیرہ" "لندن ۱۷۹۷-صفحہ ۱۵۵-۱۵۶۔

67. اسٹرابو، ۱۵-آئی --۲۰ اور ۲۳۔

68. آریان "انابسیس" ششم ۲۰، اسٹرابو ۱۵، آئی ۳۳۔

69. آریان "انڈیکا" باب ۲۰۔

70. اسٹرابو ۱۵-آئی آئی ۵-اِس قسم کی کوئی بات آریان کی "انڈیکا" میں نہیں ملتی۔

71. پتھون (Peiton) کے تقرر کے متعلق دیکھئے "انابسیس-ششم ۱۶۔

72. نیرکس کے احکامات کے لئے دیکھئے "انابسیس" ہفتم ۲۰۔ "انڈیکا" ۲۰ اور ۳۲۔

73. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۲۹-۳۰ (فٹ نوٹ ۴۴)۔

74. اِس جگہ بھی وہی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ میک کرنڈل (Mc Crindle) زور دے کر یہ بیان کرتا ہے کہ یہ "کلوٹا" جزیرہ ہی تھا جہاں سے نیرکس اپنے یادگار بحری سفر پر روانہ ہوا تھا۔ بحوالہ "اینشی اینٹ انڈیا" صفحہ ۱۶۴ فٹ نوٹ، بیان کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا گیا، یہ کوئی، غیر معمولی بات نہیں۔ پلائنی (نیت ہست) ششم -۲۳ (۹۶) میں کہتا ہے کہ نیرکس ایکسی لائم پولس (Xylime Polis) (جس کا مطلب ہے لکڑی شہر) سے روانہ ہوا۔ "یہ شہر سکندر نے آباد کیا تھا۔ لیکن یہ کس دریا کے نزدیک تھا یا کس مقام پر واقع تھا اِس کی کوئی تفصیل نہیں ملتی" سر ڈبلیو ٹارن کا بیان ہے (بحوالہ مذکورہ بالا کتاب۔ جلد اول، صفحہ ۱۰۶) کہ نیرکس مشرقی شاخ سے دریائے سندھ کے دہانہ تک پہنچا۔ اور وہاں سے روانہ ہوا، لیکن سابقہ تبصرہ نگاروں کو اِس ضمن

میں جو دشواریاں پیش آتی رہی ہیں اُنھیں یہاں نظر انداز کر دیا گیا ہے یعنی نیرکس کے اپنے انداز یا قیاس کے مطابق ڈیلٹا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کا اٹھارہ سو سٹیڈس کا فاصلہ اور اریوس کی بلندیوں کا دوسرے دن ریت کے پشتے سے باہر گذر جانے کے بعد ظاہر ہونا۔

75. نیرکس کہتا ہے (انڈیکا ۲۱) "جیسے ہی سالانہ ہوائیں مدہم ہوتے ہوئے رُک گئیں وہ وہ روانہ ہو گیا" لیکن بعد کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وقتاً فوقتاً مان سون شدید ہوتی رہیں۔

76. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۱۱-۱۲ ایک بار پھر میں یہ کہونگا کہ اِس کا نظریہ درست ہے، حالانکہ گردونواح کے متعلق جو اشارات اُس نے دیئے ہیں نظریہ اُس کے مطابق نہیں۔

77. الیگزینڈر برنس کہتا ہے کہ اُس کے زمانہ میں بھی سندھی اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔ (جرنل فور جنوری۔۲۸-۳۱-۱۸۳۱ مشمولہ بمبئی گورنمنٹ فائل ۷۹۰)

78. یہاں بھی وہی یونانی لفظ مستعمل ہے جو مندرجہ بالا کے لئے استعمال ہوا۔

79. یونانی عبارت۔

80. ہنری پوٹنجر "ٹریولز اِن بلوچستان اینڈ سنڈ" صفحہ ۳۸۵-الیگزینڈر برنس-جرنل فور جنوری ۳۰، ۱۸۳۱، بمبئی گورنمنٹ فائل ۷۹۰۔

81. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۱۲، ۱۳۲۔

82. یعنی ایم-جی-ایس-آئی جلد ۱۷-صفحہ ۲۱۰ کے مقابل نقشہ۔

83. اُس نے لاسن (Lassens) کے نقطۂ نظر کی وضاحت نقشہ سے کی ہے۔

84. "جیولوجی آف ویسٹرن سندھ" صفحہ ۱۸۶ پر بلینڈ فورڈ نے تفصیل دی ہے۔ ایک روایت کے مطابق کراچی بندرگاہ میں داخلہ کا موجودہ راستہ چٹانوں سے رُکا ہوا تھا اور یہ آٹھارویں صدی کے آغاز کی بات ہے (میموائرس آف سیٹھ ناؤمل

ہوت چند) صفحہ ۳۷۔ مگر اے۔ ایف بیلی کی " کراچی۔ پاسٹ۔ پریزنٹ اینڈ فیوچر" بھی دیکھئے (۱۸۹۰) صفحہ ۱۵۔۸۱۔

85. اے۔ ایف۔ بیلی کی " کراچی پاسٹ، پریزنٹ اینڈ فیوچر " کے صفحہ ۵۲-۵۳ کا نقشہ دیکھئے۔

86. پلائنی-۱۳-۲۵۔

87. آریان " انڈیکا" باب ۲۲۔

88. آریان " انڈیکا، دیکھئے پولیمی ششم، ۲۱-۲: امیانس مارسیلنس کی " ہسٹری بک ۲۳"

89. " سروے آف انڈیا" آدھا انچہ برابر ایک میل۔ نمبر ۳۵-ایل-این-ای-دوسرا ایڈیشن۔

90. " میموائرس آف ناؤمل ہوت چند " ایڈیٹر سر ایونز جیمس-ایکزیٹر-1915-صفحہ ۳۶۔

91. یونانی عبارت۔

92. لسبیلہ گزیٹیر۔ صفحہ ۱۰ اور ۱۸۷ پر میانی ہور کا بیان موجود ہے " دی پرشین گلف پائلٹ " (۱۹۴۴) ایڈیشن، صفحہ ۶۹-سر ڈبلیو ٹارن نے ڈیوڈورس کے ایک مبہم پیراگراف پر تکیہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ کوکالا محفوظ بندرگاہ تھا۔ لیکن نیرکس نے جو الفاظ استعمال کئے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ بیڑا ساحل سے فاصلہ پر لنگر انداز ہوا۔ ٹارن " الیگزینڈر دی گریٹ، جلد دوم-صفحہ ۲۵۳، آریان " انڈیکا " باب ۲۳۔

93. " سروے آف انڈیا" چوتھائی انچہ پیمانہ کا نقشہ ۳۵-پی۔

94. بحوالہ " لسبیلہ گزیٹیر " صفحہ ۱۳۔

95. ایضاً-صفحہ ۱۹۸۔

96. ٹارن کی مذکورہ کتاب۔

97. "پرشین گلف پائلٹ" صفحہ ۷۱۔

98. ایضاً۔

99. ڈاکٹر اینول (Dr. Aniville) کا خیال ہے کہ نیرکس کا اسٹیڈ چھوٹا تھا اور ایک میل میں پندرہ اسٹیڈ ہوتے تھے، اِسی خیال کو ڈاکٹر ونسیٹ (Dr. Vincent) نے بھی اپنایا ہے، کسی جگہ بھی "ارسطوئی اسٹیڈ، کا ذکر نہیں جبکہ سب حوالہ جاتی تحریریں قدیم لکھنے والوں کی ہیں، علاوہ ازیں اگر نیرکس کے بیان کردہ فاصلوں کو اِسی حساب سے شمار کیا جائے تو صرف ابتدائی مرحلوں کی حد تک درست معلوم ہوتا ہے جبکہ آخری مرحلوں کے فاصلے اِس حساب سے بہت بڑھ جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ نیرکس نے چپّو چلانے کے وقت سے فاصلہ کا تعین کیا ہوگا، یا پھر ایک مقام سے دوسرے تک نظری اندازہ قائم کیا ہوگا حالانکہ ساحل جگہ جگہ مخنی خط کی شکل میں ہے، مخالف یا موافق ہوائیں، چڑھتا یا اُترتا پانی ایک مرحلہ میں اِس اندازے کو کم اور دوسرے مرحلہ میں زیادہ کرسکتا ہے۔ (بن بری "اینشنی اینٹ جیوگرافی، جلد اوّل، صفحہ ۵۵۴۔۵۵٦)۔

بہرنوع سر ڈبلیو ٹارن نے مقدونی اسٹیڈ کی حمایت میں دلائل پیش کئے ہیں یونانی کے ایتھنز اسٹیڈ کا تین چوتھائی ہوتا ہے، پیائش کی مثال "الیگزنڈر دی گریٹ جلد دوم، صفحہ ١٦٩۔١٧١" پر پیش کی گئی ہے۔

لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے چھوٹے اسٹیڈس سے پیائش کا حساب لگانے سے نیرکس کے بیان کردہ فاصلے مجموعی طور پر مطابقت نہیں رکھتے۔

کرنل ہولڈچ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جس مقام پر بھی پیائش بیان کردہ فاصلہ سے مطابقت نہ رکھتی ہو وہاں ایک مختلف خیالی خط ساحل کو داخل بیان کردیا جائے۔ اِس کے بارے میں کچھ کہنا فضول ہے ("جنرل آف دی سوسائٹی آف آرٹس۔ جلد ۴۹۔ (١٩٠١) صفحہ ۴١٨)

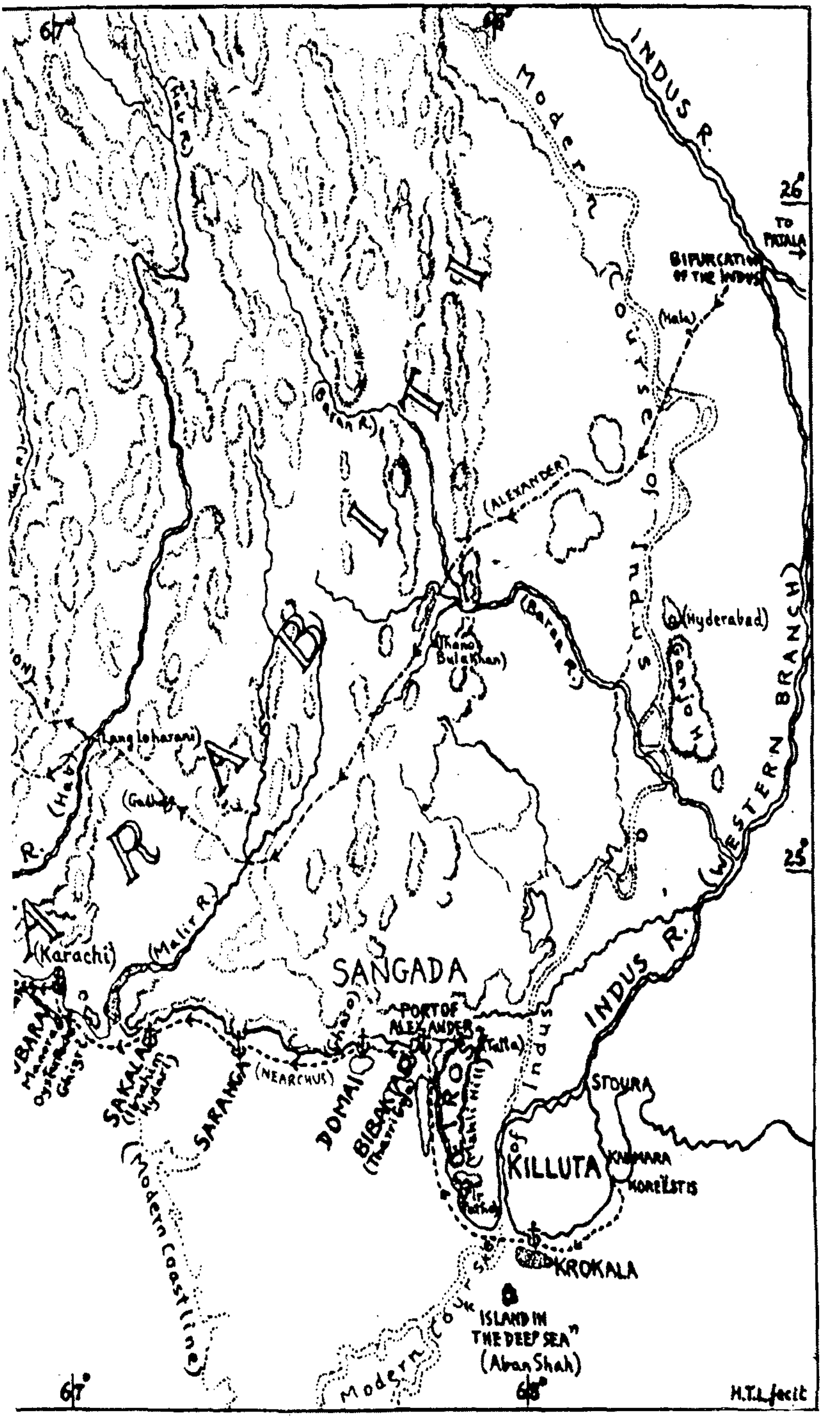

67°
68°
INDUS R.
Modern Course of Indus
26°
TO PATALA →
BIFURCATION OF THE INDUS
(Hala)
(ALEXANDER)
ARABITI
(Baran R.)
(Hyderabad)
(Thano Bula Khan)
(Baran R.)
WESTERN BRANCH
(Langlohorani)
(Hab R.)
(Malir R.)
25°
(Karachi)
SANGADA
INDUS R.
PORT OF ALEXANDER
(NEARCHUS)
DOMAI
BIBAKTA
SAKALA
SARANGA
STOURA
KILLUTA
KOREISTIS
KROKALA
"ISLAND IN THE DEEP SEA"
(Aban Shah)
Modern Coastline
Modern Coast
H.T.L. fecit

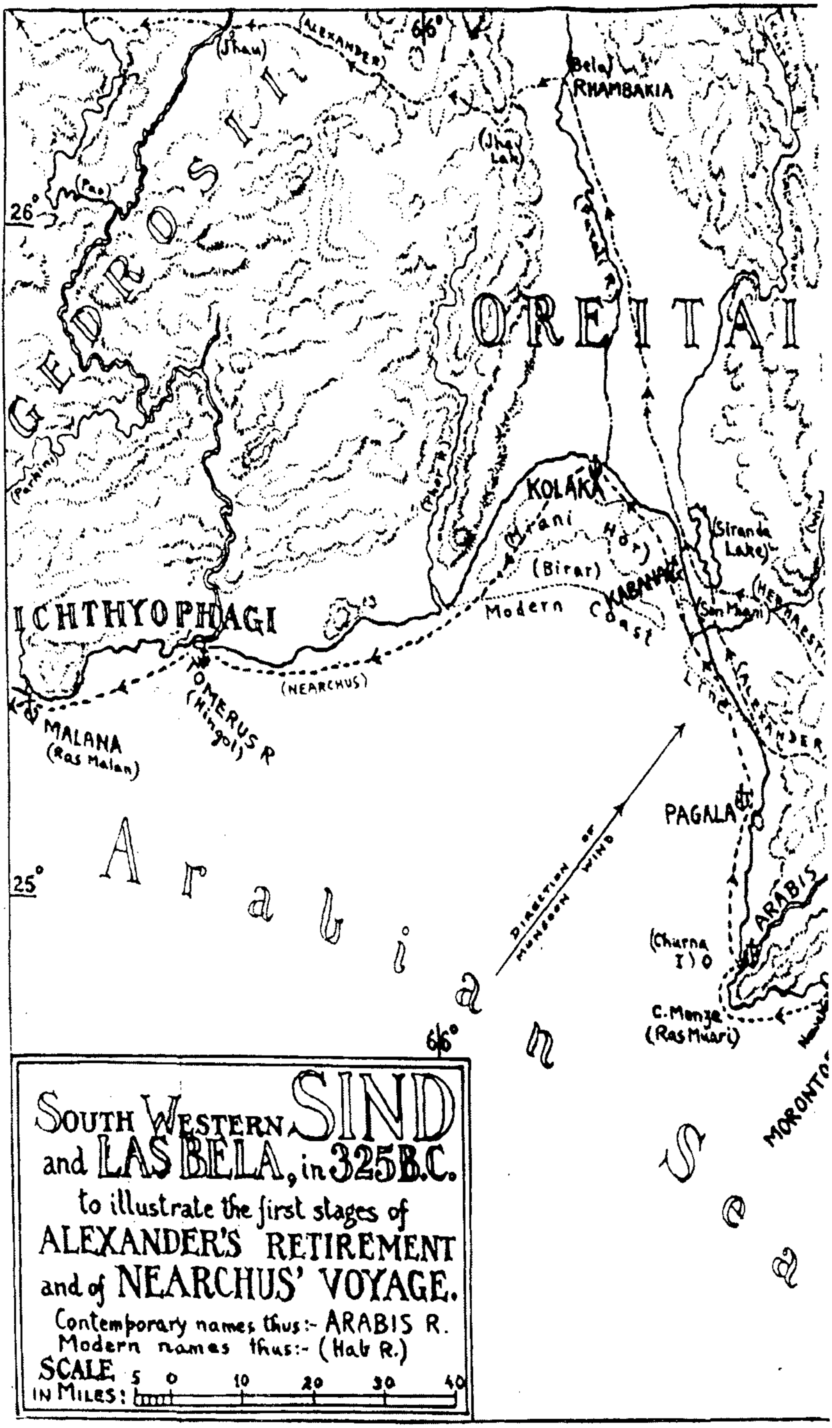

SOUTH WESTERN SIND
and LAS BELA, in 325 B.C.
to illustrate the first stages of
ALEXANDER'S RETIREMENT
and of NEARCHUS' VOYAGE.
Contemporary names thus:- ARABIS R.
Modern names thus:- (Hab R.)
SCALE IN MILES: 5 0 10 20 30 40
GEDROSII
OREITAI
ICHTHYOPHAGI
Arabian Sea
ALEXANDER
RHAMBAKIA
KOLAKA
(Birar)
Modern Coast Line
(NEARCHUS)
TOMERUS R (Hingol)
MALANA (Ras Malan)
PAGALA
ARABIS
(Churna I)
C. Monze (Ras Muari)
MORONTO
HEPHAESTI
(Siranda Lake)
(Son Miani)
DIRECTION OF MONSOON WIND
26°
25°
66°

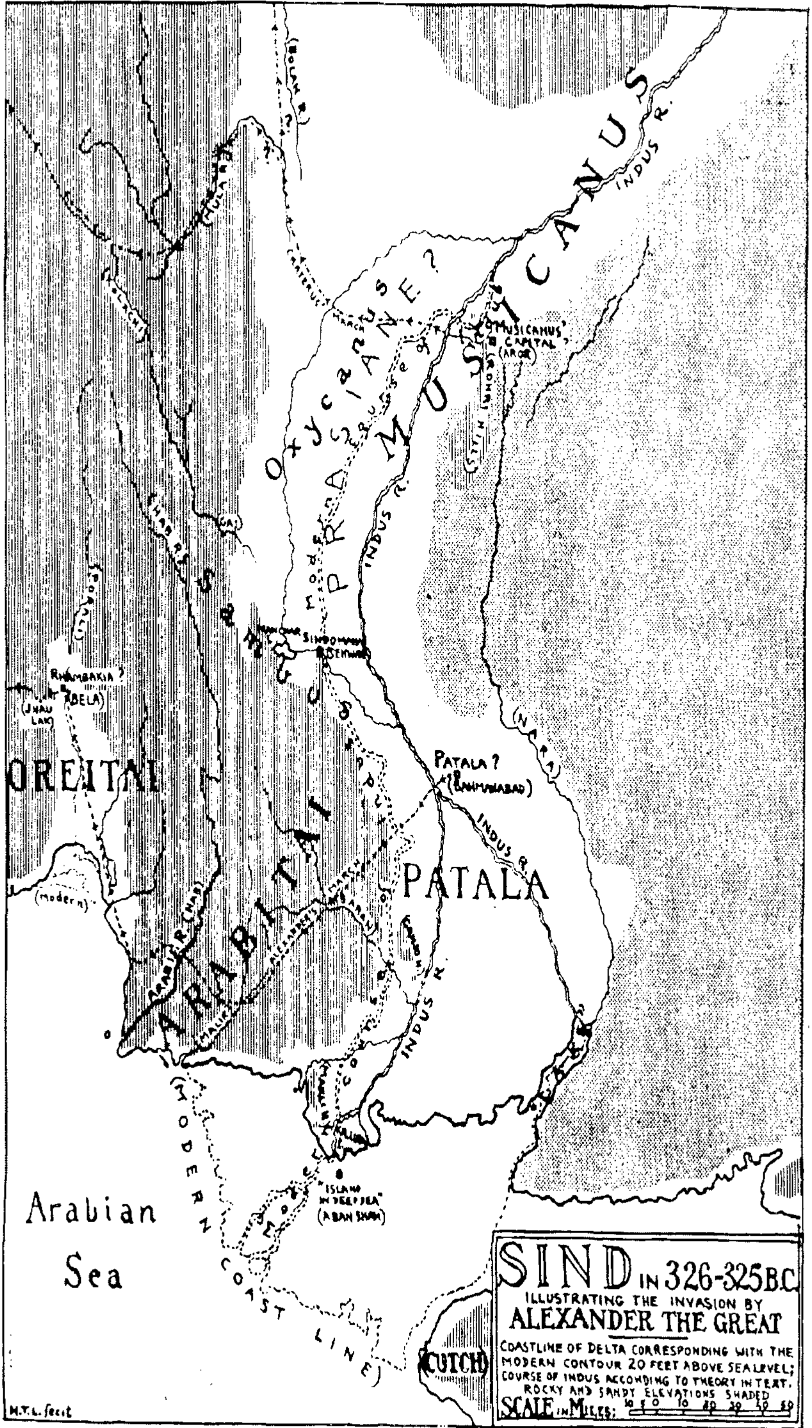

MUSICANUS
INDUS R.
OXYCANUS
SAMBUS ?
PRAESTI ?
MUSICANUS' CAPITAL ?
(AROR)
SEHWAN
PATALA ?
PATALA
NARA
ARABITAI
OREITAI
RHAMBAKIA ?
(BELA)
(modern)
MODERN COAST LINE
"ISLAND IN DEEP SEA"
(ABAN SHAH)
Arabian Sea
CUTCH
SIND IN 326-325 B.C.
ILLUSTRATING THE INVASION BY
ALEXANDER THE GREAT
COASTLINE OF DELTA CORRESPONDING WITH THE MODERN CONTOUR 20 FEET ABOVE SEA LEVEL; COURSE OF INDUS ACCORDING TO THEORY IN TEXT. ROCKY AND SANDY ELEVATIONS SHADED
SCALE IN MILES: 10 5 0 10 20 30 40 50
H.T.L. fecit

باب آٹھواں

سندھ کا حال بعد کی کلاسیکی مستند تحریروں کی زبانی

اسٹرآبو (Strabo) نے اپنا جغرافیہ ہند سکندر اعظم کے زمانہ سے تعلق رکھنے والے علماء یا وہ جو اُن کے فوراً بعد آئے، اُن کی تحریروں کی مدد سے ترتیب دیا، یہ تمام تحریریں اسٹرآبو کے اپنے زمانہ سے تین سو سال پہلے کی ہیں۔ اِن کے بعد کی تحریریں اسٹرابو کی نظر میں وقعت نہیں رکھتیں کیونکہ وہ صحیح معلومات بہم نہیں پہنچاتیں۔ وہ تاجر بھی "جو اب مصر سے دریائے نیل کے راستے خلیج عرب سے ہوتے ہوئے ہندوستان جاتے ہیں" ناواقف لوگ ہیں، جن مقامات تک وہ لوگ جاتے ہیں اُن کے متعلق قابل اعتماد معلومات بہم پہنچانا اِن کے بس کی بات نہیں ۔[1]

مسلم جغرافیہ دانوں میں جس کا نام اسٹرابو کے بعد آتا ہے وہ پلائنی (Pliny) اوّل ہے۔ جو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسٹرآبو کی علمی کاوشوں سے لاعلم تھا، اُس نے مستند دستاویزات اور تسلیم شدہ علماء کی کتابوں سے غیر محتاط انداز میں فائدہ اُٹھایا، لیکن جن ذرائع کو اسٹرابو نے ناقابل اعتماد سمجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ پلائنی نے اُن سے بہت کچھ معلومات اپنی تحریروں میں شامل کیں۔ اسٹرآبو کی تصنیفات کے ساٹھ یا ستّر سال کے اندر اندر مصر (جو اب سلطنت روم کا حصّہ تھا) اور ہندوستان کے درمیان تجارت بہت ترقی کر چکی تھی، اِس ترقی میں ہپالس (Hipalus) کی دریافت کو بہت دخل تھا، اِس کے مطابق جہاز رانی کا یہ نیا طریقہ رائج کیا گیا تھا کہ جنوبی عرب۔ سے جنوبی مغربی مان سون کی مدد کے ساتھ براہ راست ہندوستان کو جہاز روانہ ہوتے تھے۔[3] میرا خیال ہے کہ عرب قوم پہلے ہی اِس طریقہ پر عمل پیرا تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ جہاز رانی کے متعلق ایک راہنما کتاب مروّج تھی۔ جس سے مدد

لے کر پلائنی نے ساحلِ مالابار (Malaabar) پر واقع بندرگاہوں کے متعلق مفید معلومات پیش کیں۔ ساتھ ہی اُن شہروں کے نام بھی جو اندرونِ ملک آباد تھے اور اِن بندرگاہوں کی تجارت سے وابستہ تھے، اُس نے لنکا کے متعلق بھی کچھ معلومات فراہم کیں جو اُسی زمانہ سے تعلق رکھتی تھیں لیکن اِن کی صحت قابلِ اعتماد نہیں۔

جہاں تک سندھ کی وادی کا تعلق ہے جو معلومات پلائنی نے ہمیں دیں اُن میں اگر سابقہ تحریروں سے کوئی اختلاف بھی ہے تو وثوق کے ساتھ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اختلافی مواد کسی ایسے ذریعہ سے اُس نے حاصل کیا ہوگا جو میگیز تھینیز (Magesthenes) کے بعد کا ذریعہ ہے۔ اُس نے دریائے ستلج اور بیاس نیز اُن کے درمیانی فاصلوں کا ذکر کیا ہے۔ اِس کے بعد "شاہی سڑک (Royal Road) سے جاتے ہوئے پاٹلی پترا (Pat li Putra) تک جو کچھ بھی ہے وہ سب میگیز تھینیز سے لیا گیا ہے جسے اسٹرابو نے قابلِ اعتماد ذریعہ نہیں سمجھا۔

اسٹرابو کی طرح پلائنی نے بھی دریائے سندھ کی وسعت و طول کے متعلق وہ اندازے قبول کیئے ہیں جو اعتدال پر نظر آتے ہیں۔

وہ کہتا ہے کہ دریائے سندھ چھ میل سے زیادہ چوڑا نہیں ہوتا اور نہ اُس کے پانی کی سطح پینتالیس فٹ سے زیادہ بلند ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ دریائے سندھ اپنے بہاؤ کے دوران منقسم ہوکر ایک بہت بڑا جزیرہ بناتا ہے، جو پراسیاں کے نام سے مشہور ہے۔ اور دوسرا چھوٹا جزیرہ پٹالہ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔[4] پٹالہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ جزیرہ مساوی الاضلاع مثلث کی شکل کا ہے جس کا ہر ضلع دوسو میل لمبا ہے۔[5] دوسری جگہ وہ اپنے تبصرہ میں بیان کرتا ہے کہ دریائے سندھ کے نزدیک پراسی وہ لوگ ہیں جو بونے شمار کیئے جاتے ہیں۔ اُس کا یہ بیان قطعاً درست ہے کہ وہ ہندوستانی جن کا رنگ زیادہ کالا ہے دریائے گنگا کے میدان کے جنوب میں پائے جاتے ہیں اور جو دریائے سندھ کے نزدیک رہتے ہیں اُن کا رنگ صاف ہے۔[6]

دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر بہت سے قبائل آباد تھے۔ پلائنی نے اُن کے نام بیان کئے ہیں، لیکن اُن کے علاقوں کے محلِ وقوع کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی بلکہ قبائل کے جو نام قدیم تحریروں میں ملتے ہیں اُن سے یہ نام کافی مختلف ہیں۔ سندھ ڈیلٹا کے مغرب کی سمت ساحلِ سمندر کی جو تفصیلات درج ہیں وہ انتہائی ناکافی اور غیر تسلی بخش ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پلائنی نے ونیسیکرٹیس کی تحریر پر بیان کو استوار کیا ہے، اور نیرکس کی تحریروں سے کوئی استفادہ نہیں کیا۔ یہ دلچسپ معلومات بھی ہمیں پلائنی کے ذریعہ سے ہی ملتی ہے کہ اوراتی قبیلہ کے لوگ کوئی ہندوستانی زبان نہیں بولتے تھے بلکہ اُن کی اپنی جداگانہ زبان تھی۔ نیز یہ عجیب وغریب خبر کہ " سکندرِ اعظم نے ''اکھتھیو فاگی'' قبیلہ کے تمام لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ وہ کچی مچھلی نہ کھائیں''۔ ے

پلائنی کے غیر محتاط اطلاعات اور خبروں کے پلندے سے اب ہم ایک ایسی عملی کاوش کی طرف آتے ہیں جو بالکل مختلف ہے۔ " دی پیری پلس آف دی اریتھریں سی " ایک گمنام مصنف سے منسوب کتاب ہے۔ بحرِ ہند میں تجارت کے متعلق اسے ہر ممکنہ تفصیل و اطلاع کی کائنات کہا جاسکتا ہے۔ اِس میں بحیرہ احمر ابتداء سے ایک سمت میں زنجبار تک اور دوسری طرف راس کوموروں (Comoron) تک ساحلِ سمندر کے متعلق رہنمائے جہاز رانی میں بھی شامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پلائنی کی موت کے چند سال بعد ہی یہ حوالہ جاتی کتاب منظرِ عام پر آ گئی تھی، یہ مصنف اپنی کتاب کی تکمیل میں چھوٹے سے چھوٹے رسالہ اور کتاب سے استفادہ کرتا ہوا نظر آتا ہے جو اُس زمانہ میں موجود تھیں۔ " دی پیری پلس " ترتیب وار بہت صحیح اور بہت زیادہ اطلاعات فراہم کرتی ہے جبکہ پلائنی کی کتاب کے متعلقہ حصہ میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ جہاں تک ساحلِ سندھ کے بیان کا تعلق ہے بلاشبہ اِسے پلائنی کے بیان پر ترجیح دی جانی چاہئے کیونکہ یہ اُس زمانہ کے حالات پیش کرتا ہے۔

''وہ کہتا ہے کہ سطحِ سمندر بہت نیچی اور یکساں ہے جس میں دریائے سندھ کے دہانے کھلتے ہیں۔ اِس دریا سے خارج ہونے والے پانی کی مقدار اِتنی کثیر ہے کہ جبکہ زمین سے

کافی دور سمندر میں ہی ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ دریا کے پانی کی وجہ سے سمندر کا پانی سفید ہوگیا ہے''۔ دریا کے سات دہانے ہیں۔ سب پایاب ہیں اور ریت کی رکاوٹوں سے بھرے ہونے کی وجہ سے جہاز رانی کے قابل نہیں ہیں۔ سوائے درمیانی دہانے کے۔ اِس میں ایک تجارتی بندرگاہ کے مقابل چھوٹا سا جزیرہ بھی موجود ہے اور باربریکون (Barbari Con) کے نام سے پکارا جاتا ہے، یہاں جہاز ٹھہرتے تھے، اور اُن کا مال چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ دریائے سندھ کے راستہ بڑے شہر مناغر (Minagira) تک پہنچایا جاتا تھا۔ یہاں بادشاہ کا محل تھا۔ اِس زمانہ میں (تقریباً ۵۰ عیسوی) ایک پارتھین (Parthian) شہزادہ حکمران تھا حالانکہ ملک سیتھیا کہلاتا تھا۔

باربری کون کے مال خانون میں جن اشیاء کی برآمد اور درآمد ہوتی تھی، مصنف نے اُنھیں الگ الگ بیان کیا ہے۔ برامدات میں قیمتی پتھر، ریشم، چائنا کا سیمور (Fue) اور چند اشیاء جنھیں ہم مقامی پیداوار سمجھتے ہیں مثلاً مصالحہ جات، گوند، سوتی مصنوعات اور رنگ شامل ہیں۔

علاقہ کے حالت بیان کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے۔ اِس کا اندرونی علاقہ جس کی سرحدیں سیتھیا (Skythia) سے ملتی ہیں ابیریا (Aberia) کے نام سے مشہور ہے اور اِس کا سمندری دروازہ سوراسٹرین (Surastrene) ہے، یہ ایسا علاقہ ہے جہاں مکئی اور چاول بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں تیل، مکھن ململ اور ہندوستانی کپاس کے بُنے ہوئے موٹے کپڑے۔ یہاں مویشیوں کے لاتعداد گلّے بھی ہیں۔ مقامی باشندے لحیم شحیم اور کالے رنگ کے ہیں۔ اِس ریاست کی راجدھانی مِناغر ہے۔ جہاں سے سوتی کپڑا کثیر مقدار میں بیری گازا کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اِس علاقہ میں آج بھی سکندر کے حملہ کی یادگاریں حفاظت کے ساتھ رکھی گئی ہیں، مثلاً عبادت گاہیں، فوجی پڑاؤ کے مقامات اور بڑے بڑے کنویں۔ ے

پیری پلس اِس کے بعد کچھ (Cutch) اور کاٹھیاواڑ (Kathiawar) کے متعلق

بیان کرتی ہے۔ دوہری خلیج جو عظیم اور خفیف کہلاتی ہے اس میں دریا کا وہ زیریں حصہ کے چڑھتے ہوئے پانی سے متاثر ہوتا تھا رن کچھ میں داخل ہوتا ہوا نظر آتا ہے، جسے آجکل کوری (Kori) کہتے ہیں، یہ آگے خلیج کچھ تک بڑھ جاتا ہے۔ دونوں ہی جہاز رانی کے لئے مخدوش تھے جن کے متعلق جہازوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ ان سے دور رہیں لیکن دریا کے ڈیلٹا کے مغرب میں جو ساحل سمندر ہے اُس کا بیان مبہم ہے، نہ موروں تو بارا کا کوئی ذکر ہے اور نہ "عورت کی جنت" کا۔ لیکن کسی مقام پر جو شاید اورمارا (Ormara) کے مشرق میں تھا، (یعنی خشکی کا وہ ٹکڑا جو بیان کے مطابق خلیج میں دور تک چلا گیا ہے) ایک دریا موجود تھا جس کا دہانہ اتنا وسیع تھا کہ جہاز داخل ہوسکیں اور یہاں ایک چھوٹی منڈی بھی ہے جو اوریا (Oraia) کے نام سے موجود ہے۔ اِس کی پشت پر خشکی میں سات دن کی مسافت کے بعد ایک شہر آتا ہے جہاں بادشاہ رہتا ہے۔ اِس کا نام رہمبا کیہ (Rhambakia) ہے۔

بیان کیا گیا ہے کہ اندرونی علاقہ میں مکئی کے علاوہ چاول، کھجور اور انگور پیدا ہوتے تھے ساحلی علاقہ میں صرف خوشبودار گوند پیدا ہوتا تھا۔ ۸

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ دریا جس کے دہانہ پر اوریا کا بندرگاہ واقع تھا اصل میں اگور کی کھاڑی (Agor Creek) تھی جس میں دریائے ہنگول (Hingol) گرتا ہے، یہ الفاظ دگر نیرکس کے سفرنامہ میں جو ٹومیرس (To merus) کے نام سے مذکور ہے۔ کسی پرانی بستی کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ۹ جو نزدیک آبادی تھی۔ جہاں تک رہمبا کیہ کا تعلق ہے کہا جاتا ہے کہ یہ لسبیلہ (Lasbela) کے نزدیک زرخیز ویلپٹ (Welpat) نیابت میں آباد تھا ۱۰ جو لسبیلہ کے شمال میں ہے۔ ہر دو مقامات تقریباً سات دنوں کی مسافت کے برابر فاصلہ پر واقع ہوتے ہیں۔ بہر نوع یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اگور (Agor) جو پہاڑوں اور سمندر کے درمیان پھنسا ہوا ہے ایک مچھیروں کی بستی سے زیادہ اہمیت کا حامل کیسے ہوسکتا ہے جیسا کہ نیرکس کے بیڑے کے لنگر انداز ہونے کے وقت یہ تھا چنانچہ وہ بندرگاہ جو رہمبا کیہ کی ضروریات پوری کرتا تھا یقیناً مزید مشرق میں واقع ہونا

چاہیئے۔ یعنی لاس (Las) کے میدان کے ساحل پر۔ اور یہ بات بھی مشکوک ہے کہ دریائے پھور (Phor) کا دہانہ کبھی بھی ''اتنا بڑا ہوگا کہ جہاز اُس سے گذر سکیں''۔ شاید یہ قیاس کرنا درست ہوگا کہ اُس وقت تک ونڈر (Windur) اور پرالی (Purali) کے دہانوں۔ کے سامنے ریت کے جو ٹیلے اور پشتے بنتے رہتے تھے اُنھوں نے ایک دوسرے سے مل کر زمین کی شکل اختیار کر لی تھی جن کے درمیان سے دریا کی شاخیں سمندر میں گرتی تھیں۔ سون میانی (Sonmiani) ویلپت (Welpat) سے تقریباً چھ دن کی مسافت کے فاصلہ پر واقع ہے۔

ایک بار پھر سندھ ڈیلٹا کی طرف توجہ مبذول کیجئے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ بار بری کون اور مِناغر کے آثار کی شناخت مشکل ہے۔ [۱۱] یہ تو ہوسکتا ہے کہ مِناغر ہی وہ شہر تھا جو سکندر اعظم کے وقت میں پٹالہ کے نام سے مشہور تھا اور بعد میں ایک سیتھین نام سے مشہور ہوگیا۔ بہر نوع یہ فرض کرنا غلط نہیں کہ شہر دریا پر یا دریا کے نزدیک واقع تھا۔ لیکن سکندر اور اُس کی فوج کے گذرنے کے چار سو میل کے اندر ڈیلٹا کے شمال میں دریائے سندھ کا آبی راستہ کسی ایسی انقلابی تبدیلی سے دوچار ہوا جیسا کہ خود ڈیلٹا کے متعلق ثابت ہے۔

اب جس مشہور ماہر جغرافیہ دان سے ہم استفادہ کریں گے وہ قدیم جغرافیہ کے ماہر کلاڈیس ٹالمی (ClaudiusTolemy) ہے جس کا تعلق مصر کے سکندر یہ شہر سے تھا۔ اِس شخص نے اپنا شہرۂ آفاق جغرافیہ ۱۵۰ یا ۱۶۰ عیسوی کے لگ بھگ تحریر کیا۔ اِس کا طریقہ اسٹرابو سے بالکل مختلف تھا جس نے جس زمانہ کے معلوم ممالک کے متعلق عام تفصیلات پیش کی ہیں۔ ٹالمی (Tolemy) دراصل دنیا کا صحیح ترین نقشہ مکمل کرنے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کرتا رہا چنانچہ اُس کی تصنیف کا بیشتر حصہ اُن حوالہ جاتی گوشواروں پر مشتمل ہے جو نقشوں سے متعلق ہیں۔ یہ نقشے ستاروں اور سیاروں کی بہت محدود پیمانہ پر مشاہدوں کے بعد جو نسبتاً بہت قلیل وقت میں انجام پائے یا بنائے گئے ہیں اور بحری راہنماؤں اور جہاز رانوں کی فراہم کردہ اطلاعات پر منحصر ہیں۔ [۱۲] ایسے ذرائع کی مدد سے

مرتب کر دہ نقشوں پر ٹالمی نے اپنے عرض البلد (Latitude) اور طول البلدم (Longitude) کے خطوط جمائے جو اُس نے اصولاً اپنی معمولی استقداد کائنات کے سہارے پر بنائے تھے۔ اِس کے بعد اُس نے تمام مشہور مقامات کو عرض البلد اور طول البلد، ڈگری (Degree) اور منٹ (Minute) کے حساب سے نقشہ پر ظاہر کیا جیسے یہ صحیح محل وقوع ہے جس کی وہ تصدیق کر چکا ہے۔

اُس کے پیش رُو جغرافیہ دانوں سے زیادہ علم کے ذرائع ٹولیمی کو میسر تھے۔ خاص طور پر ہندوستان کے متعلق۔ بدقسمتی سے مقامات کے بیشتر نام جو اُس نے بیان کیے ہیں ہرگز شناخت نہیں کیے جا سکتے۔ یہ نام کسی دوسرے مصنف کی تحریروں میں بھی نہیں ملتے۔ وہ مخصوص اطلاعات و علم جن کی بنیاد پر مختلف مقامات کو اُس نے اپنے نقشوں پر عرض البلد اور طول البلد کے اعتبار سے جگہ دی ہمیں معلوم نہیں۔ لہٰذا اِن کی کیا اہمیت ہے؟ ہم اِس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے۔

ٹولیمی کا مطالعہ اُس کے نقشوں کی مدد سے کیا جانا چاہیئے اور یہ کہنا کہ یہ نقشے کسی دوسرے انسان کے ہاتھوں کی تخلیق ہیں کوئی اہمیت نہیں رکھتا بشرطیکہ یہ نقشے ٹالمی کے مرتب کردہ اشارات کی روشنی میں بنائے گئے ہوں اور طول البلد اور عرض البلد کے متعلق اُس کی ہدایات کا خیال رکھا گیا ہو۔ شمالی مغربی ہندوستان کے متعلق اُس کی پیش کردہ تفصیلات گو نقص سے پاک نہیں لیکن ایسی بنیادی غلطی کا شکار بھی نہیں جیسی وہ غلطی کہ جس کی وجہ سے تمام دکن (Deccan) اور لنکا کا چہرہ ہی بگاڑ دیا گیا ہے، لیکن دریائے سندھ اور اُس کے معاون دریاؤں کی گذرگاہوں کے متعلق اُس کی غلطی حیرت انگیز ہے۔ یعنی پنجاب کے تمام دریاؤں کو سندھ کے ساتھ ملتے ہوئے دریائے کابل سے صرف ایک ڈگری نیچے دکھایا ہے جبکہ اصل فاصلہ چھ ڈگری ہے۔ چنانچہ اِس غلطی کی وجہ سے اتصال کے بعد سندھ کی جو لمبائی دکھائی گئی ہے وہ حقیقی لمبائی سے دوگنا زیادہ ہوگئی ہے اِسی طرح پنجاب کے دریا چھوٹے ہو کر آدھے رہ گئے ہیں۔[۴۸] لیکن خاص خاص معاون دریاؤں کا سنگم صحیح ترتیب سے

دکھایا گیا ہے اور اُن کے بہاؤ کے عام راستے بھی درست ہیں۔ بیاس کا ستلج کے ساتھ سنگم قابل توجہ ہے جسے اصل مقام سے پہلے ہی دکھایا گیا ہے اور جو اُس کی شکل دراصل آج ہے۔

لیکن ٹالمی کے مطابق سندھ کے زیریں حصہ کی جو بات دلچسپی کا باعث ہے اور جسے دریا کی خصوصیت سمجھا جانا چاہئے۔ ۱۵ وہ ڈیلٹا کے اوپر اُس کا شاخوں میں منقسم ہونا ہے، دائیں کنارے سے ایسی دو شاخیں پھوٹتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ اور ایک بائیں کنارے سے دکھائی گئی ہے کہ بائیں شاخ دونوں دائیں شاخوں سے بہت پہلے ہی پھوٹتی ہے۔ ٹالمی اِس جگہ جو اصطلاح اور الفاظ استعمال کرتا ہے وہ عجیب ہیں جن سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے۔ ۱۶ کہ معاون دریا اِن میں سے کچھ شاخوں میں گرتے ہیں۔ سینٹ مارٹن (Saint Marin) کہتا ہے کہ شیر ہوتا ہے کہ ٹالمی دریائے سندھ سے نکلنے والی شاخوں اور اُس میں گرنے والے معاون دریاؤں میں تمیز نہیں کر سکا۔ اِس قسم کی غلط فہمی تو ہمارے زمانہ تک باقی رہی جیسا کہ میجر ریورٹی (Major Reverty) کہتے ہیں " بکھر سے سولہ میل سے کچھ زیادہ دور مغرب میں "دریائے گھاڑ (Ghar)" آب سندھ (Ab-i-Sind) سندھو (Sindus) میں مل جاتا ہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہی ہوتا تو دریائے گھاڑ اُلٹا نیچے سے پہاڑیوں کی چوٹی کی طرف بہتا ہوا ہوتا۔ ۱۷ دریائے سندھ کے مغرب میں جو علاقہ ہے اس کے بارے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ دریا سے جو شاخیں نکلتیں ہیں وہ پہاڑیوں کی سمت میں بہتی ہیں۔ اور بہت سے پہاڑی نالے جو دریا کے طرف بہتے ہیں ان سے مل جاتے ہیں۔ سیلاب کے موسم میں بارش کے بعد دریائے سندھ اور پہاڑیوں کا پانی وادی کے اندر کئی مقامات پر ملتا ہے۔ یہ وادی جو جیکب آباد (Jacobabad) کے شمال میں ایک مقام سے شروع ہوتی ہے مغرب جنوب مغرب کی سمت میں چلی گئی ہے۔ پھر جنوب مغرب کی طرف گھوم کر جنوب میں بڑھتی چلی جاتی ہے، اور منچھر جھیل تک پہنچ جاتی ہے۔ اِس طرح بگٹی (Bugti) پہاڑیوں سے آنیوالا لاہری (Lahri) دریا اِس کے علاوہ ناری (Nari) اور بولان (Bolan) اور متعدد ندیاں جو کچھی اور سندھ کے مغرب میں

پہاڑیوں سے نکلتی ہیں کسی نہ کسی وقت دریائے سندھ کی شاخوں کی معاون بن جاتی ہیں۔

ٹالمی نے دریائے سندھ کے انتہائی شمال میں جو شاخیں دریا کے داہنے کنارے سے نکلتی ہوئی دکھائی ہیں وہ ارچوسیا(Arachosia) کی طرف بہتی ہیں اور اِس موقع پر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ٹالمی کا اشارہ دریائے سندھ کی کسی ایسی شاخ یا ٹکڑے سے ہے جس کے اندر دریائے گومال(Gomal) کا سیلابی پانی پہنچتا تھا۔۲۸ بہر نوع اِس کی وضاحت ہو جانی چاہئے کہ ٹولیمی کے نقشہ کے مطابق مغرب کی سمت بہنے والی یہ شاخ دریائے سندھ کے سرچشمہ سے اُس مقام پر نکلتی ہے جو پنجند (Punjhand) اور دریائے سندھ کے اتصال سے کافی فاصلہ پر نیچے کی طرف واقع ہے۔یعنی ٹالمی کے نقشہ کے مطابق اُس مقام پر ملتا ہے جو پنجند اور سندھ کے اتصال سے ھائی ڈگری عرض البلد کے فاصلہ پر اوپر کی جانب واقع ہے۔زیریں دریائے سندھ کا جو غیر معمولی طول ٹالمی کے نقشہ میں دکھایا گیا ہے اُس کا لحاظ کرتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ شاخ وہ قدیم آبی راستہ ہے جو کشمور(Kashmore) سے نیچے سندھ ڈھوروا(Sindh Dhoro) کے مقام سے شروع ہوتا تھا اور موجودہ جیکب آباد کے شمال سے گذرتا ہے اور موھل سے ہوتا ہوا نشیب سندھ میں چلا جاتا ہے۔یہ نشیب دریائے بولان کا سیلابی پانی بھی حاصل کرتا ہے جو اُس ملک کے ایک حصہ سے گذرتا ہے جسے ٹالمی نے ارچوسیا کا نام دیا ہے۔

ٹالمی نے اِس ملک کے آبی وسائل کی جو تفصیلات دی ہیں اُن سے اِس ملک کے بالائی اور زیریں علائقوں کے بارے میں غلط فہمی اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے وہ کہتا ہے کہ مشرق میں وادیٔ سندھ تک پھیلا ہوا تھا جس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھی(Kachhi) بھی اِس میں شامل تھا۔اُس نے آراخوتوس کرین(Arakhotos Krene) نام کی ایک جھیل کو بھی دکھلایا ہے۔یہ جھیل اُس دریا نے بنائی تھی جو ارچوسیا سے گذرتا ہے چنانچہ عام طور پر یہی خیال ہوتا ہے کہ ٹالمی کی مُراد ہامون(Hamun) جھیل ہے جس میں دریائے ہلمند (Helmand) گرتا ہے۔لیکن ٹالمی زور دے کر یہ بیان کرتا ہے کہ دریا جو اِس

ملک سے گذرتا ہے دریائے سندھ کی ایک شاخ ہے اور اُس نے دریائے سندھ سے شاخ کے جُدا ہونے اور جھیل اور معاون دریا کے منبع کے جو محل وقوع بیان کئے ہیں وہ سب مذکورہ بالانظریہ سے مطابقت رکھتے ہیں کہ " جھیل" سے مراد وہ وسیع نشیب ہے جو صوبہ سندھ کے موجودہ شمالی مغربی سرحد سے ملحق لیکن باہر ہے۔اِس نشیب میں دریائے بولان (Bolan) ناری (Nari) اور مولا (Mulla) کے ذریعہ سے اِس میں آتا تھا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ٹالمی نے سیستان (Sistan) یا زراہ (Zarah) میں واقع بڑی جھیل ہامون (Hamun) کو جس میں دریا۔ ئے ہلمند گاتا ہے اور درنگیانا (Drangiana) کو اُس کے صحیح محل وقوع پر نہیں دکھایا جس کی وجہ سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اُس نے اریّا (Areia) کے علائقہ میں جو جھیل دکھائی ہے کہیں وہی تو یہ جھیل نہیں ہے اور دریائے ہری رود (Hari Rud) اور ہلمند (Helmand) کے درمیان کسی غلط فہمی کی رجہ سے ایسا ہوا ہو، وہ کہتا ہے کہ درنگیانا (Drangiana) دریائے ارابس (Arabis) کی ایک شاخ سے سیراب ہوتا تھا۔ یہ ایک فاش غلطی ہے۔٢٢

دوسری شاخ جو دریائے سندھ کے دائیں کنارے سے نکلتی ہوئی بتائی گئی ہے وہ ٹالمی کے بیان کے مطابق اربیتا پہاڑ کی طرف بہتی ہوئی چلی جاتی ہے۔٢٣ اُس نے شہر بناگرہ (Binagara) کا جو محل وقوع بیان کیا ہے یہ شاخ اُس نے نیچے کی طرف تھوڑے ہی فاصلہ پر سندھ سے پھوٹتی ہے اور بناگرہ (Binagara) کا محل وقوع "پیری پلس (Periplus) میں مذکور شہر میناگرا (Minagara) سے بڑی حد تک مطابقت رکھتا ہے لہٰذا ہم کوہ اربیتا (Arbita) کو کھیر تھر (Kirthar) اور اُس کی شاخوں کی شکل میں شناخت کر سکتے ہیں اور وہ شاخ جو اِس پہاڑ کی طرف بہتی ہوئی چلی جاتی تھی یقیناً " گھاڑ (Ghar) ہوگی یا شاید "غربی نارا (Western Nara) " ہو۔٢٤ اِس سے قبل کہ ہم زیریں دریائے سندھ کے دائیں کنارے کا بیان ختم کریں۔ یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ ٹالمی کے بیان کے مطابق کچھ دریا کوہ اربیتا (Arbita) سے نکل کر دریائے سندھ میں

گرتے تھے۔ اِن میں سے ایک دریا کے مخرج کی جونشاندہی اُس نے کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ندی اڑل (Aral)، سَن (Sann) بارانَ (Baran) والی پہاڑی ندیاں ہوسکتی ہیں۔ ۲۵ جہاں تک ڈیلٹا سے مغرب کی طرف ساحل سمندر کا تعلق ہے وہ "عورتوں کی جنّت" کے محل وقوع کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ دریائے ارابس (Arabis) کے دہانہ اور دریائے سندھ کی انتہائی مغربی شاخ کے دہانہ کے درمیان واقع تھا۔ لیکن یہ کہ ارابیس کے ساتھ فاصلہ نسبتاً کم تھا، اِس طرح آریانَ (Arrian) انڈیکا (Indica) میں موروں توبارا (Morontobara) کا جو محل وقوع بیان کیا ہے وہ تقریباً یہی ہے، لیکن فاصلے جو بیان کیے گئے ہیں وہ حقیقت سے بہت دور معلوم ہوتے ہیں۔ ٹالمی نے دریائے اربیس کے سمندر میں گرنے کا جو موقع بیان کیا ہے وہ مغرب کی طرف اتنے فاصلے پر بیان کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہ فاصلہ دریائے دشت (Dasht) کے سمندر میں گرنے کے موقع کے برابر ہے۔ ۲۶ اِسی طرح ارابیس (Arabis) شہر کے متعلق جو ارابتی (Arabiti) قبیلہ کا درالسلطنت تھا وہ لکھتا ہے کہ کرمانیہ (Karmania) کے سرحد پر آباد تھا۔ کرمانیہ کا ساحلی علاقہ بیان کے مطابق پارسیدی (Parsidi) قوم کے قبضہ میں تھا اور اِن کے مشرق میں ارابتی قوم کی علمداری تھی جبکہ دریائے سندھ کی طرف کے علاقے رہمنی (Rhamni) قوم کے ہاتھ میں تھے۔

اِس ساحل کے ضمن میں نہ اورائتی (Oreiti) کا ذکر ملتا ہے اور نہ اورائیا (Oraia) کی بندرگاہ کا، جیسا کہ ہمیں "پیری پلس (Periplus) میں ملتا ہے۔ چنانچہ فطرتاً ہم رہمنی (Rhamini) کو رہمبالیہ (Rhambaia) سے ملاتے ہیں جو ٹالمی کے وقت سے کچھ کم ایک صدی پہلے بہر نوع دنیا میں موجود تھا۔ ۲۷ بہر حال یہ پیش نظر رہے کہ ٹالمی نے اورائتی (oreiti) نام کی ایک قوم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ اراچوسیا (Arachosia) میں آباد تھا اور نقل مکانی کرکے یہاں چلا آیا اور آباد ہوگیا۔ ممکن ہے پارسی دی (parsidi) اور ارابتی (Arabiti) قوموں نے اُنھیں مجبور کردیا ہو۔

ٹالمی نے ڈیلٹا کا حدود اربعہ جن تفصیلات کے ساتھ بیان کیا ہے وہ "پیری پلس'' کے مُصنف کے بیان سے ملتا جلتا ہے۔ یہاں دریا کے سات دہانے تھے۔ سب کے نام دیئے گئے ہیں اور ہر شاخ کی گذرگاہ وضاحت کے ساتھ دکھائی گئی ہے، انتہائی مغربی دہانہ سگاپا (Sagapa) نام سے مشہور تھا جس سے ہماری یاد تازہ ہو جاتی ہے کہ نیرکس نے اِس ضلع کا نام سنگادا (Sangada) بیان کیا ہے۔۲۸ اِس کے بعد دہانہ سنتھون (Sinthon) ہے اور خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید سرچشمہ یہی تھا، حالانکہ جب "پیری پلس'' لکھی گئی تو چوتھی یا درمیانی شاخ جہازرانی کے قابل بتائی گئی تھی۔ مغرب کی طرف سے تیسری شاخ کا دہانہ کرائیسن (Chryson) سُنہرا (The Golden) کہلاتا تھا اور اِس کے بعد ترتیب وار کری پھرون (Kariphron) سپارا (Sapara) سپا لیسا (Saba Lessa) اور انتھائی مشرق میں لونی بر (Lonibare)، یہ آخری نام ایسا معلوم ہوتا ہے سنسکرت کے ایک نام سے لیا گیا ہے جس کے معنی ہیں "نمک والا" اور یہ اِس طرف اشارہ کرتا ہے کہ دہانہ میں ایک اور دریا بھی شریک تھا جس کا نام لونی (Loni) یا لاوانی (Lavani) بتایا جاتا ہے۔ یہ کھاری دریا اراولی (Aravali) کی پہاڑیوں سے نکل کر رن کچھ (Rann of Cutch) میں پہنچتا ہے۔۲۹ لاسن (Lassen) بہرحال یہ سمجھتا ہے کہ ٹالمی نے دریائے سندھ کی اُس شاخ کے بارے میں جو وندھیا (Vindhya) کوہستان کی طرف چلی جاتی ہے غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور لکھا ہے کہ ایک معاون دریا اِس سے ملتا تھا۔ یہ دراصل دریائے لونی کے بارے میں ہی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اُس کی غلطی کی وجہ سے بالکل صاف ہے۔ لاوانی دریا جس کا منبع اراولی کی پہاڑیوں میں واقع ہے کھاری جھیل میں گرتا ہے۔ جسے رن (Rin) یا اِرینا (Eirina) کہتے ہیں اور اِسی جھیل میں دریائے سندھ کی مشرقی شاخ بھی گرتی ہے۔۳۰ ٹالمی نے جو گوشوارے دیئے ہیں اُن میں اراولی پہاڑی اپوکوپی (Apocopi) کے نام سے ظاہر ہوتی ہے جن کی شناخت کے بارے میں کسی شبہ کی گنجائش بہت کم ہے۔

میں یہ کہونگا کہ دریائے سندھ کی اُس شاخ کو شناخت کرتے ہوئے جو کوہ وندھیا کی طرف بہتی چلی جاتی تھی ہمیں ٹالمی کے بیان کردہ دریائے سندھ کے پس منظر کو سامنے رکھنا چاہئے اور اُس نے معاون دریاؤں اور شاخوں کو جس جس موقع پر دکھلایا ہے اُسی کے مطابق غور کرنا چاہئے۔ اُس شاخ کو ٹالمی نے پنجند (Panjand) اور سندھ کے اتصال کے بعد کچھ فاصلہ پر دریائے سندھ کے دائیں کنارے سے نکلتا ہوا دکھایا ہے لیکن اُس شاخ کے جُدا ہونے کے موقع سے پہلے جوار چوسیا کے علاقہ سے گزرتی ہے۔ میں نے یہ نظریہ بھی پیش کیا ہے کہ یہ مؤخرالذکر شاخ اُس قدیم آبی راستہ کا دوسرا نام ہے جو کشمور کے نزدیک دریائے سندھ سے جُدا ہو کر کچھی کی طرف بہتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اگر میرا یہ قول تسلیم کرلیا جائے تو وہ شاخ جو اوپر کی طرف اِس سے پہلے ہی بائیں کنارے سے نکلتی ہوئی دکھلائی گئی ہے، وہی شمار ہوگی جو دریائے سندھ کے سیلابی پانی کو غوث پور (Gauspur) کے مقام پر دریائے ہاکڑا میں لا ڈالتی تھی، یعنی مٹھن کوٹ (Mithan Kot) کے جنوب مشرق میں۔ اور اِس شاخ کی آبی گذرگاہ واہندہ (Wahinda) تھی۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت ہی نہیں کہ جو نظریہ پیش کیا گیا ہے کہ یہ شاخ وندھیا کوہستان کی طرف بہتی چلی جاتی تھی اور وہاں پہاڑوں سے نکلنے والا ایک دریا اِس میں شامل ہو جاتا تھا قطعی غلط ہے۔ ۳۱ چونکہ واہندہ مٹھڑاؤ (Mithrao) تک اپنا بہاؤ جنوب کی سمت برقرار رکھتی ہے اِس لئے ہوسکتا ہے کہ اُسے دیکھ کر یہ غلط فہمی پیدا ہوگئی ہو۔ میجر ریورٹی کا قول بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مٹھڑاؤ کے نزدیک ہاکڑا میں ایک دریا جیسلمیر کی طرف سے آکر ملتا تھا، یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ ایسا دریا بارہ ماسی (Perennial) دریا ہوگا۔ ۳۲

چنانچہ دریائے سندھ کے متعلق ٹالمی کی تحقیق کو جب دوسرے ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے ساتھ پرکھا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ٹالمی کی فراہم کردہ معلومات بنیادی طور پر درست ہیں۔ دراصل دریائے سندھ کے آبی وسائل کی جو عام صورت حال ہے اُس میں کوئی غلطی نہیں۔ غلطی اگر ہے تو وہ مقامات کے درمیان فاصلوں

کی غلطی ہے یا چند آبی وسائل کی سمت کا تعین کرنے میں غلطی ہوئی ہے۔

دریا کی آبی گذرگاہ اور اِسی طرح اُس کی شاخوں کو ٹالمی نے نقشہ میں صحیح طور پر ظاہر کیا ہے، لیکن ہمارے پاس ایسی معلومات اور اعداد و شمار موجود نہیں جن کی مدد سے ہم سندھ کی مشکل جغرافیائی نشانیوں کے ساتھ اِن کا صحیح محل وقوع معلوم کرسکیں۔ مثلاً روہڑی پہاڑیوں، لکی پہاڑیوں اور گنجو ٹکر (Ganjo Takar) کی نسبت سے۔ اگر ایسی معلومات حاصل ہوں تو ہمیں اِن کے عوض خوشی سے بہت سے مقامات کو جن کی شناخت مشکل ہے قربان کردینا چاہئے۔ اِس کے برعکس دریائے سندھ کی آبی گذرگاہ کے متعلق جو نظریہ بھی پیش کیا جائیگا وہ مفروضہ اعداد و شمار پر منحصر ہوگا، پلائنی نے قطعیت کے ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ دریائے سندھ ڈیلٹا سے پہلے ایک بہت بڑا اجزیراہ بنائے ہوئے تھا۔ ٹالمی نے دریائے سندھ کے متعلق جو کچھ پیش کیا یہ اُس کے مطابق ہوسکتا ہے بشرطیکہ ہم یہ فرض کرلیں کہ وہ شاخ جوار ابیتا پہاڑ کی طرف بہتی تھی اور ایک معاون دریا جس کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ اِنھیں پہاڑوں سے نکل کر سندھ میں گرتا تھا وہ دونوں اصل میں ایک دوسرے سے اِسی طرح تعلق رکھتے تھے جس طرح دورِ جدید میں "غربی نارا" اور ندی اڑل منچھر جھیل کے ذریعہ مربوط ہیں۔

اب ایسی صورت میں کہ وہ جزیرہ جو دریائے سندھ کے پانی نے منقسم ہوکر بنایا اگر رقبہ کے لحاظ سے ڈیلٹا سے بھی بڑا تھا جیسا کہ پلائنی نے لکھا ہے کہ وہ تھا۔ تو دریائے سندھ کی آبی گذرگاہ کو کافی مشرق کی طرف ہونا چاہئے۔ لیکن ڈیلٹا کی جو طبعی کیفیت ٹالمی نے نقشہ میں دکھائی ہے اُس سے یہ ثابت ہے کہ دریا کی گذرگاہ روہڑی پہاڑیوں کے مغرب میں تھی۔

ٹالمی نے جس علاقہ کو انڈو سیتھیا (Indo-Skythia) کا نام دیا ہے اُس میں وادیٔ سندھ کا بیشتر حصہ اور کاٹھیاواڑ (Kathiawar) کا کچھ حصہ شامل ہے۔ جس کی تقسیم ٹالمی نے اِس طرح سے کی ہے! "نوکدار تکونی زمین جو دریا کے دو شاخوں میں منقسم ہونے کی وجہ سے وجود میں آگئی ہے: پٹالین (Patalene) ہے۔ اِس سے ملحق اوپر کا

علاقہ ابیریا (Aberia) ہے جبکہ علاقہ جس میں دریائے سندھ کے دہانے اور اِسی طرح وہ علاقہ جو خلیج کا نتھی (Kanthi) کے اطراف پھیلا ہوا ہے سوراشٹرین (Surastrene) کہلاتا ہے۔

ابیریا نام ہی اِس بات کا ثبوت ہے کہ ابھیرا (Abhira) قبیلہ جو سکندراعظم کے حملہ کے ایک یا دو صدی بعد شمال کی طرف سے سندھ کی زیریں وادی میں داخل ہوا تھا ایک اہم قبیلہ تھا، پتنجلی (Patan jali) کے مہا بھاشیہ (Maha bhasya) میں جو شاید دوسری صدی قبل مسیح کی تصنیف ہے اِس قوم کو شودرا (Sudra) کہا گیا ہے، تقریباً پانچ سو سال بعد اُن کا ذکر ایک نیم آزاد قبیلہ کی حیثیت سے ملتا ہے جو مغربی ہند میں آباد تھا اور سمدرگپت (Samudragupta) کا مطیع تھا۔ سوراشٹرین (Surastrene) مُراد سوراشٹر (Surastra) ہے یعنی جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ جس کے لئے ایک بار پھر یہ سنسکرت نام سرکاری طور پر استعمال کیا گیا۔ وشنو پران (Vishnu Purana) میں بھی سوراشٹر قوم کو ابھیرا (Abhira) قوم کے ساتھ لکھا گیا ہے اور انہیں مغربی قومیں کہا گیا ہے، اِسی طرح برہت سمیتا (Briht Samita) کو ے جنوبی حصہ میں بھی۔

ٹالمی نے انڈوسیتھیا (Indo Spythia) کے نقشہ پر بہت سے شہروں کے محل وقوع دکھائے ہیں، مگر یہ کوشش انتہائی مایوس کن ہے کیونکہ اِن شہروں مین سے چند کے سوا باقی کی شناخت ممکن ہی نہیں ہے۔

وہ بستیاں جو دریائے سندھ کے سیلابی یا طغیانی کے پانی کی زد مین تھیں وہ صدیوں تک زمین کے کٹاؤ کی وجہ سے معدوم ہوگئی ہوں گی یا وہ پانی جس پر اِن کے باشندوں کے وجود کا انحصار تھا اگر وہ اُن سے دور ہٹ گیا ہو تب بھی وہ بستیاں ختم ہوگئی ہوں گی۔ علاوہ ازیں سندھ جیسے صوبہ میں بیرونی فاتحین نے متعدد بار فتح کیا ہو۔ ناموں کا ڈھنگ اور ترتیب ایسا ہے جیسے دریا کے بہاؤ کی طرح ناقابل اعتماد کہا جاسکتا ہے۔

آیئے پہلے اُن قدیم بستیوں کو لیجئے جن کا ذکر ٹالمی سے پہلے مصنفین نے بھی کیا ہے۔

ٹالمی نے پٹالہ (Patala) کا جو محل وقوع ظاہر کیا ہے اگر یکسر غلط نہیں ہو تو پھر یہ سکندرِ اعظم اور اُس کے ساتھیوں کے بیان کردہ پٹالہ سے بالکل ہی الگ کوئی پٹالہ تھا۔ کیونکہ یہ ڈیلٹا کے اندر بہت آگے چل کر دکھا گیا ہے اور دو چھوٹی شاخوں سپارا (Sapara) اور سبالیسا (Sabalessa) کے دہانوں کے درمیان واقع ہے۔ باربری (Barbarei) نام کی جگہ جس کے متعلق ہم یہ کہہ سکتے ہیں ''پیری پلس'' میں مذکور باربری کون (Barbarikon) کا ہی دوسرا نام ہے اور بھی آگے اندرون ملک دکھائی گئی ہے اور ڈیلٹا سے پہلے دریا کی انتہائی مشرقی اور انتہائی مغربی شاخوں کے درمیان واقع ہے۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ٹالمی کا قلم اِس مقام پر پھسل گیا ہوگا اور پٹالہ کی جگہ باربری اور باربری کی جگہ پٹالہ دکھا گیا ہے، یہ بھی یاد رہے کہ پیری پلس کے مصنف نے پٹالہ کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا اور نہ ہی اُس نے ڈیلٹا کے علاقہ کو پٹالین کے نام سے پکارا ہے۔ ہیگ (Haig) کا خیال ہے کہ سکندرِ اعظم کا پٹالہ، دریائے سندھ کے بہاؤ کی تبدیلی کی وجہ سے شاید مٹ چکا تھا اور واقعہ پہلی صدی عیسوی کے وسط سے پہلے ہی ظہور پذیر ہو چکا تھا۔ لیکن ٹالمی جیسے مقامات اور اُن کے ناموں کی بڑی ہوس ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ ارسطوبس (Aristobulus) اور نیرکس (Nearchus) جیسے عظیم لوگوں نے پٹالہ کا ذکر کیا ہے تو اُس نے اِس شہر کے لئے بھی ایک محل وقوع تلاش کرنا ضروری سمجھا۔ ۳۶

میناگر (Minnagar) جس کے بارے میں پیری پلس (Periplus) کا مصنف لکھتا ہے کہ ''باربری کون (Barbarikon) کے عقب میں کافی اندرون ملک آباد تھا'' وہ ٹالمی کے نقشہ گوشوارہ میں بناگرہ (Binnagar) شہر کی صورت میں (شاید) ظاہر کیا گیا ہے، کہا جاتا ہے کہ دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر متعدد شہر آباد تھے جن میں ایک یہ شہر تھا، اور مخالف سمت کے منظر نشانات کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارچوشیا کو جانے والی دریائی شاخ کے جُدا ہونے کے بعد نیچے کی طرف آباد تھا، لیکن اربتیا پہاڑ کی طرف بہنے وال شُاخ سے اُوپر تھا، اِن دونوں شاخوں کی جو شناخت میں نے پیش کی

ہے اُس کے مطابق بناگرہ (Binnagra)، الور (Alor) کے آس پاس واقع ہوگا، اگر یہ صحیح ہے تو غالب امکان ہے کہ دونوں مقامات ایک ہی ہیں۔ اگر میوزیکانس (Musicanus) قوم کے درالخلافہ نے تین صدیوں کے بعد بھی اُن آسانیوں کو برقرار رکھا جنھیں دیکھ کر سکندر اعظم اِس کی طرف متوجہ ہوا تھا تو یقیناً پہلے سیتھین (Skythian) حملہ آور بعد کو پارتھین (Parthian) شہزادے بھی اِسی نتیجہ پر پہنچے ہوں گے کہ حکومت کرنے کے لئے اِس سے بہتر مقام نہیں۔ ۳۷

دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر کچھ آگے چل کر ٹالمی نے دوسرے مقام کامی گارا (Kamigara) کو دکھایا ہے، چند محققین کا خیال ہے کہ یہ جگہ الور سے ملتی جلتی ہے، اور وہ بیناگر کو بہمن آباد (Bahmanabad) کے محل وقوع پر قیاس کرتے ہیں۔ اِس جگہ ایک مقام بینانگر (Mina Nagar) حوالہ دیا جاتا ہے جو اِسی نواح میں آباد تھا اور ابتدائی تیرھویں صدی کی ایک تاریخ میں اِس کا ذکر ملتا ہے۔ اُس زمانہ میں یہ ایک ہندو راجا کا صدر مقام تھا جو سلطان ناصرالدین قباچہ کا جاگیردار تھا۔ ۳۹

ٹالمی نے اِن کے علاوہ انڈوسیتھیا میں جو دوسرے مقامات دکھائے ہیں اُنھیں بھی لوگوں نے پہلے یا بعد کے زمانہ کے کسی نہ کسی مقام سے ملا کر شناخت کیا ہے۔ ساؤسیکانا (Sousikana) کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مُسیکانا (Musikana) کا بگڑا ہوا نام ہے۔ لیکن یہ کسی طرح بھی الور (Alor) نہیں ہوسکتا کیونکہ اِسے ٹالمی نے سندھ ڈیلٹا کی خاص دائیں سمت والی شاخ پر دکھایا ہے۔ کولاکا (Kolaka) جسے ساگاپہ (Sagapa) شاخ پر دکھایا گیا ہے، اُسے آریان کا بیان کردہ کروکالا (Krokala) بتایا جاتا ہے۔ بونیس (Bonis) کو پنیاری پر آباد موجود بنو (Bano) سے ملایا جاتا ہے۔ اور پاسپیدا (Pasipeda) کو قدیم عرب جغرافیہ دانوں کے بیان کردہ باسمیڈ (Basmeid) کا دوسرا نام کہا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ناموں کے اندر اِس قسم کی مماثلت کو بہت محتاط طور پر قبول کرنا چاہیئے۔ خواہ کوئی دوسری مخالف شہادت موجود ہو یا نہ ہو۔

125
130
135
Imaos M.
Souastos
Indus
Hydaspes
Sandabalis
Adris
Hypasis
Zaradros
Gandara
Pandouoi
TAXILA
SAGALA
EUTHYMEDIA
Koa
EMBOLINA
BANAGARA
BOUKEPHALA
PENTAGRAMMA
IOMOUSA
PANASA
BOUDAIA
Ouindion M.
Namados
Nanaguna
NORTH WESTERN INDIA
according to
CLAUDIUS PTOLEMY
c. 150 A.D.

105
110
115
120
35
30
25
20
Areia
ALEXANDRIA
Paropanisos M.
Paropanisadai
KARDOURA
Koa
ALEXANDRIA
ANDR
Arachosia
ARAKHOTOS
Sydroi
Eoritai
MALIANA
GAMMAKE
Arakhotos Krene
Baitian M.
SOKSTRAO
MOUSARNA
KOTTOBARA
AZIKA
NAAI
Gedrosia
OSKANA
PARDABATHRA
KAMIGARA
Indo Scythia
PISKA
BINAGARA
M.
Rhamne
Arbita
PASIPEDA
PARABALI
Apokopa M.
OMIZA
XODRAKE
Indus
SYDRUS
Parisene
SOUSIKANA
BARBAREI
EPITAUSA
ASINDA
BONIS
Patalene
XOANA
KOLAKA
THEOPHILA
PATALA
RHIZANA
Syrastrene
ASTAKAPRA
OZENE TIASTANES
KANTHI
BARDAXEMA
MINAGARA
SYRASTRA
Sagapa
Sinthon
Khrysoun
Sabara
Lonibare
Larike
Nanaguna
BARAKE
BARYGAZA
Namados

اِس ضمن میں مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ ٹالمی کے شہروں کا محل وقوع طے کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ دریائے سندھ کے بہاؤ اور راستوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ ایک طرف تو اِس کی شاخوں اور معاون دریاؤں پر گہری مطالعاتی نظر رہے اور دوسرے اُن مقامات پر جن کے بارے میں صریحی شواہد موجود ہیں کہ وہ دوسری صدی قبل مسیح میں آباد تھے، اِن مقامات میں سے اکثر بدھ مذہب سے تعلق رکھنے والی باقیات سے شناخت کئے جاتے ہیں۔ وسطی اور زیریں صوبہ سندھ میں ایسی تقریباً دس اور بالائی سندھ میں پانچ یا چھ قدیم بستیاں موجود ہیں۔

اِس مطالعہ سے جو نقشہ ہمارے سامنے اُبھرے گا وہ یہ ہوگا کہ دریائے سندھ کا آبی راستہ اِس زمانہ میں روہڑی کی پہاڑیوں کے مغرب میں تھا، شاید لوہانو ڈھورو (Lohano Dohro) کے مقام پر۔ ٹالمی کا ایک چالو جملہ "دریا کے پاس" کا مطلب یہ سمجھا جانا چاہیئے "دریا سے چند میل کے اندر" کیونکہ کسی زمانہ میں بھی خاص دریا کے کنارے پر بستی آباد کرنا تباہی کو دعوت دینے کے مترادف رہا ہے۔ سوائے اِس کے کہ اس کا کنارہ چٹانوں سے بنا ہو۔ اِس بنیاد پر بہت سی ملتی جلتی باتیں سمجھ میں آتی ہیں لیکن ایک اسٹوپا (Stupa) اور اُس کے چاروں طرف بھکشوؤں کی اقامت گاہوں کے آثار جیسا کہ ہم دھامراہ (Dhamrao) نزد باڈھ (Badah)[40] میر پور خاص[41] (Mirpurkhas) اور سدھیرن جو دڑو (Sudheran Jo Daro)[42] میں پاتے ہیں لازمی طور پر کسی قدیم بستی کی نشاندہی نہیں کرتے، حقیقت یہ ہے کہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی جائے۔ اِس بنیاد پر کسی قدیم بستی کو شناخت کرنا ایک قیاس آرائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اور ایک بار پھر ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی یادداشت کو تازہ کرلیں اور یہ جان لیں کہ وہ تمام مقامات جو ٹالمی کے وقت میں پھل پھول رہے تھے۔ اور دریائے سندھ کے زیریں حصہ میں اُس کے کنارے پر آباد تھے۔ اُس کے بہاؤ میں تباہ کن تبدیلی کے بعد بہہ کر صفحۂ ہستی سے مٹ گئے ہوں گے۔

تشریحات باب آٹھواں

1. اسٹرابو۔ششم۔۳۔۴۔
2. پلائنی "نیٹ ہسٹ "ایڈیٹری مے ہوف۔ششم۔۲۳۔ نیز" دی پیری پلس " "دی ایری تھرین سی "ایڈیٹر میک کرنڈل پیرا ۵۷ (صفحہ ۱۳۸)
3. پلائنی مذکورہ بالا کتاب۔ششم۔۱۷۔۶۳۔

ویوین ڈی سینٹ مارٹن کا بیان ہے کہ دریائے جمنا اور دریائے سندھ کے درمیان اور وادیٔ سندھ کے بالائی حصہ میں آباد جن ۵۳ قبائل کا ذکر پلائنی نے کیا ہے اُن میں سے ۲۶ کو وہ شناخت کر چکا ہے اور ۱۴ ایسے ہیں جن کی شناخت میں کچھ شکوک ہیں۔(''ہندوستان کا قدیم تمدن'' دوم ۶۹۰، ایڈیشن ۱۸۵۲ء)۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں (ص ۲۰۷) کہ پلائنی سے جو نام ملتے ہیں سینٹ مارٹن نے اُن کی مماثلت بلوچ قبائل میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً سُیر یانی، عمرانی،نوتانی-وغیرہ جن کی وادی سندھ میں آمد چودھویں صدی عیسوی سے قبل کی بات نہیں ہوسکتی۔اِس ضمن میں لاسن کا بیان قابل اعتماد ہے۔

4. ایضاً ششم ۱۱۔۲۰۔
5. ایضاً ششم ۲۱۔۸۰ (......۲،۲۰ رومی وکون)۔
6. ایضاً۔ششم ۱۹۔۷۰۔
7. پلائنی۔ششم،۲۳۔۹۵۔

اے "پیری پلس "ایڈیٹر میک کرنڈل،پیرا۔۴۱

8. ایضاً پیرا۔۴۷۔
9. ایضاً صفحہ ۱۰۶۔فٹ نوٹ۔اگور کریک اور اُس پر واقع قدیم بستی کے متعلق

"لسبیلہ گزیٹیر" صفحہ ۱۹۱-۱۹۸ دیکھئے۔

10. اسٹین "جیوگرافیکل جرنل" (نومبر ۱۹۲۳) صفحہ ۲۱۵، بیلہ کے شمال میں ویل پت نیابت میں چاول کی کاشت کی جاتی ہے۔ (لسبیلہ گزیٹیر، صفحہ ۲۰۷)

11. نیز ہیگ کی "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۳۰-۳۲۔

12. مثال کے طور پر پلائنی کے بیان کردہ سکندرِ اعظم کی پیمائش کا طریقہ جچے تُلے قدموں کے ساتھ۔ ملاحظہ ہو۔

13. بن بری "اینشی اینٹ جیوگرافی" جلد دوم، صفحہ ۵۴۸-۵۵۰، ۶۴۲-۶۴۳

14. "اینشی اینٹ انڈیا ایز ڈسکرائبڈ بائی ٹالمی" ایڈیٹر آئی-ڈبلیو- میک کرنڈل (۱۸۸۵) صفحہ ۸۴۔

15. میں نے اُس شاخ کو چھوڑ دیا ہے جسے "پروپانی ساداۓ کی طرف بہتا ہوا" دکھایا گیا ہے کیونکہ ظاہری طور پر یہ ایک معاون دریا معلوم ہوتا ہے (دریائے کابل)

16. اِس کے لُغوی معنی ہیں، "ایک طرف گھوم جانے کا ذریعہ"۔

17. نیز کننگھم کی "اینشی جیوگرافی" صفحہ ۲۶۱۔ لیکن "مہران" صفحہ ۳۰۷ بھی دیکھئے (فٹ نوٹ ۳۰۷) ریورٹی کا بیان ہے کہ "گاج یا گھاڑ" نام کا جو دریا مولا (Mula) درّے سے گذرتا ہے وہ سندھ کے بڑے نشیب میں گرتا ہے۔

18. لاسن کی کتاب "انڈیچہ آلترتھمس کنڈہ" جلد سوم صفحہ ۱۲۹۔

19. "مہران" صفحہ ۳۰۰۔ صفحہ ۳۰۷ نوٹ ۳۰۹-۳۱۰۔ اگر میری یادداشت درست ہے۔ تو گڑھی خیرو کے شمال میں نصیر آباد تحصیل میں سرگوند ڈھانڈ ہے۔ وہ نشیبِ سندھ کا ایک حصہ ہے۔

20. ٹالمی-کیپ۔ ۲۹ (میک کرنڈل، صفحہ ۳۱۶) نیز امیّاس مار سیلینس۔ کتاب ۲۳ جس کا "مہران" صفحہ ۳۲۹ پر حوالہ دیا گیا ہے۔

21. دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ٹالمی کو منچھر جھیل کا علم تھا۔ اور یہ بھی اُس نے سُنا تھا

کہ اِس جھیل میں دریائے سندھ اور پہاڑوں سے نکلنے والے دریاؤں کا پانی جمع ہوتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اندازے سے ایک ایسا محل وقوع جھیل کے لئے مقرر کردیا جو بہت شمال میں تھا۔

22. ٹالمی۔کتاب ہفتم کیپ ۱۷۔۱۹۔۲۰، میک کرنڈل کا تبصرہ، صفحہ ۳۰۹-۳۱۴-۳۱۷-۳۱۸۔

23. ٹالمی کتاب ہفتم، کیپ ۱۔۲۸۔

24. میک کرنڈل کا بیان ہے کہ دریائے سندھ میں ایک معاون دریا ہالہ پہاڑی سلسلہ (کیرتھر) کے شمال سے آکر ملتا ہے، جس کا نام گندوَ (Gandaw) ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوئی معاون دریا کشمور اور سہون کے درمیان سندھ سے نہیں ملتا، اور پہاڑی نالے سب کے سب دریائے سندھ کی شاخوں میں گرتے ہیں۔ یا پھر وادی کے مغربی کنارے سے گذر کر یہ پانی منچھر جھیل میں پہنچ جاتا ہے۔

25. ٹالمی۔کتاب ہفتم -۲-۱-۳ (میک کرنڈل۔صفحہ ۲۹۵)۔

26. ٹالمی کے مقرر کردہ طول البلد کے مطابق۔ دریائے ارابس کا دہانہ ۱۰۵ درجہ پر واقع تھا۔ ''عورت کی جنت "۱۰۷ درجہ پر دریائے سندھ کا ساگاپانامی دہانہ ۱۱۰ درجہ ۲۰ فٹ پر تھا کتاب ہفتم۔کیپ -۲۱۔۲۲- کیپ ۱۔۲، میک کرنڈل صفحہ ۳۳-۳۱۹۔

27. پیری پلس۔ٹالمی کتاب ششم، ۲۰-۳۔

28. آریان "انڈیکا" باب ۲۱۔

29. "انڈس ڈیلٹا کنٹری" مصنف ہیگ-صفحہ ۳۳۔اور ضمیمہ A (صفحہ ۱۲۴)۔

30. لاسن، "انڈ۔آلٹ" جلد سوم۔صفحہ ۱۲۱-۱۲۹۔

31. کوہ کوسَنڈیون۔ناموں میں مماثلت اتفاقیہ ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔

32. ریورٹی، "مہران آف سندھ" صفحہ ۴۵۰-۴۵۴۔پلیٹ ششم۔

33. بی-سی-لا-"ٹرائبس اِن اینشی اینٹ انڈیا" (پونا ۱۹۴۳) صفحہ ۸۷۔ دیکھئے نوٹ نمبر ۱۵۔ باب ۱۱۔

34. "وشنو پوران" ترجمہ ایچ -ایچ ولسن۔ جلد دوم ۔ صفحہ ۱۳۳، "بر بہت سمہتا ترجمہ ایچ کرن۔ باب ۱۴۔ مزید جے-آر-اے-ایس۔ نیو سیریز-جلد پنجم۔

35. ٹالمی-ہفتم -۱-۵۵-۶۱ (میک کرنڈل صفحہ ۱۳۶، ۱۵۲)۔

36. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری، صفحہ ۳۳۔

37. کننگھم کا خیال ہے کہ الورہی وہ مقام ہے جسے ٹولیمی نے بناگرا کے نام سے لکھا ہے۔ لیکن وہ اِس میناگر کو پیری پلس کے مناگر سے مختلف سمجھتا ہے جس کے متعلق کننگھم کا خیال ہے کہ وہ ٹھٹھ میں یا اُس کے آس پاس آباد تھا، "اے-جی-آئی" صفحہ ۲۵۹-۲۸۹-۲۹۴۔

38. میک کرنڈل-مذکورہ کتاب-صفحہ ۱۵۱-۱۵۲۔

39. میک مڑدو- "ڈیز رٹیشن آن دی ریور انڈس"، "جے-آر-اے-ایس" جلد اول-صفحہ ۳۱-۳۲۔ اور فٹ نوٹ-نیز "مہران" صفحہ ۲۰۲۔ نوٹ ۱۰۵۔

40. مجمدار-صفحہ ۲۸۔

41. کزنس، صفحہ ۸۲-۹۷۔

42. ایضاً، صفحہ ۱۰۱۔۱۰۶۔

باب نواں

ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ کے حالات

دوسرا نظارہ جو سندھ کا ہم کرتے ہیں، وہ قانونی ماہر ڈاکٹر یوان چوانگ (Yuan Chwang) کی نظر سے کرتے ہیں۔ یہ مشہور چینی سیاح ۶۴۱ء میں سندھ میں وارد ہوا، یہ بدھ بھکشو سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے چین سے ہندوستان پہنچا اور یہاں سولہ سال مختلف مقدس مقاصات کی زیارت کرنے میں، نیز بودھ مذہب سے متعلق مقدس کتب، تحریریں اور دستاویزات جمع کرنے میں صرف کئے، یوان چوانگ کی آمد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اِس بات کا جائزہ لے کہ جس خطۂ زمین سے بودھ مذہب ظاہر ہوا وہاں اِس کے مقلدین کی کیا حالت ہے اور بدھ تعلیمات پر کسی حد تک عمل کیا جاتا ہے اِس عالم نے اپنے تاثرات کو ایک کتابی شکل میں قلمند کیا جو "مغربی دنیا کے حالات " (ریکارڈس آف دی ویسٹرن ورلڈ(Records of the Western World)ا کے نام سے مشہور ہے، اِس کتاب میں مذہب اور روحانیت کے متعلق تو بہت کچھ ملیگا لیکن جس راستہ سے وہ گذرا اُس کے گردونواح کے علائقہ کی طبعی حالت کیا تھی، اِس کا بہت معمولی اور سرسری ذکر ملیگا۔ بہرنوع اِس چینی زائر کا احسان ہے کہ اِس نے اپنے ایک پڑاؤ سے دوسرے پڑاؤ تک فاصلہ بھی تحریر کیا ہے اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک سفر کی عام روئداد بھی بیان کی ہے۔

یوان چوانگ نے اپنے سفرنامہ میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے اُن میں سے اکثر کو یقین کے ساتھ شناخت کیا جاسکتا ہے۔ لیکن سندھ کے متعلق یہ قول درست نہیں۔ اور سندھ کی ریاست کے جو صوبے اُس نے تحریر کئے اور اِس علائقہ میں اپنے سفر کا جو حال اُس نے تحریر کیا وہ بڑی حد تک قیاس آرائی معلوم ہوتا ہے۔ ایک اور پیچیدگی پیدا ہوگئی ہے۔

یوان چوانگ نے اپنے سفرنامے میں جس ترتیب سے اُن ممالک کا ذکر کیا ہے جن کی اِس سیاح نے سیر کی، وہ اُس ترتیب سے مختلف ہے جو ہوئے لی (Hoei Li) اور ین سونگ (Yen Song) نے یوان چوانگ کی سوانح حیات میں تحریر کی ہے۔[2]

لہٰذا ہم زیادہ تر یوان چوانگ کے سفرنامے پر انحصار کریں گے کیونکہ اُس میں مقامات کے درمیانی فاصلے نیز علاقے کے حالات بہرنوع ملتے ہیں، اِس ضمن میں ایک بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ یوان چوانگ نے فاصلے بیان کرنے کے لئے جو پیمانہ اختیار کیا ہے یعنی "لی" (Li) وہ حقیقی حیثیت نہیں رکھتا، بلکہ دن بھر کے سفر کو عام حالات میں پچاس لی (Li) یا دس میل کا اوسط دیا جا سکتا ہے۔[3] لیکن جس دن حالات معمول کے مطابق نہ رہے ہوں اُس دن یہ فاصلہ اوسط سے کم یا زیادہ ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک تحریر کا تعلق ہے یہ امکان ہے کہ اُس نے جو عام اوسط دن بھر کے سفر کا مقرر کیا ہوا تھا۔ اُسی کے مطابق فاصلہ لکھا ہوگا۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ یوان چوانگ جنوبی مغربی راجپوتانہ کے گوجرہ (Gujara) علاقہ سے ہوتا ہوا سندھ میں داخل ہوا۔ پہلے وہ انیس سو لی (1900) کے بعد شمال کی طرف چلتا رہا اور ایک ایسے علاقہ سے گذرا جو دشوار گذار بھی تھا، اور غیر آباد بھی۔ اِس کے بعد اُس نے دریائے "سین تو" (Sin Tu) کو عبور کیا اور مملکتِ سندھ میں داخل ہوا۔ اِس مملکت کے متعلق چینی عالم نے لکھا ہے کہ اگر ہر چہار طرف سے اِس ملک کا ایک دائرے سے احاطہ کریں تو سات ہزار (7000) لی ہوگا اور دارالخلافہ تیس لی کے اندر پھیلا ہوا تھا۔ اِس کا نام پی شین۔ پا۔ پو۔ لو (Pi Shan po, pu, lo) ہے۔ (اُس نے لکھا ہے کہ اِس ملک میں گندم اور دوسری اجناس کے علاوہ سونا اور چاندی بھی پیدا ہوتا تھا اور شاید پیتل بھی، جانوروں میں گائے بیل بھیڑیں خچر اور اونٹ پائے جاتے تھے۔ مختلف اقسام کے نمک جن میں پہاڑی نمک بھی شامل ہے ملتا تھا۔ دریائے سِن تو (Sin-tu) کے ساتھ ساتھ، زمین نشیبی اور دلدلی تھی۔ اور بہت سی نباتات سے بھری ہوئی تھی۔ پہاڑی نمک

کا ذکر ہمارے خیالات کو نمک کے پہاڑی سلسلہ تک لے جاتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ سلطنت شمال میں اِن پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی، اتفاق سے چچ نامہ میں سلطنت سندھ کا بیان مذکورہ حقیقت سے خاصی مطابقت رکھتا ہے اور ہمارا یہ مفروضہ ایک پیچیدگی کو بھی حل کر دیتا ہے جو آنیوالے سفر کے سلسلہ میں پیدا ہوئی۔ یوان چوانگ کہتا ہے کہ وہ سندھ سے مشرق کی سمت تقریباً نو سو لی تک سفر کرتا رہا اور دریا کے مشرقی کنارے کی طرف عبور کر کے جس ملک میں داخل ہوا اُس کا نام "ماؤ، لو، سان، پو، لوٗ" (Mou, Lo, San, Pu, Lu) تھا۔ کچھ ماہرین کا خیال ہے کہ یہ ملتان نہیں ہوسکتا اور اِس کے لئے وہ دو وجوہات پیش کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ سنسکرت لفظ ''ملاستانی پورا'' (Mulas thani pura) کو چینی زبان میں جس طرح لکھا جانا چاہیے وہ یوان چوانگ کے تحریر کردہ نام سے مختلف ہوگا۔ دوسرے یہ کہ ملتان سندھ کے شمال مشرق میں ہے۔ مشرق میں نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس زائر نے مشہور سورج دیوتا کے مندر کی جو تفصیلات لکھی ہے، اور اِس کا سنہری ہیولی (Golden Image) وہ دوسرے مصنفین کی تفصیلات سے مطابقت رکھتا ہے[٦] اور جہاں تک اِس کے محل وقوع کا تعلق ہے تو یہ ظاہر ہے کہ بالائی سندھ سے یہ شہر مشرق کی سمت میں واقع ہے۔ اِس زمانہ میں بالائی مملکت سندھ ڈیرہ جات (Dera Jat) تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن چینی سیّاح کی تحریر میں ایسے کئی مواقع آتے ہیں کہ جب کاتب کی غلطی سے شمال مشرق کی جگہ صرف مشرق رہ گیا ہے۔[٧]

اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جائے کہ چینی زائر نے نو سو (900) لی صرف نو دن میں طے کئے تب بھی بالائی سندھ سے مشرق کی سمت چلیں یا زیریں سندھ میں ڈیرہ جات کے موجودہ مقام سے۔ دونوں صورتوں میں چلنے والا واپس ریگستان میں پہنچ جائے گا۔ لیکن چینی سیّاح کا بیان اِس معاملہ میں بہت واضح ہے کہ "ماؤ، لو، سان، پو، لو" دریائی میدان کا شہر تھا۔

دوسری شکل اُس نام سے پیدا ہوتی ہے جو یوان چوانگ نے سندھ کے دارلسلطنت کا لکھا ہے "پی، شن، پو، تو، لو، اِس چینی تلفظ کی اصل بنیاد معلوم کرنے کے لئے کئی بار کوشش کی

جا چکی ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ۶۴۲ء ۶۴۱ء میں سندھ کی راجدھانی الور تھا۔ اگر یہ درست ہے اور یہ بھی کہ اُس زمانہ میں بھی یہ اِسی نام سے پکارا جاتا تھا، تو یقیناً چینی زائر (A.Lo.Lo) ۸ کو اِس کا نام " آ، لو، لو" لکھنا چاہئے تھا۔ اِس امکان کو ایک طرف رکھئے کہ اُس زمانہ میں الور کا کوئی دوسرا نام تھا، یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ یوان چوانگ دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد ہی الور میں وارد ہوا تھا۔ اور یہ تقریباً ناممکن ہے کہ اُس زمانہ میں دریائے سندھ الور کے مشرق میں بہتا ہو۔ ۹

سندھ میں قیام کے دوران (جس کا مطلب شاید موجودہ بالائی سندھ ہو سکتا) یوان چوانگ نے جنوب مغرب کی سمت ایک مہماتی سفر کیا تھا اور تقریباً پندرہ سو یا سولہ سو لی چلنے کے بعد جس ملک میں وارد ہوا اُس کا نام "اے، ٹین پو، پی، لو" تھا۔ وہ اِس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ بہت دور مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے سمندر کے قریب واقع تھا۔ زمین نشیبی، مرطوب اور کھاری تھی۔ لازماً چینی کا اشارہ ڈیلٹا کے علاقہ کی طرف ہے۔ اِس صوبہ کے متعلق اُس نے بیان کیا ہے کہ دائرہ پانچ ہزار لی تھا۔ اِس ملک کی راجدھانی میں جسے چوانگ نے "Kie (ka) Chi. po. chich. lo" لکھا ہے۔ وہ اِس کے متعلق لکھتا ہے کہ یہ بہت دور مغرب میں دریائے سندھ کے کنارے سمندر کے قریب واقع تھا۔ زمین نشیبی، مرطوب اور کھاری تھی۔ لازماً چینی کا اشارہ ڈیلٹا کے علاقہ کی طرف ہے۔ اِس صوبہ کے متعلق اُس نے بیان کیا ہے کہ دائرہ پانچ ہزار لی تھا۔ اِس ملک کی راجدھانی میں جسے چوانگ نے کی، چی، سو، فا، لو " لکھا ہے ایک وسیع اور مرصع مہیشؔ وورا (Mahesvora) کا مندر تھا۔

کننگھم (Cunningham) اور ہیگ (Haig) کا خیال ہے کہ "اے، ٹین، پو، چی، لو، سے مُراد ''کچھ'' (Cutch) ہے اور اِس کی راجدھانی کوٹیشور (Koteshwar) تھی۔ لیکن بڑے سے بڑے ماہرین کا خیال ہے کہ چینی تلفظ کا اِن ناموں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بہرنوع دوسرے ذرائع سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس

زمانہ میں ڈیلٹا کا خاص شہر دیبل (Debal) تھا۔ لیکن چونکہ یہ ایک "مندر" کا ہی دوسرا نام ہے تو ممکن ہے کہ عرف عام میں دیبل مشہور ہو جس کی جگہ چینی زائر نے اِس شہر کا اصل مگر غیر معروف نام بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اِس ملک میں کوئی الگ حکمراں نہیں تھا۔ اور اِس زمانہ میں یہ سندھ کے زیر اثر تھا۔ یہاں سے یوان چوانگ نے مغرب کی سمت دو ہزار لی کے بقدر ایک طویل سفر کیا اور اُس ملک میں وارد ہوا جسے وہ "لانگ، لی، لو"(Lang , Lie, Lo) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ یہ ملک ایک خلیج کے کنارے تھا اور ایران کے زیر حکومت تھا۔ اِس لئے یقین ہوتا ہے کہ اِس میں ہمارے زمانہ کا لسبیلہ (Lasbela) اور شاید جھالواں کے کچھ حصے اور مشرقی مکران بھی شامل تھا۔ یوان چوانگ کہتا ہے کہ یہاں کوئی مرکزی حکومت نہیں تھی۔ ہر وادی کا انتظام الگ تھا اور زبان جو بولی جاتی تھی وہ ہندوستان میں بولی جانے والی زبان سے کسی قدر مختلف تھی۔ [11] یہ جان کر البتہ حیرت ہوئی ہے کہ علاقہ زرخیز تھا۔ فصل عمدہ اور آبادی خوش حال تھی۔ اِس قسم کی صورت بہت محدود علاقوں میں مل سکتی ہے مگر ہر جگہ نہیں۔ مثال کے طور پر لسبیلہ کا ویلپت نیابت ممکن ہے اِس کا جواب یہ ہو سکتا کہ زائر جب اِس علاقہ میں آیا تو شاید اُس سال غیر معمولی طور پر اچھی بارش ہوئی تھی۔ اُس نے دارالسلطنت کا نام "سو، ٹو، لی، سو، فا، لو "(So, Ti, Li, Fa, Lo) لکھا ہے جسے واٹرس (Watters) نے "استری، اسویرا" (Stri, Isvara) کا چینی تلفظ کہا ہے جس کے معنی ہیں "زن راج" چوانگ کہتا ہے کہ لانگ کا لو" (Lang Ka-lo) وہ راستہ تھا جو مغرب میں "عورتوں کی سلطنت" کو جاتا تھا۔ برہت سمہتا (Brihat Samhita) کے شمالی مغربی حصے میں جس "استری راجیہ" کا ذکر ملتا ہے، یہ اُس سے مطابقت رکھتا ہے۔ [12] یہاں یہ بیان کرنا غیر مناسب نہ ہوگا کہ نیرکس کو بھی یہی معلوم ہوا تھا کہ موروتوبارا (Morotobara) کا دوسرا نام "عورتوں کا بندرگاہ (Woman's Harbour) بھی تھا کیونکہ کسی زمانہ میں یہاں ایک عورت کی

حکومت تھی۔ اِس جگہ کو میں نے شناخت کرتے ہوئے کراچی لکھا ہے، جو اپنی طبعی حیثیت میں بلوچستان کا حصہ ہے سندھ کا نہیں۔ ٹالمی نے موروِن توبارا کی بندرگاہ کو "سگاپا" (Sagapa) شاخ کے دہانہ سے تین درجے مغرب کی سمت میں دکھایا ہے۔[۱۳]

معلوم ہوتا ہے کہ چینی زائر پھر ڈیلٹا میں واپس آگیا۔ اور وہاں سے شمال کی جانب سے اُس نے سات سولی کے برابر سفر کیا اِس طرح وہ "پی، تو، شہہ، لو" (Pi, to, Sih, lo) کے ملک میں پہنچ گیا۔ اِس ملک کا احوال بیان کرتے ہوئے چوانگ لکھتا ہے کہ "زمین میں کھار بہت تھا، تیز و تند ٹھنڈی ہوائیں چلتی تھیں، یہاں گندم اور دالیں بڑی مقدار میں کاشت کی جاتی تھیں لیکن پھل اور پھول بہت کم تھے" یوان چوانگ راجدھانی کا ذکر کرتا ہے لیکن اُس کا نام بیان نہیں کرتا، یہاں بھی اپنی کوئی حکومت نہیں تھی۔ بلکہ سندھ کے زیرِ نگیں ایک ملک تھا۔ "پی، ٹو، شی، لو" (Pi, to, Shih, lo) کننگھام (Cunnuighan) کے خیال کے مطابق یہ پٹالہ (Patala) ہے۔ اِس لئے (اُس کے نظریہ کے مطابق) موجودہ حیدر آباد سمجھا نا چاہیے۔[۱۴]

جنرل ہیگ (Haig) جس کا خیال ہے کہ "اے، ٹین، پوہ، چی، لو" (A, tien, po, chih , lo) سے مُراد "کچھ" (Cuteh) کا علاقہ ہے۔ "پی، ٹی، شہہ، لو" (Pi, to, Shih, lo) کو نگر پار کر یا عمر کوٹ کے علاقہ میں سمجھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ چونکہ اِس سفر کے دوران یوان چوانگ (Youn Chwang) نے دریائے سندھ کو عبور کرنے کا ذکر نہیں کیا جیسا کہ وہ ہمیشہ کرتا رہا ہے۔ اِس لئے ثابت ہوتا ہے کہ "پی، ٹو، شی، لو" (Pi, to , Shihh , lo) دریائے سندھ کے مشرق میں ہی ہوسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دلیل بالکل برعکس صورت حال کو ثابت کرتی ہے۔ اِس زائر نے جب بالائی سندھ کا سفر کیا تو دریائے سندھ کے بائیں کنارے سے دائیں کنارے کی طرف عبور کیا۔ چنانچہ "اے، ٹین، پو، چی، لو" (A, tien, pi, chic, lo) تک پہنچنے کے لئے اُسے دریا عبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اور "لانگ، کا، لو" (Lang , Ka

(lo , تک اُس کا جانا اور پھر واپسی ، یہ تمام سفر دریائے سندھ کے مغربی علائقہ میں ہی ہوگا اور یہاں سے وہ شمال کی سمت سفر کر کے ، ''پی ، ٹو ، شی ، لو'' (Pi, to , Shih, lo) پہنچا۔

لہٰذا یہ قیاس کرنا کہ مذکورہ علائقہ سیہوَن کے آس پاس یا ممکنہ طور پر کھیرتھر پہاڑ کے مغرب میں جھلاوان کے اندر تھا غلط نہ ہوگا۔ سیہون کے آس پاس ہونے کا زیادہ امکان ہے کیونکہ چینی زائر کے بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ علائقہ پہاڑی تھا۔ اِس کے بعد ''یوان چوانگ'' (Yuang Chwang) نے تقریباً تین سو لی سے زیادہ سفر مشرق کی سمت طے کیا اور ''اے ، فان ، ٹو'' (A, Fan, To) ملک میں وارد ہوا۔ ملک کی طبعی حالت کے متعلق اُس کے بیان سے کوئی معلومات ہمیں حاصل نہیں ہوئیں جن سے ہم یہ اندازہ کر سکیں کہ یہ ملک کس قسم کا تھا اور ہم یہ سوچنے میں حق بجانب ہوں گے کہ یہ ملک بھی تقریباً ایسا ہی تھا کہ جسے ملک سے وہ ابھی گذر چکا تھا۔ اگر ''پی ، ٹو ، شی ، لو'' (Pi, to, Shih, lo) سیہون کے نزدیک تھا تو ''اے ، فان ، ٹو'' (A, Fan, tu) لاڑکانہ کے جنوب میں واقع ہوگا کیونکہ یوان چوانگ نے جو فاصلہ بیان کیا ہے وہ اِسی علائقہ کی نشان دہی کرتا ہے بشرطیکہ شمال مشرق کی سمت کا مطلب "شمال کے مشرق" سمجھا جائے۔ اگر یہ درست تسلیم کرلیا جائے تو پھر یہ یقین کرنے کا معقول وجہ موجود ہے کہ ''باڈھ'' (Badah) میں جو آثار، قدیم بستی کے موجود ہیں دراصل اِسی صوبہ کا دارالسلطنت تھا۔ جبکہ اسٹوپا جو بقول چینی زائر اِس دارالسلطنت کی شمال مشرق میں قریب ہی واقع ہے "اب بھی ایک سو فٹ بلند ہے حالانکہ اُس کی بنیادیں زمین میں دھنس کر نظروں سے اوجھل ہو چکی ہیں۔ اور یہ اسٹوپا موہن جو داڑو کا بدھ کا اسٹوپا ہی ہوسکتا ہے۔ ؎۱

بیان کے مطابق ۔ ''اے ، فان ، ٹو'' (A, Fan, tu) سے چینی زائر مسلسل شمال مشرق کی سمت سفر کرتا رہا اور نو سو لی چلنے کے بعد ایسے علائقہ میں وارد ہوا جس میں پہاڑ اور جنگلات کثرت سے پھیلے ہوئے تھے۔ آب ہوا سرد تھی اور باقاعدہ فصلیں اُگائی جاتی

تھیں۔ باشندے کمین فطرت اور ظالم تھے، اِس ملک کا نام ''فا، لا، نا'' (Fa,la,na) تھا اور یہ کافروں کے زیر اثر تھا۔ اِس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کافرستان (Kafiristan) تھا۔ جو دریائے کابل کے شمال مشرق میں واقع ہے اور ''فا، لا، نا'' (Fa,la,na) کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دریائے گومل (Gumal) جہاں اپنا آدھا بہاؤ طے کر لیتا ہے تقریباً اُس کے نواح میں واقع تھا۔ یوان چوانگ کہتا ہے کہ وہاں سے وہ شمال مغرب کی سمت دو ہزار لی کے فاصلہ تک سفر کرتا رہا اور ایک ایسے ملک میں وارد ہوا جس کا دارالسلطنت بہ ظاہر غزنی (Ghazni) سے ملتا جلتا ہے۔ دریائے گومل پر واقع وانیہ (Vaneh) اور غزنی (Ghazni) کے درمیان فاصلے دو ہزار لی سے کم ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ فا، لا، نا کا علائقہ برخان کے نواح میں تھا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ "لائف (Life) میگزین یوان چوانگ کے سفر نامہ کو پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ چینی زائر نے ''اے، فان، ٹو'' (A, fan, tu) سے مشرق کی سمت سات سولی کا سفر طے کیا جس کے بعد وہ مملکتِ سندھ میں وارد ہوا۔ اور یہ کہ یہاں سے پھر مشرق کی سمت نو سولی تک سفر کرتا رہا۔ اِس سفر میں اُس نے دریائے سندھ کو عبور کیا اور اِس طرح سے ''میو، لو، سان، پو، لیو'' (Meou, lo, San, pon, Liu) یعنی ملتان (Multan) پہنچا۔ یوان چوانگ نے اپنے سفر نامہ میں لکھا ہے کہ وہ جب فا، لا، نا، (Fa, La,Na) میں قیام پذیر تھا تو مقامی ذرائع سے اُسے معلوم ہوا کہ اِس علائقہ سے مغرب میں جو ملک ملحق ہے اُس کا نام کی ''کیا نگ نا'' (Ki, kiang na) ہے۔ جو پہاڑیوں کی وادیوں میں ہے۔ الگ الگ سردار اپنے علائقوں پر حکومت کرتے ہیں اور کوئی اعلیٰ اختیاری حکمراں پورے ملک پر قابض نہیں ہے۔ اِس ملک میں بھیڑوں اور گھوڑوں کی افراط تھی۔ اور خاص طور پر گھوڑے بہت عمدہ نسل کے ہوتے ہیں۔ اِن کے ڈیل ڈول بہت بڑے ہیں اور یہ دوسرے ممالک میں اچھی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں، اس سے ہمیں کافی مدد ملتی ہے۔ کیونکہ تاریخ ہندوستان چچ نامہ (Chach Nama)

میں کیکنان(Kaikanan) کا نام بار بار آتا ہے۔ کے کنان کے پہاڑوں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ مملکت سندھ کی شمالی سرحد میں تھی۔اور رائے سہاسی(Rai Sahasi) کا بیٹا رائے سہرس(Rai sahiras) سندھ کا حکمراں تھا۔

تحفتہ الکرام(Tuhfat-ul-kiram) نامی کتاب جس کا پہلا حصہ مذکورہ تاریخ پر مشتمل ہے یہ بیان کرتا ہے کہ مما لک کی سرحد قندھار (Kandhar) ، سیستان (Sistan) کوہ سلیمان (Suleman) اور کے کنان (Kaikanan) کے پہاڑی سلسلوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ چونکہ سلسلہ کوہِ سلیمان میدانِ سندھ سے ملحق ہے۔اِس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کیکینان کا پہاڑی سلسلہ اِس کے مغرب میں واقع ہوگا اور ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ علاقہ لورالائی (Loralai) اور ژوب(Zhob) کے موجودہ علاقوں پر مشتمل ہوگا۔عرب جب مکران(Makran) پر قبضہ کر چکے تو وہ اِس علاقہ میں پھیلتے گئے لیکن مقامی باشندوں کی طرف سے اُنھیں سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔تاریخ بتاتی ہے کہ خلیفہ معاویہ نے عبداللہ بن سواد کو اِن علاقوں کا حاکم مقرر کیا، گو یہ علاقے اُس وقت تک عربوں کے تسلّط سے آزاد تھے اور اُسے جو ہدایات دین وہ یہ تھیں۔ملک سندھ میں ایک پہاڑ ہے جو کہ کیکان کے نام سے مشہور ہے۔یہاں بڑے قد کے خوبصورت گھوڑے پائے جاتے ہیں باشندے بہت چالاک ہیں اور اِن پہاڑوں کی قدرتی فصیل کے تحفظ نے اُنھیں فطرتاً باغی بنادیا ہے۔[۲۰]

اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ چینی اور عرب مورخین ایک ہی ملک کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملک بلوچستان کے شمالی علاقہ میں واقع تھا۔ایک مقام جس کا نام کرکوان ہے وہ عرب اہل قلم کے بنائے ہوئے اُن نقشوں میں ملتا ہے۔جو مسالک وممالک" اور "اشکال البلاد" اور دوسری کتب میں موجود ہیں۔اِس مقام کا محل وقوع مذکورہ بالا تفصیلات سے ملتا جلتا ہے۔یعنی دریائے سندھ کے مغرب میں خاصے فاصلہ پر خضدار کے شمال میں (اِسی مقام نے قدیم زمانہ میں اپنا نام برقرار رکھا ہے) اور یہ ملتان

کے بالکل مقابل ہے۔ ممکن ہے کہ کرکوان ہی کے کنعان کا بگڑا ہوا نام ہو۔ دوسری طرف یہ بھی درست معلوم ہوتا ہے کہ کے کیکنان آج بھی ایک قدیم بستی کا نام ہے جو مزید جنوب کی سمت میں شمالی جھلاواں کے علاقہ میں ناّل کے قریب واقع ہے۔ لیکن اِس کا محل وقوع زائر کے بیان سے مطابقت رکھتا ہوا نہیں معلوم ہوتا۔ ۲۱

یواِن چوانگ نے سندھ اور اُس سے ملحق ممالک کے بارے میں جو تفصیلات پیش کی ہیں وہ اُس کے مشہور سفر نامہ کا سب سے زیادہ مایوس کُن حصّہ ہیں۔ ۲۲ اور یقیناً اُس نے مرکزی شہروں اور دوسرے مقامات کو جن ناموں سے پکارا ہے اُن کی شناخت اِس حد تک مشکل ہے کہ اُلجھن ہوتی ہے۔ اُس کے بیان میں جغرافیائی معلومات کا فقدان بہت افسوسناک ہے۔ لیکن مختلف علاقوں کے محل وقوع کو پہنچاننے میں زیادہ مشکل نہیں ہونی چاہئے بشرطیکہ ہم اُس کے بیان کردہ فاصلوں اور حالت کے مطابق ہی عمل کریں اور اُن میں اپنی طرف سے کوئی ردوبدل اِس کے علاوہ نہ کریں کہ "لی" کے پیمانہ سے جو فاصلہ اُس نے بیان کیا وہ ایک ملک کے طبعی حالات کے پیش نظر کسی قدر کم یا زیادہ ہوسکتا ہے اور یہ کہ بسا اوقات اپنے سفر کی سمت کا تعین کرتے ہوئے اُس نے سمت کو عمومی طور پر استعمال کیا ہے مثلاً ہوسکتا ہے کہ صحیح سمت "شمال مشرق شمال" نہ ہو بلکہ شمال ہی ہو۔

۶۴۲ عیسوی میں سندھ کی مملکت جس تنظیمی حیثیت میں تھی اُس کے متعلق چینی زائر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہاں ایک مرکزی حکومت تھی اور ملک مختلف ماتحت صوبوں میں تقسیم تھا۔ یہ حالت "چچ نامہ" یا تاریخ ہندوستان میں بیان کردہ رائے سہیرس کے دورِ حکومت کے سندھ سے مطابقت رکھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عرب تاریخ کا یہ حصّہ مقامی ہندو یا بدھ ذرائع سے حاصل کردہ معلومات پر مشتمل ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ مقامی باشندوں نے اپنی مملکت کی سرحدوں کو ازراہ تفاخر بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہوگا۔ چنانچہ کہا گیا ہے کہ مشرق یا شمال مشرق میں مملکت سندھ کی سرحد کشمیر تک تھی۔ مغرب میں مکران تک۔ جنوب مین بحرہ عرب کے ساحل تک اور شمال میں یا شمال مغرب میں کردستان اور ان کے

کیکنان کے پہاڑوں تک۔۲۳ مملکت میں "چار صوبے تھے جن پر انتظامی گورنر مقرر تھے" اِن صوبوں میں سے دو صوبے پنجاب کے دریاؤں کے آخری نصف حصّے کے میدانوں پر مشتمل تھے جن میں ملتان بھی شامل تھا، یہ مؤخرالذکر یواں چوانگ کے بیان کے مطابق ایک دوسری سلطنت کے طابع تھا جس کا نام "چھہ کہ (Cheh Ka) کا بتایا گیا ہے اور جس کا دارالسلطنت موجودہ سیالکوٹ کے نزدیک تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ محمد بن قاسم نے جب حملہ کر کے سندھ کی حکومت کا خاتمہ کیا تو یہ علاقہ اُس میں شامل تھا، چینی زائر کی سیاحت کے ستر سال کے بعد یہ واقعہ پیش آیا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ علاقہ اُس سے بھی پہلے وقتوں سے مملکتِ سندھ کا ہی حصہ رہا ہو اور صرف عارضی طور پر کسی وقت خودمختار رہا ہو۔ کم از کم یوان چوانگ نے اپنے سفرنامہ میں "چھہ کا (Cheh Ka) کے حکمراں کا تذکرہ نہیں کیا۔ چونکہ چینی سیاح نے اِس بات کو بڑی اہمیت دی ہے کہ کسی ملک کے حکمراں کا بدھ مذہب کے ساتھ کیسا سلوک ہے اور اُس نے یہ بات اپنے سفرنامہ میں بار بار تحریر بھی کی ہے۔ اِس لئے یہ قیاس کرنا کہ اُس زمانہ میں "چھہ کا" پر کوئی راجہ حکومت نہیں کرتا تھا، درست ہوگا۔۲۵

لیکن یہ وہ مسائل ہیں جن پر آنے والی جلد میں مزید روشنی ڈالی جائیگی۔ چچ نامہ میں آٹھویں صدی عیسوی کے سندھ کے بارے میں بہت کچھ جغرافیائی معلومات ملیں گی، خاص طور پر وہ زمانہ جب مسلمان خلیفہ کی فوجوں نے محمد بن قاسم کی سرکردگی میں سندھ پر حملہ کیا۔

عجیب اتفاق ہے کہ "ہند اور سندھ" کے بارے میں خلیفہ عثمان نے جو معلومات طلب کیں وہ ویسی ہی نامکمل ہیں جیسی کہ زیریں وادی سندھ کے متعلق سکندر اعظم کو اُس وقت مہیا کی گئی تھیں۔ جبکہ وہ ہندوستان میں داخلہ کی تیاری کر رہا تھا۔۲۶ خلیفہ کو بتایا گیا کہ "اِس ملک کا پانی کالا اور گندا ہے، اِس کے پھل تلخ اور زہریلے ہیں۔" جلد ہی عربوں کو معلوم ہوگیا جیسا کہ سکندر کو بھی معلوم ہوگیا تھا کہ ملک خوش حال ہے اور دو سال کی مہمات کے دوران صرف ایک مرتبہ اس کی فراہمی میں فوج کو دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور یہ بھی اُس

وقت کہ جب اُسے دو ماہ تک ایک ہی مقام پر قیام کرنا پڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علائقہ میں اناج کی قلّت تھی کیونکہ مقامی تاجر دوسرے علائقوں سے مکئی خرید کر منگوا رہے تھے۔ ۲۷ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ جب فوج نیرون کے مقام پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے تو پانی کی کمی تھی کیونکہ "اُس وقت تک دریائے جیہون (Jihun) یعنی مہران (Mehran) کا سیلابی پانی اِس مقام تک نہیں پہنچا تھا۔ اِسی بیان کی دوسری سطور سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نیرون پر مئی ۲۸ کے مہینہ میں فوج نے چڑھائی کی۔ ظاہر ہے کہ یہ مذکورہ مشکلات صرف اِس وجہ سے پیش آئیں کہ اُنھیں ملک کے متعلق کوئی تجربہ نہیں تھا، چند ماہ بعد ہی محمد بن قاسم کو اپنی پسند کے حالات کے تحت سوستان (Siwistan) پر حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ جبکہ شہر تین اطراف سے سیلاب کے پانی سے گھرا ہوا تھا۔ ۲۹ سندھ کے دوسرے شہروں پر بھی خصوصیت کے ساتھ سیلاب کا یہی اثر ہوتا ہے۔

دریائے سندھ اور اُس میں شامل ہونے والے بہت سے ندی نالوں نے محمد بن قاسم کی مہمات میں اہم کردار انجام دیا۔ اِس کے بعد ملک کے اندر کسی بڑے سیلاب کا ذکر نہیں ہے۔ ۳۰ لیکن متعدد جھیلوں اور تالابوں کا بیان ملتا ہے اور یہ واضح ہے کہ اِن میں سے کچھ خاصے لمبے چوڑے تھے۔ محمد بن قاسم نے دریائے سندھ کے ایک ایسے ہی دہانہ سے جو ساکرا Sakra کے نام سے مشہور تھا حملہ کے لئے بڑے ہتھیار کشتیوں کے ذریعہ سے روانہ کئے تھے۔ ۳۱ اِسی طرح بہمن آباد (Bahmanabad) پر حملہ کرنے کے لئے اُس منجھل ندی (Manjhal) کو سامان کی نقل و حمل کے لئے استعمال کیا۔ اِس طرح سندھیوں نے بھی بیٹ (Bet) کے نزدیک اپنی دفاعی لائن کو مستحکم کرنے کے لئے سامان اور سپاہی دریا کی ایک شاخ کو جو کوتک (Kotak) کے نام سے مشہور تھی۔ استعمال کیا تھا۔ اِن مثالوں کے علاوہ آبی گذرگاہیں عام طور پر قدرتی دفاعی لائن کے طور پر استعمال کی گئی ہیں۔

عرب حملہ کے وقت دریائے سندھ کے بہاؤ کے راستہ کے متعلق چچ نامہ سے کچھ

اندازہ قائم کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اُن مقامات کے تذکرہ سے جن کا محل وقوع آسانی کے ساتھ شناخت کیا جا سکتا ہے اور اِس میں جو کمی اور خامی باقی رہ جاتی ہے اُسے عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات سے دور کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بہر طور پیش نظر رکھنی ہوگی کہ اِن جغرافیہ دانوں کی اوّلین کتب بھی فتوحاتِ سندھ سے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد لکھی گئیں۔

ہم اپنے جائزے کو سمندر سے شروع کریں تو بہتر ہوگا۔

دیبل (Debal) کے شہر کو لیجئے (اُس زمانہ میں شہر کسی دوسرے نام سے پکارا جاتا تھا) یہ ایک بندرگاہ تھا اور البلاذری ۳۳ کے مطابق دریائے سندھ کے سب سے بڑے دہانہ پر کسی خلیج کے کنارے واقع تھا، دیبل کے محل وقوع کے متعلق موجود سطح ارض کے مطالعہ کے پیش نظر بہت کچھ بحث ہوتی رہی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جنرل ہیگ (Haig) اور میجر ریورٹی (Reverty) نے جن مقامات کی نشان دہی کی ہے یہ شہر وہیں یا اُن کے آس پاس آباد تھا، یعنی بگھاڑ (Baghar) شاخ پر جہاں ککڑ بکیر آباد (Kakar Bukerabad) ہے اور دوسرا مقام پیر پٹھو (Pir Patho) سے تھوڑا جنوب مغرب میں۔ لیکن ساحل سمندر یا دریائے سندھ کے دہانہ کے محل وقوع کے بارے میں یقینی معلومات نہ ہونے کی وجہ سے اِس سے زیادہ صحت کے ساتھ دیبل شہر کا محل وقوع مقرر کرنا ممکن نہیں ہے۔ ابتدائی برطانوی جہازیوں نے جس مقام کو دیول یا دیبل بیان کیا ہے وہ ممکنہ طور پر قدیم ہندو شہر "دیبل" نہیں ہو سکتا۔

غیر پختہ ہاتھوں کے بنائے ہوئے نقشے جو ابتدائی جغرافیائی کتابوں میں شامل ہیں وہ دریائے سندھ کو سمندر میں صرف ایک بڑے چشمے کی حیثیت سے شامل ہوتے ہوئے ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن المسعودی کے بیان کے مطابق دریا دو شاخوں میں منقسم ہو کر ساگرہ یا ساکرہ (Shagarah) قصبہ کے نزدیک سمندر میں گرتا تھا۔ البیرونی جس نے تقریباً ایک صدی بعد اپنی کتاب لکھی، کہتا ہے کہ دریائے سندھ دو شاخوں میں منقسم ہو کر سمندر میں گرتا تھا اور یہ ظاہر ہے کہ دونوں شاخوں کے دہانے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر

تھے۔ایک دہانہ شہرلوہرانی (Luharani) کے پاس" اور دوسری شاخیں مزید مشرق میں کچھ کی سرحد کے پاس جہاں وہ سندھ ساگر یعنی بحرِ سندھ کے نام سے مشہور تھیں" اِن شاخوں کی جُدائی کا مقام البیرونی کے بیان کے مطابق منصورہ میں یا اُس کے آس پاس تھا۔لیکن دوسری جگہ وہ کہتا ہے کہ "الور دریائے سندھ کی دو شاخوں کے درمیان آباد تھا۔۳۴

چچ نامہ میں اگر سندھ کے ڈیلٹا کے بارے میں کوئی اشارہ ملتا ہے تو وہ صرف یہ کہ ایک بیٹ (جزیرہ) نام کے ضلع کا ذکر کیا ہے جس میں سے عرب فوجیں دریائے سندھ کو عبور کرنے کے بعد گذریں اور یہ ایک جزیرے کی حیثیت رکھتا تھا۔جس جگہ دریا کو عبور کیا گیا اُس جگہ پاٹ کم چوڑا تھا،معلوم ہوتا ہے کہ چشمہ اِس جگہ پھٹ کر دو حصّوں میں بٹ گیا تھا جس کی وجہ سے درمیان میں ایک جزیرہ بن گیا تھا۔جہاں تک اِس جزیرے کے نام کا تعلق ہے اُس کی وجہ پانی کی دو حصّوں میں تقسیم معلوم نہیں ہوتی بلکہ اِس کا تعلق دریائے سندھ کی اُس شاخ سے معلوم ہوتا ہے جو اِس جزیرے کے مشرقی کنارے سے بہتی تھی۔ایسی شاخ کی موجودگی البلاذری کے بیان سے بھی ثابت ہے۔اُس نے یہاں ایک دریائی جنگ کا حال لکھا ہے جو راجہ ڈاہر کے بیٹے جےسینھ اور عرب فوجوں کے درمیان لڑی گئی،یہ لڑائی محمد بن قاسم کی فتوحات کے دس سال بعد واقع ہوئی۔محمد بن قاسم کو اِس حد تک مشرق میں پیش قدمی کرنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ وہ اِس شاخ تک پہنچتا،اور ہم یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے کہ کس مقام پر یہ شاخ دریا سے الگ ہوتی تھی۔چچ نامہ میں اُس بڑی شاخ کو البتہ "عظیم مہران" (Great Mehran) کا نام دیا گیا ہے۔ساگرہ یا ساکرا کے مقام پر اِس دریا کو عبور کیا گیا تھا،اور یہ مقام ضلع جھم (Jhim) کے اندر شامل تھا۔۳۶ ساگرہ یا ساکرا نام آریان کے بیان کردہ سنگالا☆ اور ٹالمی (Tolemy) کے سگاپا سے بہت ملتا جلتا ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ میرپور ساکرو ہی مقام ہے۔اِس کے متعلق یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریائے سندھ کی مغربی شاخ کا قدیم زمانہ میں جو آبی راستہ تھا یہ اُس پر آباد تھا،اور یہ بھی تقریباً

☆ سانگرہ دریائے سندھ کی شاخ تھی،جو سندھ کے جنوبی اضلاع کو آباد کرتی تھی۔(ادارہ)

یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جھمپیر اُسی پُرانے ضلع کا نام ہے۔

دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر، بیٹ (Bet) کے بالمقابل پہنچنے سے پہلے عرب جنرل کے سامنے نیرون (Nirun) کے لوگوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، اور ایک دوسرے مقام اشبہار (Ishbehar) کو وہ مغلوب کر چکا تھا، یہ مقامات ایک دوسرے سے کس سمت میں واقع تھے اِس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

نیرون کے بارے میں البتہ یہ ضرور معلوم ہے کہ یہ پہاڑی پر آباد تھا۔ اِس مقام کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں پہاڑیوں کی ایک قدرتی دفاعی لائن موجود تھی اور ایک قلعہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سیوستان کی فتح سے فارغ ہوکر جب محمد بن قاسم واپس آیا "تو نیرون کی پہاڑی پر واقع ایک قلعہ سے اُسے مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اِس کے قریب ایک تالاب تھا جس کا پانی بہت شفاف تھا، اور اِس کے چاروں طرف باغ ارم سے بھی زیادہ خوبصورت سبزہ زار تھا''۔ ۳۷ نیرون کے نزدیک ایک سرسبز میدان میں فوج نے پڑاؤ ڈالا اور یہاں سے سیوستان کی طرف پیش قدمی کی۔

مقامی طور پر یہ مشہور ہے کہ جس جگہ آجکل حیدرآباد واقع ہے نیرون اُسی جگہ آباد تھا، اِس کی تصدیق تحفتہ الکرام کے بیان سے بھی ہوتی ہے جس کے مطابق ۱۷۶۸ء میں میاں غلام شاہ نے نیرون کوٹ کے "شہر" کو اپنے دارالخلافہ کے لئے منتخب کیا اور اُس وقت وہاں ایک قلعہ کی تعمیر کا حکم دیا۔ ۳۸ اِس بیان کے باوجود میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ میجر ریورٹی کس بنیاد پر یہ تحریر کردیا کہ ''حیدرآباد شہر آباد کرنے کے متعلق سندھی کتابوں میں کوئی مواد ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ شہر اُسی مقام پر آباد کیا گیا ہے جہاں نیرون تھا''۔ ریورٹی صاحب چودسویں اور بارہویں صدی کے عرب مورخین کی تحریروں کو آنکھیں بند کر کے قبول کرتے ہیں۔ اپنی کتاب میں اِن مورخین کے بیانات کے برعکس نیرون کے محل وقوع کے بارے میں تین مختلف مقامات کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ۳۹ حیدرآباد کے لئے نیرون کے محل وقوع پر آباد ہونے کے متعلق ریورٹی کو جو اعتراض ہے وہ شاید یہ کہ منصورہ

(یعنی بہمن آباد) کی جگہ مصدقہ ہے اور دیبل کی جو جگہ اصطخری کے مطابق بیان کی گئی ہے اُس کے اور منصورہ کے عین وسط میں نیرون آباد تھا، لیکن حیدرآباد ایسے موقع پر آباد نہیں ہے۔ مذکورہ دونوں مقامات کے درمیان چھ منزلوں کا فاصلہ تھا۔۴۰ ابن حوقل کے بیان کے مطابق نیرون دیبل کی بہ نسبت منصورہ سے زیادہ قریب تھا، اور ریورٹی خود بھی اِس مصنف کا حوالہ دیتا ہے اور تحریر کرتا ہے کہ دیبل سے نیرون تک چار دن کی مسافت تھی، گویا منصورہ پہنچنے کے لئے صرف دو دن کی مسافت نیرون سے باقی رہ جاتی ہے۔۴۱ آجکل یقین کے ساتھ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بہمن آباد منصورہ سے حیدرآباد تین دن کی مسافت کے فاصلہ پر ہے، دو دن کی نہیں۔۴۲ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ مسلم فتوحات کے وقت اور اُس کے ایک ہزار سال بعد تک دریائے سندھ کا چشمہ صدر دونوں مقامات کے درمیان سے بہتا تھا، جسے عبور کرنا آدھے دن کی مسافت سے کسی طرح کم نہیں۔ لیکن دیبل اور نیرون کے درمیان ایسی کوئی دشواری راستہ میں حائل نہیں تھی۔۴۳ پھر بھی اگر ریورٹی کا نظریہ درست تسلیم کرلیا جائے تو ان کے مطابق نیرون اور دیبل کے درمیان چار دن کی مسافت حائل تھی، جبکہ عرب فوج جس کی معلومات کے مطابق کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا دیبل سے نیرون چھ دن کے بعد پہنچی۔ اِس فاصلہ کو پچیس ۲۵ فرسخ یعنی نوے میل بیان کیا گیا ہے۔۴۴

نیرون کے قدیم شہر کو حیدرآباد کے ساتھ شناخت کرلینے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ۴۵ جبکہ دریائے سندھ اِس شہر سے کم از کم سولہ میل مشرق کی سمت میں بہتا تھا۔ نیرون سے محمد بن قاسم سیوستان پہنچا۔ جسے ہم آجکل سہون کہتے ہیں، راستہ میں اُس نے ایک مقام پر پڑاؤ کیا جو موج (Moj) کے نام سے مشہور تھا اور یہ مقام معلوم ہوتا ہے کہ سیہون سے نزدیک ہی تھا۔ یہاں تک عرب فوج تیس ۳۰ فرسخ یعنی ایکسو دس ۱۱۰ میل طے کرچکی تھی۔ ہیگ کہتا ہے کہ دونوں مقامات کے درمیان سیدھا فاصلہ اسی ۸۰ میل ہے اور لکھتا ہے کہ فوجی اعتبار سے جنرل نے لمبا پہاڑی راستہ اختیار کیا جو زیادہ محفوظ ہے۔۴۶

سیوستان کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ مہران کے مغربی کنارے پر ایک قلعہ بند شہر تھا

اور ایک پہاڑی کی چوٹی پر آباد تھا۔ جس وقت عرب فوج یہاں وارد ہوئی تو موسمِ برسات تھا۔ ''دریائے سندھ کا سیلابی پانی قلعہ کی شمالی دیوار کے نیچے اڑل ندی کے ذریعے بہہ رہا تھا''۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دریائے سندھ اِس شہر سے مشرق کی سمت کافی فاصلہ پر بہتا تھا۔ ۴۷ تو سیلاب کا یہ پانی منچھر جھیل میں اڑل ندی کے راستے آرہا ہوگا، اور منچھر کے آبی ذخیرہ کو مغربی نارا جیسا کوئی دریا اور پہاڑی نالے پُر کررہے ہوں گے۔ ۴۸ چنانچہ منچھر کے زائد پانی کو اڑل ندی بہا کر جنوب مشرق میں کچھ فاصلہ پر دریائے سندھ میں ڈالتا ہوگا۔

جن عرب جغرافیہ نویسوں نے سندھ کے حالات قلمبند کئے ہیں اُنہوں نے کسی جگہ بھی منچھر جھیل کا ذکر نہیں کیا۔ ۴۹ لیکن یہ سمجھنا چاہئے کہ اُن لوگوں کی تمام تر توجہ پیش نظر موضوع پر ہی مرکوز رہی ہے اور منچھر مروجہ راستوں سے کسی قدر زیادہ فاصلہ پر واقع ہے۔ جہاں تک معاون دریا کا تعلق ہے تو سیوستان کا ہندو گورنر شہر چھوڑ کر بھاگ گیا تھا اور اُس نے سیسم (Sisam) نامی مقام پر پناہ لی تھی جہاں بودھیہ (Budhih) صوبہ کا گورنر رہتا تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ مقام کُمبھ ندی کے کنارے آباد تھا۔ ہیگ کا خیال ہے کہ یہ دونوں مقامات منچھر جھیل کے کنارے پر آباد تھے۔ ۵۰ لیکن ہیگ کے نظریہ پر ٹھوس اعتراضات کئے جاسکتے ہیں اول تو یہ کہ سیوستان کا صوبہ اُس زرخیز میدان میں پھیلا ہوا ہوگا جو شہر کے شمال میں واقع تھا اور دوسرے صوبہ کا صدر مقام یقیناً اِس شہر سے دس بارہ میل سے زیادہ ہی فاصلہ پر واقع ہوگا۔ مزید براں اگر سوستان کا گورنر اپنا صدر مقام چھوڑ کر اِس لئے بھاگا تھا کہ عرب فوج کے خلاف مزاحمت کے لئے مدد حاصل کرے تو صرف دس بارہ میل دور چلے جانا کیا بے معنی نہیں۔ ۵۱ ممکن ہے کہ کُمبھ بھی کوئی جھیل ہو لیکن یقیناً یہ منچھر نہیں تھی اور گمان غالب یہ ہے کہ یہ کوئی چھوٹا دریا تھا جو اگر غربی نارا نہیں تو اِس سے ملتا جُلتا ضرور تھا، جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے اِن چھوٹے دریاؤں اور ندیوں کے کنارے بڑے شہروں کی آبادکاری کے لئے زیادہ موزوں تھے، لہٰذا میں یہ کہوں گا کہ سیسم کا مقام شمال کی طرف کم از کم اتنے فاصلہ پر ضرور واقع تھا جتنے فاصلہ پر کگڑ ہے۔

اِس کے بعد محمد بن قاسم نے سیسم کو بھی فتح کر لیا۔ اور بہت سے ہندو سردار اور عوام وہاں سے شمال کی طرف اندرون ملک ہجرت کر گئے، اور بہت سے بودھیا کا صوبہ چھوڑ کر "ایک قلعہ بند شہر بھٹ لور (Bhatlor) میں پناہ گزین ہو گئے۔ یہ شہر سلوج (Saluj) اور قندابیل (Qandabil) کے درمیان واقع تھا۔ مذکورہ تمام مقامات میں قندابیل ایسا ہے جس کا ذکر آنیوالے جغرافیہ نویس عربوں نے اپنی کتابوں میں بار بار کیا ہے اور یہ شہر اُن کے نقشوں میں بھی دکھایا گیا ہے۔ ابن حوقل بیان کرتا ہے کہ نودھیا (بودھیا) ایک میدانی علائقہ تھا، جو توران اور مکران کے درمیان پھیلا ہوا تھا۔ اِس طرح سے کہ ایک جانب توران اور مکران اور دوسری جانب ملتان اور منصورہ کے شہر تھے اور یہ ملک مہران کے مغرب میں تھا۔ قندابیل اِس کا تجارتی مرکز تھا۔

ظاہری طور پر نودھیا کا صوبہ موجودہ کچھی کے علاقہ سے مماثل ہے اور اِس میں شاید شمالی مغربی سندھ کا علائقہ بھی شامل تھا۔ قندابیل کے متعلق عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ گنڈاوا کا قدیم نام تھا۔ "کتاب مسالک وممالک" میں جو نقشہ دیا گیا ہے اُس میں قندابیل کا محل وقوع بھی یہی ثابت کرتا ہے۔ یہاں سے ملتان اور منصورہ علی الترتیب دس اور آٹھ دن کی مسافت پر واقع ہیں۔ ۵۳؎ بہر نوع مسالک اور ممالک کے مضمون میں یہ تفصیل شامل ہے کہ قندابیل بودھیا کا صدر مقام ہے اور خضدار شہر سے پانچ فرسخ کے فاصلہ پر ایک میدان میں آباد ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شہر جھلوان کے پہاڑی علائقہ میں تھا۔ ریورٹی (Reverty) کا خیال ہے کہ یہ شہر موجودہ زہری (Zihri) کی جگہ آباد تھا۔ یہ جگہ خضدار سے پندرہ میل جنوب مشرق میں ہے، لیکن یہ بات تسلیم کر لی جائے تو مذکورہ بالا نقشہ ایک حماقت نظر آتا ہے جس کو خود ریورٹی بھی اپنے نظریہ کے ثبوت میں بار بار پیش کرتا ہے۔ ۵۵؎ خضدار اور قندابیل کے درمیان ایک علائقہ حائل ہے اور گو کسی چیز کو بھی پیمانہ کی صحت کے مطابق تو بیان نہیں کیا جا سکتا پھر بھی درمیان فاصلہ پچاس میل سے کم نہیں معلوم ہوتا مزید یہ کہ دونوں مقامات کے درمیان واضح طور پر سکندر اعظم کا شہر دکھایا گیا ہے، اِس ضمن میں

جب ہم چچ نامہ سے مدد لیتے ہیں تو اُس کے ابتدائی حصہ میں ہمیں گنڈاوا کی حمایت میں شہادتیں ملتی ہیں، اِس حصہ میں رائے چچ کی آخری مہم کا بیان دیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ مکران سے واپسی پر وہ ازمیل (Azmil) کے مقام پر شمال کی جانب مُڑ گیا۔ توران سے گذرا (یہ علاقہ خضدار کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے)۔ اور اِس کے بعد ''صحرا میں وارد ہوا''۔ ریگستان میں کسی قبیلہ نے اس کی مزاحمت نہیں کی۔ تا آنکہ وہ قندابیل پہنچ گیا۔ جس کا دوسرا نام قندھار بھی تھا۔ اُس جگہ کے نواح سے جو وادی میدانوں تک چلی گئی تھی وہاں چچ نے شہر پر حملہ کرنے کی تیاریاں کیں وغیرہ وغیرہ ۵۶ یہ بیان مطابق واقعہ ہے کیونکہ خضدار سے مولا دریا کی وادی گنڈاوا تک پھیلی ہوئی ہے۔ دونوں مقامات کے درمیان تقریباً اسّی میل کا فاصلہ ہے۔ گویا پانچ دن کی مسافت۔ اِس حساب سے یہ پچیس فرسخ سے کچھ کم ہوا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اِس مقام پر مسالک وممالک کے مضمون میں کوئی غلط نقطہ یا عدد داخل ہو گیا ہے۔

عرب جنرل نے اِس ملک میں پیش قدمی نہیں کی ۵۷ بلکہ سیسم سے نیرون لوٹ گیا۔ کیونکہ خلیفہ کی طرف سے مشرقی ممالک کے امیر حجاج کا یہی حکم تھا۔ اُس نے حجاج کو مطلع کیا کہ "وہ دریائے مہران پر واقع شہر اگھرور (Aghror) کے قلعہ بند مقام کے سامنے تک "بودھیا صوبہ کا تمام علاقہ فتح کر چکا ہے۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اگر دریا بھگرور مہران کے بائیں کنارے پر روہڑی یا بکھر کے آس پاس واقع تھا۔ جہاں تک بالائی سندھ میں دریا کے آبی راستے کا تعلق ہے اِسی کتاب سے بالواسطہ ایک اشارہ ہمیں ملتا ہے کہ جب رائے چچ الور سے بودھیا اور سوستان کے خلاف فوج کشی کے لئے روانہ ہوا تو اُس نے مہران کے بائین کنارے سے دائیں کی طرف عبور کیا، یہاں ایک گاؤں دہایت (Dihayat) نام کا آباد تھا، ''جو سمہ اور الور کی درمیانی سرحد پر واقع ہے''۔ اور جنرل ہیگ کہتا ہے کہ یہ کنڈیارو تعلقہ میں موجودہ " دیہات " نام کی بستی کا ہی قدیم نام ہے۔ جہاں دریا کی قدیم گذرگاہ "لوہانو ڈھورو" واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ موجودہ دریائے سندھ

سے یہ گذر گاہ اوسطاً سترہ میل کے فاصلہ پر ہے۔۵۹

شاید دفاعی ضروریات یا حجاج کے احکامات نے محمد بن قاسم کو مجبور کیا کہ وہ دریائے سندھ کو زیریں علاقہ میں عبور کرے جہاں "ضلع سگارہ" واقع تھا۔ اور عربوں نے دریا عبور کرنے کے بعد جھم اور بیٹ کے قلعوں کو فتح کر لیا اِس کے بعد راوڑ کی جانب پیش قدمی کی جہاں راجہ ڈاہر سندھ کی مرکزی فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ یہ قلعہ بند آبادی جس کی بنیاد چچ نے رکھی تھی اور جسے اُس کے بڑے بیٹے داہر سیہ نے مکمل کیا تھا۔۶۰ سندھ کے اُسی صوبہ میں واقع ہیں لیکن بہمن آباد سے جنوب میں کافی فاصلہ پر واقع تھی کیونکہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ اِن دونوں مقامات کے درمیان بہرور اور ڈھال لیال نامی دو مضبوط قلعے تھے۔ ڈاہر جب سندھ کی گدی پر بیٹھ گیا تو اُس نے یہ معمول بنالیا تھا کہ گرمی کے چار مہینے راوڑ میں گذارتا تھا۔ "کیونکہ شہر کی آب وہوا بہت خوشگوار اور ٹھنڈی تھی اور پانی میٹھا تھا۔ راوڑ پہنچنے کے لئے عربوں کو دو دریائی جھیلیں عبور کرنی پڑیں، دوسرے کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ دادواہ نام کی ایک نہر تھی۔

اس زمانہ می دریائے سندھ ایک وسیع وعریض ڈیلٹا کے اطراف سے بہہ کر سمندر تک پہنچتا تھا۔ جیسا کہ اِس زمانہ سے قبل اور بعد میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ تو یقیناً دادواہ، دریائے سندھ کی مشرقی شاخ ہوگی۔ بیان کیا گیا ہے کہ یہ راوڑ اور جے پور یا جے ورنامی مقام کے درمیان سے گذرتی تھی۔ وہ لڑائی جس نے سندھ کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا اور راجہ ڈاہر کی جان لے لی دریائے مہران اور داد واہ کے درمیانی علاقہ میں لڑی گئی، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ راوڑ کا قلعہ دونوں دریاؤں سے نزدیک تھا۔۶۲

البلاذری کا بیان ہے کہ عرب فوج نے جس مقام پر دریا کو عبور کیا وہ مقامی راسل کی عملداری میں واقع تھا جو "ہند کے ملک قصا (Qassa)" کا راجہ تھا۔ اِس مقام کو کچھ پڑھا جا سکتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ راجہ ڈاہر کی سلطنت کا ہی ایک صوبہ تھا۔ اور راسل اُس کا ایک گورنر تھا۔ لیکن اِس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ دریا کو عبور کرنے کا مقام موجودہ "کچھ"

کی سرحد سے نزدیک تھا۔ مزید یہ کہ راوڑ شہر کو شناخت کرنا بہت مشکل ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ جنرل ہیگ کا نظریہ غلط ہے کہ یہ شہر بہمن آباد سے اسّی میل کے فاصلہ پر مشرقی نارا کے کنارے پر آباد تھا۔ ۶۳

اِس کے بعد محمد بن قاسم بعد دیگرے بہرور اور ڈھال لیال کے قلعوں پر بھی قبضہ کرلیا، اور بہمن آباد کی جانب بڑھتا رہا۔ یہ بتایا گیا ہے کہ ڈھال لیال ایک منجھل نام کی ندی کے کنارے آباد تھا، اور جو لوگ راڑل اور ہندوستان کی طرف فرار ہو رہے تھے۔ اُنھیں اِس ندی کو عبور کرنا پڑا۔ ۶۴ یہ دریا خاصہ اہمیت کا حامل تھا کیونکہ اِس موسم میں اِس میں کشتی رانی ہوسکتی تھی۔ عرب فوج کے لئے اِس میں کشتیاں جمع کی گئیں جو شمال میں وڈھا تیھ (Wadaha Teh) نامی مقام تک پہنچیں۔ یہاں سے بہمن آباد صرف تین میل تھا۔ جنرل قاسم خود جل والی (Jawali) واھڑ کے کنارے تک گیا جو بہمن آباد کے مشرق میں واقع تھا اور وہاں خیمے ایستیادہ کرنے کا حکم دیا۔ ۶۵

بہمن آباد کا محل وقوع طویل بحث مباحثہ کا موضوع بنا رہا ہے جس کی خاص یہ وجہ عرب جغرافیہ نویسوں کے بیانات کا اطلاق ہے جو اُنھوں نے منصورہ کے متعلق تحریر کئے ہیں کیونکہ منصورہ وہ شہر ہے جو بہمن آباد کے کھنڈرات پر آباد کیا گیا تھا۔ اِس کے نواح میں کھنڈرات کے تین بڑے اجتماعات ہیں، اِن میں سے دو ایک قدیم آبی گذرگاہ کے داہنے کنارے پر یا مغرب میں واقع ہیں۔ دونوں کے درمیان آدھ میل کا فاصلہ ہے۔ اور اِس زمانہ میں یہ "بر ہمن آباد" اور "دلور" (Dalur) کے نام سے مشہور ہیں، اور تیسرا یہاں سے تقریباً پانچ میل شمال مشرق میں ہے، جو خشک آبی گذرگاہ کے بائیں کنارے پر یا مشرق میں واقع ہے اِس گذرگاہ کو "ڈیپر گھانگھرو" کہا جاتا ہے۔ مقامی روایات میں منصورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے

چنانچہ بہمن آباد کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے یہ ضروری ہے کہ اِس کی جگہ آباد ہونے والے شہر کا حوالہ دیا جائے الاصطخری جس نے المسالک والمما لک تصنیف کی اور الادریسی

متفقہ طور پر یہ کہتے ہیں کہ منصورہ شہر ایک مربع میل کے علائقہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور اِس کے اطراف میں مہران اور اُس کی ایک شاخ بہتی تھی۔ الادریسی کا قول ہے کہ یہ مہران سے کچھ فاصلہ پر آباد تھا اور اِس کی بڑی شاخ کے مغرب میں آباد تھا۔ ٦٦ بھونڈے نقشے جو المسالک والممالک اور اشکال البلدد میں شامل ہیں۔ ٦٧ دونوں ہی نے دریائے مہران کو صوبہ سندھ کے وسط سے گذرتے ہوئے دکھایا ہے۔ مشرق کی طرف ایک شاخ نکلتے ہوئے بھی دکھائی گئی ہے جو ایک خاصے بڑے علائقہ کا احاطہ کرنے کے بعد پھر بڑے دریا سے مل جاتی ہے۔ لیکن اِس جزیرے میں منصورہ کا جو محل وقوع ظاہر کیا گیا ہے وہ دونوں میں بہت مختلف ہے۔ المسالک والممالک کے نقشہ کے مطابق یہ شہر دریا کی شاخ کے داہنے کنارے پر گویا مغرب میں آباد تھا۔ جبکہ اشکال البلدد نے شہر کو بڑے دریا کے بائیں کنارے پر گویا مشرق کی سمت جزیرے پر دکھایا ہے۔

جو کھنڈرات بڑی اور متروک آبی گذرگاہ کے داہنے کنارے پر آج نظر آتے ہیں اُنھیں دیکھ کر ''المسالک والممالک'' کا بیان درست معلوم ہوتا ہے۔ یہ آبی گذرگاہ بڑے دریا کی شاخ تھی جو کچھ دور مغرب میں بہتا تھا، اور "لوہانو ڈھورو" کی گذرگاہ سے قریب تھا۔ چونکہ یہ کھنڈرات جو ایک مربع میل میں پھیلے ہوئے ہیں آج بھی برہمن آباد یا ''بھجر اجوتھل" کے نام سے مشہور ہیں اِس لئے یہ مفروضہ درست معلوم ہوتا ہے کہ منصورہ شہر پُرانے شہر کے خاص اوپر آباد کیا گیا تھا۔

البلاذری نے ٢٧٠ ہجری یعنی ٨٨٣-٨٨٤ عیسوی میں کتاب قلمبند کی اور اِس طرح یہ مصنف بہمن آباد کے خاتمہ اور منصورہ کی بنا کے زمانہ سے قریب تر ہے، اِس کا بیان مذکورہ بالاتحریر کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے، وہ کہتا ہے " محمد بن قاسم منصورہ سے دو فرسخ کے فاصلہ پر واقع پُرانے شہر بہمن آباد گیا، لیکن حقیقت میں یہ شہر کوئی وجود نہیں رکھتا تھا کیونکہ جہاں یہ آباد تھا وہاں اب جنگل تھا، ڈاہر کی بچی کھچی فوج بہمن آباد میں جمع ہوئی لیکن اُسے پھر شکست کا منہ دیکھنا پڑا، جنرل محمد بن قاسم نے وہاں ایک گورنر مقرر کر دیا، " یہ جگہ اب

کھنڈرات بن چکی ہے۔ ۶۸

دوسری سطور میں البلاذری لکھتا ہے کہ وہ دریائی دہانہ جو جھیل کے مقابل تھا اُس کے ایک کنارے پر منصورہ اور دوسرے کنارے پر محفوظہ آباد کیا گیا، محفوظہ ایک چھوٹی قلعہ بند جگہ تھی جسے عربوں نے اپنی فوجی چھاؤنی کی حفاظت کے لئے تعمیر کیا تھا، نیز اُن مسلمانوں کی حفاظت کے لئے بھی جو وہاں آباد تھے، کیونکہ اِن فتوحات کے فوراً بعد ہی ملک میں ہندوؤں کی طاقت دوبارہ اُبھر رہی تھی، اور چند سال بعد جب مسلمانوں کا تسلط مکمل ہو گیا تب منصورہ آباد کیا گیا۔

کزنس (cousens) نے بڑے کھنڈرات کی کھُدائی کے بعد یہ دریافت کیا کہ مسلمانوں کے زمانہ کے شہر کے نیچے ایک ہندو شہر کے آثار موجود ہیں اور ہم اعتماد کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہندوؤں کا پُرانا کا شہر ہی بہمن آباد تھا، اِس طرح مقامی روایت کی تصدیق ہو جاتی ہے، مزید براں ہم اُس کی یہ رائے بھی قبول کر سکتے ہیں کہ "دلور" کی جگہ محفوظہ آباد کیا گیا تھا، اور البلاذری کی بیان کردہ جھیل یا دہانہ کے آثار آدھی میل چوڑی اُس پٹی میں نظر آ سکتے ہیں جو اِن کھنڈرات اور بہمن آباد کے کھنڈرات کے درمیان واقع ہے، یہ آثار واضح طور پر ایک بڑے تالاب یا جھیل کی نشان دہی کرتے ہیں جو قدیم دریائی راستہ سے ملی ہوئی تھی۔ ۶۹

اب دیکھنا یہ ہے کہ البلاذری کے اِس بیان میں کس حد تک صداقت ہے کہ منصورہ پُرانے بہمن آباد سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر آباد کیا گیا تھا، البلاذری کے اِس بیان سے جنرل ہیگ (Gen Haig) اور ریورٹی (Reverty) نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ بہمن آباد اُس جگہ واقع تھا۔ جہاں ڈیپر گھانگھرو کے کھنڈرات ہیں کیونکہ یہ اتنے ہی فاصلہ پر شمال مشرق میں واقع ہیں۔ لیکن نسبتاً یہ بہت چھوٹی بستی کے کھنڈرات ہیں اور کسی وقت بھی یہاں ایک بڑا شہر آباد نہیں رہا ہوگا، نہ یہاں فصیل کے کوئی آثار ملتے ہیں، علاوہ ازیں وہ چھوٹا دریا جو کبھی اِس کے برابر سے بہتا ہوگا اُس کے خشک راستہ کے بائیں کنارے پر یعنی

مشرق میں یہ کھنڈرات واقع ہیں، جبکہ چچ نامہ سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ بہمن آباد جل والی ندی کے مغربی کنارے پر آباد تھا اور محمد بن قاسم نے اِس کے کنارے پر پڑاؤ ڈالا تھا۔ اے

چنانچہ اِس میں کسی شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ بہمن آباد بڑے کھنڈرات میں واقع ہے جو آج تک (ذراسی تبدیلی کے ساتھ) اُسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں، حالانکہ بعد میں یہ جگہ منصورہ کے نام سے پکاری جاتی رہی۔ بہمن آباد کو محمد بن قاسم نے مسمار نہیں کیا تھا، لیکن جس وقت مسلمان محفوظہ آباد کر رہے تھے، اُس وقت اُنھوں نے شاید مقامی باشندوں کو باہر نکال دیا اور ہندوؤں کے انخلاء کے بعد یہ شہر کھنڈرات میں تبدیل ہو گیا، چند سالوں کے بعد اِس کے اوپر اور اِس کے ملبہ سے منصورہ آباد کیا گیا۔ ۲ے البلاذری کے متعلق ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ کبھی سندھ آیا ہو، معلوم ہوتا ہے کہ اُسے محفوظہ اور منصورہ کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں وہ اُس نے خلط ملط کر دیں۔

کتاب "مجمل التواریخ" جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ہندوؤں کی ایک پُرانی کتاب سے ترتیب دی گئی ہے یہ بیان کرنے کے بعد کہ بہمن نے کس طرح بہمن آباد کی بنیاد رکھی، کہتی ہے "ایک روایت کے مطابق یہ منصوریہ ہے، واللہ اعلم"۔ ۳ے

میرا خیال ہے یہ قیاس کرنا درست ہوگا کہ ڈیپر گھانگھرو کا خشک آبی راستہ قدیم زمانہ میں جل والی ندی تھا، اور یہ کہ اِس سے بڑا دریا منجھل تھا جو برہمن آباد اور دِلور کے پاس سے گذرتا تھا، اور یہی مہران کی ایک شاخ تھی جس کے راستے عربوں نے اپنی فوج اور سامان کو ڈھال لیال سے واڈھاتیہ تک پہنچایا تھا، اِس کی وجہ کیا تھی کہ عربی فوج کے سپہ سالار محمد بن قاسم نے اِس مقام پر دریائی راستہ ترک کر کے خشکی میں مشرق کا راستہ اختیار کیا اور برہمن آباد سے تین میل کے فاصلہ پر پڑاؤ ڈالا وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ ایک مستحکم قلعہ سے جو دشمن کے ہاتھ میں تھا، محفوظ فاصلہ پر رہنا چاہتا تھا، تاکہ حملہ کے لئے اپنی فوج کو یہ اطمینان سے تیار کر سکے۔

دریائے منجھل شہر کی دیوار کے نیچے سے بہتا تھا اور اِس کے مقابل کنارے پر رہنے کی وجہ سے عرب فوج اچانک حملہ سے محفوظ تھی۔ قیام کا یہ زمانہ چھ ماہ طویل تھا، اِس دوران پانی کی سطح گھٹتی رہی حتیٰ کہ دریا حملہ آور فوج کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا کرنے کے قابل نہ رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فیصلہ کن حملہ خشکی کی جانب سے کیا گیا، یعنی مغربی سمت سے، کیونکہ یہ کہا جاتا ہے کہ فوجی دستے شہر کے مشرقی دروازے سے نکل کر فرار ہوئے تھے، ظاہر ہے کہ مسلمان فوج مغرب کی طرف سے شہر میں داخل ہو رہی ہوگی۔

کزنس (Cousens) کا خیال ہے کہ ڈیپر گھانگھرو کے کھنڈرات جن میں اہم حصہ اسٹوپا ہے۔ ممکن ہے ایک بودھسٹ (Buddhist) نوآبادی ساوندی کے آثار ہوں، جس کے نزدیک بہمن آباد سے نکلنے کے بعد محمد بن قاسم نے پہلا پڑاؤ کیا، اور یہ دلچسپ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ شاید یہی وہ بودھ دارالعلوم تھا جس کا نام بودھ نوبہار مشہور ہے اور جس کے بڑے عالم سے ملاقات کے لئے بہمن آباد پر قبضہ کرنے کے بعد چچ خود آیا تھا۔[۴۲]

محمد بن قاسم کا دوسرا اقدام بہرور پر فوج کشی تھا جس کے بعد سمہ اور سہتہ قبیلے اُس کے مطیع ہو گئے، سہتہ قبیلے نے الور تک پڑاؤ کے لئے مناسب مقامات کے لئے عرب فوج کی راہنمائی کی۔ روہڑی کی پہاڑیوں کے جنوب میں جو ریگستانی علاقہ پھیلا ہوا ہے اُس کے فوراً مغرب میں واقع علاقہ آج بھی ساہتی کے نام سے مشہور ہے، ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ عرب فوج کی پیش قدمی دریا کے ساتھ ساتھ تھوڑے فاصلہ پر جاری رہی ہوگی۔ یعنی لوہانہ ڈھورو کی خشک آبی گذرگاہ کے مشرق میں۔

میجر ریورٹی (Reverty) کا نظریہ ہے کہ دریائے مہران (اِس زمانہ سے بہت پہلے اور صدیوں بعد تک) نارا کی آبی گذرگاہ سے بہتا تھا، اور دو شاخوں میں منقسم تھا جو جاکھرو کے آس پاس سے الگ ہو کر جنوب مشرق اور جنوب مغرب کی سمت بہتی تھیں، لیکن

میں پہلے ہی یہ ثابت کر چکا ہوں کہ یہ نظریہ غلط ہے، کیونکہ سطحی ارضی مطالعہ اِس کے خلاف شہادت مہیا کرتا ہے۔ وہ خود بھی قارئین کی توجہ اِس امر کی جانب مبذول کرتا ہے کہ گو عرب فوج کو مہران پار کرنا پڑا ہوگا۔ میجر ریورٹی کی بیان کردہ اپنی شاخ، اور وہ بھی بہمن آباد سے الور کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے سفر کے ابتدائی ایام میں۔ لیکن چچ نامہ دریا عبور کرنے کے کسی واقعہ کا ذکر نہیں کرتا۔ اِس کے باوجود ریورٹی اُسی غلط خیال کی طرف پلٹ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ شاید اپنے پہلے قیام کے نزدیک یعنی کر بھائی ''ڈنڈھ'' کے مقام پر اُنہوں نے دریا عبور کیا ہوگا۔ ۸۵ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دریا کو عبور کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی کیونکہ بہمن آباد اور الور، دونوں مقامات دریائے مہران کے ایک ہی کنارے پر واقع ہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ عرب فوج بہت پہلے ہی دریا کے بڑے چشمے کو پار کر چکی ہو اور بہمن آباد پہنچنے سے پہلے اُنھیں اِس کی مشرقی شاخ کو عبور کرنا پڑا ہو جو دادواہ ۷۶ کے نام سے مشہور تھی''۔

مہران کے ضمن میں الور شہر کا تذکرہ پہلی بار المسعودی کی کتاب میں ملتا ہے جو ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی۔ وہ لکھتا ہے کہ اُس مقام پر یا اُس کے قریب جہاں سے دریا دو شاخوں میں منقسم ہوتا ہے۔ ۷۷ اور یہ دونوں شاخیں شاکرہ کے مقام پر سمندر میں داخل ہونے تک مہران ہی کہلاتی ہیں، " شاکرہ دیبل شہر سے تقریباً دو دن کی مسافت کے فاصلہ پر واقع ہے۔

لیکن سندھ کے طبعی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے اِس بیان پر یقین کرنا ممکن نہیں، کیونکہ اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ اُس کی بیان کردہ بائیں شاخ نارا تھی اور داہنی شاخ زیریں سندھ کے علاقہ میں پُران کی گذرگاہ سے بہتی تھی، جس کی وجہ سے دونوں ایک ساتھ ہی رن کچھ میں گرتی تھیں تو دیبل سے یہاں تک کا فاصلہ دو دن کی مسافت سے کہیں زیادہ ہوگا، علاوہ اپنی ایک دوسری کتاب میں جو اُس نے بعد میں لکھی المسعودی فاصلہ کو خود ہی کم کر دیتا ہے اور

دو فرسخ بیان کرتا ہے۔۷۸ے اِس سے قطع نظر وہ ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ الور مہران کے مغربی کنارے پر آباد تھا، (اگر مضمون کی عبادت میں کوئی غلطی نہیں رہ گئی) تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ شہر کے نزدیک سے طغیانی کے زمانہ میں جو دریا کا پانی بہتا تھا وہ اُسے ہی دریا کا بڑا چشمہ سمجھتا ہے۔ الور کا اصل محل وقوع پہلے باب میں بیان کیا جاچکا ہے۔۷۹ے چچ نامہ کا مصنف لکھتا ہے کہ رائے سہی راس کے زمانہ میں "اِس شہر میں بہت سے شاہی محلات تھے، باغ اور بارہ دریاں تھیں، فوارّے چشمے، سبزہ زار اور درخت تھے۔ یہ ایک دریا کے کنارے پر تھے، جو مہران کہلاتا تھا۔۸۰ے

البلاذری کا بیان ہے کہ الور پہاڑی پر آباد تھا اور دوبار بگھرور کے ساتھ اِس کو بیان کرتا ہے، چچ نامہ بھی یہ کہتا ہے کہ بگھرور کا قلعہ مہران کے کنارے اروڑ کے علائقہ میں واقع تھا اور اروڑ کے قلعہ کے بالکل مقابل تھا۔۸۱ے

الاسطخری نے بگھرور کا ذکر نہیں کیا، وہ ہر نوع یہ ضرور کہتا ہے کہ الور (ال رور) رقبہ میں ملتان کے برابر تھا۔۸۲ے چچ نامہ کے مطابق اِس شہر میں کشادہ عمارات اور بتوں کے مندر تھے اور یہ کہ محمد بن قاسم نے شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر پڑاوَ ڈالا لیکن کس سمت میں، یہ اُس نے بیان نہیں کیا اور نہ یہ کہ کس سمت سے شہر میں داخل ہوا۔

الور پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمان سندھ کے باقی دو شمالی صوبوں کی طرف متوجہ ہوئے جو پنجاب میں تھے۔ اِس فوج کشی کا بیان پنجاب کے دریاؤں کے آبی راستوں کے بارے میں کچھ معلومات بہم پہنچاتا ہے، عربوں نے سب سے پہلے باٹیہ پر قبضہ کیا۔۸۳ے یہ ایک قلعہ تھا جو دریائے بیاس کے بائیں کنارے پر یعنی جنوب میں واقع تھا۔ یہ دریا اُس زمانہ میں اپنی الگ گذرگاہ رکھتا تھا اور ملتان سے آگے دریائے چناب سے ملتا تھا۔ یہ واضح رہے کہ دریائے ستلج کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، ہوسکتا ہے کہ اُس زمانہ میں دریائے ستلج میں جب طغیانی آتی تھی تو سیلابی پانی کی کثیر مقدار ہکڑا کی آبی گذرگاہ سے ہوتی ہوئی الور شہر کے مشرق سے

بہتی تھی اور کچھ دور تک ناؔرا کی وادی سے بھی گذرتی تھی۔ لیکن میں اِس نظریہ کا قائل ہوں کہ ستلج اور بیاؔس کے بعد مشترکہ بہاؤ کا نام بیاؔس تھا کیونکہ بڑا آبی بہاؤ اُس آبی گذرگاہ سے بہتا تھا جو اگلے وقتوں میں صرف دریائے بیاؔس کے پانی کے تصرف میں تھی اور بڑا دریا اُس میں ضم ہوتا تھا۔ بہرنوع اِس امر پر کہ پہلے لکھنے والوں نے ستلج کا کوئی ذکر نہیں کیا کسی مفروضے کی بنیاد رکھنا غلط ہوگا۔

محمد بن قاسم دریا عبور کر کے بیاس کنارے پر پہنچا، اور اسکندہ کی فصیل کے نیچے سندھی فوجوں سے اُس کی مڈبھیڑ ہوئی۔ ۸۴؎ دن بھر لڑائی کے بعد سندھی فوجوں کا سپہ سالار رات کے وقت قلعہ چھوڑ کر پیچھے ہٹ گیا اور دوسرے قلعہ میں چلا گیا جو سکہء ملتان کے نام سے مشہور تھا اور رادی کے جنوب یعنی بائیں کنارے پر واقع تھا۔ موجودہ زمانہ کی دریائی معلومات کے پیش نظر ہمیں مذکورہ تفصیلات میں بہت کچھ نظر آتا ہے، اِس وقت ملتان سے تقریباً چالیس میل اُوپر دریائے راوؔی چناؔب سے ملتی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت راوی دریائے چناب یا دریائے ویاس (بیاس) سے ملتان سے چالیس میل نیچے کی طرف ملتا تھا۔ سندھی فوج نے سکہء ملتان میں بھی حملہ آوروں کا جم کر مقابلہ کیا لیکن اُنھیں قلعہ خالی کرنا پڑا اور دریائے راوؔی عبور کر کے سندھی فوج ملتاؔن شہر میں جمع ہوگئی۔

ملتان بھی جلد ہی مغلوب ہوگیا اور ایک روایت کے مطابق جنرل محمد بن قاسم نے دریائے جہلم پر واقع قلعوں میں اپنے گورنر بھیج دیئے ۸۵؎ اور خود بڑی فوج کے ساتھ پیش قدمی کرتا ہوا پنج ناہیات (Panj Nahiyat) تک پہنچ گیا جہاں چچ نے کشمیر کے ساتھ اپنی سلطنت کی سرحد کی نشانی کے طور پر ایک درخت لگایا تھا۔ ایک سردار کو فوج کے ساتھ اُسے قنوج کی سرحد پر روانہ کیا اور اودھاپور نامی ایک مقام سے راجہ رائے ہرچندر کو پیغام بھجوایا کہ وہ اطاعت قبول کرے اور مسلمان ہو جائے۔ ریوؔرٹی اِس مقام کو ہاکڑا دریا پر موجودہ ریاست بیکانیر کے اندر سوہن کوٹ کے قریب قرار دیتا ہے جو سردار گڈھ سے کچھ

زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔۸۶ اس جگہ چچ نامہ میں کسی کا ذکر نہیں جو شہر سے قریب ہو، لیکن اودھاپور کے مقام پر محمد بن قاسم کو واپسی کے احکامات ملے۔ راجہ کے انکار پر محمد بن قاسم قنوج پر حملے کی تیاری کر چکا تھا لیکن امیر کے حکم کی وجہ سے اُسے یہ حملہ ملتوی کرنا پڑا۔

چچ نامہ کے اندر بہت سے واقعات جو سرسری طور پر بیان کئے گئے ہیں اُن سے ہمیں سندھ کے پڑوسی ممالک کے متعلق بھی تھوڑی بہت معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ میں تفصیل کے ساتھ اِس پر پہلے ہی روشنی ڈال چکا ہوں کہ یوان چوانگ کے بیان کے مطابق (۶۴۲ء میں) "مو-لو-سان-پو-لو" جسے موجودہ ملتان کہا جا سکتا ہے چچہ کا مملکت کا ایک حصہ تھا اور سندھ میں شامل نہیں تھا۔ مزید وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ چچہ کا مملکت کا دائرہ اختیار دس ہزار لی تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ ملک پہاڑوں کے دامن سے لے کر دریائے سندھ اور بیاس کے درمیانی علاقہ تک پھیلا ہوا تھا۔ چچ نامہ میں ہمیں ٹکیہ نام کی جس مملکت کا ذکر اِس صراحت کے ساتھ ملتا ہے کہ وہ چتور اور کشمیر کے درمیانی علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ وہ مملکت شاید یہ چچہ کا ہی تھا جو رقبہ میں یوان چوانگ کے زمانہ سے اُس وقت تک بہت کم رہ گئی تھی۔ سلطنت کنوں یا قنوج ایک سے زیادہ مرتبہ بیان میں نظر آتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے اندر رامل نامی علاقہ بھی شامل تھا۔ یہ کہا گیا ہے کہ ڈھال لیال کے بہت سے باشندے اپنی جانیں بچا کر رامل سے ہوتے ہوئے ہندوستان میں چلے گئے تھے۔ ریورٹی کا خیال ہے کہ یہ وہ علاقہ تھا جس میں بھٹی قبیلہ آباد تھا یعنی جیسلمیر۔۸۹ اِن لوگوں کو شیرو کے علاقہ میں جہاں رائے ڈاہر کا ایک چچازاد بھائی حکمران تھا، پناہ لی۔ پھر ہمیں ایک اور ملک کا نام ملتا ہے یہ ملک جاسم تھا جس کا شہزادہ داہر کا دوست تھا۔ شیرو اور جاسم، دونوں ریاستیں شاید شمالی راجپوتانہ میں واقع تھیں۔۹۰

ڈاہر کا بیٹا جے سینھ یا جے سین خود بھی بہمن آباد پر مسلمان کے غلبہ کے بعد اپنے خاندان سمیت چتور چلا گیا، جس کے لئے اُسے ریگستان سے گذرنا پڑا۔۹۱ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چتور سے کچھ دنوں بعد کیراج چلا گیا جس کے حکمراں کا نام درو ہر رائے تھا لیکن یہ

ریاست کس جگہ واقع تھی اِس کے متعلق صحیح معلومات نہیں ملتیں۔ لیکن اِس ریاست کا حکمراں سندھ کے ماتحت نہیں معلوم ہوتا، پھر بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ بَہمن آباد کی فتح کے بعد عرب سردار نے "اُس ملک کو جس پر کیراج (Kairaj) کا راجہ درّوہر حکومت کرتا تھا" اپنے ایک ماتحت سردار کے سپرد کر کے اُسے وہاں کا گورنر بنا دیا، کیراج سے جے سینھ کشمیر چلا گیا اور وہاں کے حکمراں کے یہاں چند سال تک بطور مہمان رہا۔ اِن تحریروں کو پڑھنے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ سندھ کے پڑوسی ممالک کے متعلق اِن لکھنے والوں کی معلومات بہت معمولی تھیں اور ایک ملک کے واقعات کو دوسرے ملک کے ساتھ اُن لوگوں نے خلط ملط کر دیا، اِس کے باوجود سندھ کی تاریخ کے جو نقوش چچ نامہ کے صفحات پر اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں وہ خواہ دھندلے اور نامکمل ہی کیوں نہ معلوم ہوں لیکن قابلِ اعتماد ہیں۔

تشریحات باب نواں

1. سائی-یو-کی کے لئے میں نے زیادہ تر واٹرس کی کتاب "آن یوان چوانگس ٹریولز ان انڈیا" کا سہارا لیا ہے (آر-اے-ایس-۵-۱۹۰۴) لیکن ایس-بیل کے ترجمہ سے بھی مدد لی ہے۔

2. "ہسٹری ڈی لا وائی ڈی ہوان سانگ "ترجمہ اسٹینس لاس جولین (پیرس ۱۸۵۳)۔

3. "دی ای ٹی نیریری آف یوان چوانگ" مرتبہ ونسنٹ اسمتھ اور واٹرس کی مذکورہ بالا کتاب-جلد دوم-صفحہ ۳۳۲۔ (فٹ نوٹ-۳۳۷) جنرل ہیگ کے مطابق ایک دن کی مسافت ایک سولی کے برابر ہوتی ہے اُس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ یوان چوانگ کے مسودے میں "لو، لا، پو" اور "کی، ٹا" کا درمیانی فاصلہ تین سولی دیا گیا ہے اور اِسی فاصلہ کو دوسری جگہ تین دن کلی مسافت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (ہیگ، مذکورہ بالا کتاب۔ صفحہ ۳۸۔ اور نوٹ ۵۴) فٹ نوٹ-جولین مذکورہ بالا کتاب، صفحہ ۲۰۶)۔

ہیگ ایک دن کی مسافت سولہ میل شمار کرتا ہے۔ لیکن بیانات سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یوان چوانگ کو ہر روز تھوڑا فاصلہ طے کرنا پسند تھا۔ لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ حساب لگاتے ہوئے چھوٹا پیمانہ درست ہوگا (ایک لی = 1/12 فرلانگ، پچاس لی = تقریباً دس میل = ایک دن کی مسافت) اور اِسی حساب سے زائر کی بیان کردہ وہ تمام منزلیں جو اُس نے سندھ یا پڑوسی ممالک میں طے کیں درست نظر آتی ہیں۔ خواہ مسافت لمبی ہو یا مختصر اور یہی جغرافیائی اعتبار سے بھی صحیح معلوم ہوتی ہیں، جیسا کہ میرے نقشے نمبرے سے ظاہر ہے۔

4. یہ یوان چوانگ کے سفر نامہ کے مطابق ہے۔ "لائف" میگزین کے مطابق چینی سیاح سوراشٹر سے سندھ میں داخل ہو۔ جولین۔ صفحہ ۲۰۷۔

5. یہ فرض کرتے ہوئے کہ چینی سیاح اُس زمانہ کے گجرات کے صدر مقام بھیل مل سے روانہ ہوا تھا۔ اس کا راستہ جیسلمیر کے ریگستانی اور پہاڑی غیر آباد علاقہ سے گذرے گا۔ اور بالائی سندھ میں دریائے سندھ تک پہنچنے کے لئے اُسے شمال مغرب کی سمت اختیار کرنی پڑے گی۔ یہ فاصلہ اگر سیدھا ناپا جائے تو تین سو میل ہوتا ہے۔

6. سفر نامہ۔ ترجمہ بیل۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۴۷۔ جولین۔ صفحہ ۲۱۰۔ الاسطخری۔ بحوالہ ایلیوٹ "ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اِٹس اون ہسٹوریز" جلد اول۔ صفحہ ۲۸۔ البیرونی انڈیا ترجمہ ساشو۔ جلد اول۔ صفحہ و ۱۶۔

7. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۳۵۔

8. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۳۵ اور نوٹ۔ ونسنٹ اسمتھ "ارلی ہسٹری آف انڈیا" دوسرا ایڈیشن۔ ۳۲۸۔

9. مجمل التواریخ کی رو سے سندھ یا بالائی سندھ کا سب سے پہلا صدر مقام "الکلندوسا" تھا لیکن چینی حروف میں جو نام تحریر ہے وہ ممکنہ طور پر اِس شہر کا نام معلوم نہیں ہوتا۔

ریناڈ "فریگمنٹس" صفحہ ۱۸، ایلیوٹ، جلد اول۔ صفحہ ۱۰۹۔ اگر "پی۔ شان۔ پو۔ پو۔ لو" دریائی میدان میں واقع تھا تو زمانہ گذرنے کے ساتھ اِسے دریائے سندھ نے کاٹ کر بہادیا ہوگا اور اِس کا نام (وشواپورا) لوگوں کے حافظہ سے محو ہو گیا ہوگا۔ کلہوڑا حکمرانوں کے دو صدر مقام ایسے ہیں جنھیں دریائے سندھ نے تباہ کر دیا ہے۔ اِن کے بعد ہی غلام شاہ نے حیدرآباد تعمیر کیا۔ جس کی بنیاد قدیم اور محفوظ شہر نیرون کوٹ کی جگہ ڈالی گئی۔ اِسی طرح سے سندھ کے رائے حکمراں بھی ممکن ہے

مجبور ہو گئے ہوں اور اُنھوں نے بھی اپنی راجدھانی میدانی شہر سے ہٹا کر محفوظ مقام الور پر منتقل کر دی ہو۔

اِس مفروضہ کی بنیاد پر "پی، شان، پو، پو، لو" پنو عاقل اور کندھ کوٹ کے درمیان کسی جگہ واقع ہوگا اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر آباد ہوگا۔ یہ محل وقوع چینی زائرے کے "سین، ٹو" سے سفر کی تفصیلات کے مطابق بھی ہے۔

10. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۳۶-۳۷۔ کننگھم "اینشی اینٹ جیوگرافی آف انڈیا" صفحہ ۳۰۲، ۳۰۴۔

11. ارّیان، "انڈیکا" ۲۵۔ پلائنی ششم-۲۳-۹۵ (راوری تائی قبیلہ کے متعلق)۔

12. "برہت سمہتا" ترجمہ ایچ-کرن۔ جے-آر-اے-ایس-نیو سیریز-جلد پنجم (۱۸۷۱) باب ۱۶-صفحہ ۲۲- جولین مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۲۰۸۔ وائرس مذکورہ بالا کتاب جلد دوئم-صفحہ-۲۵۷۔ بیل مذکورہ کتاب جلد اول۔ صفحہ ۲۴۰-۲۷۹، مید قوم کے مچھیروں کے ظلم و بربریت کی روایات ابھی تک اسٹولا جزیرہ میں جاری ہیں۔ نیز ٹی-ایچ ہولڈچ کی کتاب "دی انڈین بورڈ لینڈ" صفحہ ۲۰۶-۲۰۷۔

13. مذکورہ بالا-باب ہشتم۔ نوٹ ۲۶۔

14. کننگھام-اے-جی-آئی-صفحہ-۲۸۱-۲۸۲۔

15. ہیگ، "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۳۷-۳۹۔

16. تلفظ "او، فان، ٹہہ، سا" ہے (راوادا) منصف جولین، صفحہ ۲۰۹۔

17. یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بدھ آبادی دھام راؤ دڑو سے موہن جودڑو کا رُخ مشرق ہے، شمال مشرق نہیں ہے۔

18. جولین-صفحہ ۲۰۹۔ وہ خاص وجہ جس سے "فا، لا، نا" کو وادی گومل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ ہے کہ "لائف" میگزین میں شائع ہونے والے مضمون میں یہ بیان کیا گیا کہ چینی زائر جب ہندوستان کی سیاحت کے بعد چین واپس روانہ ہونے لگا

تو واپسی کے سفر کے ابتدائی ایام میں اُس نے "لان، یو" (لاگھ من) سے سفر شروع کیا اور پندرہ دن تک جنوب کی سمت سفر کرنے کے بعد "فا، لا، نا" میں وارد ہوا۔ وادی گومل ایکسو پچاس میل سے زائد فاصلہ پر واقع ہے اور علاقہ پہاڑی اور راستہ دشوار ہے۔ چنانچہ دس میل روز کا اوسط ایک صحیح اندازہ معلوم ہوتا ہے (جولین۔ مذکورہ بالا۔ صفحہ ۲٦۵)۔ وائرس۔ مذکورہ بالا جلد دوم۔ صفحہ ۲٦۲-۲٦۳)۔

لیکن اگر "فا، لا، نا، گومل پر واقع تھا۔ تو یہ سوچنا پڑیگا کہ یہاں سے "اے، فان، ٹو" تک کا فاصلہ جہاں سے چینی اپنے سفر نامہ کے مطابق آیا تھا (نو سو لی) بہت ہی کم لکھا گیا ہے۔ جبکہ "تساؤ-کو-ٹا" تک کا فاصلہ (دو ہزار لی سے زائد) بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے اور دونوں میں کمی زیادہ کا تناسب ایک ہی جیسا ہے۔ اِس کے برعکس میرے خیال کے مطابق اگر "فا، لا، نا" اُسی جگہ واقع تھا جہاں میں نے بیان کیا ہے تو مذکورہ سفر کے دونوں مرحلے بیان کردہ فاصلوں کے مطابق نظر آتے ہیں۔ بشرطیکہ پہاڑی راستوں کا خیال رکھا جائے۔

19. ترجمہ ٹی-پوسٹانس-جے-اے-ایس بنگال، جلد ۱٦ (۱۸۴۵) صفحہ ۸۷۔

20. چچ نامہ-ایڈیٹر قلیچ بیگ، صفحہ ٦۱۔

21. "جھلوان گزیٹیر" صفحہ ۲۲۱۔

22. ہیگ-مذکورہ کتاب صفحہ ۳۴۔

23. قلیچ بیگ-صفحہ ۱۱۔ تاریخ معصومی اور تحفۃ الکرام کے حوالے سے۔ جو اِس زمانہ کے واقعات کی حد تک چچ نامہ سے اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور حدود کچھ زیادہ ہی بڑھا کر بیان کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر شمال مغرب اور جنوب میں۔

یہ مجمل التواریخ میں بھی ہے کہ سندھ میں ہندو اقتدار کے آخری زمانہ میں ایک مرکزی حکمران کے ماتحت ملک کو چار صوبوں میں تقسیم کیا ہوا تھا۔ (ایلیوٹ۔ جلد اول-صفحہ ۱۰۹، ۱۱۰)۔

24. جولین۔ مذکورہ بالا۔ صفحہ ۹۶-۶۷ واٹرس۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۴۷۔

25. ونسنٹ اسمتھ نے "چیرکا" کو ایک سلطنت بتایا ہے۔ "ارلی ہسٹری آف انڈیا" صفحہ ۳۴۷-۳۴۸۔ واٹرس جلد اول صفحہ ۲۸۶۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۵۴-۲۵۵۔

26. قلیچ بیگ- چچ نامہ صفحہ ۵۹-۶۰۔ اسٹرابو- ۱۵ (آئی) ۲۶۔

27. قلیچ بیگ- چچ نامہ۔ صفحہ ۱۱۷-۱۱۸۔

28. "مہران آف سندھ" صفحہ ۲۳۱-نوٹ ۱۸۳۔

29. قلیچ بیگ- صفحہ ۹۴۔ "مہران" صفحہ ۲۳۳۔ نوٹ ۱۶۴- ریورٹی نے کس بنیاد پر یہ کہا ہے کہ "سوستان کے خلاف فوج کشی دسمبر ۷۱۱ء یا جنوری ۷۱۲ء میں کی گئی ہوگی میری سمجھ میں نہیں آتا۔ نیرون کے واقعہ سے چھ یا سات ماہ بعد یعنی جولائی یا اگست ۷۱۱ء زیادہ درست تاریخ معلوم ہوتی ہے۔

30. "مہران" صفحہ ۳۲۹ (نوٹ ۱۸۷)۔

31. "مہران" صفحہ ۲۳۱۔ نوٹ ۱۸۳ میں "سندھ ساگر" لکھا ہے اور قلیچ بیگ کے ترجمہ میں صفحہ ۹۰ پر "جھیل سانگرہ" درج ہے۔

32. قلیچ بیگ- صفحہ ۱۱۷۔

33. البیرونی نے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ "خور" ہے جسکا ایم، ریناڈ نے غلط ترجمہ کیا ہے۔ یہ کھاری اِس قابل نہیں کہ سندھ جیسے دریا کا دہانہ شمار ہو۔ کم از کم کسی قابل ذکر شاخ کا دہانہ نہیں ہوسکتی۔ دریا کا دہانہ یہاں سے دو فرسخ مشرق میں تھا۔ جیسا کہ فوراً بعد کے زمانہ کے جغرافیہ نویسوں نے تحریر کیا ہے۔ المسعودی "مروج الذہب" میں فاصلہ کے متعلق لکھتا ہے کہ دو دن کی مسافت کے بعد تھا۔ لیکن یقیناً یہ غلط ہے۔ کیونکہ اِسی کتاب میں دوسرے مقام پر وہ لکھتا ہے کہ مہران "دیبل کے پاس" سمندر سے ملتا ہے اور اپنی دوسری تصنیف "کتاب التنبیھہ" میں ابن خردازبہ سے اتفاق کرتے ہوئے فاصلہ دو فرسخ بیان کرتا ہے۔

(ہودی والا "اسٹڈیز اِن انڈو مسلم ہسٹری۔ صفحہ نہم) البلاذری کے حوالہ کے لئے ایلیوٹ کی جلد اول۔ صفحہ ۱۱۶ ملاحظہ ہو، نیز ابن خلدون صفحہ ۱۵، المسعودی "مروج الذہب" ترجمہ الائز سپرینجر "میڈوز آف گولڈ" (مشرقی ترجمہ ۱۸۴۱) صفحہ ۳۳۴-۳۸۶۔ ایلیوٹ نے اپنی تاریخ کے صفحہ ۳۷ پر یہ نوٹ دیا ہے "ابن حوقل بیان کرتا ہے کہ دیبل مہران کے مشرق میں واقع تھا۔ یہ غلط ہے (اِسی کتاب کے صفحہ ۴۰ پر وہ لکھتا ہے) مہران دیبل کے مشرق میں سمندر سے ملتا ہے"۔ لیکن شہر کے قریب ترین محل وقوع کے متعلق ہیگ اور ریورٹی کے انداز کے لئے "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۴۲-۵۰ اور "مہران" صفحہ ۳۲۲۔ (نوٹ ۳۱۵) ملاحظہ ہو۔ ریورٹی کے بیان سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اُس نے قدیم اور جدید دیول کو ایک ہی محل وقوع پر قیاس کیا ہے۔ لیکن قدیم شہر کے آخری ذکر اور جدید شہر کے ذکر اوّل میں چار صدیوں کا زمانہ حائل ہے۔ نیز میک مرڈو کو "آر-اے-ایس" جلد اول۔ صفحہ ۲۹، کننگھام اے۔جی-آئی، صفحہ ۲۹۹ بھی ملاحظہ کریں۔

34. "اشکال البلاد"، "مسالک وممالک" اور "مروج الذہب" کے نقشے ملاحظہ فرمائیے۔ اور البیرونی کی "انڈیا" ترجمہ ساٹو۔ صفحہ ۲۰۵-۲۰۶ ملاحظہ ہو۔

35. قلیچ بیگ-چچ نامہ۔ صفحہ ۱۰۰۔ "مہران" صفحہ ۲۵۵-۲۵۶۔

36. ہیگ نے "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۶۲ پر اِس نام کو "جاہم" تحریر کیا ہے۔ اور شاید یہ وہی جگہ ہے جسے میک مرڈو نے "ہما کوٹ" یا "جھام کوٹ" بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مکلی پہاڑ پر یا اُس کے نزدیک واقع تھا، (جے-آر-اے-ایس- جلد اول۔ صفحہ ۳۱)۔

37. قلیچ بیگ-چچ نامہ-صفحہ ۹۰۔ چونکہ حجّاج کو مطلع کرتے ہوئے محمد بن قاسم نے تحریر کیا تھا کہ اُس کا پڑاؤ دریائے مہران پر ہے تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں یہ دریا گنجو ٹکر کے جنوب مشرق میں نزدیک ہی بہتا تھا۔ ریورٹی نے جھیل کو شناخت

کرتے ہوئے "سون ہاری ڈھنڈھ" سے تعبیر کیا ہے (ملاحظہ ہو نوٹ ۳۹)۔

38. قلیچ بیگ۔ "ہسٹری آف سندھ" جلد دوم، صفحہ ۱۶۲۔ میک مرڈور "این اکاؤنٹ آف دی کنٹری آف سندھ وغیرہ" جے۔آر۔اے۔ایس۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۳۴، ۲۳۵ نیر کننگھام کی "اینشی اینٹ جیوگرافی آف انڈیا" صفحہ ۲۷۹، ۲۸۱ بھی ملاظہ ہو۔

39. "مہران" صفحہ ۲۲۶-۲۲۷ نوٹ ۱۷۳ "موجودہ حیدر آباد سے ۳۵ یا ۴۰ میل جنوب میں اور تقریباً اتنے ہی فاصلہ پر ٹھٹھہ کے مشرق میں" اِسی کتاب کے صفہ ۲۲۸-۲۲۹۔ نوٹ ۱۷۳، گنجوٹکر کے جنوبی سرے کے نزدیک۔ اِسی کتاب کے صفحہ ۲۳۴-۲۳۵۔ نوٹ ۱۸۷ (نیرون کی پہاڑیاں سون ہاری ڈھنڈھ کے نزدیک اور جھرک کے مغرب میں ہیں۔

40. الاصطخری کے حوالہ سے ایلیوٹ۔ جلد اوّل صفحہ ۲۹۔ اِسی کتاب میں ابن حوقل کے حوالہ سے صفحہ ۳۹ پر اور الادریسی کے حوالہ سے صفحہ ۷۸ پر۔

41. "مہران" صفحہ ۲۱۸، ریورٹی اِس مقام پر نیرون بیان کرتا ہے۔ لیکن ایلیوٹ عبارت کو مختلف طرح سے ترجمہ کرتا ہے (جلد اوّل صفحہ ۴۰) ریورٹی کا نوٹ ۱۷۳ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ مہران صفحہ ۲۲۷۔

42. ہیگ کا مضمون "جے۔آر۔اے۔ایس۔ نیو سیریز (۱۸۸۴)" آن دی سائٹس آف بھمن آباد اینڈ منصورہ اِن سندھ" صفحہ ۲۸۵۔

43. ریورٹی کے تلفظ کے مطابق بحوالہ نوٹ ۳۳۔

44. قلیچ بیگ۔ چچ نامہ۔ صفحہ ۹۱۔

45. کزنس۔ اینٹی کوئیٹیز آف سندھ "۱۲۲-۱۲۵۔

46. ہیگ۔ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۵۵۔

47. میں نے ریورٹی کی نسبت ہیگ کے بیان کو زیادہ درست تسلیم کیا ہے۔ جس میں لکھا ہے "قدیم زمانہ میں جوءِ سندھ شمالی سمت سے یا شمال کی طرف نہیں بہتی تھی

" کیونکہ اِس کے فوراً بعد ہی جو مضمون ہے اُس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ گورنر باجرا۔ شمالی دروازہ سے نکلنے کے بعد دریا کو عبور کرکے بودھیا پہنچا۔ نیز ہودی والا کی کتاب صفحہ ۸۸ بھی ملاحظہ ہو۔ اُس نے "اڑل ڈھنڈھ" کو ترجیح دی ہے۔

48. واضح رہے کہ موجودہ زمانہ میں جب دریائے سندھ میں پانی چڑھ جاتا ہے تو وہ اڑل دریا کے ذریعہ سے جھیل منچھر میں پہنچنے لگتا ہے۔ لیکن قدیم زمانہ میں جب سندھ کا بہاؤ سہون کے مشرق میں کافی فاصلہ پر تھا تو اِس کے ساتھ دریائے اڑل کا اتصال یقیناً کافی آگے چل کر جنوب میں ہوگا اور اِس طرح پانی کا یہ اخراج ممکن ہوسکتا ہے۔

49. لیکن ایلیوٹ۔ جلد اول۔ صفحہ ۴۰ میں ابن حوقل کا حوالہ ملاحظہ ہو۔ جہاں سندھ کے مغرب میں جھیل کی نشان دہی کی گئی ہے۔

50. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۵۸-۵۹ اور ہودی والا۔ صفحہ ۸۸-۸۹۔

51. ریورٹی "مہران" صفحہ ۲۴۰۔ نوٹ ۱۸۹۔

52. ہیگ (انڈس ڈیلٹا کنٹری، صفحہ ۵۹، نوٹ ۸۲) کا خیال ہے کہ ممکنہ طور پر یہ گنداوا تھا۔ اور کہتا ہے کہ یہ ضلع کیکنان کا خاص شہر تھا۔

53. یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ مذکورہ فاصلے زہری کے لئے بھی درست ہیں۔ وہ مقام جسے ریورٹی قندابیل کی حیثیت میں شناخت کرتا ہے۔ نیچے ملاحظہ ہو۔

54. ریورٹی "نوٹس آن افغانستان" صفحہ ۵۶۶ اور ۵۵۸ فٹ نوٹ۔ لیکن "گزیٹیر آف جھلوان" سے یہ ظاہر نہیں ہوتا (صفحہ ۳۳۱) کہ وہاں کسی قدیم بستی کے آثار موجود ہیں۔

55. ریورٹی "نوٹس آن افغانستان" صفحہ ۵۶۲۔

56. قلیچ بیگ۔ چچ نامہ۔ صفحہ ۳۹۔

57. بیان کیا گیا ہے کہ عربوں نے قندابیل کے صوبہ کی تسخیر ۸۵ ہجری (۷۰۴ عیسوی)

میں مکمل کی۔(بحوالہ قلیچ بیگ، چچ نامہ، صفحہ ۶۹) لیکن شمالی بلوچستان میں اُن کی فتوحات کو اُس وقت تک استحکام نصیب نہیں ہوا جب تک سندھ فتح نہیں ہو گیا۔ چنانچہ چچ نامہ سے معلوم ہوتا (قلیچ بیگ صفحہ ۱۵۶) ہے کہ راوڑ پر قبضہ کے بعد داہر کے بیٹے جَے سینہ یا جے سینہ نے بہت سے گورنروں کو مدد کے لئے خطوط روانہ کئے۔ علیٰ ہذا چندر کے بیٹے ڈھال کو بھی جو اُس کا چچا زاد بھائی اور "بودھیا اور کیکنان ان کا گورنر تھا اُس نے خط لکھا۔ بحوالہ ریورٹی " مہران " صفحہ ۲۴۱۔ نوٹ ۱۸۹۔ جب بہمن آباد فتح ہو گیا تو محمد بن قاسم نے اپنے ایک سردار کو جس کا نام مالک تھا قندابیل کا گورنر مقرر کیا۔ (قلیچ بیگ۔ چچ نامہ۔ صفحہ ۱۷۳)

58. قلیچ بیگ، چچ نامہ۔ صفحہ ۹۹۔ اگر جیسا کہ ممکن بھی ہے یہ مقام یعنی اگھرور ہی بگھرور تھا جو البلاذری اور چچ نامہ کے مطابق الور سے نزدیک ہی تھا تو یہ درست معلوم ہوتا ہے (صفحہ ۱۴) کہ سیسم شہر منچھر جھیل سے بھی آگے شمال میں واقع تھا۔ (ہودی والا۔ صفحہ ۹۰ پر نوٹ)۔

59. قلیچ بیگ۔ چچ نامہ۔ صفحہ ۳۰ ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۱۳۳ ضمیمہ یہاں ایک مشہور روایت بھی ہے کہ ملحقہ شہر کوٹری پر جہاں لوہانہ ڈھورو کا خشک آبی راستہ بہت واضح ہے۔ دِلوراءِ حکومت کرتا تھا، ملاحظہ ہو۔ جے۔ ایس۔ اچ۔ ایس۔ جلد ہشتم صفحہ ۴۹۔

60. قلیچ بیگ۔ چچ نامہ۔ صفحہ ۴۲۔ ۴۳۔ اور ۵۴۔

61. کزنس کے نظریہ کو غلط ثابت کرنے کے لئے صرف یہ بیان ہی کافی ہے۔ کزنس کے مطابق راوڑ بالائی سندھ میں واقع تھا۔ "اینٹی کوئیٹز آف سندھ " ۲۳۔ (ہودی والا صفحہ ۸۶)۔

62. ڈاہر جس مقام پر فوت ہوا اُس کے بارے میں ایلیوٹ کا بیان ہے " مہران اور واڈھ واہ کے درمیان "اور یہ قلیچ بیگ کے مقابل میں قابلِ ترجیح ہے

جس کا بیان ہے "ڈھاواہ کی خلیج میں دریا مہران کے اندر" (مذکورہ بالا صفحہ ۱۵۳)۔ بھمن آباد پر قبضہ کرنے کے بعد محمد بن قاسم نے راوڑ کے قلعہ میں ایک سردار کو صرف کشتیوں کی آمد و رفت کے انتظام کے لئے مقرر کر دیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دریائے مہران یا شاید اُس کی بائیں ہاتھ کی شاخ تھی۔

63. ہیگ۔ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۶۳-۶۴۔

64. ایضاً صفحہ ۱۷۵۔

65. قلیچ بیگ، چچ نامہ صفحہ ۱۵۸، اشکال البلاد کے نقشہ میں ایک جگہ بلری نام کی دکھائی گئی ہے (جسے ایلیوٹ نے بلاری لکھا ہے) جو اُس مشرقی شاخ پر ہے جو مہران سے، منصورہ سے اوپر جُدائی ہوتی ہے۔ اور شاید یہ وہی مقام ہے جس کا ذکر چچ نامہ میں ایک مقام پر ملتا ہے (ایلیوٹ کی کتاب صفحہ ۳۲)۔ کے مقابل نقشہ نیز "مہران" صفحہ 215 اور نوٹ ۱۲۴۔

66. منصورہ کے لئے الاصطخری ملاحظہ ہو۔ (بحوالہ ایلیوٹ جلد اول صفحہ ۲۷) ابن حوقل (ایضاً صفحہ ۳۴-۳۵) الادریسی (ایضاً صفحہ ۷۸)۔

67. اشکال البلاد کے نقشہ کو ایلیوٹ نے اپنی کتاب کی جلد اول کے صفحہ ۳۲ کے مقابل دیا ہے اور جو نقشہ مسالک و ممالک میں ہے اُسے میجر ریورٹی کی "مہران آف سندھ" کے آخری میں پلیٹ نمبر 11 میں دکھایا گیا ہے۔ اوّل الذکر کے لئے زیر نظر کتاب کا نقشہ نمبر 9 ملاحظہ ہو۔

68. البلاذری، بحوالہ-ایلیوٹ جلد اول-صفحہ ۱۲۲۔ نیز "مہران" صفحہ ۲۰۰-نوٹ ۱۰۵۔

69. کزنس "اینٹی کوئی ٹیز آف سندھ" صفحہ ۷۰-۶۹

70. مہران صفحہ ۲۳۹۔ ہیگ-جے-آر-اے-ایس-نمبر ۱۶-نیو سیریز (۱۸۸۴)" آن دی سائٹس آف بھمن آباد اینڈ منصورہ اِن سندھ" صفحہ ۲۸۱-۲۹۴۔

71. قلیچ بیگ۔ چچ نامہ-صفحہ ۱۵۸، نیز کزنس کی کتاب کا نقشہ پلیٹ نمبر ۵ اور مضمون صفحہ

۵۹-اور ۶۰ پر-وہ آبی راستہ جو ہیگ کے خیال کے مطابق شمال مشرقی سے جنوب مغرب کو گذرتا تھا کہیں موجود نہیں۔ زمین کو عام ڈھال سے وہ زاویہ قائم بناتا ہوا ہونا چاہئے۔ بعد یہاں شمال مغرب سے جنوب مشرق کی سمت میں۔

72. کزنس مذکورہ بالا کتاب صفحہ ۶۷۔

73. ایلیوٹ جلد اوّل صفحہ ۱۰۶

شہرے بنا کردو بھمن آباد نام نہادو بروایتی گفتہ اند منصورہ است۔ واللہ اعلم۔

74. کزنس مذکورہ کتاب صفحہ ۵۹-۶۰، قلیچ بیگ چچ نامہ صفحہ ۳۳-۳۶۔ ہیگ کا مضمون ج-آر-اے-ایس- میں صفہ ۲۹۲، پر۔ ساوندی کے لئے دوسرا ہی محل وقوع تجویز کرتے ہیں۔ اور ظاہر بہ ظاہر وہ مقام "دلوراءِ، وارو بھیرو" ہے جس کا مختصر بیان "ج-ایس-ایچ-ایس۔ جلد ہشتم-صفحہ ۴۸ پر ہے۔

75. اِسی کتاب کا باب ۳۔ صفحہ ۳۴۔

76. مہران۔ صفحہ ۲۴۳-نوٹ ۱۸۹- قلیچ بیگ۔ چچ نامہ صفحہ ۳۷ اپر لکھا ہے "ڈھنڈہ کرابھا" "ہودی والا" صفحہ ۹۶ بھی ملاحظہ ہو۔

77. ایلیوٹ۔ جلد اول صفحہ ۲۳-۲۴۔ ریورٹی کا بیان ہے کہ مروج الذہب کے ایک مسودے میں "یہاں" کے بجائے "یہاں سے آگے" (الور) درج ہے-مہران-صفحہ ۱۱۰ عبارت مبہم ہے۔

78. تشریح نمبر ۳۳ دیکھیئے۔ ہو دی والا کہتا ہے کہ المسعودی نے اپنی "کتاب التنبیہ" میں یہ عبارت خردازبہ سے نقل کی ہے (ایلیوٹ جلد اول صفحہ ۱۵) حقیقت یہ ہے کہ مروج الذہب کے مقدمہ میں المسعودی نے اِس مصنف کی تعریف کی ہے لیکن وہ سندھ اور دوسرے مما لک میں اپنی سیاحت کا ذکر بھی کرتا ہے۔ (اسپرینجر، مذکورہ کتاب-صفحہ ۳-۴-۸-۲۶)

79. باب ۷-صفحہ ۱۰۸۔ المسعودی کی کتاب میں جو کچھ درج ہے اُس کے متعلق ریورٹی

کا نظریہ "مہران" صفحہ ۲۰۹، ۲۱۰ پر دیا گیا ہے، الادریسی "ڈور" یا "اور" کو جس سے اُس کا مطلب "الور" ہے، دریا کے بائیں کنارے پر بیان کرتا ہے۔ اور وہ کہتا ہے کہ "دریا شہر کے مغرب میں بہتا ہے۔ یہ شہر رقبہ میں ملتان کے برابر ہے (ریورٹی، مہران، صفحہ ۲۲۹)۔

80. چچ نامہ۔ صفحہ 11۔

81. البلدذری، بحوالہ ایلیوٹ، جلد اول صفحہ ۱۲۲، ۱۲۳، چچ نامہ (ایضاً صفحہ ۱۶۴) مقابل حصار اروڑ۔ ہیگ۔ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۶۲ پر بکھرور کو بکھر میں شناخت کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ریورٹی اور کزنس کا خیال ہے کہ بکھر اُس زمانہ میں موجود نہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ یہ موجودہ روہڑی سے ملتا جلتا ہے۔

82. ایلیوٹ۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۸۔

83. اِسی طرح قلیچ بیگ کے چچ نامہ صفحہ ۱۸۷ پر۔ ایلیوٹ نے "یابیہ" لکھا ہے لیکن ایلیوٹ نے کسی دوسرے مسودہ میں اِسے "باسہ" بھی پڑھا ہے۔ اور ریورٹی اِسے "اسکہ" بتاتا ہے (ایلیوٹ وار اول صفحہ ۲۰۲۔ مہران صفحہ ۲۲۴ اور نوٹ ۱۹)۔

84. قلیچ بیگ نے "گھول کندہ" لکھا ہے (صفحہ ۱۸۸) بہت سے مختلف نام بیان کئے گئے ہیں، ریورٹی نے تفصیل سے بحث کرتے ہوئے اسکندہ کو سکندر اعظم سے متعلق سمجھا ہے۔ لیکن البلاذری کا بیان کردہ "اسکلہ" یا تو اِسی جگہ کی طرف اشارہ ہے یا اُس مقام کی طرف جو ابھی مذکور ہوا اور جسے قلیچ بیگ یا بیہ کہتا ہے۔ یقیناً دونوں کے درمیان خلطِ بحث ہے۔ اسکلند شاید وہی جگہ ہے جو عسقلد ہے۔ یعنی مجمل التواریخ میں جسے مملکت سندھ سے پہلے راجدھانی لکھا گیا ہے، ایلیوٹ کے حوالے سے اسی کتاب میں شہر کا نام دوسری جگہ عسقلندوسہ تحریر ہے۔

85. تاریخ معصومی میں دیبل پور کی فتح کا حال درج ہے یہ بیاس (قدیم) کے کنارے پر واقع تھا، قلیچ بیگ چچ نامہ۔ صفحہ ۱۹۲۔ فٹ نوٹ۔ نیز مہران صفحہ ۲۵۴۔ نوٹ ۱۹۴۔

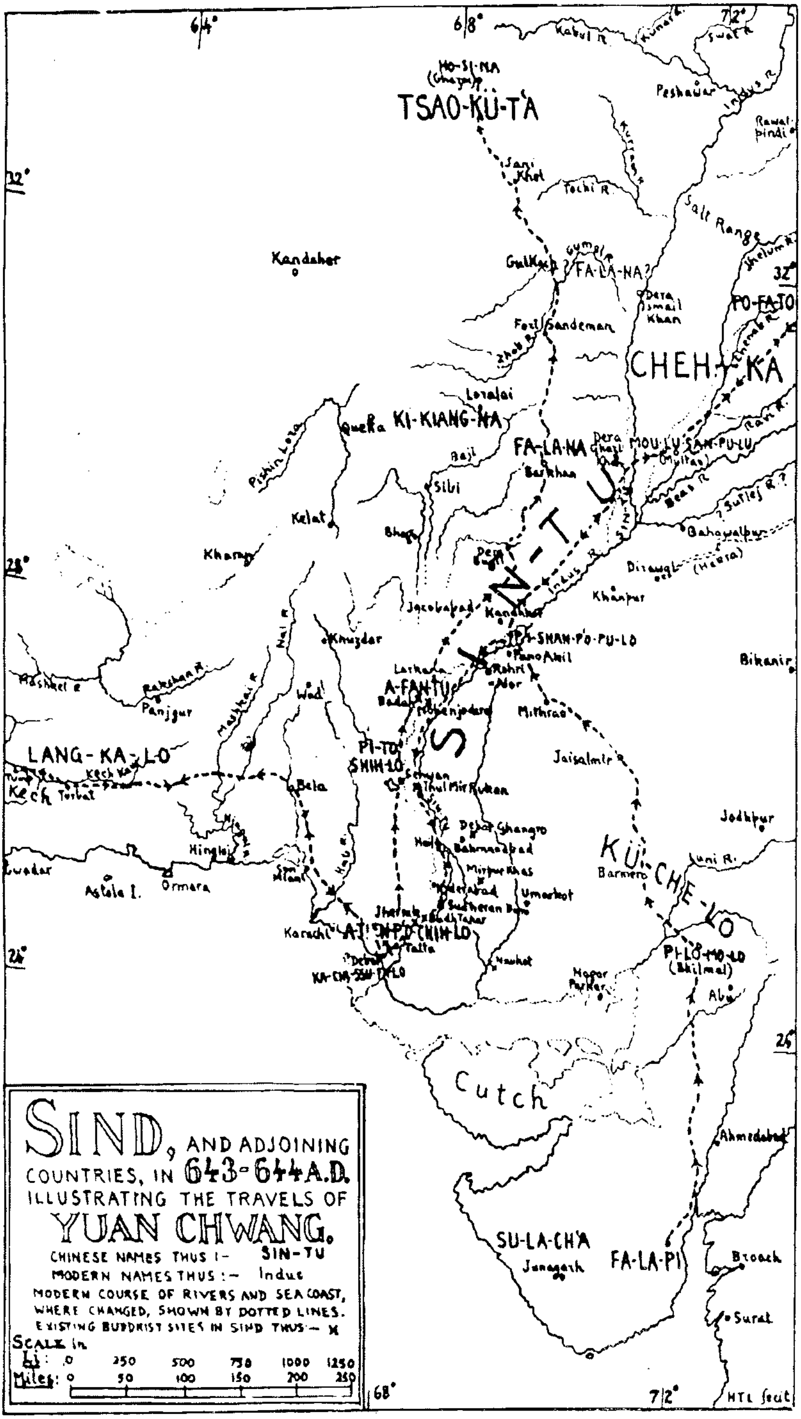
SIND, AND ADJOINING COUNTRIES, IN 643-644 A.D. ILLUSTRATING THE TRAVELS OF YUAN CHWANG.
CHINESE NAMES THUS :- SIN-TU
MODERN NAMES THUS :- Indus
MODERN COURSE OF RIVERS AND SEA COAST, WHERE CHANGED, SHOWN BY DOTTED LINES.
EXISTING BUDDHIST SITES IN SIND THUS :- x
SCALE in Li: 0 250 500 750 1000 1250
Miles: 0 50 100 150 200 250
64°
68°
72°
32°
28°
24°
HO-SI-NA
TSAO-KU-TA
Kabul R.
Swat R.
Peshawar
Indus R.
Rawalpindi
Kurram R.
Tochi R.
Salt Range
Jhelum R.
Kandahar
Gumal R.
FA-LA-NA?
Dera Ismail Khan
PO-FA-TO
Fort Sandeman
Zhob R.
CHEH-KA
Loralai
Quetta
KI-KIANG-NA
FA-LA-NA
Dera Ghazi Khan
MOU-LU-SAN-PU-LU
(Multan)
Ravi R.
Beas R.
Sutlej R.?
Pishin Lora
Sibi
Barkhan
Kelat
Bahawalpur
SIN-TU
Indus R.
Jacobabad
Khanpur
Khuzdar
PI-SHAN-PO-PU-LO
Bikanir
Rohri
Nor
Larkana
A-FAN-TU
Mohenjodaro
Mithrao
Panjgur
Rakshan R.
Mashkai R.
Wad
Jaisalmir
LANG-KA-LO
PI-TO-SHIH-LO
Sehwan
Kech
Turbat
Bela
Jodhpur
Hingol R.
Hab R.
Brahmanabad
Mirpur Khas
Umarkot
KU-CHE-LO
Barmer
Luni R.
Gwadar
Astola I.
Ormara
Sonmiani
Hyderabad
Karachi
Jherruk
Tatta
PI-LO-MO-LO
(Bhilmal)
Debal
KA-CHA-SSU-FA-LO
Nagar Parkar
Abu
Cutch
Ahmedabad
SU-LA-CH'A
Junagarh
FA-LA-PI
Broach
Surat
HTL fecit

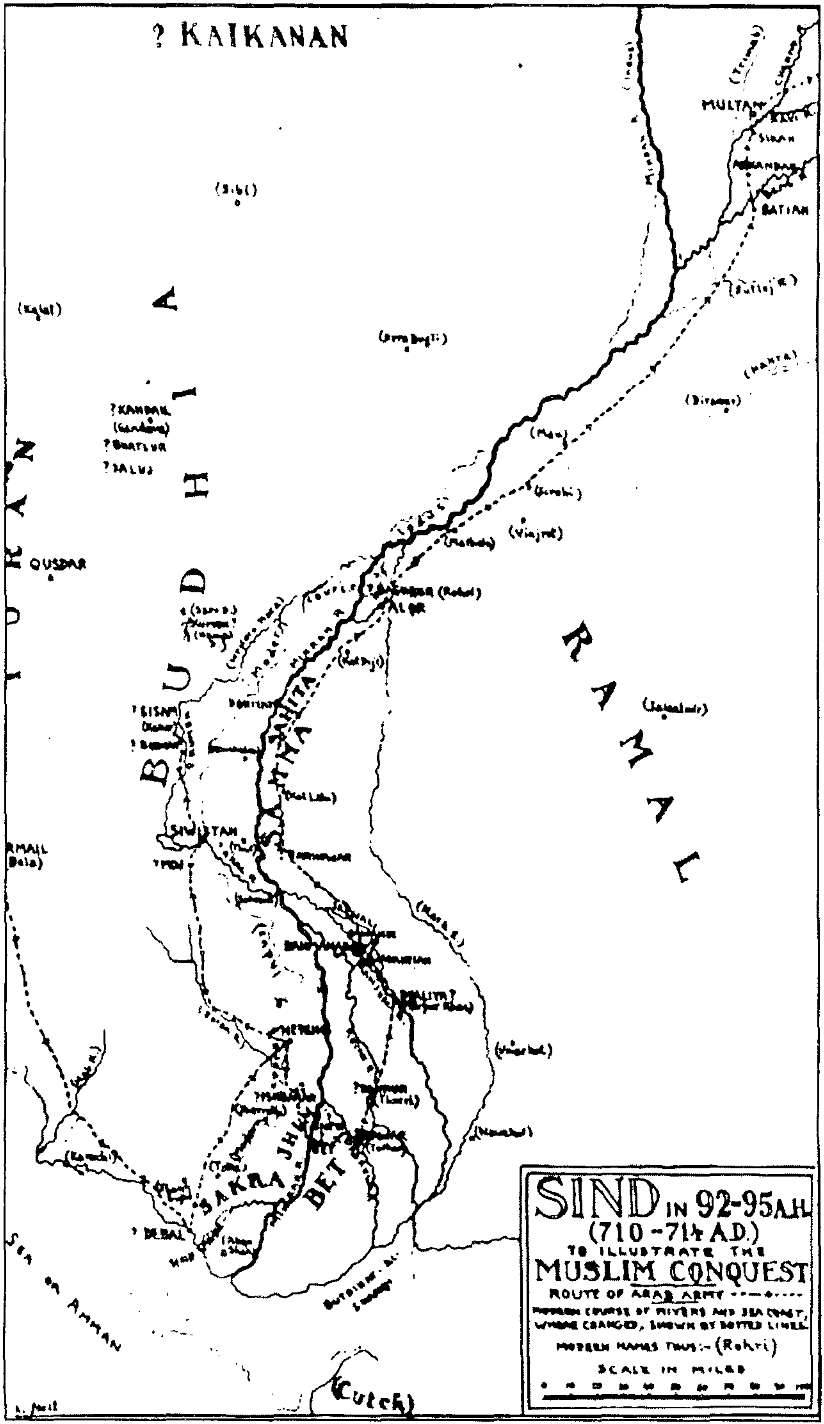

? KAIKANAN
TURAN
BUDHIA
RAMAL
MULTAN
BATIAH
QUSDAR
SIWISTAN
ALOR
SAMMA
SAKRA
BET
JHIL
DEBAL
SEA OF AMMAN
(Cutch)
SIND IN 92-95 A.H.
(710-714 A.D.)
TO ILLUSTRATE THE
MUSLIM CONQUEST
ROUTE OF ARAB ARMY
MODERN COURSE OF RIVERS AND SEA COAST, WHERE CHANGED, SHOWN BY DOTTED LINES.
MODERN NAMES THUS:- (Rohri)
SCALE IN MILES

86. مہران صفحہ ۲۵۴ نوٹ ۱۹۴۔ لیکن ہودی والا بیان کرتا ہے کہ مقام کے کئی مختلف نام ہیں۔
87. واٹرس "یوان چوانگ" جلد اول صفحہ ۲۸۶۔
88. قلیچ بیگ- چچ نامہ۔ صفحہ ۱۶۰۔
89. ایضاً- صفحہ ۵۵-۱۵۷۔ مہران صفحہ ۲۴۱ نوٹ ۱۸۹۔ ابن خرداذبہ نے املہ یار مال کے متعلق لکھا ہے کہ یہ مملکت سندھ کا ایک حصّہ تھا، (ایلیوٹ، جلد اول، صفحہ ۱۴) اور الادریسی نے اِسے اندرون ملک ریگستان کے کنارے پر بیان کیا ہے، ایضاً صفحہ ۸۶۔
90. قلیچ بیگ۔ چچ نامہ صفحہ ۱۲۲-۱۵۷۔
91. ایضاً- صفحہ ۱۶۰-۱۶۱۔ مہران صفحہ ۲۴۲-نوٹ ۱۸۹۔
92. قلیچ بیگ- چچ نامہ۔ صفحہ ۱۷۲-۱۸۰۔
93. قلیچ بیگ- چچ نامہ۔ صفحہ ۱۸۵۔

باب دسواں

سندھ، مسلمانوں کے دور میں

سندھ کے برہمن۔ رائے حکمرانوں کی وسیع و عریض سلطنت کو خلافت عباسیہ نے دو صوبوں میں تقسیم کر دیا اور علی الترتیب ملتان اور منصورہ کو اُن کے دارالخلافہ قرار دیا۔ گویا انتظامی طور پر اِن لوگوں نے قبل تاریخ کی انڈس سلطنت کی تقلید کی جس کے دو انتظامی مراکز ہڑپا اور موہن جودڑو تھے [1]

الور جو اب اِس سلطنت کے وسط میں تو نہیں لیکن صوبوں کے مشترکہ سرحد کے قریب تھا رفتہ رفتہ زوال پذیر ہوتا گیا۔ پھر بھی اِس کا ذکر تیرھویں صدی عیسوی تک کتابوں میں ہوتا رہا [2]

المسعودی سے تقریباً نوّے سال بعد البیرونی حالات قلمبند کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ الور شہر ایک مقام بھاٹیہ سے پندرہ فرسخ جنوب مغرب میں دریائے سندھ کی دو شاخوں کے درمیان آباد تھا۔ لیکن اپنی کتاب "الہند" میں دوسری جگہ وہ بالکل مختلف تصویر پیش کرتا ہے پنجاب کے تمام دریاؤں کے متحدہ چشمے کی تفصیل بیان کرنے کے بعد وہ لکھتا ہے کہ اِس کا نام مہران مشہور تھا جبکہ یہ چشمہ الور شہر سے گذر چکا تھا [3] وہ لکھتا ہے کہ اپنے بہاؤ کے دوران یہ چشمہ آگے چل کر کئی جگہ زمین کے قطعات کو جزیروں کی شکل میں گھیرتے ہوئے منصورہ پہنچتا ہے جو خود بھی دریا کی شاخوں کے درمیان آباد ہے اور اِس کے بعد دو حصّوں میں بٹ کر سمندر سے ملتا ہے۔ ایک شاخ لوہارانی (Loharani) کے قریب سمندر میں گرتی ہے جبکہ دوسری مزید مشرق کی طرف کچھ (Cutch) میں گرتی ہے یہاں ایک مقام سندھو ساگر [4] کے نام سے موجود ہے، اور اِس کے معنی ہیں بحرِ سندھ۔

المسعودی نے یہ بیان کیا تھا کہ دونوں شاخیں " سانگرہ شہر کے پاس [5] " سمندر میں

گرتی ہیں۔الاصطخری جو المسعودی کے فوراً بعد آئے، اِسی طرح ابن حوقل بھی سندھ میں اپنے سفر کے حالات تحریر کرتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ دریائے مہران دیبل شہر کے نزدیک واحد چشمہ کی حالت میں سمندر میں گرتا ہے، الادریسی جس نے اپنے جغرافیہ کی کُلیات کو سابقہ کتب سے مرتب کیا ہے۔وہ اِسی نظریہ کو اختیار کرتا ہے اور البیرونی کو مسترد کر دیتا ہے۔اِس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اُس نے اُن مصنفین پر اعتماد کرنا بہتر سمجھا جو خود سمندر میں آئے بہ نسبت اُس کے جو زمانہ کے اعتبار سے مؤخر ہے اور سندھ میں آیا بھی نہیں۔اِن محققین کے بیانات کی صداقت کو پرکھنے سے پہلے میں قارئین کی توجہ اُس خلیج کی جانب مبذول کراؤں گا۔[۷] جس میں عرب سردار جنید اور ڈاہر کے بیٹے جے سینھ کے درمیان بحری جنگ ہوئی۔البلاذری نے اِس مقام کو ایک نام دیا ہے جیسا کہ آخری باب میں مذکور ہے۔وہ اِسے بطیحۃ الشرقی کے نام سے موسوم کرتا ہے۔جنرل ہیگ نے اِس کا ترجمہ " مشرقی اندرونی سمندر " اور ریورٹی نے اِسے " الشرقی کھاڑی یا سانگرہ کا دوآبہ "۔[۸] لکھا ہے۔ہیگ کا خیال ہے کہ یہ بحری قطعہ موجودہ رن کچھ کے مغربی حصّہ میں تھا، ریورٹی جبکہ اِسے مزید شمال میں اندر تک پھیلا ہوا قیاس کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ سامارو ڈھنڈھ اور بدین تک یہ پھیلا ہوا تھا۔بہر نوع یہ سمجھنا زیادہ درست ہوگا کہ مذکورہ آبی قطعہ اگر خود نہیں تو بہر حال سندھ ساگرہ یا سانگرہ سے ملا ہوا ضرور تھا جس کے متعلق البیرونی نے یہ بیان کیا ہے کہ اِس میں دریائے مہران گرتا تھا۔چنانچہ اِس طرح یہ قطعہ آب موجوہ کوری کریک سے ملتا جلتا ہوگا۔بحری لڑائی بہر حال لڑی گئی۔جیسا کہ ہیگ نے خیال ظاہر کیا ہے کہ جے سینھ نے کچھ کے پار سے فوجی کمک حاصل کرنے کے بعد مسلم قابضین کو بے دخل کرنے کی کوشش کی تھی۔[۱۰]

دریائے سندھ کے پس منظر میں الور کے محل وقوع کا تذکرہ ہو رہا تھا: الادریسی نے اپنی کتاب " نزہت المشتاق " میں واضح طور پر یہ بیان کیا ہے کہ دریائے مہران الور کے مغرب میں بہتا تھا۔گویا اُس وقت یہ شہر دریا کے مشرقی کنارے پر آباد تھا۔اور توقع بھی یہی

کی جا سکتی ہے کیونکہ دریا کے دو شاخوں میں منقسم ہونے کا مقام اَلوَر سے آگے کلری تھا اور یہی شاخیں منصورہ سے بارہ میل آگے دوبارہ متحد ہوگئی تھیں۔ الادریسی بھی البیرونی کی طرح سندھ کے علاقہ کے متعلق اپنی ذاتی معلومات نہیں رکھتا۔ اُس کا طریقہ جو ہمیں ٹالمی کے طریقہ کی یاد دلاتا ہے۔ عام طور پر دستور یہ تھا کہ دسویں صدی کے محققین کے بیانات سے وہ مواد لے لیا جائے جو خود اُس کے زمانہ میں بھی درست نظر آسکے گو متروک ہو چکا ہو۔ اور اُس کے ساتھ جدید معلومات شامل کر کے پیش کر دیا جائے۔ اِس کا نتیجہ اکثر اوقات ابہام کا باعث ہوتا ہے اور بعض اوقات حماقت آمیز بھی۔ ١١ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں تک الور کے محل وقوع کا تعلق ہے الادریسی کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ١٢ لیکن جب وہ یہ لکھتا ہے کہ کلری کے پاس سے جدا ہونے والی دو شاخوں میں سے ایک شاخ شمال کی سمت بہتی تھی وہ ایسی بات کہتا ہے جو طبعی طور پر ناممکن ہے۔ ١٣

چنانچہ عرب جغرافیہ نویسوں کی تحریروں میں ہمیں ایسی کوئی خبر نہیں ملتی کہ دریائے مہران کے بہاؤ کے راستہ میں تبدیلی نے الور کے لئے تباہی کا سامان پیدا کر دیا تھا کیونکہ شہر اور ملحقہ زمین دریا کے پانی سے محروم ہوگئی تھی۔ اِس عظیم سانحہ کا پہلی بار ذکر میرے علم و اطلاع کے مطابق تاریخ طاہری میں ملتا ہے جو ١٠٣٠ھ ہجری (١٦٢١ء عیسوی) میں مکمل ہوئی۔ ١٤ اِس کتاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دریا کی تبدیلی کا یہ واقعہ سندھ میں سومرا دورِ حکومت کے آخری زمانہ میں ظہور پذیر ہوا۔ حالانکہ تحفتہ الکرام جو حکومت کے خاتمہ کے ڈیڑھ سو سال بعد تصنیف کی گئی اِس تبدیلی کو دوسری صدی ہجری کی بات کہتی ہے۔

تاریخ طاہری اِس تبدیلی کو چودھویں صدی عیسوی میں قرار دیتی ہے۔ لیکن اُس زمانہ کے مصنفین نے ایسی اہم تبدیلی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ ابن بطوطہ بکھر کے مقام سے ١٣٣٣ء سے گذرا۔ لیکن اِس مقام کے بارے میں اُس نے جو کچھ لکھا ہے اُن سے ہرگز یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اُس زمانہ کے متعلقہ حالات جو تقریباً ایسے ہی تھے جیسے آج۔ بالکل زمانہ حال کی ہی پیداوار ہوں۔ ١٦ اِن تمام دلائل کے باوجود سندھ کے علاقہ میں شدومد کے

ساتھ یہ مشہور ہے کہ الور دریائے سندھ کی آبی گذرگاہ کی تبدیلی سے تباہ ہوا۔ اِس روایت کو بغیر کسی ٹھوس ثبوت کے مسترد نہیں کیا جا سکتا، اور محض اِس شہادت کی بنا پر کہ تبدیلی کے متعلق جو زمانہ مقرر کیا گیا ہے اُس زمانہ میں یہ تبدیلی واقع نہیں ہوئی مذکورہ عالمگیر شہرت کی روایت کو پس پشت نہیں ڈالا جا سکتا۔

اِس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ ایک وقت دریائے سندھ کی شاخ اُس واضح آبی گذرگاہ سے بہتی رہی ہے جو اُن پہاڑیوں کے سلسلہ کو بیچ سے کاٹتی ہے جو الور کے شمال میں قریب ہی واقع ہیں اور روہڑی گھاٹی سے جس کے اندر سے مکمل دریا آجکل گذرتا ہے چار میل جنوب میں واقع ہیں۔ ۱۷ دریائے سندھ نے الور سے کس طرح منہ موڑا یہ بھی ایک افسانہ ہے جو مذکورہ بالا جیسی دو کتابوں میں ہمیں ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دولت مند تاجر کا نام سیف الملوک تھا۔ اُس نے اپنی ملکیت اور اپنی خوبصورت کنیز بدیع الجمال کے تحفظ کے خاطر ایک راستہ کھُدا کر دریا کے بہاؤ کو تبدیل کر دیا۔ الور کا ظالم حکمراں دلوراءِ اِس تاجر کے مال پر ناجائز ٹیکس عائد کر رہا تھا۔ مزید براں، جیسا کہ اس کا قاعدہ تھا وہ خوبصورت ملازمہ کو بھی اپنے قبضہ میں لینا چاہتا تھا۔ تاجر نے راجہ سے تین دن کی مہلت طلب اور اُس وقت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کثیر تعداد میں ہوشیار کاریگر جمع کئے، اور زرِ کثیر صرف کر کے الور شہر سے پہلے دریا پر ایک بند باندھا جس سے بہاؤ کا رُخ موڑ کر الور سے دور کر دیا۔ اُس کی کوشش کامیاب ہوئی۔ دریا نے "سہون اور لکی پہاڑ کی طرف" نیا راستہ اختیار کر لیا، بالآخر ایک صبح ایسی نمودار ہوئی کہ الور کے باشندوں نے اُس دریا میں جو بہت گہرا تھا سوائے کیچڑ اور گدلے پانی کے اور کچھ بھی نہ پایا۔ ۱۸

ریورٹی نے اِس بحث میں کافی جگہ صرف کی ہے کہ ایسا کرنا عملاً ناممکن نہیں ہے۔ بہر حال یہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ معاملہ دریا کی کسی چھوٹی شاخ کا ہو نیز قریب ہی کوئی نشیبی وادی بھی ایسی موجود ہو جس میں ایک کٹاؤ کے ذریعہ پانی پہنچا دیا جائے لیکن یہ یقین کے قابل نہیں ہے کہ الور کو ایسی کسی تدبیر سے دریا کے پانی سے محروم کر دیا گیا ہوگا۔ یہ صرف کسی قدرتی

انقلاب کا ہی نتیجہ ہو سکتا ہے۔

ریورٹی نے اِس موضوع پر بھی زوردار خیال آرائی کی ہے کہ بہاؤ کی تبدیلی نے دریا کو "مزید فاصلہ پر مغرب کی سمت دھکیل دیا ہوگا بہ نسبت چونے کی پہاڑیوں میں واقع اُس گھاٹی سے جس میں سے یہ آجکل گذرتا ہے اور جہاں بعد کے زمانہ میں روہڑی اور بکھر آباد ہوئے۔ ۱۹ ذرا غور کریں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر دریا صرف اُسی مقام تک ہٹا ہوتا جہاں آجکل بہتا ہے تو یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ اِس میں سے ایک نہر نکال کر پانی الور تک پہنچا دیا جاتا۔ جیسی نہر فی الحقیقت لائڈ بیراج کی آبپاشی کے نظام سے قبل یہاں موجود بھی تھی۔ ۲۰

لیکن دوسرے متعلقہ شواہد کا جائزہ لینے کے بعد یہ امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ آیا الور کا زوال براہ راست دریائے سندھ کے بہاؤ کی تبدیلی کے سبب سے ہوا۔ اِس سے قطع نظر یہ کہ عرب جغرافیہ نویسوں کے وہ بیانات جن کا مندرجہ بالا سطور میں حوصلہ دیا گیا اِس شہر کی اہمیت کا اظہار کرتے ہیں، ہم جیسلمیر اور میواڑ کی کتابوں میں بھی جن کا تعلق بارہویں عیسوی صدی سے ہے الور شہر کا ذکر پاتے ہیں اور اِن کتابوں کا تعلق عرب یا دوسرے کسی ذریعہ کی معلومات سے نہیں۔ اِس کے ساتھ ہی ہمارے پاس چچ نامہ کے مترجم کی شہادت بھی موجود ہے۔ جہاں تک جیسلمیر اور میواڑ کی کتابوں کا تعلق ہے اُن میں تحریر کیا گیا ہے کہ شہر پر حکمراں خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک شخص کابل کی حکومت کی طرف سے بطور نمائندہ قابض تھا۔ ۲۱ اور یہ صورت ۱۲۰۱ء سے تعلق رکھتی ہے۔ علی کوفی جو چچ نامہ کا مترجم ہے کتاب کے مقدمہ میں یہ بیان کرتا ہے کہ ۱۲۱۶ء میں یا اُس کے فوراً بعد اُس نے بکھر اور الور کا دورہ کیا، اور یہ پایا کہ الور پر محمد بن قاسم نے جو قاضی مقرر کیا تھا اُسی کی نسل سے اب بھی ایک قاضی موجود ہے۔ جس سے علی کوفی نے اصل عربی مسودات حاصل کیے۔ ۲۲ تقریباً اِسی زمانہ میں دہلی کے سلطان کی تواریخ بھی بکھر کا تذکرہ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور یہ ممکن ہے کہ اُس وقت قدیم شہر زوال پذیر ہو چکا ہو اور جدید شہر نے اہمیت اختیار کر لی ہو۔ ۲۳ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اُسی زمانہ کے لگ بھگ دریائے سندھ نے قدیم آبی راستہ چھوڑ

کر بکھر گھاٹی کا نیا راستہ اختیار کیا ہو۔

کچھ لوگوں نے ممکنہ طور پر یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ چونکہ دلوراءِ کی کہانی سندھ کی دونوں تواریخ میں سومرا خاندان کے ظلم اور زوال سے ہی تعلق رکھتی ہے اِس لئے حقیقت میں وہ دریائے ہاکڑا کے زیریں حصّہ کے خشک ہو جانے اور اُس سے سومرا دارالسلطنت محمد طور کے زوال کو ظاہر کرتی ہے۔الور کے نہیں۔اور مصنف نے اِن واقعات کے سلسلہ میں جو تاریخیں درج کی ہیں وہ غلط ہیں، تاریخ طاہری سے یہی تاثر ملتا ہے۔اِس کتاب میں بیان کیا گیا ہے کہ مملکت سندھ کا وہ علائقہ " جواب خوش حال تھا۔یعنی ۱۲۲۰ء میں سومرا دورِ حکومت میں " ایک بنجر علائقہ تھا " کیونکہ " دریائے سندھ میں پانی کی قلت تھی۔بکھر سے آگے یہ دریا مذکورہ نام سے ہی مشہور ہے، جس علائقہ کا حوالہ دیا گیا ہے وہ شاید مغربی یا جنوبی مغربی سندھ کا علائقہ ہے۔اور وہ دریا جو الور سے آگے بہتا تھا " وہ کوئی پنجاب کا دریا تھا۔اور یہی دریا ہاکڑا کے نام سے مشہور ہے، اور یہی واہندہ اور داہان کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ہر نئے قصبہ میں جس کے پاس سے یہ دریا گذرتا ہے اِس کا نام بیدردی کے ساتھ بدل دیا جاتا ہے۔زمین کو سیراب کرنے کے بعد یہ دریا اپنا پانی سمندر کے حوالے کر دیتا ہے۔۲۶ چنانچہ ظاہر ہے کہ دو الگ الگ دریا تھے، جنھیں ہم سلسلہ بیان کی خاطر سندھ اور ہاکڑا کہہ سکتے ہیں۔دریائے سندھ کے زیریں حصہ میں پانی کی قلت کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ مقامی ہوگی مجموعی نہیں کیونکہ پانی کی کثیر مقدار کسی اور راستہ سے گذرتی ہوگی جس کے بارے میں مصنف کو علم نہیں تھا۔۲۷ اس کے برعکس جنوبی مشرقی علائقہ میں پانی کی بہتات تھی۔میرے نزدیک اِس صورت حال کا یہ جواب ہے کہ دریائے سندھ کا وہ سرچشمہ جو الور سے اوپر تھا سکھر کے شمال مغرب کی جانب بہتا تھا۔شاید اُس راستہ سے جو سندھ ڈھورو یا سندھ واہ کا راستہ ہے لیکن بائیں ہاتھ کی طرف بھی ایک شاخ اُس سے نکلتی تھی جو الور گھاٹی سے گذرتی تھی۔

اِس مقام سے نیچے دریا کا بہاؤ موجودہ راستہ سے مزید مشرق کی طرف تھا۔اور زیریں

سنؔدھ میں یہ دریا اُس راستہ سے گذرتا تھا جو آجکل پراؔن کا راستہ ہے۔ جبکہ دائیں ہاتھ پر اگر کچھ شاخیں تھیں تو وہ غیر اہم تھیں۔

اُدھر دریائے ہاکڑؔا کو اُن راستوں سے جو اُسے ستلج سے ملاتے ہیں دریا کے زائد پانی کی خاصی مقدار پہنچتی ہوگی۔ لیکن ممکن ہے کہ ایسا موقع صرف سیلاب کے زمانہ میں پیدا ہوتا ہو جبکہ یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ الوؔر سے اوپر پانی کی بھاری مقدار ناراوادی سے گذر کر بالائی ہاکڑا کے پانی سے مل جاتی ہوگی۔ اور جنوبی مشرقی سنؔدھ کی خوش حالی کا سبب بن جاتی ہوگی۔

میرے خیال کے مطابق جو کچھ اُس زمانہ میں ہوا ہوگا وہ یہ کہ زیریں ستلج میں کسی قدرتی عمل کی بدولت ہاکڑا کو موسمی پانی کی مقدار ملنی بند ہوگئی جبکہ ستلج کے پانی کی زیادہ مقدار نے پنجند کا رُخ اختیار کرلیا۔ اِس تبدیلی کی وجہ سے یا اِس کے ساتھ ہی ساتھ دریائے سنؔدھ نے بھی وہ راستہ جو سکھر کے شمال سے تھا چھوڑ دیا اور بکھر کے نزدیک پہاڑیوں سے اپنی پوری قوت کے ساتھ گذرا۔ یہاں پانی کے کٹاؤ کی وجہ سے گھاٹی گہری ہوتی چلی گئی جس کے نتیجہ میں دریا کا مکمل پانی اِسی راستہ سے گذرنے لگا اور پُرانی شاخ جو الوؔر کی طرف جاتی تھی وہ معدوم ہوگئی یا صرف سیلابی موسم میں کار آمد رہ گئی۔

سنؔدھ کے زیریں علائقہ میں بھی دریا کا راستہ تبدیل ہوا، یعنی پراؔن کے راستے سے گذرنے والے پانی کی مقدار کم ہوگئی۔ ہاکڑا میں تو موسمی پانی کی پہلے ہی قلت واقع ہوچکی تھی۔ لہٰذا سنؔدھ کا جنوبی مشرقی علائقہ جو پہلے زرخیز تھا بُری طرح متاثر ہوا۔ اِس عمل کی تکمیل میں بہت سے سال گذر گئے ہوں گے۔ اِس کے ساتھ ہی کبھی کبھی ناؔرا کے راستہ سے زیریں ہاکڑا کے اندر بھی دریائے سنؔدھ کا سیلابی پانی پہنچ جاتا ہوگا، جس سے صورت حال پیچیدہ نظر آتی ہے اور ایسا ہمارے زمانہ تک ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ دریا کے قدیم راستوں کی روایت کیا ہے اور فی الحقیقت کیا ہوا ہوگا؟ یہ مسئلہ اُلجھ گیا۔

الوؔر بند سے متعلق تصدیق شدہ حقائق اِس اُلجھن کا صحیح اندازہ قائم کرنے میں مدد

دیتے ہیں، تاریخ طاہری کا تو یہ بیان ہے کہ یہ بند "الور سے آگے" ۔۲۸ باندھا گیا تھا حالانکہ اِس پورے افسانہ کی رو سے ہونا یہ چاہئے تھا کہ بندر الور سے اوپر کی طرف باندھا جاتا اور ایلیوٹ نے اپنے ترجمہ میں متعلقہ عبارت کو ایسے ہی بدل بھی دیا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ مشرق کی طرف سے الور کے آبی راستہ تک ایک نالہ جاتا ہے اِس آبی گذرگاہ کے راستہ میں اب بھی ایک پُشتہ نظر آتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ نظر آتا تھا جس کے متعلق کچھ لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہی "الور بند" ہے۔ حالانکہ عملاً اِس پشتے کا اثر اُس کے بالکل برعکس تھا۔ جو افسانہ سے ظاہر ہوتا ہے اور میک مرڈو کے بیان کے مطابق یہ پشتہ غلام شاہ کلہوڑو نے اٹھارویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں تعمیر کرایا تھا۔ ۲۹

ملک پر برطانیہ کے تسلّط کے بعد رچرڈ برٹن اور دوسرے لوگوں کو اُن روایات سے دلچسپی پیدا ہوئی جو الور بند سے متعلق ہیں۔ لہٰذا بند کو مسمار کر دینے کے متعلق رائے ہموار ہونے لگی تا کہ دریائے ہاکڑا میں پانی دوبارہ بہنے لگے۔ ۳۰ اس خیال نے لوگوں کی توجہ اُس بند کی طرف موڑ دی جو خود ہاکڑا کے راستہ میں تھا۔ اور جب دریائے سندھ سے نارا میں پانی پہنچانے کی تجویز پر غور کیا گیا تو فیصلہ کیا گیا کہ پہلے یہ بند ہٹا دیا جائے اور اُس کے نتائج کا مطالعہ کیا جائے۔ وہ آبی گذرگاہ جس کے ذریعہ دریائے سندھ کا پانی نارا وادی تک پہنچتا ہے۔ بہرہ کے مقام پر ایک پشتہ سے رُکی ہوئی ہے اور الور سے پانچ میل مشرق میں واقع ہے لیکن اِس کا مقصد جیسا کہ اُس زمانہ کے برطانوی افسروں نے مشاہدہ میں آنے والے اکثر بیشتر پشتوں کا مقصد سمجھا صرف یہ تھا کہ سیلابی پانی کو ملحقہ زمینوں میں دور دور تک پھیلا دیا جائے تا کہ وہ کھیتی باڑی کے کام آسکے۔ اور انجینیئروں نے یہ رائے پیش کی کہ سیلابی پانی کو نارا وادی میں جانے سے روکنے کے لئے اس پشتہ کی صرف برائے نام اہمیت ہے۔ اِس پر سندھ کے لوگوں نے یہ کہا کہ اصل بند جو "دو کوس لمبا اور ساٹھ گز چوڑا ہے" مزید فاصلہ پر مشرق کی سمت واقع ہے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی ایک بے بنیاد بات تھی۔ حالانکہ میجر ریورٹی نے اِس پر بھی حقیقت سمجھ کر بحث کی ہے۔ ۳۱ بہرنوع میجر ریورٹی اس بند

کے لئے جو محل وقوع تجویز کرتا ہے اگر حقیقت میں یہ وہاں موجود بھی ہوتا تب بھی سیلابی پانی کو کھیتی باڑی کے لئے دوسری طرف موڑنے کے علاوہ اور کوئی مقصد پورا نہیں کرسکتا تھا۔۳۲

یہاں یہ واضع کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند محققین کی رائے میں تیرھویں صدی عیسوی تک دریائے ہاکڑا نارا میں تمام سال پانی رہتا تھا، اور سمندر تک پہنچتا تھا، اور اس کی سیدھی سادی وجہ صرف یہ تھی کہ دریائے ستلج اِس دریا کے اندر گرتا تھا۔ تیرھویں صدی کے بعد کسی وقت سے ستلج نے دریائے سندھ کے ساتھ اتصال کیا، پنجاب کی آبی وسائل میں ایسی انقلابی تبدیلی سندھ کے علائقہ میں بہت سی تبدیلیوں کو پیدکرنے کے لئے کافی تھی جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اِس سے قبل میں بیان کر چکا ہوں کہ دریائے ستلج کے زیریں حصہ (گھارا) کو ہاکڑا سے ملانے والے کئی قدیم آبی راستے موجود ہیں۔ یہ بیکانیر اور بھاولپور میں دیکھے جاسکتے ہیں، اور طبعی جغرافیہ اِس علائقہ کے سلسلہ میں واضح نشان دہی کرتا ہے کہ ایک وقت ستلج ہاکڑا سے ملتا تھا۔ بہرنوع یہ سوال اپنی جگہ باقی رہتا ہے کہ اگر یہ تبدیلیاں واقع ہوئیں تو کس زمانہ میں؟ ۳۳ میں نے پہلے ہی کچھ وجوہات پیش کی ہیں اور یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ سکندر اعظم کے زمانہ میں گزرا تھا وہ ستلج ایک الگ قائم دریا نہیں تھا۔ اور ٹالمی جو سکندر اعظم سے پانچ سو سال بعد کے زمانہ ہوا بیان کرتا ہے کہ ستلج بیاس سے ملتا تھا جیسا کہ آج بھی ہم دیکھتے ہیں۔ جو لوگ اِس نظریہ کے قائل ہیں کہ سکندر کے بعد کسی زمانہ میں یہ دریائے ہاکڑا میں شامل ہوگیا تھا وہ دراصل منفی شہادت کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ یہ منفی شہادت کیا ہے، وہ یہ کہ چونکہ مسلم جغرافیہ نویسوں اور مورخین نے ایک آدھ مرتبہ کے علاوہ کبھی بھی ستلج کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ بادشاہ اور فاتحین جن دریاؤں کو عبور کرتے ہیں اُنھیں ضابطہ تحریر میں لایا جاتا ہے، اگر ستلج اُن راستوں پر موجود ہوتا جہاں سے یہ لوگ گذرے تو اُس کا ذکر لازم تھا۔۳۴

اِس نظریہ پر دوسرے اعتراضات بھی عائد کئے جاسکتے ہیں۔ مگر میں یہاں اپنا

مفروضہ دوبارہ پیش کرنے پر ہی اکتفا کرونگا کہ دریائے ستلج، گھارا پہلے اپنا سیلابی پانی دریائے ہاکڑا کے اندر پہنچاتا رہتا تھا، لیکن اِس کی آبی گذرگاہ میں کچھ ایسی قدرتی تبدیلی واقع ہوئی کہ یہ پانی ہاکڑا میں جانا بند ہوگیا، اُس وقت سکھر شہر سے پہلے دریائے سندھ کے بہاؤ میں بھی تبدیلی واقع ہوئی۔ مجموعی طور پر انھیں کا اثر تھا کہ سندھ کے علائقہ میں وہ تبدیلیاں واقع ہوئیں جن پر ہم اِس وقت غور کررہے ہیں۔

جس سال دریائے سندھ نے بکھرّ کی تنگ نائے ☆ کے راستے سے بہنا شروع کیا وہ سال ای-بی-ایسٹوک کے خیال کے مطابق ایک درگاہ کے کتبہ پرکندہ ہے جو روہڑی کے مقابل ایک جزیرے پر واقع ہے اور جسے درگاہ خواجہ خضر یا زندہ پیر کہتے ہیں، ابجد کے اعتبار سے جو تاریخ نکلتی ہے وہ ۳۴۱ ہجری یا ۹۵۲ عیسوی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ یہ پتھر جس پر عبارت کندہ ہے کسی پُرانی عمارت سے لیا گیا ہے اور درگاہ میں چنا گیا ہے۔ مگر مسٹر یزدانی کا خیال ہے کہ یہ کتبہ جس تاریخ کو ظاہر کرتا ہے اُس سے بہت بعد کے زمانہ میں تیار کیا گیا ہوگا۔ کیونکہ نستعلیق طرز کتابت اور فارسی عبارت جس میں یہ تاریخ کا قطعہ موجود ہے کئی صدیوں بعد علائقہ میں مروج ہوا۔ قطعہ جو مطلب ظاہر کرتا ہے وہ بھی صاف نہیں ہے اور یہ خیال کہ اِس سے دریائے سندھ کے بہاؤ کی تبدیلی اور اِس جزیرے کے وجود میں آنے کا اشارہ ملتا ہے۔ ایک تصور سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ گو یہ جزیرہ جاذب نظر ہے۔[۳۶]

ایسٹوک کا بیان ہے کہ اُس نے دو بڑے پتھروں پر کندہ عبارت کو پڑھا ہے، یہ پتھر دریا کی پُرانی گذرگاہ پر جو پہاڑیوں کو کاٹتی ہوئی الور کے نزدیک سے جاتی ہے موجود تھے۔ اِس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ میر معصوم نے اِنھیں دریا کی قدیم گذرگاہ کی نشان کے طور پر نصب کردیا تھا۔ بہرصورت بعد کی تحقیقات اِن پتھروں کو تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ لیکن کھُدے ہوئے پتھروں کی اینٹیں جنھیں کزنس (Cousens) اور یزدانی نے دیکھا اور جانچا دریا کے بارے میں کچھ ظاہر نہیں کرتیں بلکہ ایک نیک ہدایت میر معصوم کی طرف

☆ اس تنگ نائے کو سندھ میں "چورلک" کہتے ہیں۔ (ادارہ)

سے ان پر کندہ تھی۔ اور ان کی تاریخ ۱۵۹۹ء تھی۔ ۳۷ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر معصوم اپنی تاریخ سندھ میں نہ تو دریائے سندھ کا گذرگاہ کی تبدیلی کا ذکر کرتا ہے اور نہ دلورائے کے وجود کا، حالانکہ وہ خود بکھرّ کا باشندہ تھا اور وہاں عرصہ دراز تک مقیم رہا۔ اور نہ ہی میر صاحب قدرت کے کرشمے بیان کرنے کے معاملہ میں کنجوس تھے۔ ۳۸

تاریخ طاہری اور تحفتہ الکرام میں جو افسانہ درج ہے اُس کی رو سے ظالم دلورائے نے اپنی راجدھانی الور سے بمنوایا برہمن آباد میں منتقل کردی تھی اور اپنے مکروہ طرز عمل کو اُس وقت تک برقرار رکھا جب تک یہ جگہ برباد نہ ہوگئی۔ اِس ظالم حکمراں کے شہر کے ساتھ جو تعلق تھا وہ آج بھی ایک دیہات کی شکل میں باقی ہے۔ شہر کے ویرانے سے نزدیک یہ موضع دلوراءِ کے نام سے موجود ہے۔ یہ کہانی ایسی ہی ہے جیسی دوسری بہت سی کہانیاں مشہور ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ شمالی مغربی ہندوستان کے ہر ایک قدیم شہر میں ایک نہ ایک ظالم اور بدمعاش حکمراں کی روایت مشہور ہے یا ایک نافرمان قوم کی جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا اور دلوراءِ کا نام ڈیرہ غازی خان کے ایک مقام سے بھی وابستہ ہے۔ جہاں تک بہمن آباد کا تعلق ہے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک زلزلہ نے اِسے زمین دوز کردیا تھا۔ صرف ایک مینار باقی رہ گیا تھا جسے شہر کی یادگار کہا جاسکتا ہے۔ ۳۹

زلزلہ سے بہمن آباد کی تباہی کو میجر ریورٹی (Raverty) ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے اِسے ۱۰۵۰ء عیسوی کا واقعہ بتاتے ہیں۔ ۴۰ لیکن اِسی زمانہ میں اور ۲۰۰ دوسو سال بعد تک منصورہ شہر جو بہمن آباد سے کُل چھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، میجر ریورٹی کے بیان کے مطابق خوب خوش حالی سے ہمکنار تھا۔ شہر کی تاریخ لکھنے کے لئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الادریسی نے اپنے زمانہ تک کی مکمل معلومات حاصل کی تھیں۔ وہ کہتا ہے کہ عمارتیں پختہ اینٹوں، پلاسٹر اور ٹائیلس سے تعمیر کی گئی تھیں۔ ۴۱ اِس کے ایک صدی بعد القزوینی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے (جیسا کہ اُس سے پہلے بہت سے مصنفین لکھ چکے تھے) کہ مہران دریا کی ایک شاخ نے شہر کا احاطہ کیا ہوا تھا اور یہ بھی کہ شہر کی آب و ہوا بہت

گرم اور مکھیاں بہت زیادہ ہیں۔ "شہر کا رقبہ وسیع ہے اور پانی اچھا اور شیریں ہے" اگر ہم اِس کی شہادت کو اِس بنا پر مسترد بھی کر دیں کہ اُس نے اپنے وقت سے تین سو سال پہلے کے ایک مصنف کی کتابوں سے بہت کچھ نقل کیا ہے۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ منہاج السراج نے اپنی کتاب "طبقات ناصری میں درج کئے ہیں، جو القزوینی کے زمانے میں ہی لکھی گئے ہے۔ شہر منصورہ کے بارے میں وہ واقعات درج کئے گئے ہیں جو ۱۲۲۶ء میں رونما ہوئے۔ اور یہ کہ "یہ ملک سیوستان کا ایک شہر ہے"۔ پچاس سال بعد البلاذری اِس شہر کے بارے میں لکھتے ہوئے ماضی کے صیغے استعمال کرتا ہے اور اِس شہر کو ہم نام دوسرے شہروں سے متعلق قرار دیتا ہے۔ جو برباد ہو چکے تھے۔ ۴۲ "طبقات ناصری" نے لکھا ہے کہ "یہ بات مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہے کہ جس زلزلہ نے اچانک بھمن آباد شہر اور اِس کے باشندوں کو تباہ کر دیا ہو، منصورہ شہر پر بالکل بھی اثر انداز نہ ہوا ہو۔ جبکہ یہ شہر بھمن آباد سے صرف چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ جب خلجی ترک یہاں وارد ہوئے (۱۲۲۶ء) تو شہر ویران ہوگا اور محدود چند لوگ ہی وہاں آباد ہوں گے"۔ ۴۳

میجر ریورٹی (Raverty) کے لئے یہ بیان حیران کن ہے۔ وہ البلاذری کی اِس شہادت پر اپنا نظریہ قائم کرتا ہے کہ منصورہ بھمن آباد سے دو فرسخ کے فاصلہ پر آباد کیا گیا تھا، کزنس (Cousens) نے جو آثار یاتی شواہد جمع کئے اور اِن کے ساتھ الادریسی اور دوسرے لوگوں کے حوالہ جات۔ وہ سب اِس نظریہ کو باطل کر دیتے ہیں اور اِس حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں کہ منصورہ شہر بھمن آباد کی جگہ آباد کیا گیا اور اِس کی تعمیر میں بھمن آباد کے خرابہ کا بہت سامان استعمال کیا گیا۔ ۴۴

لیکن اِس شہر کے متردک ہونے کے سبب کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ روایت یہی مشہور ہے کہ راجہ دِلورائے کے مظالم کی وجہ سے خدا کا عذاب زلزلہ کی شکل میں نازل ہوا، اور شہر تباہ ہوگیا۔ ہیگ (Haig) کا خیال ہے کہ "دریائے سندھ کے بہاؤ میں کسی بڑی تبدیلی کی وجہ سے ایسا ہوا۔۔۔۔۔۔ اور یہ تبدیلی تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر یا

چودھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں واقع ہوئی'' کزنس (Cousens) نے اِس ضمن میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے "اِس مقام پر کنوؤں کی کثیر تعداد موجود تھی اور کنویں کھودنے کے بعد پانی کی قلت کے سبب شہر کو ترک کر دینے کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ اِس سبب سے شہر کو چھوڑ دینے کا سلسلہ بتدریج ہوا ہو گا۔ لیکن ایسی صورت میں تانبے کے پُرانے سکّوں کی کثیر تعداد جو اِس مقام پر ہر جگہ بکھرے ہوئے تھے دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ ۴۶؎ چنانچہ وہ اِس نظریہ کو ترجیح دیتا ہے کہ شہر کو کسی دشمن نے لوٹ مار سے تباہ کیا۔ آثار یاتی شواہد جو اُس نے جمع کئے ہیں ان میں انسانی ہڈیوں کی بڑی مقدار، قیمتی دھاتوں کا فقدان اور تانبے کے چھوٹے سکوں کی کثیر مقدار جو ہر جگہ بکھری ہوئی ملی۔ اُس کے نظریہ کی تائید کرتے ہیں لیکن اِس کے لئے حتمی ثبوت کے طور پر پیش نہیں کئے جاسکتے۔ اِس مقام پر حضریاتی عمل ایسے پیمانہ پر نہیں ہوا جس کی بنا پر یقینی طور پر کہا جا سکے کہ کیا چیز موجود ہے، اور کیا چیز وہاں موجود نہیں ہے اور ایسی اشیاء کے وجود اور عدم وجود سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

مجموعی طور پر جس امکانی صورت کے حق میں زیادہ شواہد نظر آتے ہیں وہ یہی ہے کہ دریا اپنا راستہ بدل کر شہر سے دور ہو گیا تھا۔ باشندوں نے رفتہ رفتہ اِس شہر کو چھوڑ دیا اور اپنے قیمتی اثاثے ساتھ لے گئے اور اِس پُر آشوب زمانہ میں شہر کی کمزوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کسی دشمن یا مقامی لٹیروں نے بچے کھچے شہریوں کا قتل عام کیا اور لوٹ مار کی۔ ۴۷؎ کزنس نے یہ دلیل پیش کرتے ہوئے کہ اتنے بہت سے کنویں موجود ہونے کے بعد قلت آب کا سوال باقی نہیں رہتا اور اِس بنا پر شہر کو ترک کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ایک بہت اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ایک بڑا تجارتی مرکز جیسا کہ الادریسی کے الفاظ میں منصورہ تھا، وہ صرف پینے کے پانی پر ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ نہروں اور ندیوں سے آبپاشی کے بغیر قرب وجوار میں کھیتی باڑی ممکن نہیں جس سے آبادی کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اِسی طرح مال تجارت کی آمد ورفت کی آسانی ختم ہونے کے بعد تجارت بھی ختم ہو جائے گی۔

بلاشبہ یہ ممکن ہے کہ تین صدیوں میں تین مرتبہ دریائے سندھ نے رُخ بدلا یا اِس سے بھی کم زمانہ میں۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ الور شہر پر زوال آ گیا۔ سندھ کے جنوبی مشرقی علاقہ میں ساری زمینیں ویران ہو گئیں اور منصورہ کے لوگوں نے رہنا ترک کر دیا۔ میرے نزدیک اِس بات کا زیادہ امکان ہے کہ تینوں سانحے یکے بعد دیگرے چند سالوں کے اندر ہی رونما ہوئے اور ان سب کا سبب دریائے سندھ کے بہاؤ میں تبدیلی یا تبدیلی کا وہ عمل جو چند سال جاری رہا قرار دیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ [۴۸]

یہ محض ایک اتفاق نہیں ہوگا کہ تقریباً اِسی زمانہ میں یعنی تیرھویں صدی کے نصف اول میں ہمیں بکھر اور روہڑی کا ذکر بھی کتابوں میں ملتا ہے۔ اِس زمانہ سے پہلے یہ ممکن ہے کہ ہر دو مقامات موجود ہوں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہ ہو لیکن اگر ان کے محل وقوع کا سندھ سے وہی تعلق تھا جو اس زمانہ تک جاری ہے جو سلطان محمد غوری نے ملتان فتح کرنے کے بعد ۸-۱۱۷۷ء میں اُچ کے راستے سے گجرات پر حملہ کیا تھا۔ اور پانچ سال بعد اُس نے ملتان سے دیبل پر پیش قدمی کی اور اِس طرح صوبہ پر مکمل قبضہ حاصل کر لیا، اِن فتوحات کے جو تذکرے موجود ہیں اُن میں نہ تو بکھر کا بیان ہے اور نہ منصورہ کا۔ چنانچہ اِس سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اِس زمانہ میں اِن مقامات کی کوئی اہمیت نہیں تھی، بکھر کا حوالہ مسلمانوں کے دور میں پہلی بار تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی سالوں میں ملتا ہے۔ بلکہ جب ناصر الدین قباچہ کو علاقہ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا۔ اُس زمانہ میں یہ ایک مضبوط قلعہ تھا اور میجر ریورٹی (Raverty) کا خیال ہے کہ ان سے پہلے حکمران کے زمانہ میں یہ قلعہ بندی تعمیر کی گئی ہوگی۔ یعنی سلطان محمد غوری کے مقرر کردہ پہلے حاکم کے دور میں۔

چنانچہ یہ ممکن ہے کہ بارھویں صدی عیسوی کے آخری دو عشروں کے لگ بھگ دریائے سندھ سے کوئی شاخ بکھر تنگ نائے سے گذرنے لگی ہوگی۔ میجر ریورٹی (Raverty) کا نظریہ ہے کہ اِس زمانہ کے ڈیڑھ سو سال بعد تک بھی دریائے سندھ کا سرچشمہ اپنے پُرانے راستہ پر ہی قائم تھا۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ یہ پرانا راستہ سکھر کے شمال میں تھا۔ میجر ریورٹی

کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ کم از کم ۱۲۲۸ء تک مذکورہ بالا شاخ نے بکھر کا احاطہ نہیں کیا تھا بلکہ اُس وقت تک یہ مقام داہنے کنارے کی طرف سے ایک جزیرہ نما تھا اور دریا اِس کی جنوبی سرحد سے گذرتا تھا۔ ریورٹی کا یہ نظریہ اِس سال واقع ہونے والی فوجی مہمات کے تذکروں پر مبنی ہے، اِسی سال بکھر کے قلعہ میں موجود ناصر الدین قباچہ کی فوجوں کا نظام الملک کی فوجوں نے محاصرہ کرلیا تھا۔۵۲ "جامع الحکایات" میں یہ درج ہے کہ ملک ناصر الدین قباچہ کی فوجوں کو شہر کے حصار سے پیچھے دھکیل دیا گیا تھا۔ اور اُنھوں نے قلعہ کے اندر مورچے سنبھال لئے تھے۔ اِس بیان سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ سکھر شہر بیرونی فصیل کے اندر واقع تھا تاج المآثر کے بیان سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بکھر ایک جزیرہ تھا حالانکہ اِس کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ "قلعوں کی آنکھ اور سلطنت ہند کا چہرہ تھا۔ جسے کوئی بادشاہ بھی فتح نہیں کرسکا تھا۔۵۴ اِسی طرح سے "طبقات ناصری" ملاحظہ فرمایئے۔ یہ ایک مستند کتاب ہے۔ گو تفصیلات کے اعتبار سے مختصر ہے۔ اِس کی رو سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُس زمانہ میں بکھر ایک جزیرہ تھا۔

اِس کے برعکس جوینی نے اپنی کتاب "جہاں کُشا" میں واضح طور پر یہ تحریر کیا ہے کہ کباچہ فرار ہوکر "بکھر اور سکھر میں پناہ گزین ہوگیا۔ یہ دو قلعے ایک جزیرے پر واقع تھے"۔۵۶ رشید الدین کی جامع التواریخ" بھی اِس بیان کی تصدیق کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اِس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے، ایلیوٹ نے لکھا ہے کہ "تاریخ الفی" میں یہ بات صاف طور پر بیان کی گئی ہے کہ "قباچہ بکھر کے جزیرے کی طرف چلا گیا"۔ جہاں کُشا کی تاریخ تصنیف تقریباً ۶۵۰ ہجری (۱۲۵۲ء) ہے جو بلاشبہ یہ شہادت بہم پہنچاتی ہے کہ بکھر قباچہ کے زوال کے وقت ایک جزیرہ تھا۔ اور دوسری تواریخ جن میں یہ چیز موجود نہیں اِس کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔

کم از کم اتنا ضرور ہے کہ بکھر کو نواحی زمین سے الگ کرنے کا عمل ۱۳۳۳ء سے قبل دریائے سندھ انجام دے چکا تھا۔ یہ وہ وقت ہے کہ جب ابن بطوطہ اِس شہر سے گذرا۔ اُس

نے لکھا ہے کہ بکھر ایک خوبصورت شہر ہے جس کے درمیان سے دریائے سندھ کی ایک شاخ بہتی ہے۔ اِس پانی کے درمیان ایک شاندار مسافر خانہ ہے جس میں ٹھہرنے والوں کے آرام وآسائش کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ جگہ ایک سابق گورنر نے تعمیر کرائی تھی۔ ۵۸

ابن بطوطہ کی ایسی عبارت کو ریورٹی (Raverty) نے اپنے نظریہ کی تائید میں پیش کیا ہے۔ ریورٹی (Raverty) کا نظریہ یہ ہے کہ اُس وقت بھی دریائے سندھ کا سر چشمہ بکھر تنگ نائے سے نہیں گذرا تھا۔ اُس نے لکھا ہے کہ کچھ لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے اور دریائے سندھ کے راستہ سفر کرتے ہوئے یکم محرم ۷۳۴ ہجری (ستمبر ۱۳۳۳ء) میں اُس مقام اتصال تک پہنچے جو پنج آب کے نام سے مشہور تھا، یہاں سے وہ جتوئی اور پھر سیوستان گئے۔ وہ کہتا ہے کہ نیچے تک اِس سفر کے دوران بکھر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا گیا، " بغیر بکھر سے گذرے ہوئے وہ سیوستان کیسے پہنچ سکتا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔ چنانچہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ سرچشمہ سندھ جو مزید مغرب کی سمت بہتا تھا۔ ۵۹ وہ اُسی سے سفر طے کرتا رہا...... وغیرہ۔ اگر ابن بطوطہ کے بیان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ریورٹی (Raverty) کا بیان غلط فہمی پیدا کرنے والا ہے۔ اوّل تو یہ کہ وہ کچھی (Catch) کے راستے سے سندھ میں داخل ہوا اور "پنج آب" جو اُس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے، وہ دریائے سندھ کا ہی دوسرا نام ہے۔ پھر یہ کہ اُس نے اپنا سفر دریا کے راستے سے طے نہیں کیا بلکہ اِسے عبور کرکے جنانی (Janani) پہنچا (جسے ریورٹی نے جتوئی لکھا ہے) اور یہ دو دن کی مسافت تھی۔ ۶۲ یہاں سے وہ سہون پہنچا البتہ سہون سے لاھری تک جو دریا کے دہانہ پر واقع تھا وہ دریا کے راستے گیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ دریائے سندھ میں اوپر کی طرف بکھر اور اُچ تک کشتی سے گیا ہو حالانکہ اُس نے ایسی کوئی بات بیان نہیں کی ہے امکان یہ ہے کہ صوبہ سندھ میں داخلہ اور دریائے سندھ کا عبور ایسے مقام پر عمل پر آیا جو بکھر سے نیچے تھا۔ یعنی لاڑکانہ کے آس پاس کسی مقام پر۔ اور یہی ایک کاروان کے لئے بولان سے گذر کر کچھی سے گذرتا ہوا مغرب کی سمت مروجہ راستہ تھا۔

اِس زمانہ سے سندھ کی تاریخ میں بکھر کو ایک اہمیت حاصل رہی ہے۔ ۱۵۲۰ء میں شاہ بیگ ارغون نے ازسرنو اِس مقام کی قلعہ بندی کی جس کے لئے الور کی پُرانی عمارات کی اینٹیں استعمال کی گئیں۔ اِس موقع پر اُس نے بکھر سے سیّدوں کو باہر نکال دیا جو عرصہ دراز سے وہاں رہتے تھے اور اُنھیں روہڑی میں رہائش کے لئے متبادل جگہ دیدی۔ ۶۳ اِس وقت تک بلاشبہ پورا دریائے سندھ بکھر سے ہی گذرنے لگا تھا۔ بالکل اِسی طرح جس طرح ہم آج دیکھتے ہیں۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد پانچ صدیوں کے دوران زیریں سندھ میں تبدیلیوں اور ترقیوں کا جو عمل جاری رہا اُس کی صحیح تفصیلات جمع کرنے میں اگر زیادہ نہیں تو اُتنی ہی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے جو سابقہ ادوار کے سلسلہ میں پیش آیا تھا۔

گجو کے مغرب میں بارہ میل کے فاصلہ پر بھمبھور کے کھنڈرات واقع ہیں۔ یہ گھارو خلیج کا داہنا کنارہ ہے۔ تحفتہ الکرام کے مُصنف کا بیان ہے کہ اِس شہر کو بھمبورائے نامی ایک شخص نے آباد کیا تھا جسے زلزلہ نے تباہ کر دیا تھا۔ یہ واقعہ آٹھویں صدی عیسوی کے اواخر میں پیش آیا۔ میر طاہر نے بہر حال یہ لکھا ہے کہ دریا جو اِس مقام کے پاس بہتا تھا۔ اُس کے خشک ہو جانے کی وجہ سے یہ مقام ویران ہو گیا اور یہاں کے باشندے پرگنہ ساکرہ میں منتقل ہو گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے یہ واقعہ گیارھویں صدی کے شروع میں پیش آیا۔

علی شیر قانع نے اِن واقعات کو اِس سے بھی پہلے زمانہ سے منسوب کیا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ عباسی خلفاء نے جب دوبارہ اسلامی اقتدار کو مستحکم کرنا شروع کیا تو یہاں شیخ ابوتراب کی سرکردگی میں بہت سی مہمات انجام دی گئیں۔ اس نے "ضلع ساکرہ میں قلعہ تھرہ (Tharah) پر قبضہ کیا" اور دوسرے مقامات بھی فتح کئے۔ اِس زمانہ میں یہ علاقہ ویران ہوا۔ اِن کھنڈرات کی تحقیق سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر یہ مقام عربوں نے تعمیر نہیں کیا تو کم ازکم وہ یہاں مقیم ضرور رہے۔ کزنس (Cousnes) کا خیال ہے کہ ایک سرحدی چوکی سے زیادہ اِس مقام کی اہمیت نہیں تھی۔ اِس کا مقصد خلیج کے آبی راستے کی دیکھ بھال یا کسی

ایسے چھوٹے بندر گاہ کی حفاظت کرنا تھا، جہاں سے ہو کر جہاز دیول (دیبل) اور اندرون ملک تک پہنچتے تھے"۔ اور جب خلیج سے دریائے سندھ کا آبی راستہ منقطع ہو گیا تو اِس چوکی کو ترک کر دیا گیا اور یہ جگہ رفتہ رفتہ ویران ہو گئی۔ سسی پنوں کے مشہور واقعہ سے میک مرڈو (Mc Murdo) نے بنبھور شہر کے متعلق کچھ نتائج اخذ کیے ہیں، اِس کہانی کی رو سے سسی کو جبکہ وہ طفیل شیر خوار تھی ایک ٹوکری میں رکھ کر بھمنو کے مقام پر دریا میں بہا دیا گیا تھا، جب یہ ٹوکری بنبھور پہنچی تو ایک دھوبی نے اِسے نکال لیا۔ اِس جگہ دھوبی کا ذکر نشاندہی کرتا ہے کہ اُس وقت خلیج کا پانی تازہ ہوتا تھا۔٦٦ اِس جگہ میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ٹھٹھ میں جو روایات آج بھی مشہور ہیں اُن کے اعتبار سے شیخ علی تراب کی فوج کشی کے واقعات یہ اشارہ کرتے ہیں کہ اُس زمانہ میں کھلے سمندر سے جہاز کافی دور اندرون ملک یعنی تھری (Tharri) کے مقام تک جاتے تھے۔

میک مرڈو (Mc Murdo) اِس یقین کا اظہار کرتا ہے کہ " دیبل کے پہلے شہر " کے زوال کے بعد ہی بنبھور وجود میں آیا۔ چنانچہ اِس شہر کی تاریخ کا کھوج لگانے کی کوشش کرنا ضروری ہے، بلکہ یکے بعد دیگرے جتنے شہر اِس نام کے سامنے آتے ہیں اُن سب کے بارے میں تحقیق کرنا چاہیے۔

دیبل کو اپنی فتوحات کی ابتداء میں ہی عربوں نے تباہ کر دیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر دوبارہ آباد ہوا۔ چنانچہ تمام مسلم جغرافیہ دانوں نے ابنِ خرداذبہ سے لے کر الادریسی تک مملکتِ سندھ کے احوال میں اِس شہر کا ضرور ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ساحل سمندر پر یہ سب سے اہم مقام شمار کیا جاتا تھا۔

البیرونی کا بیان خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ کیونکہ اُس نے ایک دوسرے شہر کا بھی ذکر کیا ہے جو اِس سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ یہ شہر دریائے سندھ کی مغربی شاخ کے دہانہ پر واقع تھا اور لوہارانی کے نام سے مشہور تھا جو آگے چل کر سندھ کے بندر گاہ کی حیثیت سے دیبل کا قائم مقام بننے والا تھا۔ دونوں شہروں کے درمیان البیرونی کے بیان کے مطابق

بارہ فرسنگ کا فاصلہ تھا، خردار بہ اور المسعودی نے اِس فاصلہ کو "دو" فرسنگ بیان کیا ہے، میرا خیال ہے کہ البیرونی کا بیان کردہ فاصلہ کتابت کی غلطی نہیں ہے کہ دو کے بجائے بارہ فرسنگ لکھ دیا گیا ہو۔٦٩

الادریسی نے دیبل کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اُس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے اپنی کتاب "نزہت المشتاق" میں اپنے پیش رو جغرافیہ دانوں کی کتابوں سے اِس مقام پر آنکھیں بند کر کے نقل نہیں کی جیسا کہ دوسرے مقامات پر اُس کا طریقہ رہا ہے۔ بلکہ یہاں اُس نے صحیح اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ "یہ مقام بہت آباد ہے لیکن یہاں کی زمین زرخیز نہیں ہے۔ کھجور کے علاوہ مشکل سے ہی کوئی دوسرا درخت اِس زمین پر نظر آئیگا۔ بلند زمینیں بنجر اور میدانی علائقہ پیداوار کے قابل نہیں۔ مکانات لکڑی اور مٹی سے بنائے گئے ہیں، یہ مقام صرف اِس وجہ سے آباد ہے کہ یہاں سندھ اور دوسرے ممالک کے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں۔٧٠ دیبل تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر تک اہم شہر شمار ہوتا رہا۔ سلطان جلال الدین نے بھی اِس شہر کو تاراج کیا۔ اُس نے یہاں ایک مندر کی جگہ مسجد تعمیر کی اور ١٢٢٣ء اِسی سلطان کو چنگیز خان سے جان بچانے کے لئے یہاں پناہ لینی پڑی۔

ہیگ (Haig) کہتا ہے کہ شاید یہ شہر قدیم دیبل نہیں تھا۔" بلکہ دوسرا کوئی شہر جسے دیبل کے نام سے پکارا جانے لگا۔ البیرونی سے متاثر ہو کر ہیگ (Haig) نے یہ رائے قائم کی ہے۔ کیونکہ البیرونی نے دیبل نام کے ساتھ مبینہ طور پر اِس شہر کا ذکر نہیں کیا۔ حالانکہ یہ خیال غلط ہے۔ البیرونی نہ صرف یہ کہ لوہارانی کا ذکر کرتے ہوئے دیبل کا حوالہ دیتا ہے بلکہ ساحل کے متعلق تفصیلات پیش کرتے ہوئے بھی "دیبل کے علائقہ" کا حوالہ دیتا ہے۔٧١

قوی امکان یہ ہے کہ جلال الدین کی غارتگری سے دیبل پھر کبھی اپنے بل میں کھڑا نہ سکا جبکہ ١٢٥٠ء کے لگ بھگ دریائے سندھ کے بہاؤ کی تبدیلی نے لوہارانی کی قسمت کو جگا دیا۔ دریا کی تبدیلی کے متعلق ہم آگے اپنا نظریہ پیش کریں گے۔

١٣٣٣ء کے اواخر میں جب ابنِ بطوطہ سندھ کے زیریں علائقہ میں وارد ہوا تو سندھ

کی حکومت کا انتظامی مرکز اور اِس ملک کا بندرگاہ لاہری تھا۔ اِس شہر کے متعلق اُس نے لکھا ہے "ساحل سمندر پر ایک خوبصورت مقام ہے، جس کے نزدیک دریائے سندھ سمندر میں گرتا ہے اِس طرح سمندر اور دریا کا پانی اِس شہر کے قریب وجوار میں ایک دوسرے سے ملے ہیں۔ شہر میں ایک عمدہ بندرگاہ ہے جہاں یمن اور فارس وغیرہ سے لوگ آتے ہیں۔۲ے اِس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ یہی وہ مقام ہے جسے البیرونی نے لوہارنی کے نام یاد کیا ہے۔ اپنے قیام کے دوران البیرونی اپنے میزبان کے ساتھ پُرانے کھنڈرات دیکھنے کے لئے گیا۔ یہ لاہری سے سات میل دور ایک میدان میں تھے جسے تارنا کہا جاتا تھا۔ کھنڈرات میں پتھروں کے بڑے بڑے ڈھیر تھے۔ کچھ انسانوں اور جانوروں کے اعضاء سے مشابہ تھے اور کچھ اناج کے دانوں جیسے۔ مکانات کی دیواروں کے آثار بھی موجود تھے اور ایک ایسی عمارت کے آثار بھی جو تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا، اِس میں ایک چبوترے پر مورتی رکھی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر کسی ہندی زبان کی عبارت کندہ تھی۔ گورنر نے اپنے مہمان کو بتایا کہ موؤخین کا خیال ہے کہ اِس مقام پر کسی زمانہ میں ایک بڑا شہر آباد تھا۔ جس کے باشندے سخت گناہوں کا ارتکاب کرتے تھے جس کے سبب اُنھیں پتھر میں تبدیل کر دیا گیا تھا اور یہ عبارت اِس واقعہ کی تاریخ کا پتہ دیتی ہے۔ البیرونی کو بتایا گیا کہ تقریباً ایک ہزار سال پہلے یہ واقعہ ہوا تھا۔۳ے

لاہری بندر سے چند میل شمال میں جی-ای-ایل کارٹر (G.E.L.Carter) نے ایک مسجد کے کھنڈرات کا ذکر کیا ہے جسے "ٹھٹھہ واری مسجد" کہا جاتا تھا۔ یہ مسجد ظاہر ہے ہندو مندر کے ملبہ سے تعمیر کی گئی تھی۔۴ے اور کزنس (Cousens) کے خیال کے مطابق بارھویں عیسوی صدی میں یہ مسجد تعمیر کی گئی تھی۔ اِس مقام پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جامع مسجد جسے جلال الدین نے بت کدہ کے کھنڈرات پر تعمیر کیا تھا اور جو دیبل میں واقع تھی اور اِس طرح ابن بطوطہ کا بیان کردہ "تارنا" یہی تو نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کننگھم (Counnigham) نے دیبل کا جو محل وقوع بیان کیا

ہے وہ اسی مقام سے مطابقت رکھتا ہے۔۵ے لیکن اس مقام کے قریب جولاہری بندر ہے۔ نکولاس وتھنگٹن نے اسی کا حوالہ دیا ہے اور اسی طرح سترھویں عیسوی صدی کے دوسرے محققین مثلاً والٹرپیٹن وغیرہ، یہ لوگ اِس کے محل وقوع کو عرض البلد ۲۲ ڈگری ۳۸ اور طول البلد ۶۷ ڈگری ۲۲ فٹ بیان کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابن بطوطہ کے وقت میں دریائے سندھ کا ڈیلٹا اِس قدر مغرب تک پھیلا ہوا نہیں تھا محمد بن قاسم کے زمانہ کا تو ذکر ہی کیا۔

صاحب تحفۃ الکرام نے بھنبھور "اور چند دوسرے شہروں" کی زلزلہ سے تباہی کا ذکر کیا ہے یہ زلزلہ ہارون الرشید کی خلافت کے زمانہ میں آیا جبکہ شیخ علی تراب یہاں حاکم تھا۔۶ے تمام شہادتوں سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ عربوں کے ابتدائی دورِ حکومت میں سندھ کے علاقہ میں یقیناً زبردست زلزلہ آیا تھا جس کی وجہ سے بہت سے شہر ملبے کا ڈھیر بن گئے تھے۔ لیکن کئی صدیوں بعد تک تواریخ نے اِس کا احوال قلمبند نہیں کیا۔ بھنبھور اور بہمن آباد کے خاتمہ کی جو کہانیاں ہم تک پہنچی ہیں وہ اِس قدرتی آفت کی مسخ شدہ روایات ہیں۔

البیرونی اور ابن بطوطہ کے درمیان تین صدیوں کا جو عرصہ حائل ہے وہ زیریں سندھ میں سومرا اقتدار کا زمانہ ہے۔ اور چونکہ مقامی مورخین نے اِس خاندان کے زوال کا سبب دریائے سندھ کے بہاؤ میں انقلابی تبدیلی بتایا ہے۔ اِس لئے ہمیں پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ البیرونی نے اِس دریا کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ گو البیرونی خود کبھی سندھ میں نہیں آیا۔ ہمیں یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ وہ ایک سمجھدار نقاد اور عالمانہ ذہنیت کا انسان تھا۔ اُس کی رائے قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے، چنانچہ اُس سے پہلے جو لوگ گذرے اُن کے بیانات کو البیرونی نے جوں کا توں ہرگز قبول نہیں کیا ہوگا۔ بلکہ ہر امکانی ذریعہ سے اُن کی صداقت کو پرکھا ہوگا اور اپنے ملتان کے قیام کے دوران اِن متعلقہ مسائل پر تحقیق میں کمی نہیں کی ہوگی۔

البیرونی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ساحل ہند مکران کے مرکزی شہر تیز (Tiz) سے شروع ہوتا ہے اِس شہر اور دیبل کے درمیان خلیج توران واقع تھی (خلیج سون میانی) اور یہ واضح

رہے کہ وہ خلیج اور عارضی ذخیرہ' آپ کے درمیان بہت احتیاط کے ساتھ امتیاز کرتا ہے۔۷۷ے اور لکھتا ہے، "مندرجہ بالا خلیج کے بعد چھوٹا دہانہ آتا ہے، اِس کے بعد بڑا۔ اِن سے گذرنے کے بعد آدمی بوارج (Buwarij) پہنچتا ہے، اور رن کچھ کے سمندری قزاقوں سے گذر کر سومناتھ آتا ہے" اِس بیان سے صاف ظاہر ہے کہ دریائے سندھ کی مغربی یعنی داہنی شاخ چھوٹی اور شرقی دوسری شاخ کی نسبت بڑی تھی۔ جب وہ دریا کے آبی راستے کا بیان پیش کرتا ہے تو کہتا ہے کہ "یہ منصورہ کے نزدیک دو شاخوں میں منقسم ہو گیا تھا" اور سمندر میں دو راستوں سے داخل ہوتا ہے۔ ایک شہر لوہارانی کے نزدیک اور دوسرے مقام پر مزید مشرق کی طرف کچھ کے صوبہ میں سندھو ساگر کے نزدیک۔ "اِس بیان سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ گیارھویں صدی کے ابتدائی دور میں سندھو ڈیلٹا کی بڑی شاخ پُرانی آبی گذرگاہ سے جسے پران کہتے ہیں بہتی تھی اور اُس علاقہ کو سیراب کرتی تھی جس کا تعلق سومرا خاندان سے ہے۔

ابنِ بطوطہ نے سہون سے لاہری بندرگاہ تک کشتی کے ذریعہ سے سفر کیا جو دریا کے دہانہ پر آباد تھا۔ یہ سفر پانچ دن میں طے ہوا۔ یہ واقعہ ۳۴۔ ۱۳۳۳ء کا ہے۔ اُس نے اپنے سفرنامہ میں یہ ذکر نہیں کیا کہ جس آبی راستے سے وہ گذرا اُس میں سے کوئی شاخ بھی نکلتی تھی۔ لیکن ایسے ذکر کی عدم موجودگی اِس بات کی دلیل نہیں ہے کہ شاخ نہیں تھی۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس آبی راستے سے وہ گذرا اُسی سے دریائے سندھ کے پانی کی زیادہ مقدار لاہری کے دہانہ سے سمندر میں داخل ہوتی تھی، سیاح نے اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "اِس طرح سے اِس مقام پر دو سمندر ملتے ہیں۔ البیرونی کے زمانہ میں صورت حال اِس کے برعکس ہونے کی وجہ میرے نقطہ' نظر سے یہ تھی کہ اندرون ملک کافی دور دریائے سندھ اپنی آبی گذرگاہ تبدیل کر چکا تھا۔ اور یہ تبدیلی تیرھویں صدی عیسوی کے وسط میں واقع ہوئی۔ یہی تبدیلی سومرا قوم کے حکومت کی بدحالی کا سبب بنی اور بالآخر زیریں سندھ کے جنوبی مشرقی نصف حصہ کی تباہی کے ساتھ ہی اِس قوم پر زوال آ گیا۔ اِس سے یہ

بھی سمجھ میں آتا ہے کہ سومرا حکمران نے اپنا دارالسلطنت کیوں منتقل کیا تھا۔ پہلے یہ ٹھری کے نزدیک موجودہ ڈیرو مہابت (ماتلی) تعلقہ میں تھا اور اُس شاخ پر آباد تھا جسے ہیگ (Haig) نے غربی پران شاخ کا نام دیا ہے، یہ شاخ رن کچھ میں داخل ہونے سے پہلے مشرقی پران اور ہاکڑا میں شامل ہو جاتی ہے۔ دارالسلطنت کے آثار قدیم آبی گذرگاہ کے دائیں کنارے پر موجود ہیں اور تقریباً دس ایکڑ زمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ یا تو یہ گذرگاہ تھا یا خود پران ہی شاخ یقینی طور پر دریائے سندھ کی مشرقی شاخ کا راستہ تھا جس کا البیرونی نے ذکر کیا ہے۔

سومرا قوم کے لوگوں نے اپنا صدر مقام محمد طور منتقل کر لیا۔ دریائے سندھ کی جو شاخ گنگرو (Gungro) کے نام سے معروف ہے اور سیر کریک میں داخل ہوتی ہے۔ یہ مقام اُس کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ صدر مقام کی تبدیلی کی تاریخ اور اسباب کسی کتاب میں بیان نہیں کیے گئے لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ غربی پران شاخ کے خشک ہو جانے کی وجہ سے ایسا کرنا ضروری ہو گیا ہوگا۔ غربی پران کے خشک ہونے کے متعلق میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں کہ وسطی یا بالائی سندھ میں دریائے سندھ نے اپنے بہاؤ کا راستہ تبدیل کیا ہوگا۔ یہی سبب منصورہ کی بربادی کا بھی ہوا اور تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف دور میں یہ تبدیلی واقع ہوئی، اِس صدی کے خاتمہ سے پہلے محمد طور ایک ترقی یافتہ خوش حال شہر بن چکا تھا جسے نصرت خان نے جو سلطان علاؤ الدین خلجی کا فوجی سردار تھا تباہ و برباد کر دیا، ایک دوسرا مقام جو سومرا قوم کے عروج کے زمانہ میں اہمیت کا حامل تھا، ٹھل بنگر یا ٹھل بھنگر کے قریب تھا جس کے آثار موجود ہیں، یہ مقام پنگریو اور نوکوٹ کے درمیان مشرقی پران کے کنارے پر واقع تھا۔[۸۱]

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ سومرا حکومت سندھ ڈیلٹا کے مشرقی حصّہ سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ اور اِن کے زوال کے بعد سما قبیلے نے اِن کی جگہ لے لی۔ یہ قبیلہ تعداد میں بھی زیادہ تھا اور یہ لوگ ایک وسیع علاقہ میں پھیلے ہوئے تھے۔ اِنھوں نے اپنا صدر مقام مغربی ڈیلٹا میں

ایسی جگہ آباد کیا جس کا دفاع آسانی کے ساتھ کیا جاسکتا تھا۔ ۱۳۴۰ء کے لگ بھگ دریائے سندھ کی غربی شاخ ایسے دو حصّوں میں منقسم تھی جو ایک دوسرے سے کافی فاصلہ پر تھے۔ جو حصّہ دائیں ہاتھ کی طرف تھا وہ مکلّی پہاڑیوں کے شمال میں موجودہ کلری کینال کے راستہ سے بہتا ہوگا بگھاڑ کی آبی گذرگاہ اختیار کیے ہوئے تھا۔ آگے چل کر دونوں حصے متحد ہوکر ایک شاخ بن جاتے تھے۔ اس طرح دونوں حصوں کے درمیان جو جزیرہ بن گیا تھا وہ تقریباً ایک سو مربع میل کے رقبہ پر مشتمل تھا اور اِس میں پہاڑیوں کا ایک پورا سلسلہ موجود تھا۔ ۸۳ یہاں تغلق آباد کا قلعہ۔ مختصر زندگی کا ساموئی اور اِس کے بعد ٹھٹہ تعمیر کیے گئے۔

کلری شاخ تقریباً دوسو سال تک دریائے سندھ کے آبی نظام کا اہم جزو بنی رہی، معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۱۹ء میں دریائے سندھ کا زیادہ پانی اِسی راستے سے گذرتا تھا، اِس کے بعد بگھاڑ نے اہمیت اختیار کرلی اور تقریباً دوسو سال تک اِس کا بھی یہی حال رہا۔ ۸۴

محمد بن قاسم کے وقت سے سہون جو سیوستان کے نام سے بھی مشہور ہے، سندھ کی تاریخ میں بار بار سامنے آتا ہے، یہ ایک قلعہ بند مقام تھا جو بالائی سندھ سے زیریں سندھ جانے والے راستہ پر قبضہ رکھتا تھا اور شمال کی جانب سے آنے والے حملہ آور اِسی راستے سے گذرتے تھے۔ اُس زمانہ میں بھی کہ جب دریائے سندھ اِس جگہ سے مشرق کی سمت کافی فاصلہ پر بہتا تھا کسی مہم میں کامیابی کے لئے اِس مقام پر قبضہ ہونا ضروری تھا۔

اکبر اعظم نے جب امیر عبدالرحیم خان خاناں کو زیریں سندھ کی فتح کے لئے روانہ کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت دریائے سندھ سہون سے آگے اپنی موجودہ آبی گذرگاہ کے مغرب میں کسی راستے سے بہتا تھا، اور اِس طرح پاٹ (Pat) اور ٹلٹی (Talti) کے مقامات اُس کے بائیں کنارے پر تھے۔ یہ دریا سہون سے ملا ہوا گذرتا تھا اور لکی پہنچ کر موڑ کھاتا تھا جس کی مطابقت سے بہاؤ مشرقی رُخ اختیار کرگیا تھا اور نصرپور کے قریب ہوگیا تھا۔ ۸۶ دریا کے اِس حصّہ میں شاہی افواج اور مرزا جانی بیگ کی فوجوں کے درمیان کی لڑائیاں دریا کے اندر کشتیوں کے ذریعہ لڑی گئیں۔

دریائے سندھ کے ڈیلٹا کی وسعت کا ذکر کرتے ہوئے۔ ریورٹی (Raverty) لکھتا ہے کہ اگر ایک خط مستقیم کراچی کے نزدیک سے ایک ایسے مقام تک کھینچا جائے جو لکھ پت سے بیس میل شمال میں واقع ہو تو یہ اُس زمانہ کے سندھ ڈیلٹا کی تقریباً جنوبی سمندری حد ہوگی اور ڈیلٹا اِس سے متجاوز نہ ہوگا۔ اِس مفروضہ کی بنیاد ایک روایت ہے کہ خان خاناں نے جب سمندر کا نظارہ کرنے کی خواہش کی تو وہ مغل بھین گیا جہاں اُس نے سمندر دیکھا، اِس وقت یہ مقام ساحل سمندر سے پچاس میل اندر خشکی میں واقع ہے۔ اِس مقام کے نام کو بھی ریورٹی اِسی واقعہ سے منسوب کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "بھین" دراصل "بین" ہے جو فارسی میں "دیدن" سے بنا ہے، یعنی دیکھنا۔ مقامی طور پر مغل اور بھین دو الگ الگ مزاروں کے نام ہیں۔ ریورٹی (Raverty) اپنے اخذ کردہ نتیجہ کے لئے کوئی ثبوت پیش نہیں کرتا۔ تاریخ معصومی اِس سلسلہ میں پہلا واقعہ نگار ہے جس کے مطابق خان خانان نے بحری بندرگاہ لاہری بندر کا بھی اِس موقع پر معائنہ کیا۔ ۸۷

سترھیں صدی عیسوی میں اِس ڈیلٹے کی بالائی نوک شاید موجودہ حیدرآباد سے تقریباً بیس میل جنوب مشرق میں تھی۔ حیدرآباد اُس وقت تک نیرون کوٹ کے نام سے مشہور تھا اور ایک قلعہ بند مقام کی حیثیت سے کچھ اہمیت کا حامل تھا، بائیں شاخ جو رین ندی کے نام سے مشہور تھی، موجودہ گونی کینال کے راستے بدین سے ہوتی ہوئی رن کچھ کے مغربی سرے پر سمندر میں داخل ہوتی تھی۔ اس مقام پر ہیگ (Haig) نے یہ اشارہ کیا ہے کہ رین شاید بارہ مہینے بہنے والا دریا نہیں تھا۔ دریائے سندھ کا زیادہ بہاؤ دائیں شاخ کی طرف متوجہ تھا جو کسی قدر مغرب جنوبی سمت میں بہتی ہوئی ٹھٹہ کو گھیرے میں لے لیتی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ ۸۸

سولھویں صدی میں یہ واضح ہے کہ دریائے ستلج کا پانی ہاکڑا میں پہنچنا بند ہو گیا تھا سوائے اُس پانی کے جو طغیانی کے وقت کناروں سے بہکر نکلتا تھا۔ ستلج اور بیاس کا متحدہ چشمہ جو گھارا کے نام سے پکارا جاتا تھا ملتان کے سلطان حسین لانگاہ اور سندھ کے حکمراں

مرزا شاہ حسین ارغون کے درمیان سلطنتوں کی قدرتی سرحد کے طور پر ۲۵۔ ۱۵۲۴ء میں تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اِسی سال شاہ حسین کی فوجوں نے دراوڑ کے قلعہ پر پیش قدمی کی۔ یہ قلعہ بھاولپور سے پینتالیس ۴۵ میل دور جنوب۔ مغرب میں ہاکڑا کے خشک آبی راستے کے اُس حصہ میں واقع ہے جو اسٹین (Stein) کے نظریہ کے مطابق قبل تاریخ کے زمانہ میں دریائے ستلج کی آبی گذرگاہ رہ چکا تھا۔ اُس سال یعنی ۱۵۲۵ء میں ایک بے آب و گیاہ بیابان تھا۔ " کہ جس پر پرندے بھی نظر ڈالتے ہوئے خوف کھاتے تھے۔ " حملہ سے قبل مرزا شاہ حسین نے ایک سو کنویں کھدوائے اور فوج کے ساتھ ایک مہینے کا سامان رسد لے کر روانہ ہوا۔۸۹ چنانچہ ۱۵۲۵ء سے بہت زمانہ پہلے سے دریائے ہاکڑا کا بالائی حصہ سورت گڈھ سے دراوڑ تک پانی سے محروم چلا آرہا تھا۔ اور اِس کی وہ شاخیں جو سندھ اور پنج ندسے غوث پور نشیب کے ذریعہ کچھ سیلابی پانی کی مقدار یا " ڈھوروں " کا پانی کبھی کبھی اِن تک پہنچتا تھا۔

اِس ضمن میں تاریخ طاہری کا بیان جو ۱۶۲۱ء کے قریب لکھی گئی قابل توجہ ہے " سندھ کا وہ علاقہ جو اب زرخیز ہے سومرا خاندان کی حکومت کے زمانہ میں آب سندھ کی قلّت کے سبب ناقابل پیداوار کاشت تھا۔ اُس وقت اِس علاقہ کی طرف کچھ بھی پانی نہیں پہنچتا تھا۔ " دراصل سندھ کا کونسا علاقہ اِس بیان کی رو سے مُراد لیا گیا ہے یہ واضح نہیں ہے۔ لیکن عجب نہیں کہ شمال مغرب میں بکھر کا تعلقہ سرکار اِس سے مُراد ہو۔ یہ بھی تقریباً درست ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جنوبی مشرقی علاقہ جو سومرا خاندان کے دورِ حکومت میں زرخیز تھا کیونکہ پران جو اُس وقت دریائے سندھ کی مشرقی شاخ تھا اور ہاکڑا دونوں دریائے سندھ کے پانی سے پُر رہتے تھے اور اِس علاقہ کو سیراب کرتے تھے ۱۶۲۱ء میں " ناقابل پیداوار کاشت " ہوگیا تھا کیونکہ اِس زمانہ سے بہت مدت پہلے ہی یہ دریا خشک ہو چکے تھے۔۹۰

بہر نوع ہاکڑا کا آخری حصہ یعنی ونجروٹ سے رن کچھ تک اُس علاقہ کی جنوبی سرحد

کے طور پر نادر شاہ نے منتخب کرنا بہتر سمجھا تھا جو مغل بادشاہ محمد شاہ نے ۱۷۳۹ء میں اُس کے حوالے کرنا منظور کیا تھا۔ معاہدہ میں اِس کا نام نالا سانکرا لکھا ہوا ہے اور خاص طور پر اِس کا بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ سندھ کا تمام علاقہ جیسا کہ اُس وقت کی سیاسی سرحد کا مطابق ہوگا ایران کی سلطنت میں شامل کرنا مقصود تھا۔ اگر دریائے سندھ کو اِس کی پوری لمبائی کے ساتھ سرحد تسلیم کیا جاتا تو یہ صوبہ دو حصّوں میں بٹ جاتا اور یہاں کا گورنر میاں نور محمد کلہوڑا دو بادشاہوں کی جوابدہ ہوتا۔ نادر شاہ جیسا آدمی ایسا انتظام کس طرح قبول کرسکتا تھا جس کی رو سے سندھ کی وفاداریاں منقسم ہوں، چنانچہ جنرل ہیگ (Haig) نے جو نالا سانکرا کو سانگرا کینال یا رین ندی شناخت کیا ہے یہ غلط ہے۔ عین ممکن ہے نادر شاہ کی نیت یہ رہی ہو کہ قدیم فارسی سلطنت کا بیسواں صوبہ جس علاقہ پر مشتمل تھا اُسے واپس حاصل کرے۔ اِس میں سندھ شامل تھا اور صوبہ کا بیشتر حصہ دریائے سندھ کے اُس زمانہ کے آبی راستے کے مغرب میں پھیلا ہوا تھا۔ ۹۱

ریورٹی (Raverty) بیان کرتا ہے کہ اِس بات کا اِمکان ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی میں دریائے ہاکڑا میں وقتاً فوقتاً دریائے سندھ کا پانی پہنچتا رہتا تھا۔ اور درحقیقت اِس بات کی شہادت بھی موجود ہے کہ ۱۷۴۲ء میں کم از کم موافق موسم میں اِس دریا کو کشتی رانی کے لئے استعمال کیا جاسکتا تھا اور روہڑی پہاڑیوں سے عمرکوٹ کے جنوب تک پتھروں کو دریا کے راستے پہنچایا جاسکتا تھا۔ ۹۲

حیرت اِس بات پر ہے کہ میجر ریورٹی (Raverty) نے شمال مغربی ہندوستان کے بڑے دریاؤں کے ایک ہزار سال کے اندر آبی راستہ کے تعین کے متعلق بڑی عالمانہ بحث کی ہے اور ان میں مختلف ادوار میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اُنھیں مدلل طور پر واضح کیا ہے لیکن دریائے سندھ کے آبی راستوں کی انقلابی تبدیلیوں کی تاریخی شہادت موجود ہونے کے باوجود اِن کے تذکرہ کو یکسر فراموش کردیا ہے۔ ۹۳

آبی گذرگاہ کی تبدیلی کا واقعہ ۹-۱۷۵۸ء کے قریب رونما ہوا۔ جس مقام پر اِس

دریا نے اپنی پہلی گذر گاہ کو تبدیل کیا اُسے عرض البلد ۲۵ ڈگری چالیس فٹ اور طول البلد اڑسٹھ ڈگری ۳۱ فٹ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یعنی قدیم ہالہ شہر سے کچھ نیچے۔ یہاں یہ دریا یک لخت مغرب کی طرف گھوم گیا تھا اور آج بھی یہ موڑ موجود ہے۔ اِس طرح سے کہ متروک گذر گاہ اِس سے کسی قدر فاصلہ پر جنوب کے مشرق میں رہ گئی تھی۔ پُرانی گذر گاہ کو حیدر آباد سے پندرہ میل مشرق میں نصر پور سے آگے آسانی سے شناخت کیا جا سکتا ہے، اس میں ریت کے بڑے بڑے ٹیلے جمع ہو گئے ہیں جنھوں نے گذر گاہ کے نشیب کو تقریباً ڈھک لیا ہے اور یہ نشیب جو قدیم گذر گاہ کی نشانی ہے کافی دور تک بھر کیو تک دیکھا جا سکتا ہے، اِس کے بعد یہ گذر گاہ اتنی واضح نہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً ایک سو میل لمبی گذر گاہ کو دریا نے ترک کر دیا تھا بمعہ اُن شاخوں کے جو مشرق کے کنارے پر واقع تھیں جیسے رین ندی۔

ظاہر ہے کہ یہ غیر معمولی تبدیلی کسی ایک برسات میں مکمل نہیں ہوئی ہوگی، ہیگ (Haig) نے ایک روایت نقل کی ہے جو نصر پور میں مشہور ہے کہ پہلے سال دریائے سندھ کے ایک حصّہ کا پانی نئی گذر گاہ میں منتقل ہوا اور اِس کے بعد کئی سال کے عرصہ میں رفتہ رفتہ تمام پانی نئے راستے سے بہنے لگا۔۹۴ تحفۃ الکرام سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۵ء میں میاں محمد مراد یاب خان سندھ کا حاکم بنا اور اُس نے نصر پور کے قریب ایک شہر آباد کیا جسے مُراد آباد کا نام دیا، لیکن صرف دو سال بعد ہی "یہ بدقسمت شہر آب سندھ سے گھر گیا"۔۹۵ یہ ممکن ہے کہ مندرجہ بالا عظیم تبدیلی اُس سال غیر معمولی کثرتِ آب اور طغیانی کی بدولت واقع ہوئی ہو۔ محمد مراد یاب کے نام کے بھائی نے جو بالآخر مراد یاب کا وارث ہوا۔ ایک دوسرا ''شہر'' آباد کیا جسے اللہ آباد کا نام دیا جو اُس کے باپ کے دارالخلافہ سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن یہ مقام کبھی اہمیت اختیار نہ کر سکا۔ سندھ میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ متعدد دیگر تجربات کے بعد غلام شاہ نے تمام سندھ پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے بعد نیرون کوٹ کے قدیم مقام کی طرف توجہ کی۔ یہاں ۱۷۶۸ء میں حیدر آباد کا شہر آباد کیا گیا۔۹۶ اِس وقت تک دریائے سندھ اپنی نئی گذر گاہ میں مستقل طور پر قائم ہو چکا تھا یعنی گنجو ٹکر کے مغرب سے

بہتا تھا جبکہ حیدرآباد سے چند میل اوپر اِس سے ایک شاخ نکل کر حیدرآباد کے مشرقی کنارے سے گذرتی تھی۔ نئی شاخ پھلیلی کے نام سے مشہور ہوئی۔ کچھ دور کے بعد یہ رین ندی کی گذرگاہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ رین کو سندھ کے پانی کی مقدار پہلے کے مقابلہ میں بہت کم حاصل ہونے لگی لیکن اندازہ ہے کہ ضلع حیدرآباد کا جنوبی حصّہ اِس تبدیلی سے کچھ زیادہ ضرر رسیدہ نہیں ہوا۔

اِس تبدیلی سے حیدرآباد سے دور مشرقی علاقہ میں کیا اثرات رونما ہوئے؟ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ہمیں معلوم ہے کہ ۱۷۶۲ء تک رن کچھ کے مغربی گوشہ میں ہر سال کثرت سے چاول کی کاشت ہوتی تھی، ہاکڑا کی گذرگاہ سے نیچے اور پران کی مشرقی اور غربی شاخوں کے قریب کا تمام علاقہ (سندھڑی کے قریب) اِس کاشت کا مرکز تھا۔ البتہ یہ واضح نہیں کہ مذکورہ آبی شاخوں میں کونسی گذرگاہ مطلوبہ مقدار میں پانی فراہم کرتی تھی۔ ۱۷۶۳ء میں کچھ پر پہلے حملہ کے بعد میاں غلام شاہ نے اپنے علاقہ میں اِس متحدہ آبی گذرگاہ کے سامنے بند تعمیر کئے تھے، روایت کے مطابق مقصد یہ تھا کہ اُس کے دشمن پانی سے محروم ہو جائیں اور اُن کی زراعت تباہ ہو جائے جس کی بدولت اُس دشمن حکمراں کو بقول برنس (Burns) تقریباً سات آٹھ لاکھ کوڑی کے محاصل ملتے تھے۔

غلام شاہ کے جانشینوں اور تالپور خاندان کے اولین حکمرانوں نے بھی کئی بند تعمیر کئے، کم از کم اِس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ سندھ کے حکمرانوں کا بندوں کی تعمیر سے ایک دوسرا مقصد بھی وابستہ تھا۔ چونکہ دریائے سندھ کی آبی گذرگاہ کے مغرب کی سمت ہٹ جانے کی وجہ سے پران شاخ میں پانی کی مقدار کم ہوگئی تھی۔ چنانچہ بندوں کے ذریعہ سے پانی کو روکنے کا مقصد اُسے اپنے علاقہ کی کاشت کے لئے ذخیرہ کرنا تھا تاکہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دشمن کو نقصان پہنچے۔ ۹۷

صوبہ سندھ کے جنوبی اور جنوب مشرقی علاقہ پر دریائے سندھ کی تبدیلی کا جو بھی اثر ہوا اُس سے قطع نظر یہ بات یقینی ہے کہ حیدرآباد کے فوراً مشرق کا تمام علاقہ ویران ہوگیا

ہوگا اور تقریباً ایک صدی تک اپنی سابقہ خوش حال حیثیت حاصل نہ کرسکا۔ اِس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حکمراں اِس طرف سے غافل تھے۔ سرفراز واہ (شاخ) جو غلام شاہ کے فرزند کے نام پر مشہور ہے، اِسی لیے کھدوائی گئی کہ متاثرہ علاقہ کی مصیبت کو دور کیا جاسکے، اور امرا اور زمینداروں نے بھی بہت سی چھوٹی نہریں کھدوائیں تھیں۔

آبپاشی کے ذرائع کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا کلہوڑا حکمرانوں کی امتیازی روایت رہی ہے۔ بالائی سندھ میں دریا کے دونوں کناروں پر چند عمدہ نہروں کی کھدائی کا سہرا میاں سرفراز خان کے دادا میاں نور محمد کے سر ہے، مکمل طور پر انسانوں کی کھودی ہوئی صرف چند نہریں ایسی ہیں جو اِن سے پہلے حکمرانوں نے کھدوائیں جن میں بیگاری نہر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔۹۸

اِن سے پہلے سمہ حکمرانوں نے بھی آبپاشی کے ذرائع کو وسعت دینے کے لئے، خاص طور پر ٹھٹہ کے اطراف میں بہت کام کیا لیکن مخصوص طور پر ان کے دورِ حکومت میں انجام کو پہنچیں یہ معلوم نہیں۔ یہ لوگ اور اِن سے پہلے حکمراں اِسی طرح مغل حاکم جو سندھ میں مقرر کئے گئے اِس سلسلہ میں کوئی خاص کام نہیں کرسکے سوائے اِس کے کہ دریائے سندھ کی قدرتی شاخوں کو آبپاشی کے لئے ضرورت کے مطابق درست کیا اور زمینداروں نے اپنی زمینوں کو سیراب کرنے کے لئے اِن شاخوں سے پانی کی نالیاں بنالیں۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں دریائے سندھ کے بہاؤ میں انقلابی تبدیلی کا ایک نتیجہ تو یہ ہوا کہ ٹھٹہ کے شمال میں کلری شاخ ہمیشہ کے لئے معدوم ہوگئی۔ اِس کے فوراً بعد ۱۸۱۷ء میں بگھاڑ شاخ جس سے دریائی پانی کا زیادہ حصہ گذرتا تھا ریت اور کیچڑ سے بھر کر پایاب ہوگئی۔ اور چشمہ نے زیادتی کے ساتھ جنوبی بہاؤ کا رُخ اختیار کرلیا اور بہت سی ایسی شاخیں جو بگھاڑ کے بائیں کنارے سے نکلتی تھیں اُنھیں کاٹتا ہوا بہنے لگا۔۹۹

یہ واضح نہیں کہ علاقہ سندھ کی آبی صورت میں یہ تبدیلی آئی کسی طرح سے شاید ۱۸۱۹ء کے اُس شدید زلزلہ کا نتیجہ تھی جس نے کچھ کے علاقہ میں کافی تباہی مچائی اور اُس کے

نواحی علاقہ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کردیں۔ کوری کریک جو پہلے وقتوں میں پران اور ہاکڑا کے داخلہ کی جگہ تھی بہت عرصہ سے اِن دریاؤں کے پانی سے محروم تھی۔ لیکن زلزلہ نے اِسے کافی چوڑا اور گہرا کردیا اور اِسی زلزلہ کے نتیجہ میں رن کچھ کا مغربی حصہ ایسی حیثیت اختیار کرگیا کہ اِس میں پہلے کی بہ نسبت سمندری پانی کی زیادہ مقدار پہنچنے لگی۔ ۱۰۰

۱۸۱۹ء کے بعد دریائے سندھ کے بہاؤ میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن مقامی طور پر دائیں یا بائیں یہ دریا چار چار پانچ پانچ میل وقتاً فوقتاً ہٹتا رہا ہے جس سے تھوڑے تھوڑے فاصلہ تک علاقہ متاثر ہوا ہے۔ سندھ کی ارضی سطح پر اِس دوران اور خاص طور پر آخری نصف زمانہ میں جو بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں وہ انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ تالپور حکمرانوں نے کلہوڑا روایات کو برقرار رکھا اور حکومتِ برطانیہ کے لئے نہروں کا ایک قیمتی ورثہ چھوڑا۔ جنگ میانی کے بعد تقریباً نوے سال تک سندھ کا بیشتر علاقہ انہیں نہروں سے سیراب ہوتا رہا جو مذکورہ دونوں خاندانوں نے چھوڑی تھیں۔ انگریزوں نے اِنھیں صرف درست کیا یا کہیں کہیں بڑھا دیا۔ وسیع بنجر علاقے جو اِن نہروں کے پانی سے محروم تھے خصوصاً مشرقی سندھ میں۔ وہ اِس اثناء میں جدید طریقوں سے بنائی ہوئی نہروں سے ترقی دیئے گئے اور یہ نہریں عظیم پیمانہ پر بنائی گئی تھیں۔

جدید کوششوں میں سب سے پہلا قدم یہ تھا کہ ہاکڑا گذرگاہ کے اندر دوسو میل تک بارہ ماہی پانی کے بہاؤ کا انتظام کیا جائے۔ مقامی طور پر مذکورہ گذرگاہ مشرقی نارا کہلاتا ہے۔ اِس مقصد کو پورا کرنے کے لئے روہڑی سے اوپر دریائے سندھ سے اِس گذرگاہ تک ایک مستقل رابطہ نہر کھودی گئی۔ اِس طرح کی آبی حیثیت بدل جانے کے بعد اِس سے دو عظیم الشان نہریں مٹھراؤ اور جمڑاؤ نکالی گئیں۔ جنھوں نے اِس وسیع بنجر علاقہ کو سیراب کرنے کے لئے چھوٹی نہروں اور نالیوں کا ایک جال بچھا دیا اور ۱۹۳۲ء میں جب لائڈ بیراج کا شاندار منصوبہ مکمل ہوا تو آبپاشی کے مذکورہ نظام کو اِس کے ساتھ آسانی سے مربوط کردیا گیا۔ اِس وقت تک سندھ کی شمالی سرحد سے لیکر نیچے ڈیلٹا کے سرے تک دریائے سندھ کے

دونوں کناروں پر حفاظتی پشتوں کی تعمیر کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے پانی کی کثرت کے موسم میں طغیانی کی وجہ سے کناروں سے نکلنے والے پانی کو ایک محدود راہداری میں بہنے پر پابند کر دیا گیا۔ زیریں سندھ کے پانی کو استعمال کرنے کے لئے مزید دو بیراج تعمیر کرنے کا عمل مکمل ہونے پر یہ ممکن ہو جائیگا کہ خاص مرکزی علاقہ میں سکھر بیراج کے تحت شمالی اور جنوبی علاقوں میں ضرورت مند علاقوں کو پانی مل سکے۔

اِس طرح برطانوی دورِ حکومت میں آبپاشی کے قدیم نظام کی اصلاح اور اُس میں اضافہ کے ساتھ کچھ ایسے نئے منصوبے بھی پائیہ تکمیل کو پہنچے جو تمام سابقہ منصوبوں سے بڑھ گئے اور اِسی دوران سندھ میں رسل و رسائل کی ترقی بھی جاری رہی۔ سڑکوں کا ایک جال بچھا دیا گیا اور ریلوے لائنیں تعمیر کی گئیں۔

گذرے ہوئے زمانوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح سندھ کی تاریخ پر اِس کا جغرافیہ مسلسل اثر انداز ہوتا رہا ہے۔ مشرق کی جانب پھیلے ہوئے بڑے ریگستان نے قدرتی طور پر اِس علاقہ کی قسمت کو ہندوستان کی اجتماعی قسمت سے الگ تھلگ رکھا ہے۔ کچھ کے ساتھ درحقیقت مختلف اوقات میں سندھ کے گہرے روابط رہے ہیں۔ لیکن خود کچھ بھی زیادہ تر اُن ممالک سے الگ تھلگ ہی رہا ہے جو اُس کے مشرق میں واقع ہیں، چنانچہ سیاسی طور پر سندھ کے تعلقات شمال اور مغرب کے ساتھ ہی رہے ہیں اور چونکہ دورِ جدید سے قبل اِن اطراف سے تعلق بھی ذرائع آمد و رفت کی مشکلات کے سبب طویل عرصوں کے لئے نہ ہونے کے برابر رہا ہے اِس لئے سندھ الگ ہی رہا اور یہاں زیادہ تر مقامی قبائل حکومت کرتے رہے۔

کچھ دور ایسے بھی گذرے کہ گو تمدّنی اعتبار سے سندھ کا تمام علاقہ ایک جیسا تھا لیکن بالائی اور زیریں سندھ میں الگ الگ اور مخالف حکمراں قابض رہے، سومرا خاندان تقریباً تین سو سال تک ڈیلٹا کے علاقہ میں خود مختار حاکم رہا، جبکہ بالائی سندھ میں غزنی اور غوری سلطانوں کے نائب حکومت کرتے رہے۔ اِن کے بعد دہلی کے غلام خاندان اور خلجی

خاندانوں نے حکومت کی۔ دارالسلطنت وقتاً فوقتاً حملوں کا شکار ضرور رہا لیکن مغلوب نہیں ہوا۔ سومرا خاندان کے حکمرانوں کا اِن حملوں سے کامیابی کے ساتھ بچتے رہنا زیادہ تر اِس سبب سے تھا کہ یہ ملک فوجی مہمات کے لئے مشکلات سے پُر علاقہ تھا۔ تغلق سلاطین کو بھی یہی تجربہ حاصل ہوا، جبکہ محمد شاہ اور فیروز شاہ نے سومرا حکمرانوں کو مطیع کرنے کی کوشش کی۔ یہ علاقے کس قدر دشوار گذار تھے؟ اِس کا اندازہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ کلہوڑا خاندان کے دورِ حکومت میں بھی مغربی ڈیلٹا کے علاقہ میں بہت سے ایسے ہندو راجہ تھے جو تقریباً آزاد تھے۔ بلیاری اور بدین میں کچھ کے راؤ کے جو "تھانے" تھے وہ بھی آزاد رہے اور اِسی طرح تالپور حکمرانوں کی شکست کے بعد بھی عمرکوٹ پر سوڈھا راجپوت حکومت کرتے رہے اور انگریز اُنھیں عرصے تک مطیع نہ کر سکے۔

وہ مدنی خصوصیات جو سندھ کا طرۂ امتیاز ہیں۔ دوسرے ممالک کے ساتھ اِس کے انقطاع کے سبب سے اُبھریں اور قومیں وقتاً فوقتاً اِس علاقہ میں داخل ہوئیں اور یہاں آباد ہوگئیں اُن کی انفرادیت کو بھی اُنھیں مدنی خصوصیات نے معتدل بنا دیا۔

اجتماعی حیثیت سے یہاں کے باشندوں کا طرزِ زندگی جس چیز سے خاص طور پر متاثر ہوا وہ یہاں کی انوکھی آب و ہوا اور دریائے سندھ کی اچانک رُخ بدل لینے والی زرخیزی ہے۔ اگر یہاں دریائے سندھ نہ ہوتا تو اِس علاقہ کی اقتصادیات بھی پڑوسی ممالک کی طرح گلہ بانی تک محدود ہوکر رہ جاتیں اور کبھی ترقی نہ کرسکتیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ خاصے قریب ماضی تک خود وادیٔ سندھ میں بھی باشندوں کا سب سے بڑا ذریعہ معاش گلہ بانی رہا ہے۔ کیونکہ یہ پیشہ بقائے حیات کے لئے بہر نوع قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا تھا جبکہ زراعت پر دریائے سندھ کے لاابالی پن سے آفت آسکتی تھی۔ پھر بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ دریا کی اِن تبدیلیوں کی رہائش گاہیں ہر جگہ عارضی قسم کی نظر آئیں گی جیسی ایک نیم خانہ بدوش قوم کے لئے مناسب ہوسکتی ہے۔

وہ عادات جو صدیوں کی مشق کے بعد لوگوں کی فطرت کا حصّہ بن گئی ہیں آسانی سے

ترک نہیں کی جاسکتیں۔ مستقل دیہاتی آبادکاری جیسی ہندوستان کے بیشتر علاقہ میں پائی جاتی ہے اُس کا وجود سندھ میں نظر نہیں آئیگا۔ مختلف اضلاع میں سماجی ڈھانچہ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو قبائل اور برادریوں پر مشتمل نظر آئیگا۔

دریائے سندھ سے آبپاشی کے توسیعی منصوبوں کی بدولت اب میدانی علاقوں میں مچھلی پکڑنے یا پرندوں کا شکار کرنے امکانات تقریباً ختم ہوگئے ہیں۔ یہ دونوں عمل قدیم زمانہ سے یہاں گلہ بان قبیلے کاشتکاری اختیار کر چکے ہیں، اِسی طرح موہانہ مچھیرے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ زراعت کے لئے مزدوروں کی سہولتیں محدود ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن دریائے سندھ میں کشتی رانی باقی رہی۔ حالانکہ اب ریلوے موجود تھی، کیونکہ بہت سی اجناس دریا کے راستے با کفایت اور آسانی کے ساتھ دوسرے مقام پر منتقل کی جاسکتی ہیں، بہرنوع لائڈ بیراج کے بروئے کار آنے کے بعد کشتی رانی میں بھی فرق پیدا ہوا۔ سکھر سے اوپر یہ طریقہ نقل وحمل قوت کے ساتھ لوگوں کی روزمرہ زندگی میں موجود ہے، لیکن بیراج سے نیچے صرف طغیانی کے زمانہ میں کشتیاں چلائی جاسکتی ہیں۔ قدیم سیلابی نالوں اور راستوں میں پانی بند ہو جانے کی وجہ سے بہت سے ایسے علاقے کشتی کی سہولت سے محروم ہو گئے ہیں جو ۱۹۳۰ء تک کشتی کے ذریعے دوسرے مقامات سے رابطہ رکھتے تھے۔ اور جیسے جیسے آبپاشی کے لئے بیراج بنتے رہیں گے۔ یہ دریا کشتی رانی کے استعمال کے لئے ناقابل ہوتا جائیگا۔ انگریزوں نے صوبہ سندھ پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے دریائے سندھ کو نقل وحمل کے لئے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔

جہاں تک اُن تجارتی سرگرمیوں کا تعلق ہے جو دریائے سندھ کے راستے سے ملک کے اندر یا اِس کے ذریعہ سے سمندری راستے سے بیرونی ممالک کے ساتھ عمل میں آئیں اُن کی اہمیت زمانہ کے ساتھ بدلتی رہی ہے۔ ۱۰۳ اگر سندھ کی مملکت کے سیاسی حالات یا پڑوسی ممالک کے حالات نے اِس سرگرمی میں اضافہ یا کمی کی تو اُس کے ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ دریائے سندھ کے دہانہ کا جہازوں کی آمد و رفت کے قابل ہونا یا نہ ہونا بھی

ایک اہم سبب رہا۔ نیز اِن دہانوں پر قائم ہونے والے ایک کے بعد دوسرے بندرگاہوں کا جہاز رانی کے لئے کارآمد ہونا بھی تجارتی سرگرمیوں پر اثر انداز ہوتا رہا۔ چنانچہ باربری کون قدیم دیبل جو چینی اور عرب دونوں جہاز رانوں کے لئے معروف بندرگاہ تھا۔ لاہری بندر اور اِس کے بعد " دیول سندھ " اپنے اپنے وقت میں اہم بندرگاہ رہے اور ایک زمانہ کے بعد دریائے سندھ کی مٹی سے اَٹ کر ختم ہوتے رہے۔

کراچی جو دریا کے اِس عمل سے محفوظ ہے اور انیسویں صدی سے جدید سائنسی طریقوں کی بدولت خراب ہونے سے محفوظ رہا ہے۔ اپنے سے پہلے بندرگاہوں کی بہ نسبت طویل عمر کی توقع کرسکتا ہے۔ قدیم منضبط زمانہ کے بعد صدیوں تک تاریخ میں اِس جگہ کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ لیکن (میرے خیال کے مطابق) اِس زمانہ میں یہ مقام " مائی بندر " یا عورت کا بندرگاہ کے نام سے کافی مشہور تھا۔ موجودہ نام کے ساتھ یہ مقام ۱۷۴۲ء میں سامنے آیا۔ کہا جاتا ہے کہ نادرشاہ نے سورت کی بندرگاہ میں کچھ جہازوں کی تعمیر کرائی تھی، جب یہ مکمل ہوگئے تو نادرشاہ کے حکم پر اُس کا ایک افسر ان جہازوں کو سورت سے کراچی کے بندرگاہ پر لایا۔ ۱۰۵ سیٹھ ناؤمل کی تحقیق کے مطابق جدید کراچی ۱۷۲۹ء کے لگ بھگ وجود میں آیا۔ اِس سے قبل یہاں مچھیروں کا ایک گاؤں تھا۔ یہی محقق لکھتا ہے کہ ایک شہر " بادشاہ دلورائے نے آباد کیا تھا " جو چنّا کریک کے برابر ایک چٹانی پہاڑی پر واقع تھا۔ یہ پہاڑی باتھ آئی لینڈ (Bath Island) کے نام سے معروف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ شہر مسلسل ترقی کرتا رہا۔ " یہاں ایک عمدہ بندرگاہ تھا جو خاصی تجارتی سرگرمی کا مرکز تھا " گویا مذکورہ بالا جدید کراچی کے قیام سے کوئی تین سو سال قبل یہ شہر بسایا گیا تھا۔ کراچی کے بعد بندرگاہ کے علاقہ میں جو سمندری راستے ہیں وہ طویل زمانہ گذرنے کے بعد قدرتی طور پر تبدیلیوں کا شکار ہوسکتے ہیں جو ایک تجارتی شہر کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہوں لیکن پھر بھی مچھیروں کے لئے موزوں جگہ پر ایک مرکز قائم رکھنے کی ضرورت موجود رہے گی۔

کراچی کے نزدیک ایک خوش حال اور ترقی یافتہ بندرگاہ کی مذکورہ بالا شہادت سماقبیلہ

کے دورِ حکومت کی بات ہے۔ لیکن سندھ کی تواریخ اور دستاویزات میں کسی مقام پر اِس کا ذکر نہیں ملتا۔ اِس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ اِسی طرح کراچی سے تقریباً پندرہ میل مشرق میں گھارو کھدرو کریک کے دہانہ پر واقع واگھودر کا بھی مسئلہ ہے۔ اِس مقام کے آثار ابھی موجود ہیں، اور سیٹھ ناؤمل نے جو روایت بیان کی ہے اُس کے مطابق یہاں "ایک مشہور شہر آباد تھا اور خلیج پر اِس کے بندرگاہ کو پنجاب اور بالائی سندھ سے غلّہ لانے والی کشتیاں استعمال کرتی تھیں، یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب بگھاڑ شاخ کے ذریعہ دریائے سندھ کا زیادہ پانی سمندر میں پہنچتا تھا۔ اِس شہر کے قرب وجوار کا علاقہ جودھپور کے راجپوتوں کے قبضہ میں تھا۔ میں اِس بیان سے یہ سمجھتا ہوں کہ علاقہ "راجپوت نسل سے تعلق رکھنے والے قبائل کی علمداری میں تھا جو لسبیلہ پر حکومت کرتے تھے"۔ ۱۰۸ اٹھارویں صدی کے اوائل میں جاموٹ خاندان کی حکمرانی قائم ہونے سے پہلے راجپوتوں کے چار قبیلے یکے بعد دیگرے یہاں حکومت کرتے رہے تھے، ایک دو روایات ایسی ضرور ملتی ہیں کہ اِن قبائل کے کچھ حکمرانوں نے پڑوسی علاقہ پر فوج کشی کی۔ اِس کے علاوہ تاریخ کے صفحات اِن لوگوں کے ذکر سے بالکل خالی ہیں۔ لیکن اِس زمانہ کے لئے تواریخ سندھ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ہے کہ سومرا خاندان کے حکمرانوں سے لیکر مغل بادشاہوں کے مقررہ کردہ سرداروں تک، سندھ کے کسی حکمراں نے سندھ ڈیلٹا کے مغرب میں واقع علاقہ پر قبضہ کیا ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود مغربی ڈیلٹا بھی اٹھارویں صدی کے وسط تک ایسے ہندو راجاؤں اور شہزادوں کے زیرِ نگیں تھا جو نیم خود مختار تھے۔ اور اُس زمانہ میں کراچی اور اِس کا نواحی علاقہ قلات کی حکومت میں شامل تھا۔

قرونِ وسطیٰ کے کراچی اور وادی سندھ کے درمیان آمدورفت اُس راستے سے تھی جو پہاڑیوں سے تھانو احمد خان کے قریب گذرتے ہوئے سہون جاتا ہے۔ یہ قبل تاریخ سے تجارتی قافلوں کی گذرگاہ رہی ہے۔ اِس راستے کے ساتھ ایسے باقیات ملتے ہیں جنھیں "پتھروں کے مکانات" ہی کہا جاسکتا ہے۔ اِن کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ یہ کاروان

سرائے تھے جو عربوں کی آمد سے بھی پہلے موجود تھے۔ آثاریات پر گہری تحقیق کے بعد ہی اِس موضوع پر مزید روشنی پڑسکتی ہے۔۱۱۰

مضمون کو ختم کرتے ہوئے میں یہ کہونگا کہ تاریخی پس منظر میں سندھ کے جغرافیہ کا مطالعہ کرنے سے یہ احساس اُجاگر ہو جاتا ہے کہ دورِ جدید سے قبل کسی بھی زمانہ میں اِس ملک کے صحیح حالات کا پتہ چلانے میں بہت سی اُلجھیں باقی رہ جاتی ہیں۔ وہ تحقیق جن کی تحریریں ہمارے سامنے ہیں خاص طور پر سیاسی حالات واوقات پر خاصہ فرسائی کر کے گذر گئے اور صرف اتفاق بلکہ غیر واضح بیانات ایسے ہیں جن سے کبھی کبھی دیار و دربار کا تاریک پس منظر ہلکے سے اُجالے میں آتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے عرب جغرافیہ دان ہمیں مقامات کے بہت سے نام ضرور فراہم کرتے ہیں۔ لیکن اکثر کتابیں پسند کے اعتبار سے اصل عبارات میں تحریف کی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اصل نسخے کی عبارات اغلاط سے پر نسخوں کے انبار تلے دب کر رہ گئیں۔ اِسی طرح سفر ناموں کے تقابلی جائزے سے جو تضادات اور شکوک سامنے آتے ہیں اُن کی وجہ سے سفر ناموں کی اہمیت کم ہوگئی ہے۔۱۱۱

سندھ کے ماضی کی ایک وہ کتاب بھی ہے جس کے حروف ارضی سطح کے نقوش کی زبان میں لکھے ہوئے ہیں۔ ہر گذرنے والا سال اِس تحریر کو مشکل سے مشکل تر بنا رہا ہے۔ ایک وسیع اور مسلسل عمل جس کا تعلق آبپاشی سے ہے آہستہ آہستہ صفحہ ارض سے قدیم آبی گذرگاہوں کے ان نشانات کو مٹا دیا ہے جو ایک صدی قبل آسانی کے ساتھ تلاش کئے جاسکتے تھے۔ جیسے جیسے کھیتی باڑی دور دور تک پھیلتی جاری ہے ویسے ویسے کاشتکاروں کی قدیم کھنڈرات اور آثار پر یلغار سے جس کا مقصد کار آمد اینٹیں تلاش کرنا یا کھاد حاصل کرنا ہوتا ہے، یہ باقیات معدوم ہوتی جارہی ہیں۔ جب تک اِس ترقیاتی عمل کی رفتار کے مطابق تحقیق کی رفتار بھی تیز نہیں ہوتی تو مٹتے ہوئے قدیم نشانات کو تاریخ نہیں بنایا جاسکتا اور قدیم سندھ کا خاکہ جو پہلے ہی تاریکی سے ڈھکا ہوا ہے کبھی روشن نہ ہو سکے گا۔

کافر قبرستان، ڈملوٹ، تعلقہ کراچی کے نزدیک

پہاڑی گپھا، نیئنگ تعلقہ سہون کے نزدیک

قدیم مورچہ بندی کے نشانات، واگھودر، تعلقہ کراچی کے نزدیک

تشریحات

1. وہیلر "دی انڈس سوی لائزیشن" صفحہ۴۔

2. راجپوتوں کی کتابوں سے جو حوالہ جات ملتے ہیں یہ اُنھیں سے اخذ کیا گیا ہے۔ نیز علی کوفی اور اُس سے تقریباً نصف صدی قبل الادریسی نے جو تفصیلات پیش کی ہیں اُن سے بھی مدد لی گئی ہے۔ دیکھئے صفحہ ۱۷۵۔

3. عربی عبارت یہ ہے "بھاتی فیما بین الجنوب والمغرب الی ارور خمسۃ عشر دھی بلدۃ شعبتی "ماء السند" (ریناڈ "فریگمنٹس صفحہ ۸۸) لیکن ریورٹی نے اِس عبارت کا ترجمہ بالکل مختلف کیا ہے۔ اُس کے مطابق دریائے سندھ کی دو شاخوں کے درمیان جو شہر آباد تھا وہ بھاتی تھا۔ الور نہیں۔ اور اِس دریا کو رودِ سندھ کا نام دیا گیا جو "نہر مہران" سے جداگانہ ہے (مہران۔ صفحہ ۱۲۲۔ نوٹ ۱۶۳) جہاں تک البیرونی کا تعلق ہے ہر دو مذکورہ دریاؤں میں یہ فرق غیر واضح ہے۔

4. سندھ شاکر یا سند ساکرہ۔ مہران صفحہ ۲۲۱۔ اور نوٹ ۱۶۲۔ ساشاؤ کی مذکورہ تحریر صفحہ ۲۶۰۔ ریورٹی نے اِس سلسلہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے اُس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ الور دریا کے مشرق میں واقع تھا۔ ملاحظہ، "مہران" صفحہ ۲۱۸۔ نوٹ ۱۶۵۔

5. شاکرۃ (اسپرینجر، صفحہ ۳۸۶)۔

6. ایلیوٹ۔ جلد اوّل میں جو حوالہ جات موجود ہیں وہ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ الاصطخری صفحہ ۳۰۔ ابن حوقل صفحہ ۴۰، الادریسی صفحہ ۷۸۔ اشکال البلاد۔ صفحہ ۳۳ کا نقشہ بھی دیکھئے نیز مسالک وممالک کا وہ نقشہ بھی ملاحظہ ہو جسے ریورٹی نے "مہران" کے صفحہ ۵۰۸ پر دیا ہے۔ لیکن اشکال البلاد کا حوالہ اِس کتاب کے نقشہ نمبر ۹ میں بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

7. اِس جلد کا باب ۹-صفحہ ۱۵۴۔

8. بطیحتہ الشرقی۔ایلیوٹ۔جلد اول صفحہ ۱۲۵۔ریناڈ، "فریگمنٹس" صفحہ ۲۰۶۔ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۶۵۔"مہران" صفحہ ۲۵۵-۲۵۶۔ہودی والا اِس ضمن میں تحریر کرتا ہے کہ "مشرقی کھادر-جھیل-قطعہ آب یا تالاب" کے علاوہ وہ اِس عبارت کا اور کوئی مطلب نہیں ہے۔

9. "مہران" صفحہ ۴۶۵ نوٹ ۵۳۴۔نیز مندرجہ بالا صفحہ ۴۷۷ نوٹ ۵۵۳۔ریورٹی کا ساما رو ڈھنڈھ والا نظریہ مسترد کر دینا چاہئے اور اِس کے لئے صرف یہی وجہ کافی ہے کہ نوکوٹ کے قریب جو کھنڈرات موجود ہیں وہ یقینی طور پر بودھ زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں۔اگر ریورٹی کا نظریہ درست تسلیم کر لیا جائے تو اِن کھنڈرات کو سمندری کھاڑی کے تہہ میں ہونا چاہئے۔ملاحظہ ہو۔جے-ایچ-ایس-ایچ" جلد ہشتم۔ صفحہ ۶۱۔ریورٹی نے "الشرقی "قطعہ' کو "دہلنہ' کوھرائی" سمجھ لیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس نے البیرونی کی عبارت میں لوھرانی کو جسے عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔کوھرائے پڑھا ہے۔(مہران، صفحہ ۲۲۳ نوٹ ۱۶۸)۔

10. یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ البیرونی نے "الشرقی" کو ایک مملکت کی حیثیت سے بیان کیا ہے "امیر موسیٰ نے جسے خلیفہ نے سندھ اور ہند کے درمیان سرحد کا حاکم مقرر کیا تھا۔الشرقی کے حکمراں بالا کو قتل کر دیا (ایلیوٹ، جلد اوّل، صفحہ ۱۲۸) یہ واقعہ جُنید کے ہاتھوں جے سینہ کی شکست کے تقریباً ایک صدی بعد ہوا۔

11. ہودی والا۔صفحہ ۵۹۔نیز مندرجہ بالا کتاب صفحات ۶۲۔۶۴-۶۵۔

12. ریورٹی نے جو عبارت نقل کی ہے اُس کی رو سے اِس موقع پر الادرسی نے البیرونی کی تصدیق کی ہے۔ملاحظہ ہو ریورٹی کی بحوالہ بالا کتاب نوٹ نمبر ۴۔

13. ایلیوٹ۔جلد اوّل۔صفحہ ۷۸۔مہران۔صفحہ ۲۲۹۔ریورٹی نے یوں تو چھوٹی سے چھوٹی غلطی کی گرفت کرنے میں بھی خاصی سرگرمی دکھائی ہے۔بشرطیکہ یہ غلطی

اُس کے نظریہ سے متصادم ہو۔ لیکن اِس حماقت سے اُس نے اتفاق کیا ہے۔ ملاحظہ مہران صفحہ ۴۷۴ ہیگ الادریسی کی اس عبارت کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے لکھتا ہے کہ اگر ہم ان مراکز جنہیں الادریسی نے بیان کیا بالکل اُلٹ دیں تو عبارت بامعنی ہو جاتی ہے (انڈس ڈیلٹا کنٹری صفحہ ۶۹) نیز آر-ڈی-اولڈہم کی " آن پر وبیبل چینجز اِن دی جوگرافی آف دی پنجاب اینڈ اٹس ریورز" جو جے-اے-ایس بنگال جلد پندرہ۔ پارٹ دو۔ (۱۸۸۶) صفحات ۳۲۷-۳۲۸ اور ۳۲۹ بھی ملاحظہ ہوں۔

14. ایلیوٹ-جلد اوّل-صفحہ ۸-۲۵۶-مہران صفحہ ۴۸۴-نوٹ ۵۶۴۔

15. ترجمہ ٹی پوسٹانس جو جے-اے-ایس بنگال جلد ۱۴-صفحہ ۲۷ اپر شائع ہوا۔ نیز قلیچ بیگ کی "ہسٹری آف سندھ" جلد دوم-صفحہ ۵۔

16. "وانجز آف ابن بطوطہ" ترجمہ سی-ڈیفریمری اور بی-آر سنگوئی نیٹی (پیرس، ۱۸۸۵) جلد سوم-صفحہ ۱۱۵۔

17. بلین فورڈ "جیوگرافی آف ویسٹرن سندھ" ایم-جی-ایس-آئی۔ جلد سترہ، صفحہ ۱۰۵ نیز ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ ۱۳۱۔

18. ایلیوٹ جلد اوّل۔ صفحہ ۸-۲۵۶۔

19. مہران۔ صفحہ ۴۸۰ اور ۴۸۷۔

20. لائڈ بیراج کی تعمیر سے قبل ایک بارانی نہر روہڑی سے پہلے دریائے سندھ سے نکلتی تھی اور الور کی گھاٹی سے گذرتی تھی۔ اِسے سندھ کی قدیم قدرتی شاخ کی چھوٹی نقل کہا جا سکتا ہے (اور وہ جو " گزیٹیئر آف سندھ-۱۹۰۷-صفحہ ۲۷۶، ۲۷۷ پر بیان کی گئی ہے) معلوم ہوتا ہے کہ میک مرڈو نے اِس کو اُس "نالے" کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ جو "چھوٹا اٹوک" کہلاتا تھا۔ (ڈیزرٹیشن آف دی ریور انڈس۔ جے-آر-ایس، جلد اوّل (۱۸۳۴) آرٹیکل نمبر ۳-صفحہ ۴۳ اور

نوٹ)۔ شرقی نارا کو پانی دینے والا نیا راستہ بیراج سے الور گھاٹی ہوتا ہوا اِس طرح سے بنایا گیا تھا کہ اُس میں پانی اُلٹی سمت میں بہتا تھا یعنی مغرب سے مشرق کی جانب، نارا کو ملانے کی تجویز ۱۸۴۴ء میں کیپٹن بیکر نے پیش کی تھی۔

21. جیمس ٹاڈ "انالز اینڈ اینٹی کوئیٹیز آف راجستھان" جلد اول صفحہ ۲۶۰۔

22. قلیچ بیگ "چچ نامہ" صفحہ ۷۔

23. ٹاڈ کی بیان کردہ راجپوتوں کی روایات کے مطابق (جیمس ٹوڈ کی مذکورہ کتاب۔ صفحہ ۹۱) بکھر ایک بہت قدیم بستی ہے۔ چنانچہ "نوٹس آف دی لوسٹ ریور آف دی انڈین ڈیزرٹ" کے مصنف نے بیان کیا ہے کہ شہر دراصل وہی ہے جسے چچ نامہ میں بگھرور کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ (کلکتہ ریویو-۴-۱۸۷، صفحہ ۲۲)۔

24. "نوٹس آن دی لوسٹ ریور آف دی انڈین ڈیزرٹ" کلکتہ ریویو-۲-۱۸۷۔ صفحہ ۲۱۔

25. ایلیوٹ۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۵۶۔

"بواسطہ کمیء آب سند یعنی پنجاب کہ پائین از ارور و بھکر بھمین نامی نامند"۔

26. ایلیوٹ۔ مذکورہ حوالہ۔ "مہران "۲۸۵ نوٹ ۵۶۴، ایلیوٹ نے اِس کا تلفظ "دہن" کیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی عبارت میں "ذ" اور "ڈ" میں امتیاز نہ کرنے کی وجہ سے ایسا ہوا۔

"الور سے نیچے" کی اہمیت کیا ہے؟ یہ واضح نہیں۔

27. چنانچہ ۱۸۳۰ء یا ۱۸۳۲ء کے وقت میں "شکارپور کے شمال اور شمال مغرب میں خاصا بڑا علاقہ ایسا ہے جو ایک موسم میں مکمل طور پر پانی میں ڈوبا رہتا ہے...... یہ پانی اُس ذخیرہ آب کا حصّہ ہے جو بارانی موسم میں دریائے سندھ کی ایک متروک شاخ کے ذریعہ بہہ نکلتا ہے۔ یہ شاخ کسی زمانہ میں بکھر کے شمال میں ایک سو میل کے فاصلہ پر دریا سے نکل کر جنوب مغرب کی سمت بہتی تھی" (کیپٹن ڈبلیو پوٹنگر۔ "میموائر آن سندھ"۔ بمبئی گورنمنٹ فائل سیکرٹ۔ نیز پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ نمبر ۵۷۱

(۱۸۳۲) " سمری اور جنرل ریمارکس آن سندھ " کے ضمن ہیں۔

کچھ آگے چل کر کیپٹن موصوف نے لکھا ہے کہ " یہ آبی ذخیرہ مغرب کی سمت غلام علی بڑدی تک چلا گیا ہے، (موجودہ جعفر آباد کے نزدیک) اور اِس مقام پر اِس کی چوڑائی سولہ میل تھی۔

قدرتی امر ہے کہ اتنے بھاری مقدار پانی کی اگر دریا سے خارج ہو جائیگی تو اگلے حصّہ میں دریا میں پانی کی کمی ہو جائیگی۔

28. زیرِ قصبہ الور-ایلیوٹ-جلد اوّل-صفحہ ۲۵۷۔

29. اے-برنس " ٹریولز اِن بخارا " (۱۸۳۴) جلد سوئم-صفحہ ۷۷-نیز کیپٹن جے-ایچ-کربی کا اقتباس جو " جرنل آف دی موبئی برانچ آف دی آر-اے-ایس " جلد پنجم (۱۸۵۷) صفحہ ۲۷۴ پر شائع ہوا۔ مزید براں کپٹن ڈبلیو بیکر کا مضمون، ایس-آر-بی-جی-نیو سیریز (۱۸۵۷) صفحہ ۲ (اِس رپورٹ کا پیرا گراف نمبر ۵ ۱۴ ۱۱ اکتوبر ۱۸۴۴ء کو تحریر کیا گیا)، جسے میک مرڈو کا مضمون، جے-آر-اے-ایس جلد اوّل (۱۸۳۴) صفحہ ۴۳، فٹ نوٹ

30. آر-ایف برٹن " سندھ اینڈ دی ریسز دیٹ ان ہیبٹ دی ویلی آف دی انڈس " (۱۸۵۱) صفحہ ۸۸۔

ھاک وھندو ہاکڑو بھجندی بند اروڑ،
بھ مچھی ایں لوڑھ، سمی ویندا سوکھڑی۔

31. ایس-آر-بی-جی، نیو سیریز " رپورٹ آن دی اپر پورشن آف دی ایسٹرن نارا " صفحات ۶-۹-۱۴-۲۲-۲۶۔ بہڑا کے مقام پر ایک بند کا ذکر کیپٹن ڈبلیو پونجر نے کیا ہے۔ اور لفٹنٹ ای-ڈیل ہوسٹ نے بھی لکھا ہے۔ " میموائرس آن سندھ " (۱۸۳۲)۔

32. " مہران " صفحہ ۴۸۲-۴۸۳ اور نوٹ ۵۶۳ پلیٹ ۹ اور ۱۰ بھی ملاحظہ ہو۔ جہاں تک

الور سے ۲۶ میل مشرق کی سمت کسی بند کا تعلق ہے، میں نے اِس علاقہ میں اپنے کیمپوں سے گھوڑے پر سفر کر کے خود جائزہ لیا ہے۔ اِس بند کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ یہ مبارک پور اور کھوہی کھینگی کے مقام پر ہے، لیکن میں ایسا بند تلاش نہیں کر سکا۔ جو دو کوس لمبا اور ساٹھ گز چوڑا ہوا۔

33. سر اوریل اسٹائن اپنی تحقیق سے اِس نتیجہ پر پہنچے کہ دریائے ستلج سے ہاکڑا کو پانی کی فراہمی (بارانی بھی اور مستقل بھی) تاریخ سے قبل کہ زمانہ کے آخری ایام میں بند ہو چکی تھی۔ حوالہ کے لئے ملاحظہ ہو "اے سروے آف اینشی اینٹ سائٹس الونگ دی لوسٹ سرسوتی ریور" مطبوعہ جیوگرافکل جرنل" نمبر 4 ۱۹۴۲- صفحہ ۱۷۹-۱۸۲۔

34. اِسی کے مطابق اتفاق سے سی-ایف-اولڈہم نے بھی "نوٹس آن دی لوسٹ ایور آف دی انڈین ڈیزرٹ" کلکتہ ریویو ۱۸۷۴ء میں شہادت پیش کی ہے، اُس کے اخذ کردہ نتائج اور شواہد سے ایک دوسرے مصنف نے بھی اتفاق کرتے ہوئے مذکورہ رسالہ میں اپنا مضمون پیش کیا ہے۔ (کلکتہ ریویو۔۱۸۷۵) اِس مصنف نے اپنا قلمی نام "نیرکس" تحریر کیا ہے۔

علم الارضیات کے نقطۂ نظر سے پہلے مصنف کے نظریہ کو آر ڈی۔ اورلڈہم نے دلائل کے ساتھ درست ثابت کیا ہے۔ جے-اے-ایس- بنگال ۱۸۷۴ء اور میجر مذکورہ بالا کتاب کے باب ۴۔ صفحہ ۸۱-۸۴ پر دی ہیں۔

35. جے-اے-ایس بنگال صفحہ ۳۳۶-۳۳۸، نیز "مہران" صفحہ ۳۹۶، ۳۹۷، ۴۱۸۔

36. اے بی، اسٹوک ''ڈرائی لیوز فروم ینگ اجپٹ'' (۱۸۴۹) صفحہ ۳۸-۳۴۔ ہیگ ''انڈس ڈیلٹا کنٹری'' جلد ۳ ۱۳۳-۱۳۴۔ ''مہران'' صفحہ ۴۹۱-۴۹۲ اور نوٹ ۵۴۹۔ کزنس ''اینٹی کوئیٹیز آف سندھ'' صفحہ ۱۴۵-۱۴۷۔

37. ڈرائی لیوز فروم ینگ اجپٹ'' صفحہ۴۴۔ نیز کزنس کی مذکورہ کتاب صفحہ ۷۸-۷۹۔

38. ملاحظہ ہو ہیگ کا مضمون بہ عنوان " آن دی سائنٹس آف برہمن آباد اینڈ منصورہ" مطبوعہ جے- آر-اے-ایس- نیو سیریز (۱۸۸۴) صفحہ ۲۸۷۔ نیز کزنس کی مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ ۱۷۶، ۱۷۷ بھی ملاحظہ کیجئے۔

39. ایلیوٹ جلد اول صفحہ ۲۵۷--۲۶۰۔

40. یعنی اِس کے وہ ابواب جس میں بستی اور کنداہر کے عجائبات بیان کئے گئے ہیں، " تاریخ سندھ " ترجمہ میلٹ۔ صفحہ ۸۷، ۹۲۔

41. ایلیوٹ جلد اوّل۔ صفحہ ۲۵۷--۲۶۰۔

42. "مہران " صفحہ ۱۹۹-۲۰۵ نوٹ ۱۰۵- محمود غزنی نے سومناتھ کی مہم سے واپسی منصورہ شہر پر قبضہ کیا تھا۔ یہ ۱۰۲۶-۱۰۲۷ عیسوی کا واقعہ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۵۸- ۲۵۹) نوٹ ۲۰۴)۔

43. ایلیوٹ- جلد اوّل۔ صفحہ ۷۸۔

44. ''مہران''۔ صفحہ ۲۰۵۔

45. مہران ۱۹۹--۲۰۰ نوٹ ۱۰۲۔

46. مطابق مہران باب ۹- صفحہ ۱۶۰- البلاذری سندھ میں وارد نہیں ہوا تھا۔

47. ہیگ " انڈس ڈیلٹا کنٹری " صفحہ ۲۷۔

48. کزنس " اینٹی کوئیٹیز آف سندھ " صفحہ ۷۰-۷۱۔

49. میں نے بھی موہن جوڈرو کے خاتمہ کی وجوہات اِسی ترتیب سے پیش کی ہیں جو کزنس نے مذکورہ بالا کتاب کے باب ۴۔ صفحہ ۸۱-۸۴ پر دی ہیں۔

49. ملاحظہ ہو ہیگ کا مضمون بہ عنوان " آن دی سائنٹس آف برہمن آباد اینڈ منصورہ" مطبوعہ جے-آر-اے-ایس-نیو سیریز (۱۸۸۴) صفحہ ۲۸۷۔ نیر کزنس کی مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ ۱۷۶-۱۷۷ بھی ملاحظہ کیجئے۔

49. معیز الدین اور شہاب الدین کے ناموں سے بھی مشہور تھے۔ قلیچ بیگ "ہسٹری آف سندھ" جلد دوم۔ صفحہ ۹، مہران صفحہ ۴۸۹-۴۹۰۔ ریورٹی نے اسی رسالہ میں بیان کردہ اقتباسات کے مطابق اپنی کتاب "دی مہران آف سندھ" میں اِس نظریہ سے نتائج اخذ کیے ہیں جو دونوں سے مختلف ہیں۔

50. سندھ میں سلطان محمود کی مہمات کے ضمن میں بکھرّ اور ٹھٹہ کا ذکر کرتے ہوئے میر معصوم نے اپنی تاریخ میں اُن اضلاع کو بیان کیا ہے جن میں آگے چل کر ہر دو مقامات اہمیت اختیار کر گئے۔ دوسرے ہمعصر مصنفین نے اِن مقامات کا ذکر نہیں کیا۔ (تاریخ معصومی) ترجمہ۔ میلٹ۔ صفحہ ۲۳۔ نیز مہران، صفحہ ۴۹۲۔

51. مہران۔ صفحہ ۴۸۹۔

52. مہران۔ صفحہ ۴۸۹-۴۹۰۔

53. ایلیوٹ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۰۱-۲۰۲۔ دوسری صورت میں ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ بکھر جزیرہ اُس زمانہ میں زندھ پیر اور سادھ بیلو کے ٹاپوؤں سے ملحق تھا۔ حصار "اکر" تھا۔ جبکہ قلعہ بکھرّ تھا اور یہ دونوں ایک ایسے جزیرہ پر تھے جو موجودہ جزیرے سے بڑا تھا۔ اور یہ عین ممکن ہے کیونکہ شاید سندھ کا پانی مکمل طور پر بکھرّ کی تنگ نائے سے اُس وقت تک نہیں گذرتا تھا۔

54. ایضاً۔ صفحہ ۲۴۲۔

55. ایضاً۔ صفحہ ۳۰۴۔

56. ایضاً۔ صفحہ ۳۹۶۔

57. ایضاً صفحہ ۵۵۴۔ اِس عبارت کو کئی مختلف طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔ سر ہنری ایلیوٹ نے جو عبارت اختیار کی ہے وہ یہ ہے۔
در کشتی ہا کرد و بکر دو قعلہ داشت در جزیرہ رفت۔

58. "وائجز ڈی ابن بطوطہ" جلد سوم صفحہ ۱۱۵۔ لفظ خلیج کا ترجمہ "کینال" یعنی نہر کیا گیا

ہے۔لیکن ریورٹی نے اِسے "شاخ دریا" لکھ کر بہتر مفہوم پیش کیا ہے۔یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی کہ دریا کے بیچ میں کوئی مسافر خانہ تعمیر کیا گیا ہوگا۔یہ ممکن ہے کہ شاخ نے زندہ پیر اور سادھ بیلو چہار اطراف سے گھیرا ہوا ہو۔اور جس بکھر کو ہم آج جانتے ہیں وہ ممکن ہے کہ اِس سے باہر ہو۔مذکورہ عمارت اِن تینوں مقامات میں سے کسی ایک پر واقع ہوگی۔ملاحظہ ہو "مہران" صفحہ ۲۹۴ نوٹ ۵۷۲۔ ۱۵۵۰ء سے قبل سادھ بیلو ایک الگ جزیرہ تھا۔ایک چھوٹی سی پہاڑی جو بکھر کے مغرب کی سمت پانی کے بیچوں بیچ کھڑی ہوئی ہے۔(تاریخ معصومی ترجمہ میلٹ۔بمبئی گورنمنٹ ریکارڈز نمبر ۱۳ نیو سیریز (۱۸۵۵) صفحہ ۱۲۱۔

59. مہران" صفحہ ۴۹۹۔نوٹ ۵۷۵۔"جتوئی" جسے ریورٹی نے اختیار کیا ہے اِس سے شاید وہ مقام مراد لیا گیا ہے جو آئین اکبری میں پنج ند کے نزدیک بیان کیا گیا ہے۔ایضاً۔صفحہ ۵۰۶ نوٹ ۵۸۹۔ بمطابق ریورٹی کے "نوٹس آن افغانستان" صفحہ ۵۵۹۔

60. "وائجز ڈی ابن بطوطہ" جلد سوم صفحہ ۹۰" مملکتِ ترکستان کی آخری حد پر جب انسانی آبادی کا علائقہ ختم ہوا" تو سیاح بیان کرتا ہے" ہم ایک عظیم صحرا میں داخل ہوئے جو پندرہ یوم کی مسافت کے برابر پھیلا ہوا ہے۔ ''دخلنا البریۃ الکبریٰ وھی میسرۃ خمس عشرۃ'' اِس صحرا میں زہریلی ہوائیں چلتی ہیں (سموم)" وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ ایسا علائقہ کچھی کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا۔ہیگ نے یہ نظریہ ظاہر کیا ہے کہ سیاح پشاور کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا اور جس صحرا کا اُس نے ذکر کیا ہے اُس سے وہ علائقہ مُراد ہے جو کوہ سلیمان کے دامن میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہیگ کے دلائل باطل ہو جاتے ہیں ("ابن بطوطہ اِن سندھ" جے-آر-اے-ایس) نیو سیریز (۱۸۸۷) صفحہ ۴۰۱۔

61. "وائجز ڈی ابن بطوطہ" سوم صفحہ ۱۹۰ اور صفحہ ۱۰۰ "نھر السند المعروف پنج آب۔

62. ایضاً۔صفحہ ۱۰۱ جنانی کے نام سے کونسا مقام مُراد لیا گیا ہے اِس کی شناخت ممکن معلوم نہیں ہوتی ۔بحوالہ ہیگ (ابن بطوطہ اِن سندھ۔صفحہ ۴۰۱)۔

63. ترخان نامہ۔ایلیوٹ جلد اوّل صفحہ ۳۱۱۔ ریورٹی "مہران" صفحہ ۴۹۵، ۴۹۶۔

64. گجو کے قریب تھرو کے مقام پر شیخ کے مقبرہ کے متعلق اُس نے تحریر کیا ہے "اِس عظیم شیخ کی قبر پر جو مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے اُس پر ۱۷۱ھ (۷۸۷عیسوی) بطور تاریخ تعمیر دی گئی ہے۔ (قلیچ بیگ۔ ہسٹری آف سندھ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۵) کتبات جو مقبرے پر موجود ہیں یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ سلطان فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں تعمیر کیا گیا اور سن تعمیر ۷۷۲ یا ۷۸۲ ہجری تھا۔اِس کے معنی یہ ہیں کہ جب علی شیر قانع نے اِس مقبرے کو دیکھا تو یہ چار سو سال پُرانا تھا اور ہم صرف یہ کہہ سکے ہیں کہ اِس کی تاریخ لکھتے ہوئے اُس نے ابوتراب کی تاریخ وفات تحریر کی (این۔ایم۔بلموریا۔انسکرپشن آن دی ٹومب آف ابوتراب اِن سندھ۔ جے۔اے۔ایچ۔ ایس۔جلد پنجم۔نمبر ۳۔صفحات ۱۳۶۔۱۳۳) میں نے ۷۷۲ ھجری اختیار کیا ہے جو ۷۰۔۱۳۷۱ء کے مطابق ہے۔

65. کزنس" اینٹی کوئیٹیز آف سندھ" صفحہ ۸۰۔بحوالہ ایلیوٹ جلد اوّل۔صفحہ ۳۶۸۔
کننگھم "اینشی اینٹ جیوگرافی آف انڈیا" صفحہ ۲۹۴۔ ۲۹۵۔ مجمدار صفحہ ۱۹۔
ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے نظریہ کے مطابق بھمبھور دیبل کے آثاریات پر آباد ہوا۔
(چچ نامہ۔سندھی زبان میں ترجمہ۔مخدوم امیر احمد۔ایڈیٹر۔ نبی بخش۔صفحہ ۳۹۲۔ ۳۹۵) لیکن ڈاکٹر لزلی الکوک (Dr. Lslie Alcock) کی تحقیقات نے اِس نظریہ کو حتمی طور باطل قرار دیدیا ہے۔
ملاحظہ ہو "بلوگرافی آف انڈین آرکیولوجی"۔جلد سولہ (۱۹۴۸، ۵۳) صفحہ ۱۷۔
۱۷ دی ریسز دیٹ اِن ہیبٹ دی ویلی آف دی انڈس" صفحہ ۹۳۔۹۲۔

66. میک مرڈو "ڈزرٹیشن آن دی ریور انڈس صفحہ ۲۶-۲۵ نیز برٹن-سندھ اینڈ دی ریسز ان ہیبٹ دی ویلی آف دی انڈس-صفحہ۹۳-۹۲۔

67. جے-ا-ایس-ایچ-ایس جلد چھ نمبر۲-صفحہ۱۱۔

68. میک مرڈو۔مذکورہ کتاب-صفحہ۲۵۔فٹ نوٹ۔

69. مطلب یہ ہے کہ نقل نویس نے اِس مقام پر بے خیالی میں لفظ اثنین کے ساتھ عشر بڑھا دیا ہوگا (رینا ڈکے "فریگ منٹس" صفحہ۹۱ ملاحظہ ہو)۔

70. ایلیوٹ-جلد اوّل۔صفحہ۷۷۔"اینٹی کوئیٹیز آف سندھ" صفحہ۱۲۵ پر کزنس یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ "الادریسی حقیقت میں نئے بندرگاہ دیول کا ذکر کر رہا ہے۔ (یعنی البیرونی کا بیان کردہ لوہرانی) یہ خورداد بہ کا دیبل نہیں، الادریسی اورحوقل کے بیان میں جو فرق ہے اور بس پر کزنس نے اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی ہے۔ مجھے کسی اہمیت کے حامل نظر نہیں آتے، (ملاحظہ ہو ایلیوٹ۔جلد اوّل صفحہ ۳۷) مثال کے طور پر جب الادریسی یہ کہتا ہے "مغرب کی سمت چلئے تو شہر اور دریا کے درمیان چھ میل کا فاصلہ ہے" تو لازمی طور پر اُس کا مطلب یہی ہے کہ یہ شہر دریا کے مغرب میں واقع تھا۔اور اُس سے قبل کے جغرافیہ دانوں کے بیان کے مطابق دریائے کے دہانے اور شہر کے درمیان دو فرسخ کا فاصلہ تھا۔اِس سے بھی کزنس کے نظریہ کی نفی ہوتی ہے۔

71. ہیگ "انڈس ڈیلٹا کنٹری" صفحہ۴۸-نوٹ ۶۸۔یعنی البیرونی کی عبارت کو ریناڈ نے "فریگ منٹس" صفحہ۹۱ پر دیا ہے اور ترجمہ صفحہ۱۱۸ پر دیا گیا ہے-وہ یہ ہے۔ (البحر) دیا خذ ساحلہ من تیز قصبہ مکران ظاعنا الی ما بین الجنوب والمشرق۔ ناحیتہ الدیبل اربعین فرسخا۔

یہاں دیبل اور تیز کے درمیان کے فاصلہ کو چالیس فرسخ بیان کیا گیا ہے جو درحقیقت بہت کم ہے۔ اصل فاصلہ ۵۰۰ میل سے کم نہیں ہوگا۔ ملاحظہ ہو ہودی

والا۔ صفحہ ۳۴ اور ایلیوٹ جلد اوّل۔ صفحہ ۳۰ جس میں الاصطخری کی غلطی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ البیرونی نے اِس عبارت کو اپنی کتاب میں نقل کر دیا ہے۔

72. "وائجز ڈی ابن بطوطہ" جلد سوم۔ صفحہ ۱۱۲۔

73. ایضاً صفحہ ۱۱۳-۱۱۴۔

74. "انڈین اینٹی کوئیٹیز۔ ۱۹۳۲ء صفحہ ۸۶، کارٹر نے ٹھمبھن واری مسجد کے جو فوٹو گراف لئے تھے اُنھیں کزنس نے "انٹی کوئیٹیز آف سندھ" صفحہ ۱۲۶-۱۲۷ پر پیش کیا ہے۔

75. کننگھم "اینشی اینٹ جیوگرافی آف انڈیا" صفحہ ۲۹۹۔

76. قلیچ بیگ "ہسٹری آف سندھ" جلد دوم صفحہ ۵۔

77. رینالڈ "فریگ منٹس" صفحہ ۹۱۔ اور ترجمہ صفحہ ۱۱۹۔ غب یعنی خلیج اور خور یعنی کھاڑی (جس کا رینالڈ نے غلط ترجمہ کیا ہے)۔

78. درحقیقت البیرونی نے سندھی زبان کا لفظ "مُنہ" استعمال کیا ہے جس کے موجودہ ہجے مُنھُں ہیں۔

79. ریورٹی (مہران۔ صفحہ ۲۲۰) پر البیرونی کے بیان سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے۔ "خاص طور پر دریا کے متعلق جب البیرونی یہ کہتا ہے کہ یہ دو شاخوں میں منقسم ہو کر سمندر تک پہنچتا ہے درست نہیں کیونکہ اُس پرانے زمانہ میں ایسا نہیں تھا"۔ ریورٹی نے البیرونی کی کتاب کے اُس ایڈیشن کے بارے میں جو رشید الدین نے مرتب کیا جو کچھ بھی کہا وہ موضوع سے غیر متعلق ہے۔ کیونکہ دریا کے متعلق البیرونی کا بیان اُس کے اصل عربی نسخہ میں موجود ہے، اس نے اپنے نظریے کی بنیاد الادرسی کے بیان پر رکھی ہے جس نے یہ کہا ہے کہ دو شاخیں جن سے منصورہ گھرا ہوتا تھا آگے چل کر ایک دوسری سے مل جاتی ہیں۔ اور "اِس کے بعد ایک متحد چشمہ کی حیثیت سے بہتی ہیں" (ایلیوٹ، جلد اوّل۔ صفحہ ۷۸۔ مہران صفحہ ۲۲۸-۲۲۹ اور نوٹ ۱۷۴) لیکن اِس مقام پر الادریسی شاید

اُن بیانات کو یکجا کر کے پیش کر رہا ہے جو المسعودی اور مسالک و ممالک میں موجود ہیں۔ جبکہ اپنے زمانہ کے حالات کو وہ بیان نہیں کرتے۔ اُس کا اپنا نظریہ ناقابلِ یقین قرار پاتا ہے کیونکہ دریائے مہران صفحہ ۱۱۵۔

80. وائجز ڈی ابن بطوطہ۔ جلد سوم۔ صفحہ ۱۰۹۔۱۱۲۔

81. ج۔ ایس۔ ایچ۔ ایس جلد سوم۔ صفحہ ۶۱۔

82. اگر ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ابن بطوطہ کا بیان کردہ "السمیرہ" صرف سومرہ قبیلہ ہی کی طرف اشارہ کرتا ہے تو یہ ظاہر ہے کہ اُن کا اقتدار بالائی سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ (وائجز ڈی ابن بطوطہ صفحات۔۱۰۱۔۱۰۲۔۱۰۵۔۱۰۷) ہیگ نے بہر حال یہ دلیل پیش کی ہے کہ سیّاح کا اشارہ سمہ قبیلہ کی طرف ہے۔ (ابن بطوطہ ان سندھ، جیسا کہ ج۔ آر۔ اے۔ ایس نمبر ۱۹ نیو سیریز مضمون پر صفحہ ۴۰۱۔۴۰۵۔۴۰۷ میں موجود ہے) فٹ نمبر ۱۳۴۔ صفحہ ۱۰۹ انڈس ڈیلٹا کنٹری۔ میں انڑپور کے ضمن میں لکھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود ہیگ نے بھی "سومرہ" لکھا ہے۔ جبکہ اُس کی مُراد "سمہ" ہے۔

83. ہیگ۔ انڈس ڈیلٹا کنٹری۔ صفحہ ۸۶ اور نوٹ ۱۰۵۔ قلیچ بیگ (ہسٹری آف سندھ جلد دوم۔ صفحہ ۶۴۔۶۵۔۶۵) یہاں پیچیدگی پیدا کر دی گئی ہے۔

84. تغلق آباد ایک اور بھی پُرانے قلعہ "کالا کوٹ" کے کھنڈرات پر آباد کیا گیا تھا۔ مہران صفحہ ۳۲۷۔۳۲۸۔ نوٹ ۳۱۶ نیز۔ ج۔ آر۔ اے۔ ایس جلد اوّل۔ صفحہ ۳۱ پر میک مرڈو کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔

85. ہیگ۔ انڈس ڈیلٹا کنٹری صفحہ ۸۵۔ مہران صفحہ ۵۰۰ نوٹ ۵۷۷۔ میر معصوم نے اِسے "خان واہ" بیان کیا ہے۔

86. ہیگ۔ انڈس ڈیلٹا کنٹری۔ صفحہ ۹۱ نوٹ ۱۱۰ صفحہ ۱۰۳ اور نوٹ ۱۲۴۔ بمطابق مہران۔ صفحہ ۳۱۵۔ نوٹ ۳۱۴۔

87. مہران صفحہ ۴۲۹-نوٹ ۵۳۷- بمطابق قلیچ بیگ ہسٹری آف سندھ-جلد دوم صفحہ ۱۱۳-اکبر نامہ- جلد سوم- صفحہ ۹۷۳ " تاریخ معصومی "ترجمہ میلٹ- بمبئی گورنمنٹ ریکارڈ نمبر ۱۳-نیو سیریز صفحہ ۱۵۶۔

88. ہیگ- انڈس ڈیلٹا کنٹری- صفحہ ۹۲ دوم ۹۳- قلیچ بیگ ہسٹری آف سندھ- جلد دوم صفحہ ۱۰۱-۱۱۳۔

سندھ کا جو راستہ وسطی سندھ میں اُس نے بیان کیا ہے وہ جغرافیائی اعتبار سے ناممکن ہے۔ البیرونی کا جہاں تک تعلق ہے وہ کم از کم ملتان میں تو قیام پذیر رہا تھا۔ اور ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ صحیح معلومات جمع کرنے میں اُس نے کوئی کوشش فرد گذاشت نہ کی ہوگی۔

89. قلیچ بیگ، ہسٹری آف سندھ- جلد دوم- صفحہ ۷۷-۷۸-مہران صفحہ ۱۸۴-نوٹ ۴۷-ملاحظہ ہو اسٹین کا مضمون مطبوطہ، جیوگرافیکل جرنل نمبر ۴-۱۸۱-جلد XCIX۔

90. مہران صفحہ ۵۰۲-نوٹ ۵۷۸۔

91. مہران صفحہ ۴۶۶-نوٹ ۵۳۵-نیز بیگ انڈس ڈیلٹا کنٹری صفحہ ۱۱۵-۱۱۶ اور صفحہ ۱۰۳ نوٹ ۱۲۵۔

92. مہران صفحہ ۴۲۱- ج-ایس-ایچ-ایس جلد ہشتم صفحہ ۵۸، ۵۹، فائف کی رپورٹ مطبوطہ ایس-آر-بی-جی XLV نیو سیریز صفحہ ۴۰۔

93. اپنے مضمون میں ایک فٹ نوٹ میں اُس نے لکھا ہے۔ ہیگ نے بیان کیا ہے کہ یہ تبدیلی گذشتہ صدی کے وسط میں واقع ہوئی، اور یہ بیان بالکل درست ہے" اور یہ کہ اِسی انقلاب کو نصر پور کی تباہی کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے" مہران صفحہ ۲۲۵-نوٹ ۱۷۳۔

94. ہیگ انڈس ڈیلٹا کنٹری، صفحہ ۱۱۸-۱۱۹- یہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷۶۲ء میں

دریائے ستلج میں جو زبردست طغیانی آئی تھی۔ اُس کا اثر دریائے سندھ کی اس تبدیلی پر ضرور پڑا ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم یہ کہ اِس طغیانی نے دریائے سندھ کے نئے راستہ کو مستقل بنا دیا ہوگا، میجر جنرل کنگھم کے بیان کے مطابق پہاڑوں میں زمین کے بڑے بڑے تودے گرنے سے دریائے ستلج کے راستہ میں ایک طرح سے قدرتی بند بن گیا تھا - اُس کا پانی چار سو فٹ تک بلند ہو گیا - اِس کے بعد وہ رکاوٹ پانی کے زور سے بہہ گئی - (نوٹس آن دی لوسٹ ریور آف دی انڈین ڈیزرٹ کلکتہ ریویو، نمبر CXVII، جلد ۵۹ - باب نمبر ۱ - صفحہ ۸) شاید ۱۷۶۲ میں ہی یہ واقعہ بھی رونما ہوا کہ دریائے پران، دھان کی کاشت کے لئے پوری مقدار میں پانی مہیا نہ کر سکا - نیچے ملاحظہ ہو۔

95. قلیچ بیگ - ہسٹری آف سندھ - جلد دوم صفحہ ۱۵۴ - ۱۵۵۔

96. ایضاً - صفحہ ۱۶۲۔

97. اے - برنس - "اے میموائر آف اے میپ آف دی ایسٹرن برانچ آف دی انڈس" بمبئی گورنمنٹ فائل نمبر ۶۳ ۷، پیراگراف ۳، ۶

98. "ارلی کینال ایڈمنسٹریشن اِن سندھ" جے - ایس - ایچ - ایس - جلد سوم - پارٹ ۱ - صفحہ ۱۷ - ۱۸۔

99. ایس - آر - بی - جی نیو سیریز - جلد دوم - صفحہ ۴۹۱ - ۴۹۲ - ۵۳۴ - ۵۳۵ - نیز وہ نقشہ جو صفحہ ۵۳۴ کے مقابل ہے - بنانے والے لفٹنٹ ٹی - جی - کارلس - نقشہ نمبر A ۱۳، B ۱۳۔

100. "اے میموائر اینڈ سپلیمنٹری میموائر آف میپ آف دی ایسٹرن برانچ آف دی انڈس" لفٹنٹ اے - برنس (۲۸، ۱۸۲۷) بمبئی گورنمنٹ فائل نمبر ۶۳ ۷، پیراگراف ۱۳۔

101. یعنی ۱۹۰۶ میں سردار اسٹیشن کے پاس - " گزیٹیر آف سندھ " ۱۹۰۷ - صفحہ ۳۴۸۔

102. اے-برنس "میموائر آف اے مپ آف دی ایسٹرن برانچ آف دی انڈس" پیرا-۳

103. خلاصۃ التوریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی کے اختتام پر "ملتان اور بکھر کے بہت سے تاجر مال تجارت اور مویشی دریا کے راستے ٹھٹہ لاتے ہیں۔اور ایسا کبھی کبھار ہوتا ہے کہ لوگ خشکی کا راستہ استعمال کرتے ہوں۔ کیونکہ خشکی کے سفر میں بہت تکالیف اور دشواریاں ہیں" نیز "آرائش محفل "ترجمہ اینچ کورٹ (کلکتہ ۱۸۸۲) صفحہ ۱۱۸-۱۱۷۔

104. ہیگ-انڈس ڈیلٹا کنٹری-صفحہ ۴۹-نوٹ ۶۹۔

105. تحفۃ الکرام--بحوالہ قلیچ بیگ-ہسٹری آف سندھ-جلد دوم-صفحہ ۱۴۹۔

106. میموائرس آف سیٹھ ناؤمل ہوت چند-ایڈیٹر سر ایوان جیمس (ا یگزیٹر ۱۹۱۵) صفحہ ۳۷۔

107. ایضاً (ضمیمہ ۱۲) صفحہ ۲۰۹۔

108. ایضاً (ضمیمہ ۱۲) صفحہ ۲۰۹ جے-ایس-ایچ-ایس-جلد چھ صفحہ ۱۰۶-۱۰۸۔

109. ظاہر یہ ہوتا ہے کہ کلہوڑا خاندان اٹھارویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف میں چند سالوں تک کراچی پر قابض رہے، (ناؤمل میموائرس۔صفحہ ۳۸)

110. میسن نے اِن ڈھانچوں کا مشاہدہ کیا ہے، (ٹریولز اِن بلوچستان وغیرہ۔جلد دوم صفحہ ۱۵۰-۱۵۲-۱۵۶) ملاحظہ ہو رپورٹ کیپٹن پریڈی اور جے میکلوڈ جسے بارٹل فریر نے پیش کیا ہے۔(جرنل آف دی بمبئی برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی۔جلد پنجم (۱۸۵۷) صفحہ ۳۴۹-۳۶۲) نیز کزنس کا "اینٹی کوئٹیز آف سندھ " کا صفحہ ۲۴۔ اور مجمدار صفحہ ۱۴۲-۱۴۳، جے-ایس ار-ایچ-ایس جلد ششم-صفحہ ۱۰۴-۱۰۶ بھی ملاحظہ ہو۔

111. مہران-صفحہ ۱۸۵-۲۱۲-۲۱۵-۲۱۶ وغیرہ۔نیز وہائٹ ہیڈ "ریور کورسز آف دی پنجاب اینڈ سندھ" صفحہ ۱۶۲ اور ہودی والا صفحہ ۲۹-۳۲-۳۸-۳۹۔

باب گیارہواں

سندھ کی مختلف نسلیں اور قومیں

جب سے سندھ کی قدیم تہذیب دریافت ہوئی ہے۔ یہاں کے باشندوں کا قدیم قوموں اور قبائل سے تعلق متعین کرنے کے لئے یہ ضروری ہوگیا ہے کہ سب سے پہلے اِس اہم سوال کا جواب دیا جائے کہ آیا سندھ کے موجودہ باشندوں میں موہن جو دڑو کے باشندوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ڈھونڈ نکالنا ممکن ہے؟

براہوئی زبان میں دراوڑ الفاظ کی آمیزش اِس بات کا ثبوت ہے کہ یہ زبان بولنے والے آریوں سے قبل کی نسل سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور رکھتے ہیں۔ حالانکہ بعد کے زمانہ میں تورانی اور دوسری نسلوں سے تعلق رکھنے والے قبائل بھی کافی حد تک اِن لوگوں میں خلط ملط ہوگئے۔ سر اوریل اسٹین جھالاواں اور ساراواں پہاڑیوں میں آباد قبائل کے بارے میں جن کی زبان براہوئی سے بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں [1] یہ ویران بیابانی علائقہ جو کسی حملہ آور کے لئے مستقبل آبادکاری کا کوئی سامان نہیں رکھتا۔ سندھ کی قدیم ترین قوم سے تعلق رکھنے والے غریب خانہ بدوش قبائل کے رہنے کے لئے موزوں ترین جگہ ہوسکتی ہے، کیونکہ یہاں وہ حملہ آوروں کی دستبرداری سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ملک میں آریائی اثرات نے جہاں اِن لوگوں کے اُن بھائیوں کو جو ترقی یافتہ شہروں میں آباد تھے تباہ و برباد کردیا یہ لوگ اُس سے محفوظ رہے۔ زیریں سندھ کے علائقہ میں آریہ اثرات کو پھیلنے میں کچھ مدت لگی کیونکہ اُن کی کثیر تعداد پہلے پنجاب سے ہوتے ہوئے وادی گنگا میں آباد ہوئی۔ لیکن اِن لوگوں کو جو "داسیہ" ہاتھ لگے اُنھیں آریوں نے صفحہ ہستی سے نہیں مٹایا۔ آثاریاتی شواہد جو ماہرین کے ہاتھ لگے کم ازکم سندھ کے بارے میں اِس بات کا ٹھوس ثبوت ہیں کہ یہاں کے قدیم باشندوں کو بلوچستان کی طرف سے مشرق میں بڑھتے

ہوئے وحشی قبائل نے مغلوب کیا اور اِس کے بعد ہی آریہ قوم سندھ کے منظر پر ظاہر ہوتی ہے۔

یہ لوگ نیز وسطِ ایشیا سے ہندوستان میں داخل ہونے والے بہت سے دوسرے قبائل نے "سندھ" کے پُرانے خون میں اِس قدر نئے خون کی آمیزش کردی ہوگی کہ موجود سندھ کے قبائل میں موہن، جودڑو نسل کے لوگوں کو تلاش کرنا صرف وقت ضایع کرنا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موہن جو دڑو سے جو انسانی اجسام کے ڈھانچے اور کھوپڑیاں دریافت ہوئی اُنھیں دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ خود موہن جودڑو میں صرف ایک نسل کے نہیں بلکہ متعدد نسلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ پھر بھی اگر دعویٰ کیا جائے ۲؎ تو شاید منچھر جھیل پر آباد موہانہ قبائل کے لوگ اپنے دعوے میں سچے ہوں گے کہ وہ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے زمانہ میں اِس جھیل پر بسنے والے قدیم ترین باشندوں کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کے خون میں باہر سے آنے والے لوگوں کے خون کی ملاوٹ کم سے کم ہے، اِن کے ساتھ مغربی پہاڑیوں کے ماچھی اور چھٹا قبائل، نیز بلک اور گانچہ بھی قدیم ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اِن کے طور طریقے اور خصوصیات ایک دوسروں سے مختلف اور انوکھی ہیں، اِن کے پڑوسی اِن لوگوں کو سندھ کے قدیم ترین میر بحر کہتے ہیں۔ لیکن صرف اتنی سی شہادت کی بنا پر کوئی یقینی نظریہ قائم نہیں کیا جا سکتا ہے۔☆

پلائنی نے اپنی "نیچرل ہسٹری" کی کتاب میں شمالی مغربی ہندوستان یا وادیٔ سندھ

☆ بھیرومل مہرچند آڈوانی کی راءِ ہے کہ قدیم سندھ کے اصل باشندے عصر حاضر کے کول، سنتھال، بھیل اور میدلوگوں کے ''آباؤ اجداد'' تھے۔ ان لوگوں کی تہذیب کے جو آثار و نشانیاں اس وقت (۱۹۴۴ء) میں ملتی ہیں، ان میں سے کچھ مثال یہ ہیں: سندھ میں خاص طور پر تھرپارکر میں بھیل (یعنی کول) لوگوں کی اکثریت، مزارعوں کھیت مزدور اور دوسرے لوگ کوڑی کوڑی کر کے حساب کتاب کرنا، سندھی زبان کے آوازوں سے بنے ہوئے ''الفاظ'' کا موجود ہونا، عام سندھیوں کی اکثریت کا ''پوتڑو'' (چھوٹی دھوتی) نیچے کر کے اپنے کام کرنا، منچھر جھیل کے مُہانوں اور مچھیروں ''پابوڑا'' (کنول کے پتے)) باندھ کر زندہ آبی پرندوں کو پکڑنا، کچھ مچھیروں کو غلیل تیروں سے مرغابیوں اور دوسرے آبی پرندوں کو نشانہ بنا کر پکڑنا، کراچی ضلعے میں شاہ بندر کی طرف سندھونڈی کے کن خاص حصوں میں مچھیرا قبائل میں ''پوپٹ'' (طوطا) نام سے پکارا اور بلانا قدیم زمانے میں اس طرف کے میر بحر دریا میں داخل ہوتے وقت اپنے پیر کے لیے ''پوپٹ'' (طوطے) کی قربانی دیا کرتے تھے۔ اب یہ رواج نہیں رہا (قدیم سندھ، ۱۹۵۷ء، ص ص ۵۱ اور ۶۲_۵۸)

کے تقریباً تیس ۳۰ قبائل کی ایک فہرست شامل کی ہے، اِسی طرح سنسکرت زبان کے ''پرانوں'' میں سے چار کے اندر الگ الگ علاقوں میں آباد قبائل کی فہرستیں ملتی ہیں۔۳ اِن میں سے کچھ پلائنی کے زمانہ کی کتابیں ہیں، اِن کے علاوہ ہمیں ''مہا بھارت'' میں بھی قبائل کے کثیر نام ملتے ہیں۔ جن میں بہت سے مکّرر اور بار بار دُہرائے گئے ہیں اور کسی خاص ترتیب کے تحت شامل نہیں کیے گئے۔ اِسی کتاب میں ''کھشتریہ'' قبائل کی بھی ایک فہرست ہے جن کی اکثریت شاید شمالی مغربی ہندوستان سے تعلق رکھتی تھی، اور آخر میں ورہمہ ہیر (Varahamihira) کی لکھی ہوئی ''بری ہت سمہیتا'' میں بھارت ورشن کو نو صوبوں میں رہنے والے قبائل کے نام درج ہیں جیسا کہ وایو پران میں بھارت ورشن کے سیاسی حُدود دیئے گئے ہیں۔ بری ہت سمہیتا چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں لکھی گئی تھی اور عجیب اتفاق ہے کہ اِس میں ہمیں دو تین قبائل ایسے بھی ملتے ہیں جو پلائنی کی مرتب کی ہوئی فہرست میں شامل ہیں۔ جبکہ کم از کم ایک نام ایسا ہے جسے قدیم کتب میں بھی شناخت کیا جا سکتا ہے۔۴ چونکہ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ پلائنی نے اپنے ناموں کو یونانی سیّاح میگاستھیز کے اوراق سے حاصل کیا تھا جو اب ناپید ہیں اور چار صدی قبل مسیح میں لکھے گئے تھے۔ چنانچہ مالّی (Malli) اور سوگدی (Sogdi) قبائل جو سکندر اعظم کے زمانہ میں ممتاز تھے، اِن ناموں میں موجود ہونے چاہئیں، لیکن ہمیں صرف اور کسی ڈرکا (Oxydracae) قبیلہ کا سرسری ذکر ملتا ہے۔ یعنی اِس قبیلہ کے علاقہ میں سکندر اعظم کی پیش قدمی آخری تھی۔۷ اور مالّی جسے اِس نے بیان کیا ہے اور لکھا ہے دریائے گنگا کے آخری حصّہ میں اوڑیسہ کے علاقہ میں آباد تھے وہ یقیناً اسٹرابو (Strabo) اور آریان (Arrian) کے بیان کردہ مالولی قبیلہ سے مختلف ہے۔ یہ شاید سنسکرت کتابوں کے مالوہ قبیلہ سے ملتا جلتا ہے لیکن مہا بھارت میں جو قبیلہ مَلّا کے نام سے بنگال کے علاقہ میں بیان کیا گیا ہے یہ اُس سے مشابہ ہے۔۸

چنانچہ سنسکرت کی قدیم کتب کا سہارا لینا زیادہ مفید ہوگا جن میں وہ سب نام بھی شامل ہیں جنہیں مغرب کے دوسرے قدیم مصنفین نے بیان کیا ہے، جہاں تک ہندوستان کے

سیاسی نقشہ کا تعلق ہے وہ پرانوں اور بری ہت سمہیتا میں مختلف ظاہر کیا گیا ہے۔ مؤخر الذکر کتاب میں آٹھ بیرونی صوبوں کو مرکزی صوبہ کے تعلق سے پیش کیا گیا ہے، اِس طرح سے سندھ بھارت ورش کے جنوبی مغربی صوبہ میں شمار ہوتا ہے اور ''وشنو پران'' کے رُو سے مغربی صوبہ میں۔ لیکن اِس سے بیان کی تمام خامیاں دور نہیں ہو جاتیں، پہلوا یوُنا اور ابھیرا قبائل بری ہت سمہیتا کے مطابق جنوبی مغربی صوبہ میں اور وشنو پران کے مطابق مغربی صوبے میں نظر آتے ہیں جبکہ ''وایو پُران'' اِنہیں شمالی صوبہ میں بیان کرتا ہے۔9 یہ وہ قبائل ہیں جو تاریخی معلومات کی روشنی میں شمال مغرب کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے، چنانچہ عین ممکن ہے کہ اِن قبائل کی تین الگ الگ مقامی نوعیت اُن کی پیش قدمی کو ظاہر کرتی ہو۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ بری سمہیتا جو اِن میں سب سے آخری کتاب ہے وہ مالی (مالوہ) قبیلہ کو شمالی صوبہ میں دکھاتی ہے جبکہ دوسرے تاریخی شواہد یہ ثابر کرتے ہیں کہ چھٹی صدی عیسوی سے قبل یہ لوگ جنوبی پنجاب کو چھوڑ کر مزید جنوب کی طرف کوُچ کر گئے تھے۔10

مہابھارت کی کشتری فہرست میں مالوہ اور شودرا کا قبائل ایک ساتھ ہی منضبط کئے گئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اِن دونوں کا اتحاد یعنی مالی (Malli) اوراکسی ڈرکا نے جو سکندرِ اعظم کا متحد ہوکر مقابلہ کیا تھا، وہ دیرپا ثابت ہوا۔ مہابھارت میں جو طویل تر فہرست ہے اُس میں شودر، یعنی شودرکا ابھیرا کے فوراً بعد تحریر کئے گئے ہیں جن کی حالت دوسری صدی عیسوی میں ٹالمی (Tolmy) نے بیان کی ہے اُس نے اِن لوگوں کا علاقہ پٹالین (Patalene) سے ملحق شمال میں دریائے سندھ کے کنارے پر بیان کیا ہے۔ یہ بھی خیال گذرتا ہے کہ آرّیان (Arrian) نے جس سوگدی (Sogdi) قبیلہ کا ذکر کیا ہے وہ یہی شودر تھی اور جنھیں ڈیوڈورس سائیکلس نے ''سودرائے Sodrai'' لکھا ہے۔11

متبادل صورت یہ ہوسکتی ہے کہ سوگدی سے مُراد سوویرا ہوں جو سنسکرت کی تمام کتابوں

میں انڈس علاقہ کے ممتاز قبیلے کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہیں۔ فہرست میں یہ لوگ اکثر سندھو کے ساتھ لکھے گئے ہیں جیسے سندھو سو ویرا اور مہا بھارت میں سیوا کے ساتھ بھی اِن کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہی شاید وہ قبیلہ ہے جسے اسٹرابو نے سبائے (Sabai) لکھا ہے۔ اِن کا ذکر تری گارتا اور مدرا کا قبیلہ کے ساتھ بھی ملتا ہے۔[۱۲] مہا بھارت کے مطابق سندھو سو ویرا قبیلہ نے کروکشیتر کی جنگ میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔

یہ ماننا پڑیگا کہ جس طرح اکثر مغربی کتب میں ہم دیکھتے ہیں اِسی طرح سنسکرت زبان کی کتابوں میں بھی قدیم ماخذ سے بہت کچھ نقل کیا گیا ہے اور اُس میں اپنے دور کے مواد کو بھی شامل کر دیا گیا ہے، اِس سے جو تصویر سامنے آتی ہے وہ بجائے خود مکمل صحیح لیکن کسی مخصوص دور کی نشاندہی نہیں کرتی۔ یہ کتابیں جس زمانہ کا اِحاطہ کرتی ہیں ایسا تھا کہ جب شمالی مغربی ہندوستان میں قبائل کی آبادی میں بہت تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں، خاص طور پر سن عیسوی سے دو سو سال پہلے سے لے کر دو سو سال بعد تک آبادی پے در پے خلط ملط اور انقلاب کا شکار نظر آتی ہے۔

شمال اور مغرب کی طرف سے حملہ آور ہونے والے قبائل کے داخلہ کی وجہ سے بہت سے پُرانے آباد قبائل مُنتشر ہوئے بہت سے قبائل جو آباد تھے وہ نئے قبائل میں ضم ہو گئے۔ اکثر و بیشتر یہ ہوا کہ آنے والے فاتح قبائل ہندو ذات پات تنظیم میں اکشتریوں کی حیثیت سے شامل ہوتے گئے، گو اِن کا مرتبہ قدیم اکشتری خاندانوں کے برابر شمار نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ لوگ مذہبی رسومات کی انجام دہی کو "فراموش" کرتے تھے۔[۱۳] لیکن عملاً یہ لوگ جہاں آباد ہوئے وہاں کے مسلّمہ حکمراں کی حیثیت سے قائم ہو گئے۔ سو ویرا قبیلہ اِس طرح آنیوالے قبائل کے ہاتھوں مغلوب ہوتا رہا پہلے ساکا، پھر پہلوا، پھر کشن اور اُن کے بعد ہندو ساکا جو مغربی بھارت کے اکشتری حکمراں تھے اِن پر غالب آئے۔[۱۳]

اِس کے برخلاف مالوہ قبیلہ نے غلامی پر ہجرت کو ترجیح دی اور سن عیسوی کے ابتدائی دور میں ہمیں یہ شہادت ملتی ہے کہ یہ لوگ راجپوتانہ میں جے پور کے علاقہ میں آباد ہو گئے

تھے، آگے چل کر جب گُپتا خاندان کی حکومت قائم ہوئی تو اِن کا ذکر ابھیرا قبیلہ کے ساتھ سلطنت کی مغربی سرحد پر آباد قبائل میں ملتا ہے اور تقریباً اُسی علاقہ کی نشاندہی ہوتی ہے جو اوپر مذکور ہے۔ اِس قبیلہ نے اپنی آزادی برقرار رکھتے ہوئے سمندر گپتا کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کا سلوک کیا تھا۔[۱۵]

سندھ میں نسل انسانی کے قدیم عناصر کی تلاش کے لئے ایک دوسری سنسکرت زبان کی کتاب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ مہابھارت سے بھی زیادہ پُرانی کتاب ہے۔ ہمیں اِس کتاب کے صرف اقتباسات ایک فارسی ترجمے میں ملتے ہیں اور یہ فارسی ترجمہ خود اپنے سے پہلے ایک عربی کتاب سے کیا گیا ہے۔ جسے مجمل التواریخ کے مصنف نے جوں کا توں نقل کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے تاریخ عالم کا خاکہ ہے اور سندھ اور شمالی مغربی ہندوستان کی قدیم تاریخ پر روشنی ڈالنے کے لئے اِس سے مدد لی گئی ہے۔[۱۶]

سنسکرت کی اِس کتاب کی رو سے سندھ کے اصل قدیم باشندے جاٹ اور مید تھے۔ جاٹ کشتی رانی سے تعلق رکھتے تھے۔ اور مید چرواہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مترجم یا کاتب نے غلطی کرتے ہوئے دونوں کو اُلٹا دیا ہے کیونکہ موجودہ دور کے مید جو لسبیلہ میں آباد ہیں جہاز رانی سے تعلق رکھنے والی قوم ہے۔[۱۷] اور سندھ کے جاٹ اونٹ پالتے ہیں، بہرنوع حقیقت کچھ بھی ہو۔ ہمارے سامنے وادی سندھ کے دو قدیم ترین پیشے ہیں۔ یعنی ماہی گیری اور گلّہ بانی۔ جس سے ہمیں اِس کتاب کی صداقت کو تسلیم کر لینے میں مدد ملتی ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ہر دو اقوام نے سندھ پر تسلّط کے لئے ایک دوسرے کے خلاف صف آرائی کی ہو جیسا کہ کتاب میں مذکور ہے۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب اِس ملک میں برہمن داخل نہیں ہوئے تھے، اور یہ کہ برہمنوں کی آمد کے بعد اِس علاقہ میں تہذیب اور خوشحالی کا دور شروع ہوا۔[۱۸] قدیم عرب مصنفین جنہوں نے سندھ کے متعلق لکھا ہے بیان کرتے ہیں کہ جاٹ اور مید کے زمانہ میں ممتاز قبائل شمار ہوتے تھے خورداز بہ لکھتا ہے کہ کرمان اور منصورہ کے درمیان شاہراہ کی زٹ (جت) قبیلہ نگرانی کرتا تھا، اور مید جورن کچھ کے آس پاس آباد

تھے لوٹ مار کرتے تھے۔ ۱۹

البلاذری لکھتا ہے کہ مسلمان خلیفہ کا نائب برائے سندھ عمران تھا جس نے ۸۳۶ء کے بعد کسی وقت مید قبیلہ پر چڑھائی کی اور جاٹوں پر بھی حملے کئے اور انھیں مغلوب کیا۔ اس کے بعد جاٹوں کے سرداروں کی مدد سے مید قبیلہ پر دوبارہ فوج کشی کی۔ ۲۰ ادریسی کے بیان کے مطابق میدرن کچھ کے علائقہ میں آباد تھے، لیکن اُن کی ماردھاڑ الور تک پہنچتی تھی، اور کبھی کبھی مکران کے سرحدی علائقہ تک وہ لوگ حملہ کرتے تھے۔ جاٹوں کے بارے میں ابن حوقل نے تحریر کیا ہے " مکران اور منصورہ کے درمیانی علائقہ میں دریائے مہران کے پانی سے جگہ جگہ جھیلیں بن گئی ہیں اور اِس علائقہ کے باشندے ہندی قوم سے تعلق رکھتے ہیں جو زٹ کہلاتی ہے، جو لوگ دریا کے قریب آباد ہیں وہ سرکنڈے کے ایسے مکانات بنا کر رہتے ہیں جیسے بربر قبیلہ والے اور مچھلی اور جنگلی پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ اِن کی دوسری شاخ جو دریا سے دور آباد ہے وہ کُرد قبائل سے مشابہ ہے اور دودھ، پنیر اور آٹے کی روٹی اِن کی خوراک ہے۔ ۲۲

یہ عرب مصنفین دسویں عیسوی سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پانڈووں کی جنگ سے یہ زمانہ صدیوں بعد کا ہے۔ جبکہ مجمل التواریخ اُسی ابتدائی زمانہ کے واقعات سے شروع ہوتی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف کے بارے میں ہمارے پاس ایک اور مصدقہ شہادت یوان چوانگ کی ہے جس کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کے زمانہ میں سندھ کے باشندے قریب قریب قدیم باشندوں جیسے ہی تھے۔ وہ لکھتا ہے دریائے سندھ کی ترائی میں تقریباً ایک ہزار لی تک ایسے خاندانوں کے جتھے آباد تھے جو انتہائی وحشی اور خونخوار تھے۔ کسی کی جان لے لینا اُن کا معمول تھا، یہ لوگ مویشی پال کر بسر اوقات کرتے تھے۔ اِن لوگوں میں کوئی سماجی امتیازات اور کوئی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔ ۲۳ چچ نامہ میں جو حوالہ جات ملتے ہیں اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ شاید جاٹ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم نے "لوہانہ قبیلہ کے جاٹوں کے متعلق معلومات کی فرمائش کی تھی" جس

کے جواب میں اُسے بتایا گیا" اِن کے درمیانی بڑے چھوٹے کی کوئی تمیز نہیں۔ وہ سب کے سب ظالم و وحشی ہیں۔ یہ لوگ ہر ایک حکمراں سے ہمیشہ باغی رہے ہیں۔ اور شاہراہوں پر راہزنی کرتے ہیں"۔ ۲۴ چنانچہ مسلمان جنرل نے اِن لوگوں کے ساتھ ویسا ہی سخت رویہ اختیار کیا جیسا رائے چچ کا تھا۔ اور ایک صدی بعد امیر عمران کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس نے اِس قوم کے تمام لوگوں کے ہاتھوں کو داغ کر یہ حکم دیا تھا" اِن میں سے جو بھی اُس سے ملاقات کے لئے آئے وہ کُتے کے ساتھ آئے"۔ ۲۵ اپنی رعیت کو ریشمی لباس گھوڑے کے زین اور ایسی ہی چیزوں کے استعمال کی ممانعت کرنے کی رسم راجپوت حکمرانوں میں تو موجودہ زمانہ تک باقی تھی۔ ۲۶

کہا جاتا ہے کہ محمد بن قاسم کو یہ بات بھی بتائی گئی کہ رائے چچ نے سما اور لاکھا قبائل پر بھی وہی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جو لوہانہ جاٹوں پر عائد تھیں لیکن عرب سردار نے سما اور سہتہ قبائل کے ساتھ نرمی اور رعایت کا برتاؤ کیا۔ ۲۷ یہ امر قابل ذکر ہے کہ سہتہ قبیلہ کتب تاریخ کے مطابق جس علائقہ میں رہتا تھا اُس کا نام آج بھی قبیلہ کے نام پر ہی مشہور ہے۔ یہ بھی کتابون میں ملتا ہے کہ جاٹ کافی دور قندابیل تک آباد تھے ۲۸۔ اور اب بارہ سو سال بعد بھی کچھی علائقہ کی آبادی کے زراعت پیشہ لوگوں میں جاٹ اور سمّاٹ اقوام کی اکثریت ہے۔

آپ کو یاد ہوگا کہ موریہ خاندان کے دورِ حکومت سے لیکر محمد بن قاسم کے دور تک شمال اور مغرب کی سمت سے وقتاً فوقتاً مختلف قبائل ہندوستان میں گھستے رہے تھے اِن میں ساکا، یوہ چی اور ہُن خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اِن وحشی اقوام نے یہاں کی آبادی کی شکل کافی بدل ڈال ہوگی، اِس ملے جلے اِنسانی گروہ سے جو حملہ آور قبائل اور مقامی باشندوں کے مخلوطہ ہونے سے ظہور میں آیا، جاٹ اور راجپوتوں کے بہت سے خاندان تعلق رکھتے ہیں، اور موجودہ سندھ کے باشندوں کی اکثریت بھی اِسی مخلوط خون سے تعلق رکھتی ہے۔

مسلمانوں کی فتح کے ساتھ ہی سندھ میں عرب آباد ہونے شروع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ تعداد میں انتہائی قلیل تھے لیکن سندھ کی تاریخ اور باشندوں کے مذہب پر گہرے اثرات اِن

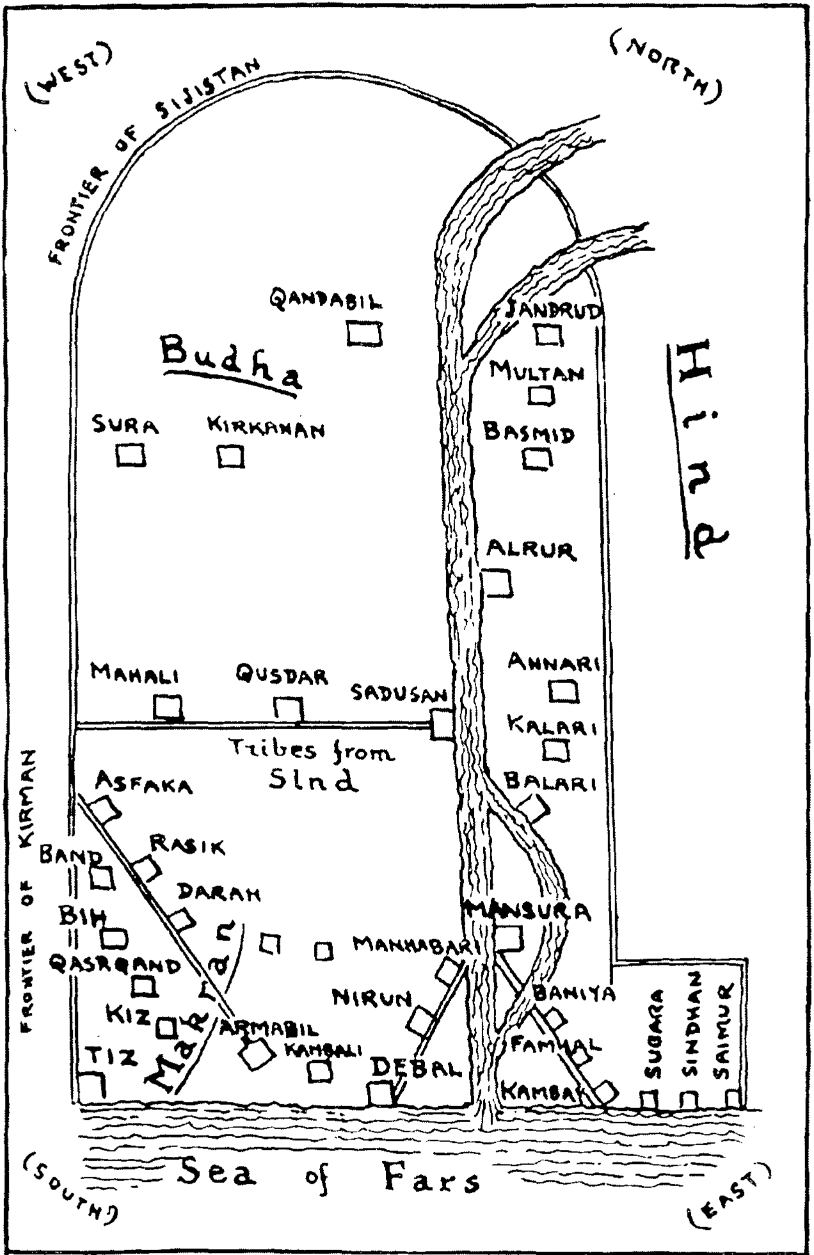

SIND, WITH PARTS OF ADJOINING COUNTRIES, ACCORDING TO THE ASHKALU-L-BILAD (c. 1100 A.D.)

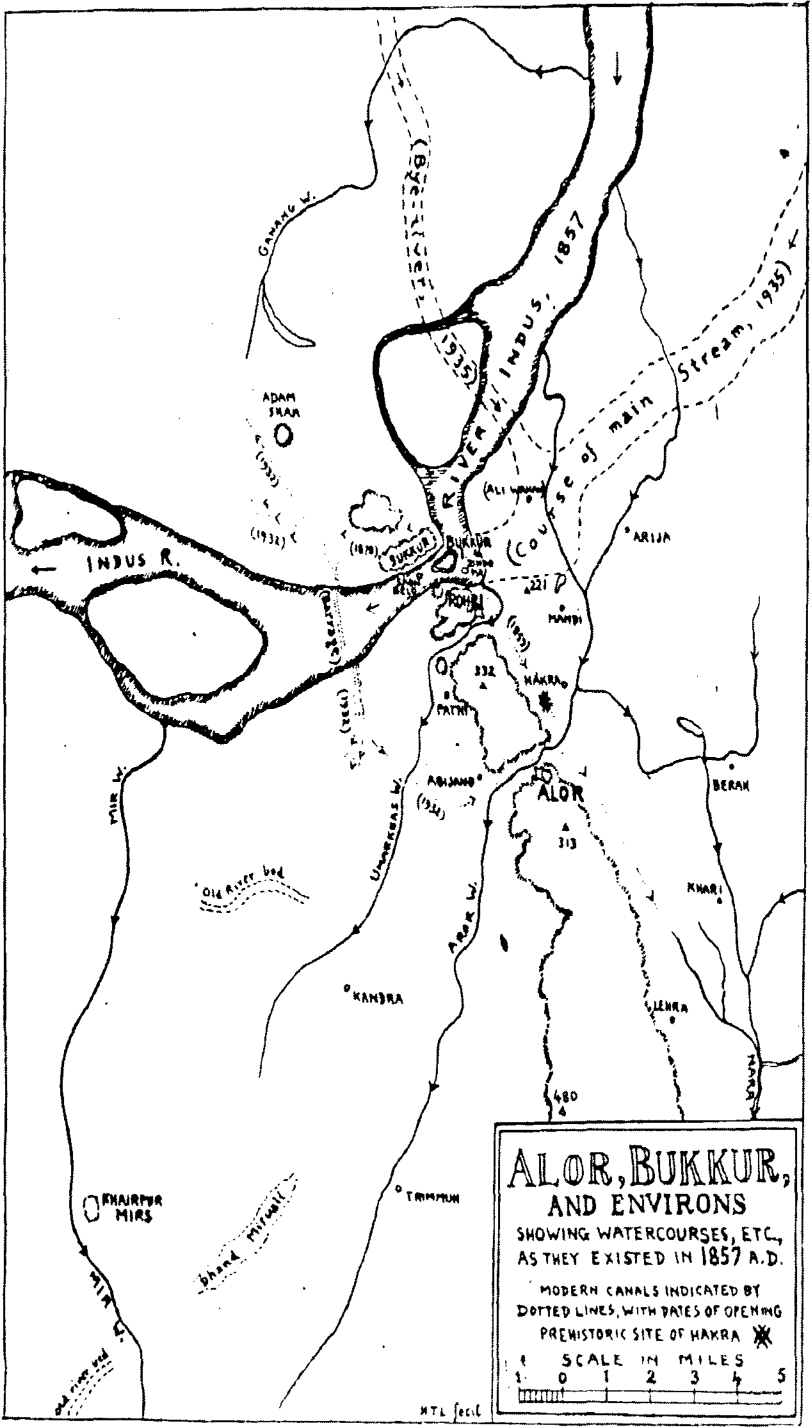

ALOR, BUKKUR, AND ENVIRONS

SHOWING WATERCOURSES, ETC., AS THEY EXISTED IN 1857 A.D.

MODERN CANALS INDICATED BY DOTTED LINES, WITH DATES OF OPENING

PREHISTORIC SITE OF HAKRA ✻

SCALE IN MILES

1 0 1 2 3 4 5

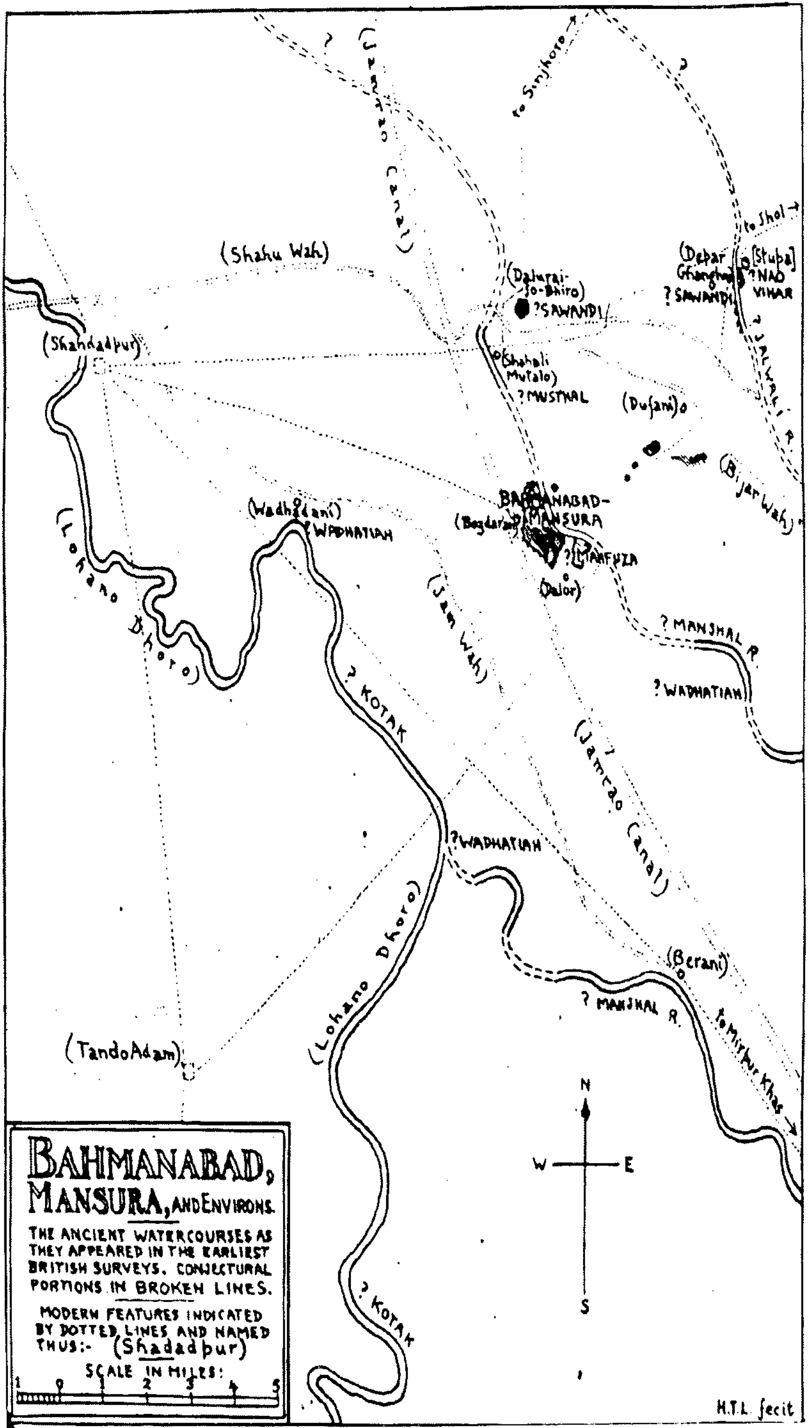
BAHMANABAD, MANSURA, AND ENVIRONS.
THE ANCIENT WATERCOURSES AS THEY APPEARED IN THE EARLIEST BRITISH SURVEYS. CONJECTURAL PORTIONS IN BROKEN LINES.
MODERN FEATURES INDICATED BY DOTTED LINES AND NAMED THUS:- (Shadadpur)
SCALE IN MILES:
1 0 1 2 3 4 5
H.T.L. fecit
N
W
E
S
(Jamrao Canal)
to Sanjhoro
(Shahu Wah)
(Shahdadpur)
(Dalurai-Jo-Bhiro)
?SAWANDI
(Shahali Mutalo)
?MUSTHAL
(Debar Ghangharo)
[Stupa]
?NAO VIHAR
?SAWANDI
to Shol
?JALWALI R.
(Dufani)
(Bijar Wah)
BAHMANABAD-MANSURA
(Bogdarai)
?MAHFUZA
(Dalor)
(Wadhadani)
?WADHATIAH
(Lohano Dhoro)
(Jam Wah)
?MANJHAL R.
?WADHATIAH
?KOTAK
(Jamrao Canal)
?WADHATIAH
(Berani)
?MANJHAL R.
to Mirpur Khas
(Tando Adam)
(Lohano Dhoro)
?KOTAK

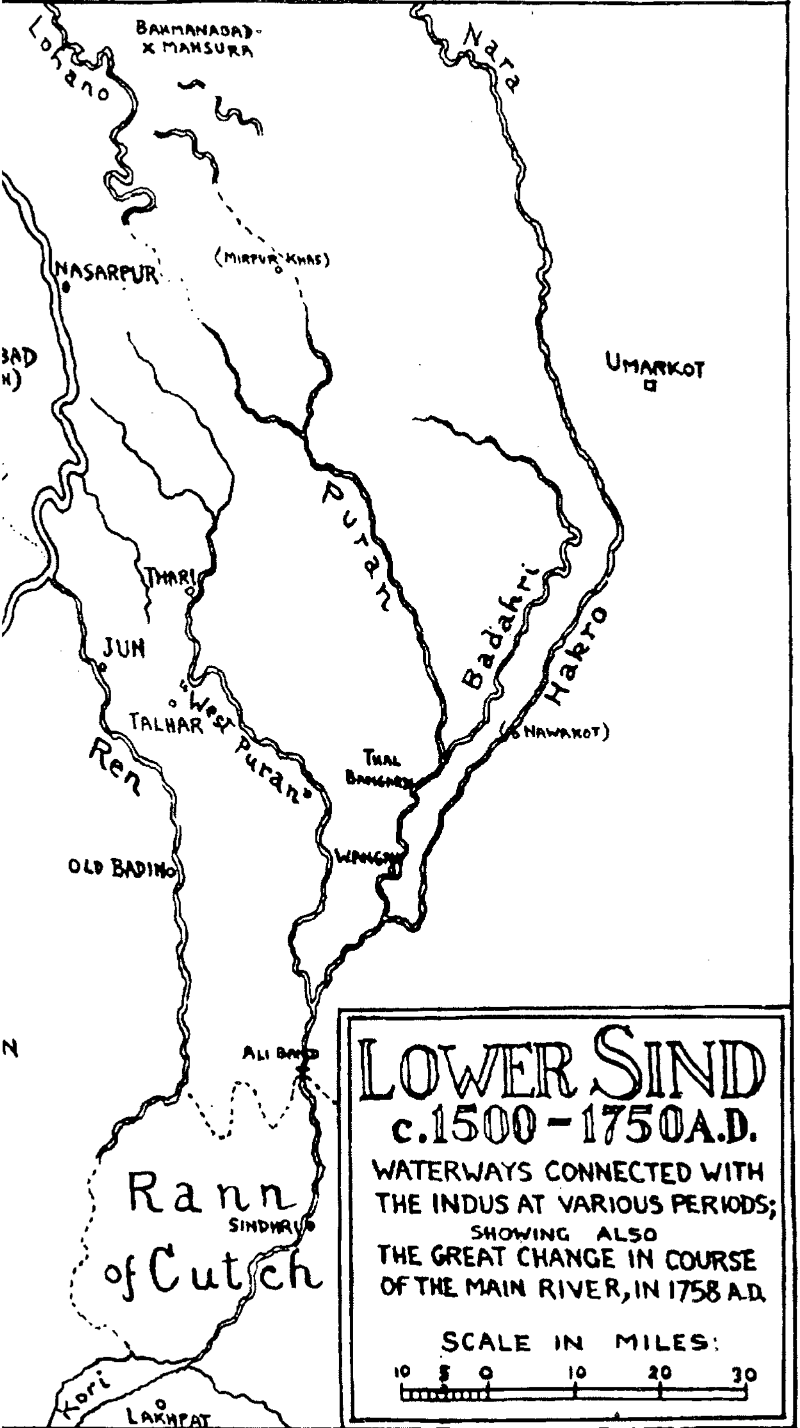
LOWER SIND
c.1500 – 1750 A.D.
WATERWAYS CONNECTED WITH THE INDUS AT VARIOUS PERIODS;
SHOWING ALSO
THE GREAT CHANGE IN COURSE OF THE MAIN RIVER, IN 1758 A.D.
SCALE IN MILES:
10 5 0 10 20 30
BAHMANABAD
MANSURA
Lohano
Nara
NASARPUR
(MIRPUR KHAS)
UMARKOT
Puran
Badahri
Hakro
THARI
JUN
TALHAR
"West Puran"
Ren
THAL
(NAWAKOT)
OLD BADIN
ALI BAND
SINDHRI
Rann of Cutch
Kori
LAKHPAT

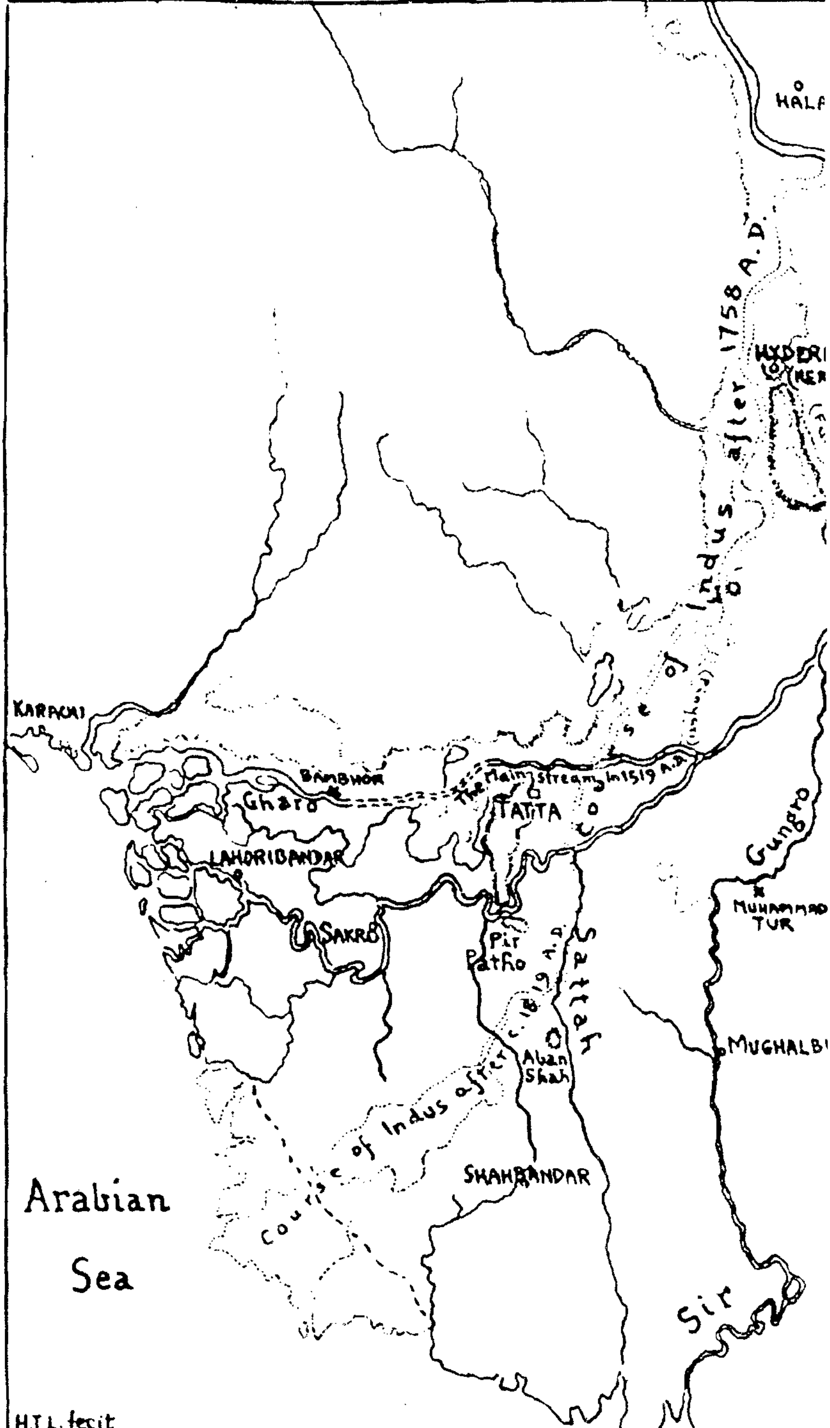
KARACHI
BAMBHOR
Gharo
The main stream in 1519 A.D.
TATTA
LAHORIBANDAR
SAKRO
Pir Patho
course of Indus after 1758 A.D.
course of Indus after c. 1819 A.D.
Gungro
MUHAMMAD TUR
Sattah
Aban Shah
SHAHBANDAR
Sir
Arabian Sea
H.T.L. fecit

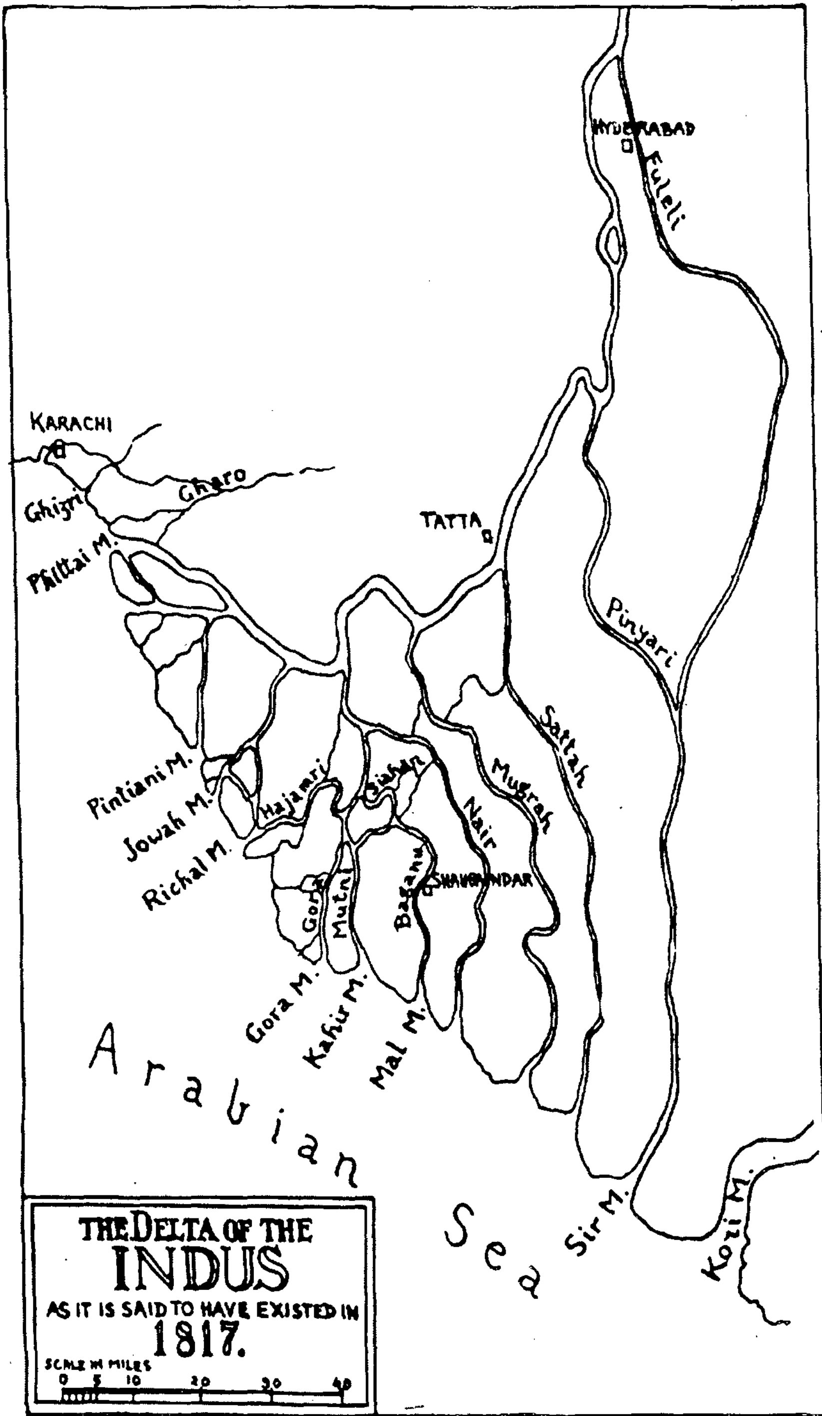

THE DELTA OF THE INDUS AS IT IS SAID TO HAVE EXISTED IN 1817.

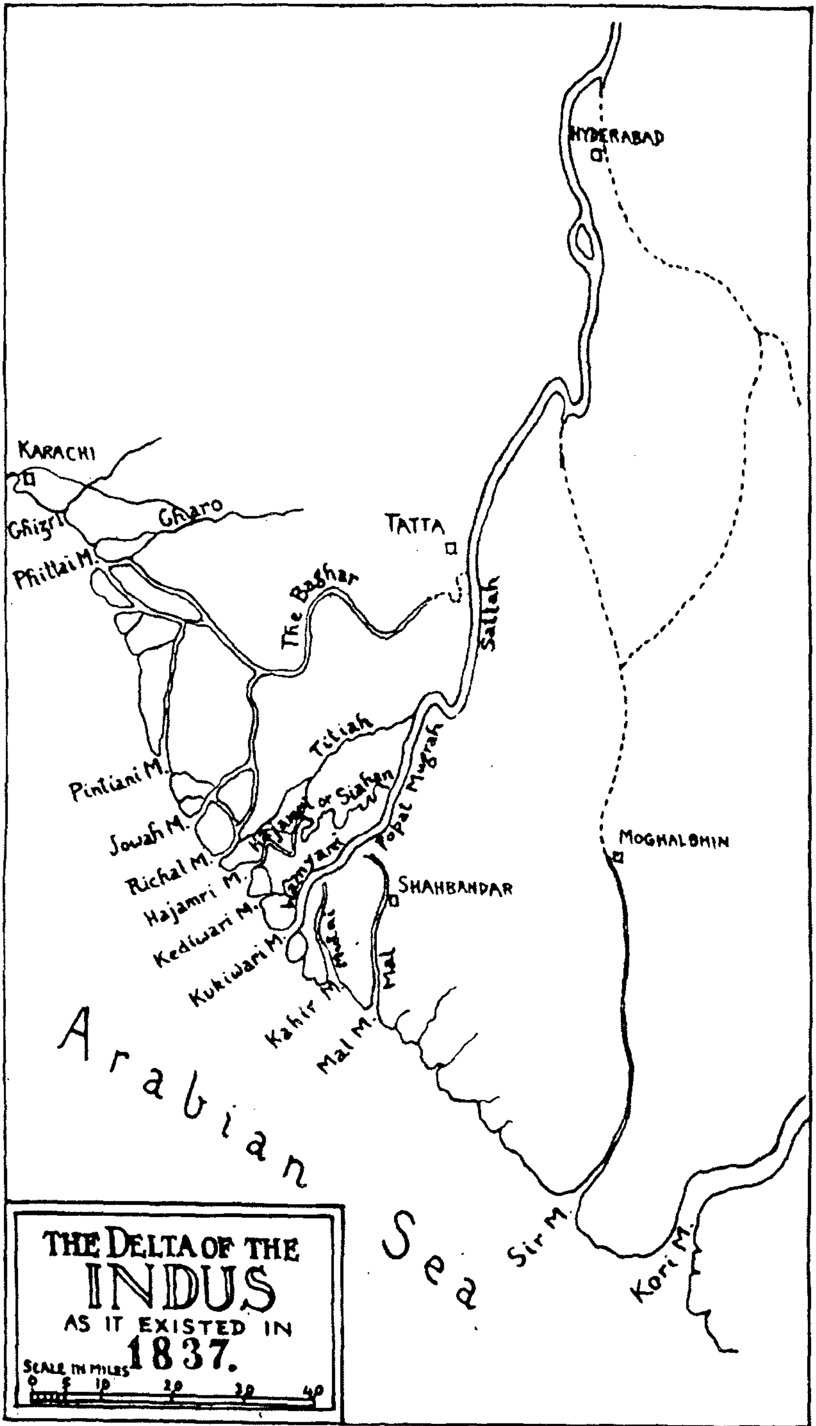
HYDERABAD
KARACHI
Gharo
Ghizri
Phitti M.
TATTA
The Baghar
Sattah
Tiliah
Pintiani M.
Jowah M.
Richal M.
Hajamri M.
Kediwari M.
Kukiwari M.
Kahir M.
Mal M.
Mal
Popat Mugrah
SHAHBANDAR
MOGHALBHIN
Arabian Sea
Sir M.
Kori M.
THE DELTA OF THE INDUS AS IT EXISTED IN 1837.
SCALE IN MILES
0 5 10 20 30 40

لوگوں نے پیدا کیئے۔ رسول اسلامؐ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے سیّدوں کی اولاد کی مختلف خاندان ایران، افغانستان اور وسطِ ایشیا میں آباد ہو گئے تھے۔ جہاں سے اُنہوں نے سندھ کی طرف ہجرت کی۔ یہ عمل تقریباً ایک ہزار سال تک جاری رہا۔ یہ اُنھیں کا طفیل ہے کہ ہندوؤں کی اکثریت نے اسلام مذہب قبول کرلیا۔ قبول اسلام کی تحریک کا زور خاص طور پر چودھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی میں نظر آتا ہے۔ ۲۹

سندھ کے دوسرے خاندان جو اپنا سلسلہ عربوں سے ملاتے ہیں اور عرب کے قریش خاندان سے خون کا رشتہ جوڑتے ہیں اُن کا دعویٰ بالکل ایسا ہی ہے جیسا برطانیہ میں رہنے والا کوئی شخص نارمن فاتحین کے اصحاب میں سے کسی کی اولاد ہونے کا دعویدار ہو۔ یا ایسے ہی کسی معزز نسل سے اپنا تعلق ثابت کرنے کے لئے ایسے شجرۂ نسب کو پیش کرے جو بعد کے زمانہ میں جوڑ توڑ کر بنائے گئے ہوں، بہرصورت سندھ کے خاندانوں میں ایسے خاندان تلاش کرنا جو نسبی اعتبار سے عرب خون سے بوگس تعلق رکھتے ہوں۔ اگر غلط اقدام نہیں تو ناممکن ضرور ہے۔

سندھ کی موجود آبادی میں ایک اہم عنصر بلوچوں کا ہے جو اپنی اصل کے اعتبار سے عرب ہونے کے دعویدار ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام سے قبل یہ قوم اپنی موجودگی اور اہمیت کا لوہا منوا رہی تھی ۳۰، یہ لوگ گلّہ بانی کرتے تھے اور نیم خانہ بدوشی کی زندگی گذارتے تھے۔ یہ لوگ بالطبع تشدّد پسند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ ابتداء میں شام کے ملک میں تھے جہاں سے اِنھوں نے آہستہ آہستہ مشرق کی سمت بڑھنا شروع کیا اور ہجرت کا یہ عمل کبھی کبھی خاصہ تیز رفتاری سے جاری ہو گیا۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ جس ملک میں یہ لوگ آباد ہوئے وہاں کے حکمرانوں نے اِن کے طور طریقوں سے تنگ ہو کر اِن کے خلاف تعزیری اقدامات کیئے اور اِنھیں ملک کو خیرباد کہنا پڑا، یہ لوگ کافی طویل عرصہ تک سیستان کے علاقہ میں آباد رہے۔ یہاں سے اُن کا آخری عمل ہجرت وادیٔ سندھ کی طرف تھا۔ اِس کی وجہ وہ اقتصادی و معاشی مشکلات تھیں جن کا دباؤ اِن لوگوں پر اور اِن کے مویشیوں پر

روز بہ روز بڑھ رہا تھا۔
اِن کے بہت سے قبائل کچھی میں آباد ہو گئے۔ اور وہاں سے آہستہ آہستہ شمال کی سمت پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ ڈیرہ جات اور جنوب میں سیہون اور اُس سے بھی آگے تک پھیل گئے۔ جنگ جو قبائل کی حیثیت سے جلد ہی اُنھیں شہرت حاصل ہو گئی۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ سبی کے سندھی گورنر نے اِن لوگوں کو شاہ بیگ ارغون سے لڑنے کے لئے اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ اِس کے بعد جب چند سال کے اندر اِس شہزادے نے بالائی سندھ کے ایک حصہ پر قبضہ کرلیا تو اس نے بلوچوں کو اپنے لئے ایک مستقل دردِ سمجھا اور اِن سے پیچھا چھڑانے کے لئے اور اِن کے وجود سے ملک کو پاک کرنے کے لئے پے در پے اِن کا قتلِ عام کرایا۔ یہ واقعات ۱۵۲۱ء کے زمانہ میں ہوئے، ۱۵۲۳ء میں شاہ بیگ کے فرزند مرزا شاہ حسن نے سبی میں آباد رِند اور دوسرے بلوچی قبائل کے خلاف فوجی کاروائیاں کیں، جن میں وہ کامیاب رہا۔ ۳۱؎ ریورٹی کے بیان کے مطابق درگاہ جاٹ جو ملتان پر حکمرانی کرتے تھے۔ سولھویں صدی عیسوی کے اوّل ربع میں بلوچوں کے بہت مددگار ثابت ہوئے۔ اِنہوں نے بلوچوں کو جاگیریں اور انعامات دیگر ڈیرہ جات کے آس پاس آباد ہونے کی ترغیب دی جس کے عوض اِن لوگوں کو فوجی خدمات انجام دینی تھیں۔ ۳۲؎ سندھ میں ان لوگوں کے ناجائز قبضہ کا عمل دھیرے دھیرے جاری رہا۔ اِنھوں نے اپنا آبائی پیشہ گلہ بانی برقرار رکھا اور ملک میں چراگاہوں کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ ایک قبیلہ جہاں آباد ہوا وہ علاقہ اُس کے نام سے مشہور ہو گیا۔ جیسے چانڈکا بُرو دیکا۔ کلہوڑا پہلا حکمران خاندان تھا جس نے بلوچوں کی سندھ میں آبادکاری کی حوصلہ افزائی کی صرف اِس وجہ سے کہ وہ اِن کی سپاہیانہ صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ اُنھوں نے تالپور اور مری قبائل کو اپنی مذہبی پیشوائی کی بدولت مجبور کیا کہ وہ آئیں اور فوجی خدمات انجام دیں۔ بہر صورت بلوچی اپنی قبائل تنظیم، تشدد پسندی اور ایسی ہی خصلتوں کی بدولت سندھ کی آبادی میں ہمیشہ ایک پریشان کُن عنصر کی حیثیت سے شامل رہے اور یہ حالت اُس وقت بھی قائم رہی جب خود اِن کے

خاندانوں کی سندھ میں حکومت تھی۔

جب سندھ پر تالپور حکمراں قابض ہوئے تو بلوچیوں کا کثیر تعداد میں سندھ کے علاقہ میں داخل ہونا قدرتی بات تھی۔ خاص طور پر پنجاب کی طرف سے یہ لوگ آئے اور اِن کے سردار تھوڑے عرصہ میں ہی فوجی معززین میں شمار کیئے جانے لگے۔ بلوچی جاگیرداروں کی حیثیت کو انگریزوں نے برقرار رکھا۔ حالانکہ اُس میں کچھ تبدیلیاں ضرور کی گئیں۔ اور سندھ کے اضلاع میں آج بھی زراعت پیشہ آبادی سماجی اعتبار سے بلوچی زمینداروں کے زیر اثر ہے۔

اُس وقت جب بلوچی سندھ میں اپنے قدم جمارہے تھے سیاسی انقلاب نے کچھ اور اقوام کو سندھ کا رُخ کرنے پر مجبور کر دیا گو یہ لوگ تعداد میں قلیل تھے۔ چنانچہ بہت سے مغل اور ٹھٹہ کے شاہی صوبیداروں کی فوج میں شامل تھے، سندھ میں وارد ہوئے۔ اِن میں گڑھی یاسین اور شکار پور کے پٹھان خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو افغانستان میں دُرّانی خاندان کی حکومت کے دور میں یہاں آباد ہوئے۔

اِسی طرح بہت سے قبائل اور قومیتیں ایسی بھی ہیں جو پڑوسی ممالک سے شمال اور مشرق کے راستوں سے سندھ میں داخل ہوئیں۔ اِس ہجرت کی بہت سی وجوہات تھیں اور یہ زمانہ حال کی ہی بات ہے، مثلاً آپس کی قبائل یا مذہبی لڑائی جھگڑے۔ آبائی زمینوں کا خراب ہو جانا یا ظالم حکمرانوں سے نجات۔ سب سے زیادہ تعداد پنجاب سے آئے ہوئے جاٹوں کی ہے، مثلاً سیال، جویو، کھوہاوڑ جن کے لئے عام طور پر "سرائی" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے اِن میں سے اکثر کلہوڑا خاندان کے عروج کے وقت داخل ہوئے، یہ لوگ کلہوڑا کے معتقدین یا معاونین تھے۔ مغل بادشاہوں نے اِن کے ساتھ رعایت برتی اور اِنھیں بکھر کی نوابی دیدی گئی۔

"سرائی" جس کا مطلب شروع میں صرف "شمال سے آیا ہوا آدمی" تھا۔ رفتہ رفتہ کلہوڑا حکمرانوں کے ساتھ تعلق کی بنا پر ایک باعزت خطاب کے معنوں میں استعمال ہونے

لگا۔ اِن قبائل کی اکثریت آپس میں گفتگو کرتے ہوئے لاہندا یا مغربی پنجاب کی زبان استعمال کرتی ہے۔ جسے سندھ میں سرائیکی زبان کہتے ہیں۔ اونٹ پالنے اور اونٹ چُرانے والے جانوں کی بھی یہی زبان ہے۔ اِسی طرح بہت سے بلوچی قبائل یا خاندان جو طویل عرصہ تک پنجاب میں آباد رہے یہی زبان استعمال کرتے ہیں۔

سندھ کے باشندوں کی اکثریت راجپوت سمّا اور جاٹ قوموں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ ابتداء میں اِن دونوں قوموں کے درمیان شاید کچھ امتیاز رہا ہو۔ لیکن اب عام طور پر نہیں ہے ہاں کچھ مثالیں اِس سے مستثنیٰ ہیں۔ کئی قبائل جو مشہور راجپوت نام استعمال کرتے ہیں پنجاب میں جاٹ کہلاتے ہیں اور سندھ میں سمّاٹ کے نام سے مشہور ہیں، جنوبی مغربی پنجاب میں جاٹ کا لفظ متعدد قسم کے متعرف قبائل کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت پیشے کے اعتبار سے ہے جو یہ ظاہر کرتی ہے کہ وہ کھیتی باڑی، زمینداری یا مخصوص معاشرتی رہن سہن رکھتے ہیں، اور حسب نسب سے اِس کا اتنا تعلق نہیں ہے۔ یہ اصطلاح اُن لوگوں کے لئے استعمال نہیں ہوتی ہے جو زمانہ حال ہی دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہیں۔ پھر بھی بہت سے بلوچی جن کے بلوچی ہونے میں کوئی شبہ نہیں اپنے جتھوں سے الگ ہو کر پنجاب میں آباد ہیں وہ جاٹ کہلاتے ہیں۔ گذشتہ چند صدیوں میں پنجاب کے علاقہ میں لفظ جاٹ نے ایک باعزت مقام حاصل کر لیا ہے، اور ایک جاٹ قبیلہ عام طور پر باعزت اور محنتی افراد کا قبیلہ شمار کیا جاتا ہے۔ یہ نام درحقیقت راجپوت سے زیادہ عزت رکھتا ہے، ایک مسلمان اکثریتی علاقہ میں لفظ راجپوت کو وہ وقار حاصل نہیں۔ کیونکہ یہ نام خلاف اسلام روایات سے متعلق سمجھا جاتا ہے۔ اِسی طرح وسطی پنجاب میں جو بلوچ قبائل کے علاقہ سے کافی فاصلہ پر ہے۔ بلوچی سے مُراد ایک پیشہ ور اونٹ والا لی جاتی ہے۔ جبکہ سندھ میں اِس کے بالکل برعکس ملیگا، اِس طرح دریائے سندھ کے مشرق میں پنجاب کے تمام مغربی علاقہ میں جاٹ کا خطاب اپنے لئے حاصل کرنے کا ایک عام رجحان ہے بالکل اِسی طرح جس طرح سندھ میں بہت سے جاٹ سمّاٹ قبیلے یہ چاہتے ہیں کہ اُنھیں بلوچی

شمار کیا جائے۔

سندھ میں داخل ہونے والے بلوچوں نے تمام مقامی باشندوں کو جاٹ کے نام سے پکارنا شروع کیا۔ جب یہ لوگ کلہوڑا اور تالپور حکومتوں کے زمانہ میں کثیر تعداد میں داخل ہوئے تو یقیناً اِن کے ساتھ بڑی تعداد میں اونٹ ساربان اور خدمت کرنے والے ہوں گے اور بہت سے ایسے غلام بھی ہوں گے جو قبائلی جنگوں میں پکڑے گئے۔ یہ بھی اجتماعی طور پر ازراہِ تحقیر جاٹ ہی کہلاتے تھے۔

جب بلوچوں کو سندھ میں فوجی سرداری کا امتیاز حاصل ہوا تو جاٹ کا لفظ عملاً مخصوص پیشہ کی مناسبت سے استعمال ہونے لگا۔ یعنی ساربان اور قومیت سے اِس کا کوئی تعلق نہ رہا۔ مسٹر کورنٹن نے اشارہ کیا ہے کہ پنجاب میں ایک مخصوص ذات کے لئے لفظ جاٹ یا جٹ استعمال کیا جاتا ہے۔ جبکہ لاہندا زبان میں بھی اور سندھ میں بھی ساربان کے لئے جت کا لفظ استعمال کرتے تھے اور یہ لفظ شاید اُس ذات کے لئے استعمال ہوتا ہے جو پنجاب سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن اِس اصطلاح سے کمتر سماجی مقام مُراد لیا جاتا ہے۔ سندھ میں لفظ جاٹ کو ایسے حقارت آمیز موقعہ پر استعمال کرنے کی وجہ کیا ہے؟ اِس کا شاید یہ جواب ہوسکتا ہے کہ بلوچی زبان میں چونکہ ایسا کوئی لفظ نہیں تھا جو 'ٹ' سے مماثلت رکھتا ہو لہٰذا وہ عادتاً جاٹ کو 'ت' کے ساتھ بولتے تھے، اور جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا لفظ جت کے معنی ساربان کے ہیں۔ خاص طور پر جبکہ مقامی کسان طبقہ کی طرف اشارہ ہو۔

راجپوت کی اصطلاح پہلے پہل ایک پُروقار سماجی حیثیت والے آدمی اور شرفا کے لئے استعمال ہوتی تھی جیسا کہ خود لفظ راج اور پوت سے ظاہر ہے اور کسی مخصوص ذات سے متعلق نہیں تھی۔ بہت سے راجپوت قبائل جاٹ نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چچ نامہ میں راجہ ڈاہر کے فوجی سرداروں کو ٹھاکر کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ لوگ راجپوت کی اصل اصطلاح کے مطابق شرفا تھے۔ اُن کے قبائل کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ سندھ میں آجکل جو راجپوت سوڈھا قبائل آباد ہیں

اُنھیں ٹھاکر کے نام سے پکارا جاتا ہے، گویا یہی اُن کے قبیلہ کا نام ہے۔زیریں سندھ کے علاقہ میں یہ لوگ تیرھویں صدی عیسوی سے پندرھویں صدی عیسوی تک بااثر شمار ہوتے تھے۔سومرا اور سمہ حکمرانوں کی فوجوں میں اِن کی اکثریت تھی۔اِن لوگوں نے اکثر جاڑیجہ قبائل کے ساتھ فوجی مہمات میں حصہ لیا۔جاڑیجہ کو اکثر اوقات راجپوت کہا جاتا ہے اور یہ مطابق واقعہ بھی ہے کیونکہ اِنھیں لوگوں کے خاندان نے کچھ پر حکومت کی لیکن یہ لوگ خود کو سندھ کے سمہ قبیلہ کی ایک شاخ کہتے ہیں۔جاڑیجہ نسل کے لوگ سندھ کے کچھ اضلاع میں مسلمان اور کچھ اضلاع میں مذہبی اعتبار سے ہندو ہیں۔سماٹ قبائل میں سے اکثر کے ساتھ یہی صورت ہے، لیکن سوڈھا سختی کے ساتھ ہندو مذہب پر قائم رہے ہیں۔ٹاڈ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ سومرا خاندان جنھوں نے آگے چل کر اسلام مذہب قبول کر لیا تھا۔سوڈھا نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔کھوکھر راجپوت جو راجپوتوں کے راٹھوڑ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔سندھ میں زیادہ تر مسلمان ہیں، اور اِنھیں "سرائی" شمار کیا جاتا ہے کیونکہ یہ لوگ ماضی قریب میں ہی پنجاب سے سندھ میں وارد ہوئے تھے۔۳۴

یہ ایک پیچیدہ سوال ہے کہ سندھ کے ہندو بنئے جن کی اکثریت لوہانہ ہے آیا چچ نامہ کے لوہانہ جاٹوں ہی کی باقیات ہیں؟ کہا جاتا ہے کہ چند صدیوں کے عرصہ میں تھر ریگستان کے مغرب میں سندھ کے علاقہ میں آباد ہندو اور بدھ مذہب کے لوگ سب کے سب مسلمان ہو گئے تھے جو باقی بچے وہ نقل مکانی کر کے چلے گئے تھے۔یہ حقیقت ہے کہ ہندو لوہانہ کچھ اور کاٹھیاواڑ میں موجود ہیں، اور سندھ میں بھی ہیں لیکن پنجاب میں نہیں ہیں اور پنجاب بھی بہت عرصہ پہلے دائرہ اسلام میں داخل ہو گیا تھا۔

موجودہ زمانہ کے لوہانہ ایک روایت بیان کرتے ہیں کہ وہ پنجاب سے سندھ میں داخل ہوئے اس وقت عرب فتوحات کو طویل مدت گذر چکی تھی۔لیکن اِس سے قطع نظر کہ محمد بن قاسم نے لوہانہ جاٹوں پر کڑی پابندیاں عائد کر دی تھیں جو رائے چچ کے زمانہ کی پابندیوں جیسی ہی تھیں۔عربوں کا سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ جو سلوک تھا وہ مجموعی طور پر نرم تھا۔

خاص طور پر مذہبی بنیاد پر سزائیں نہیں دی گئیں۔ یہ قول کہ محمود غزنوی کے دور کے بعد لوہانہ کو سندھ میں ایک الگ قومیت یا قبیلہ کی حیثیت نہیں دی گئی بے معنی ہے۔ ہمارے پاس کم از کم ایک شہادت موجود ہے کہ قبیلہ کا ایک سانز جو دھاج کا بیٹا تھا وہ" کوریجہ سمہ لوہانہ "قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور یہ شخص اُن سات جاگیرداروں میں ایک تھا جو ملک ناصرالدین قباچہ، گورنر سندھ کے زمانہ میں یعنی تیرھویں صد عیسوی کے اوائل میں اِس مُلک پر حکومت کرتے تھے۔ ۳۴

سندھ کے سہتہ جن میں کچھ مسلمان اور کچھ ہندو ہیں چچ نامہ کے سہتہ قبیلہ کی نسل سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ اور جیسا کہ کورنٹن نے لکھا ہے کہ مسلم سماٹ قبائل اور لوہانہ قبائل کے لوگوں میں آجکل جو ذہنی اور جسمانی امتیاز پایا جاتا ہے وہ اِسے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ سینکڑوں سال سے لوہانہ شہری زندگی بسر کر رہے ہیں اور تجارت اِن کا پیشہ ہے جبکہ سمہ لوگ کاشتکار اور دیہاتی ہیں۔ علاوہ ازیں لوہانہ قوم کو صدیوں تک مسلمانوں نے کمتر خیال کیا۔ یہی وجہ اُن کی ابتدائی نسلی خصوصیات کو تبدیل کر دینے کے لئے کافی ہے۔

اگر لوہانہ قوم سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اسلام کے ابتدائی دور میں سندھ کو خیر باد کہا اور پھر دوبارہ واپس آئے تو یہ واپسی اتنے طویل عرصہ کے بعد نہیں ہوئی کہ اُن کے طور طریقوں یا زبان پر اثر انداز ہوتی۔ اور اُن کی جلاوطنی کا مقام یقیناً پنجاب نہیں تھا۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کچھ لوگ بلاشبہ وہاں آباد ہو گئے ہوتے لیکن لوہانہ قوم پنجاب میں نہیں ملتی۔ وہ قوم جو پنجاب میں آباد ہے اور لوہانہ سے ملتی جلتی ہے اروڑا ہے۔ تقریباً یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُن کا یہ نام اروڑ (الور) سے نکلا ہے جو سندھ میں واقع ہے یہ لوگ شاید خلافت کے زمانہ میں جب اُن کا شہر ویران ہونے لگا اور زوال پذیر ہو گیا تو شمال کی سمت نقل مکانی کر گئے۔

بہت سے اروڑا قبائل کے لوگ اوڈیرو لال کی پوجا کرتے ہیں جو سندھ کے تمدن سے تعلق رکھنے والا ایک دیوتا ہے اور یہ لوہانہ عقیدے کے مطابق ہے۔ دونوں قومیں اپنے

"نوکھ" کے ناموں میں کافی حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔ اِس مقصد کے لئے اروڑا قوم کے لوگ پنجابی "ڈا" کے بجائے سندھ کا نسلی نشان "جا" اختیار کرتے ہیں۔ اِس گفتگو سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دونوں قومیں شروع میں سندھ سے ہی تعلق رکھتی تھیں، لیکن اروڑا منتقل ہوکر پنجاب چلے گئے اور وہاں اُنھوں نے امتیاز کی خاطر اپنا موجودہ نام اختیار کرلیا۔ اور جبکہ سندھ کے موجودہ لوہانہ صدیوں سے اِسی نام کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے کسی موقع پر بھی سندھ سے ہجرت نہیں کی، جو لوہانہ کچھ اور کاٹھیاواڑ میں آباد ہیں وہ عربوں کی آمد سے پہلے ہی وہاں آباد ہو چکے تھے۔

خاص دریائے سندھ کے میدانی علائقوں کی آبادی جو صوبہ سندھ میں ہے، ذرائع آبپاشی لی ترقی کے ساتھ تیزی سے تبدیل ہورہی ہے۔ دوسو سال پہلے اِس کے بنیادی عناصر اور آبادی کی تقسیم بالکل سیدھی سادی تھی۔ اب پیچیدہ ہے۔ خانہ بدوشی ختم ہورہی ہے۔

لیکن مستقل سکونت والے لوگ نسلی اعتبار اور مدّتِ سکونت کے اعتبار سے اتنی قسموں پر مشتمل ہیں کہ سماجی تاریخ پر کام کرنے والے محققین کی بھاری جمعیت ہی ان طبقات کو الگ الگ، شمار کرنے اور اندازے لگانے کا کام انجام دے سکتی ہے۔

جہاں تک آبادی کی نوعیت کا تعلق ہے کچھو کا علائقہ، کوہستان اور ریگستان اور کسی حدتک ڈیلٹا کے علائقہ میں بھی نسبتاً یہ نوعیت پائیدار نظر آئیگی کیونکہ یہ علائقے آنیوالوں کے لئے دلچسپی کا کوئی سامان نہیں رکھتے اور جو پُرانے باشندے ہیں وہ کسی بھی نووارد کے لئے اچھے پڑوسی ثابت نہیں ہوں گے۔ چنانچہ موجود شمالی مغربی سرحد سے جنوب میں سہون تک پہاڑیاں اور کچھو کے علائقے بلوچ قبائل سے آباد ہیں وہ قبائل جو عرصہ دراز سے اِن کے ساتھ رہتے چلے آئے ہیں۔ اِس میں وہ قبائل بھی شامل ہیں جن کا تعلق قدیم ترین مقامی باشندوں سے ہے مثلاً چھٹا اور گائینچہ۔

سیہون، کوٹڑی اور کراچی کے درمیان پہاڑیوں کے بہت بڑے ٹکڑے میں جو لوگ

آباد ہیں وہ نومڑیا اور برفت قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں، یہ راجپوت ہیں اور اِن کے جنوب میں جو پہاڑیوں کے دامن میں ملیر اور ٹھٹہ کی سمت آباد ہیں وہ جوکھیہ قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ بھی راجپوت ہیں، ایک وقت یہ دونوں قبائل لسبیلہ سے زیادہ روابط رکھتے تھے اور سندھ سے اِن کا تعلق برائے نام تھا، سترویں صدی عیسوی میں تھوڑی سی مدت کے لئے نومڑیا قبیلہ کے ایک خاندان نے اِس ملک پر حکومت بھی کی ہے۔ تراشے ہوئے پتھر کے مقبروں کا جو اسٹائل جھرک سے لے کر شمال میں حب ندی کے دائیں کنارے پرہنی دان تک ملتا ہے وہ اِن قبائل کے راجپوت نسل کی طرف اشارہ کرتا ہے اِس علاقہ میں یہ لوگ اکثریت رکھتے ہیں۔

کوہستان میں بلوچی بھی آباد ہیں، گبول مغرب میں، سہون کے جنوب سے لے کر کراچی تک اور کھوسہ مشرقی پٹی میں کوٹری کی طرف پہاڑی علاقہ کے جنوب میں میرپور ساکرو کے آس پاس کرمتی بلوچ نمایاں ہیں۔ اِن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ سولھویں صدی عیسوی کے اوائل میں یہ لوگ براہ راست مکران سے یہاں وارد ہوئے تھے، اِن کا نام مکران کی ایک ساحلی کھاڑی حکمت ہور سے لیا گیا ہے۔

نگر پارکر کے پاس ایک بار پھر ہمیں کھوسہ بلوچی ملتے ہیں جو تھر سے آگے آباد ہیں۔ یہ لوگ کچھ کے علاقہ پر حملے کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے برٹش گورنمنٹ کو جو اِس علاقہ کی محافظ تھی کو تالپور حکمراں کے ساتھ سفارتی خط و کتاب کرنی پڑی اور بالا آخر ۱۸۲۰ء کا صلح نامہ طے ہوا۔ یہ کھوسہ بھی اُن کی طرح جو جنوبی پہاڑیوں میں آباد ہیں یقیناً مکران سے ہی سندھ میں آئے اور اِن کی آمد ماضی قریب سے تعلق رکھتی ہے۔[۳۵]

تھر ریگستان کے جنوبی نصف میں جو لوگ آباد ہیں سندھ میں اُن کی اکثریت راجپوتوں کی سوڈھا ذات سے ہے جن کے متعلق پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے۔ اِن کے ساتھ سماٹ اور دوسرے راجپوت قبائل خلط ملط ہوگئے ہیں۔ یہ لوگ تھوڑہ عرصہ پہلے ہی مسلمان ہوئے تھے۔ اِن میں راجڑ، پلّی اور نہڑیا قابل ذکر ہیں۔ سندھ کے کوہلی اور بھیل جو دریا کے

مشرق میں ہیں حال ہی کے زمانہ میں وہاں آباد ہوئے ہیں۔

شمالی مشرقی سندھ کے ریگستان علائقہ میں نیز ملحقہ میدانی علائقہ میں مہر ممتاز قبیلہ ہے۔اور کہا جاسکتا ہے کہ بہت قدیم زمانہ سے یہاں آباد ہے۔ریگستان میں اب بھی بہت سے مہر راجپوت موجود ہیں جو ہندو مذہب رکھتے ہیں۔لیکن بڑی اکثریت باثر مسلمانوں کی ہے موجودہ سندھ کے شمالی مشرقی انتہائی گوشہ میں ڈاہر قبیلہ ہے جو شاید راجپوتانہ سے ماضی قریب میں ہی سندھ میں وارد ہوا، اِس قبیلہ نے مہر قبیلہ کے ساتھ مل کر سولھویں صدی عیسوی کی اوائل میں کافی اقتدار حاصل کرلیا تھا، اور علائقہ ان کا اِن کے نام سے ہی مشہور ہوگیا، قریب ہی قطعۂ زمین ہے جو ماچھکو کہلاتا ہے، اِس کا یہ نام ماچھی قبیلہ کی وجہ سے مشہور ہوا جو یہاں آباد ہے۔۳۶ یہ لوگ پورے سندھ میں کافی تعداد میں موجود ہیں، اور پنجاب اور گجرات کے علائقوں میں بھی آباد ہیں، اِن کی اصلیت کا پتہ نہیں، اِنھیں عام طور سے نیچی ذات کے لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جو لوگ سولنگی ماچھی کہلاتے ہیں اور راجپوت خون کے دعویدار ہیں اُن کا دعویٰ مشکوک ہے۔البتہ معقول وجوہات یہ یقین کرنے کے لئے موجود ہیں کہ یہ لوگ ، ماہی گیر تھے، لیکن اب ضروری نہیں کہ ماچھی قبیلہ سے تعلق رکھنے والا ہر فرد ماہی گیر ہی ہو، یہ لوگ لکڑی کاٹنے اور گھاس اور پتوں کی چٹائیاں بُننے کا کام کرتے ہیں اور دوسری ماہی گیر قدیم قبائل موہانہ سے بالکل مختلف ہیں۔

ماچھکو سے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر ہم ایسے علائقہ میں داخل ہوتے ہیں جہاں بلوچ اکثریت میں آباد ہیں۔اِن کا علائقہ دہ میدان ہے جو شمال میں ڈیرہ غازی خان سے آگے تک مغرب میں جیک آباد اور پہاڑیوں کے دامن میں کچھی کے مشرق اور مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔اِن کے بیچ بیچ میں جاٹ اور سمہ قبائل کے بچے کھچے لوگ آباد ہیں جو بلوچوں سے پہلے اِس علائقے کے مالک تھے۔

انتہائی ناقص شکل میں یہ ایک مختصر خاکہ ہے سندھ کے اُس حصّہ کی آبادی کا جو موجودہ دور میں کم سے کم انقلابات سے دوچار ہوئی ہے۔پہاڑوں میں اور ریگستان کے علائقہ میں

جو ترقیاتی کاموں سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ آبادی کے موجودہ نوعیت کافی طویل عرصہ تک برقرار رہنے کی توقع ہے۔ دوسرے علائقوں میں ایک نئی تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔

سندھ کی پاکستان میں شمولیت کے بعد دولت مند ہندوؤں کی کثیر تعداد گجرات اور بمبئی منتقل ہوگئی۔ اور سکھ زمینداروں اور کاشتکاروں کی بستیاں اپنے اصلی وطن مشرقی پنجاب چلی گئیں، اِس کے بدلے ہندوستان سے نقل مکانی کرنے والوں کا ایک سیلاب آیا جس میں مختلف قومیتوں کے مسلمان شامل ہیں، جو عملاً ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر علائقے سے تعلق رکھتے ہیں، جو ہندستان سے سندھ کی طرف مسلسل بہہ رہا ہے۔ حکومت کے لئے اِن لوگوں کو صوبہ کے اقتصادی ڈھانچے میں جذب کرنا انتہائی تکلیف دہ مسئلہ ہے، جس کا اثر صوبہ کے سماجی ڈھانچے پر ضرور ظاہر ہوگا۔ غیر ترقی یافتہ علائقوں میں آبپاشی کے نئے منصوبے کے نو واردوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ترقی یافتہ علائقوں میں زراعت کی زیادتی اور صنعت کاری تیزی کے ساتھ بڑھے گی۔ وہ لوگ جنھیں اِس ملک میں جگہ مل جاتی ہے اور سمہ، جاٹ، سرائی اور بلوچی کے شانہ بہ شانہ ٹکرانے کا موقع ملتا ہے وہ سندھ کے قدیم سحر کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سندھ ہی ہے جس نے کتنے اجنبیوں کو مختلف اوقات میں اپنے دامن میں جگہ دی اور اُنھوں نے بالآخر یہ محسوس کیا کہ وہ اِسی دھرتی کے بیٹے ہیں۔

تشریحات باب گیارہواں

1. سر اوریل اسٹین "این آرکیولوجیکل ٹور اِن جیڈ روسیہ "ایم -اے-ایس-آئی نمبر ۴۳ صفحہ ۱۴۔

2. سر پی کیڈل کی رائے اِس سوال پر "موہن جودڑو کے باشندوں کی نسل سے کون سے لوگ تعلق رکھتے ہیں؟ جرنل آف دی بمبئی اینتھر و پولوجیکل سوسائٹی- جوبلی نمبر ۱۹۳۷ء میں ملاحظہ ہو۔

3. پلائنی "نیچرل ہسٹری" جلد چھ- باب ۲۰ (۲۳) میں نے کارل مے ہوف کا ایڈیشن استعمال کیا ہے۔ جولیپرگ میں ۱۹۰۶ء میں طبع ہوا (۴۶۰-۴۶۴)۔

4. وشنو-وایو-مٹیہ اور مرکندیہ پُران- ولسن کے خیال کے مطابق وشنو پران میں جو بھارت کی سیاسی تقسیم دی گئی ہے وہ "سن عیسوی کی ابتداء کے زمانہ میں رائج تھی "(وشنو پران-ترجمہ ایچ ایچ ولسن-ٹرب نر-لندن-۱۸۶۵-جلد دوم باب ۳- صفحہ ۱۳۳ اور ۱۳۶ نوٹ)

5. بڑی فہرست بھیشمہ پاروا-سیکشن ۹ میں ملتی ہے (مہا بھارت-ترجمہ پی-سی- رائے کلکتہ ۱۹۲۵، جلد چہارم صفحہ ۲۱، ۲۴) اکشتری خاندانوں کا ذکر سبھا پاورا سیکشن میں ملیگا۔

6. "بری ہت سمہیتا" ترجمہ ایچ کرن-مطبوطہ جے-آر-اے ایس-نیوسیریز جلد پنجم (۱۸۷۱) باب ۱۴ "ڈویشرنس آف دی گلوب" پلائنی کا بیان کردہ اربے (Arbae) لوک میرے خیال کے مطابق بری ہت سمہتا کا اروڑا ہے (ایس، ڈبلیو، ڈویشرن) اور اُس نے جسے سرحد قبیلہ "اسٹاسنی لوک" (Astaceni) لکھا ہے وہ شمالی مغربی علاقہ کا اشمکا ہیں۔ جو دریائے سندھ اور دریائے کابل کے درمیان آباد تھے۔

7. پلائنی-جلد۱۲-۱۲۔

8. ایضاً جلد ششم-۲۱ (صفحہ ۴۵۷ مے ہوف ایڈیشن) برہی سمہتا کے مطابق مالوہ قبیلہ شمالی صوبہ میں آباد تھا، ملا قبیلہ کے لئے ملاحظہ ہو مہابھارت-سبھاپاروا-۱۰۷۷ اور ۱۰۸۶۔

9. ولسن بیان کرتا ہے (وشنوپران-صفحہ ۱۶۸ انوٹ) "حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ دریائے سندھ کے آس پاس سوات سے ہمالیہ پہاڑ تک جو لوگ آباد تھے اُنھیں اکثر مغربی یا شمالی اقوام کہا جاتا ہے۔اور یہ مصنف کی اپنی جغرافیائی پوزیشن کے مطابق معلوم ہوتا ہے"۔

10. تشریح نمبر ۱۴ اور ۱۵ املاحظہ ہو۔

11. ای-واشن برن ہوپکنس-"دی گریٹ اے پک آف انڈیا" (لندن ۱۹۰۱) صفحہ ۳۹۳-آر-جی بھنڈاکر "انڈین اینٹی کواری" جلد اول صفحہ ۲۳ ملی اور آگزیڈریکاءِ قبیلوں کا ذکر کرتے ہوئے اسٹرابو نے تحریر کیا ہے "عظیم قومیں" اور آگزیڈریکاءِ کو یونانی زبان میں دو طرح سے لکھا ہے (پندرہ-۷-۳۳)۔

نیز ولسن-وشنوپران-صفحہ ۱۸۴،۱۸۵ انوٹ-مہابھارت کے مطابق شودر اُس علاقہ میں آباد تھے جہاں دریائے سرسوتی ریگستان میں گُم ہو جاتا ہے۔

موسیو ویویان دُسین ماختان کی کتاب "اٹیوڈ سر لا جیوگرافک گریک" (پیرس ۱۸۵۸) صفحہ ۱۵۲-۱۵۳ بھی ملاحظہ ہو-ٹاڈ "انالس وغیرہ جلد دوم-صفحہ ۳۰۱-۳۱۱۔

سوگدی قبیلہ کا سوڈھا راجپوت ذات سے کیا تعلق تھا اِس کے بارے میں میک مرڈو کا مضمون مطبوطہ جے-آر-اے-ایس جلد اوّل-صفحہ ۲۳-ملاحظہ فرمائیں۔

12. ''مہابھارت''-ناناپاروا-رائے کی مذکورہ بالا کتاب-نیز اسٹرابو۔

13. منو، دہم-۴۳-۴۴-اِس درجہ میں-ساکا، پہلوا اور یونا شمار کئے گئے ہیں۔ بافتری (بیکرین) یونانیوں کے متعلق یہ نظریہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ کسی وقت وہ

سندھ پر حکمراں رہے ہیں۔ اِس کے بارے میں جو شہادت پیش کی جاتی ہے اُس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ لوگ اِس فہرست میں بھی شامل ہیں۔

14. کننگھم " آرکیولوجیکل سروے رپورٹس " جلد ششم ۳۰ -۱۸۷۱-صفحہ۲۷ ٹاڈ " انالس اینڈ اینٹی کوئیٹز آف راجستان " جلد دوم صفحہ ۲۹۶-۲۹۷-۳۰۱۔

15. الہ آباد کے قدیم ستون پر کتبہ- جے-آر-اے-ایس-۱۸۹۷-صفحہ ۸۵۶-ایضاً، ۱۸۹۸ صفحہ ۳۸۶-ابھیرا قبیلہ کے متعلق عام خیال ہے کہ وہ پنجاب کے موجودہ اہیر ہیں۔ (بی-سی-لا "ٹرائبس اِن اینشی اینٹ انڈیا- پونا ۱۹۴۳ صفحہ ۷۸) "میں یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ کے اہیر قبیلہ کا دعویٰ بھی اتنا ہی وزن رکھتا ہے (میک مرڈو- جے-آر-اے-ایس-جلد اوّل-صفحہ ۲۴۸-۲۴۹) نیز سی-ایچ-آئی -صفحہ ۵۹۶ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

16. ایم-رینا ڈ "فریگمنٹس " صفحہ ۲۵-ایلیوٹ جلد اول صفحہ ۱۰۰-۱۰۵-نیز ہودی والا صفحہ ۴۷-۵۷۔ اِس زمانہ کے جاٹ اور مید قبائل کے علاقہ کے متعلق ہودی والا کا نظریہ غلط ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہ لوگ " نمک کے پہاڑوں کے نزدیک آباد تھے "۔

17. "بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹیر " سیریز ۱۹۰۷-جلد ہشتم -لسبیلہ-صفحہ ۵۷-۵۹۔

18. قابل ذکر بات یہ ہے کہ بودھیانہ دھرما سوترا کے مطابق سوویرا قبیلہ کے علاقہ کو ناپاک ملک سمجھا جاتا تھا۔ اور آریہ ورت کی خاص حدود سے باہر شمار کیا جاتا تھا۔ جو آریہ اِس علاقہ میں جاتے اُنھیں واپسی پر اپنی نجاست دور کرنے کے لئے قربانیاں پیش کرنی ہوتی تھیں۔ بمطابق بی-سی-لا "ٹرائبس اِن اینشی اینٹ انڈیا " صفحہ ۳۴۴-

نیز مہابھارت-کرنا پاروا XL-۸-۴۰-(رائے-جلد ششم-صفحہ ۱۰۱)۔

19. ایلیوٹ-جلد اوّل-صفحہ ۱۴-۱۵-ابن خردازبہ نے ۳۰۰ ھجری میں انتقال کیا۔

20. ایضاً۔صفحہ ۱۲۸۔

21. ایضاً۔صفحہ۷۹۔

22. ایضاً-صفحہ۷۰-یہاں ہم منچھر کے میر بحر اور اونٹ پالنے والے جاٹ شناخت کرتے ہیں۔

23. واٹرس-یوان چوانگ-جلد دوم-صفحہ۲۵۲۔

24. قلیچ بیگ-چچ نامہ-صفحہ۱۷۰۔

25. البلاذری-ایلیوٹ-جلد اوّل-صفحہ۱۲۸۔

26. ہودی والا-صفحہ۸۵۔

27. قلیچ بیگ-چچ نامہ صفحہ۱۷۴-۱۷۵۔

28. ایضاً صفحہ-۱۷۳۔

29. ہیگ انڈس ڈیلٹا کنٹری-صفحہ۷۹۔

30. تاریخ معصومی کے بیان کے مطابق کچھ بلوچی بہت پہلے یعنی ۱۳۲۶ءعیسوی میں سندھ میں داخل ہو گئے تھے۔جبکہ خسرو خان گورنر سندھ نے اپنے بادشاہ محمد شاہ تغلق کے خلاف بغاوت کردی اور بکھر کے قلعہ میں بلوچوں کا ایک لشکر تیار کیا۔
اِسی کتاب کے مطابق چودھویں عیسوی صدی میں ایک وقت بلوچوں نے سومرا حکمرانوں کے خلاف جاڑیجہ اور سوڈھا راجپوتوں کے ساتھ مل کر صف آرائی کی۔
یہ اتحاد کچھ عجیب ہی تھا۔
(تاریخ معصومی-ترجمہ میلٹ-بمبئی گورنمنٹ ریکاڈز-نمبر۱۳-نیو سیریز ۱۸۵۵-صفحہ۳۲-۴۲)

31. قلیچ بیگ-ہسٹری آف سندھ،جلد دوم،صفحہ۶۱-۷۰۔

32. مہران-صفحہ۳۵۸-۳۵۹-پرنوٹ۳۵۹۔

33. سماٹ عربی زبان کے قاعدہ سے سمہ کی جمع ہے اور سندھ کے تمام زراعت پیشہ قبائل کے

لئے استعمال ہوتا ہے جو قدیم ہندو سلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔

34. تحفتہ الکرام میں فہرست موجود ہے۔ لوہانہ قبیلہ کو سمہ کے بعد ترتیب میں شامل کرتے ہوئے میں نے ریورٹی کی تقلید کی ہے (مہران صفحہ ۳۲۶) قلیچ بیگ کے ترجمہ میں اس کا ذکر نہیں ملتا (ہسٹری آف سندھ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۸) اور نہ ہی پوسٹانس کے ترجمہ میں (جے۔اے۔ انس۔ بنگال۔ جلد چودہ صفحہ۔ ۱۲۶)۔

35. تالپور حکمراں کھوسہ قبیلہ کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ اُنھیں فوج میں بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ سابق حکمرانوں یعنی کلہوڑا۔ کے وقت میں یہ لوگ فوج میں ہی خاص طور پر شامل تھے۔ اِسی طرح نہمر دی (نومڑیا) قبیلہ بھی ناپسندیدہ شمار کیا جاتا تھا۔ اُس کی بھی یہی وجہ تھی (جے۔ مرڈو۔ این اکاؤنٹ آف دی کنٹری آف دی سندھ۔ وغیرہ۔ جے۔ آر۔ اے۔ ایس۔ جلد ۱ول۔ مضمون نمبر ۲۰ صفحہ ۲۵۴)۔

36. یہ بات ہم تک میر معصوم کے ذریعہ سے پہنچتی ہے کہ ۱۵۲۱ء میں ڈہر اور ماچھی جو ادباوڑو میں آباد تھے، ماتھیلو کے مہر قبیلہ سے مسلسل برسرپیکار رہتے تھے۔ اُنھوں نے مقامی بلوچوں کو بھی اپنے ساتھ شمولیت کے لئے اُبھارا۔ "تاریخ معصومی۔ ترجمہ میلٹ۔ صفحہ ۹۶-۹۷۔

باب بارھواں

سندھی زبان [1]

مسلمہ لسانی درجہ بندی کی رو سے انڈو۔آرین زبانوں کی بیرونی علائقہ ہندستان کے مغرب اور شمال میں شمار کیا جاتا ہے۔ پنجابی جو مغربی علائقہ میں بولی جاتی ہے اور پورے شمالی مغربی ہندوستان کی زبان شمار ہوتی ہے اِسی کی درجہ میں سندھی زبان کو بھی ماہرین لسانیات نے رکھا ہے۔ گویا لہندا زبان اور سندھی زبان ایک ہی درجہ میں ہیں، مزید شمال میں جو دارڈک زبانیں مستعمل ہیں، مذکورہ دونوں زبانیں اُن سے گہرا رابطہ رکھتی ہیں۔

خاص طور پر کشمیری زبان سے آریہ، قبیلے کی دوسری جدید زبانوں کی طرح سندھی زبانوں کا ابتدائی مخرج بھی پراکرت ہے جو سنسکرت کا مقبول عام قدیم تلفظ کہا جاسکتا ہے۔

لیکن سندھی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس نے قدیم پراکرت زبان کے رنگ کو اپنے اندر جوں کا توں برقرار رکھا ہے جبکہ دوسری جدید انڈو آرین زبانوں میں پراکرت کی آمیزش مسلسل تبدیلیوں سے دوچار رہی ہے۔ سندھی زبان کا یہ کٹر پن شاید اِس وجہ سے ہے کہ سندھ کا علائقہ جغرافیائی اعتبار سے دوسرے علائقوں سے الگ تھلگ رہا ہے۔ ایک عظیم ریگستان نے اِسے اُن شاہراہوں سے دور رکھا ہے جہاں مختلف زبانوں کے لوگ ملتے جلتے رہتے ہیں۔

پراکرت زبان کی ماہر صرف ونحو مارکنڈیہ کے قول کے مطابق سندھ میں جو اپ بھرنش پراکرت بولی جاتی تھی وہ وراچڈ کہلاتی تھی۔ اِس عالم کا کہنا ہے کہ الفاظ کے شروع میں "ٹ" اور "ڈ" کے حروف جو پراکرت بولنے والوں کے لئے عام طور پر استعمال میں آتے ہیں وہ وراچڈ پراکرت میں جب ادا کئے جاتے ہیں تو زبان دانتوں سے ملنے کے بجائے

تالو سے ٹکراتی ہے، اِسی طرح وہ حروف جن کی آواز ہلکی سیٹی جیسی آواز سے مشابہ ہے مثلاً "ث"، "س"، "ز" ان کے لئے وراچڈ پراکرت میں اِس عالم کو یہ رجحان ملا ہے کہ وہ "ش" کی طرح بولے جاتے ہیں، وہ صورت جدید سندھی زبان میں پائی جاتی ہے جبکہ اِس سے تعلق رکھنے والی دیگر زبانوں میں ایسا نہیں ہے۔

صرف ونحو کے ہندو ماہرین نے وراچڈ ہر بان بولنے والے علاقہ میں پیسا چک اور داردِک تلفظ کا استعمال بھی پایا ہے۔ داردک زبانوں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے حرف "ٹ" کسی صورت میں بھی ایک لفظ میں آئے اپنی آواز برقرار رکھے گا لیکن دوسری انڈو آرین زبانوں میں کچھ مخصوص مقامات پر یہ حرف قاموس رہتا ہے۔ جدید سندھی میں یہ پراکرتی وراچڈ خصوصیت برقرار ہے، اور قدیم زمانہ کی طرف توجہ دیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ پالی زبان کا وہ لب ولہجہ جو ہمیں مہاراجہ اشوک کی لاٹوں پر کندہ عبارت میں ملتا ہے، اِس میں آواز اور تلفظ کی جو خصوصیات ملتی ہیں وہ آج بھی داردِک زبانوں میں نیز لہنداور سندھی زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔

سندھی زبان کی خصوصیات پر مزید بحث کرنے سے پہلے ہمیں اُن علاقوں کا جائزہ لینا چاہئے جہاں یہ اکثریتی مقامی زبان کے طور پر بولی جاتی ہے، اِس میں پورا صوبہ سندھ بشمول خیرپور، جزیرہ نمائے کچھ، بلوچستان میں لسبیلہ کا جنوبی حصہ اور بلوچستان صوبہ کا کچھی علاقہ جو شمال مغرب میں صوبہ سندھ سے ملحق ہے اور بھاولپور کا انتہائی جنوبی حصہ شامل ہے۔

معیاری سندھی زبان یا ادبی سندھی زبان صوبہ کے وسطی علاقہ میں مستعمل جسے وچولو کہتے ہیں مزید براں سندھی۔ کے پانچ علاقائی شکلیں ہیں، سرائیکی بالائی سندھ اور کچھی میں، تھریلی یا ڈھاٹکی مشرقی ریگستانی علاقہ میں۔ لاڑی دریائے سندھ کے ڈیلٹا اور ساحلی علاقوں میں۔ کچھی جزیرہ نمائے کچھ میں، اور لاسی کراچی اور لسبیلہ کے جنوبی حصے میں بولی جاتی ہیں۔

اگر اُس علاقہ کو جس میں سندھی اکثریتی مادری زبان ہے، خواہ معیاری یا مستعمل۔

اُن علاقوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے جن میں ملتی جلتی لہندا زبان بولی جاتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ متحدہ کُل علاقہ قریب قریب ایسی سرحدیں بناتا ہے جو چچ نامہ کے مطابق بدھ سلطنت کی حدود تھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ داریوس ہستاسپ نے جب اِس علاقہ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اُس سے بہت پہلے ہی پراکرت زبان جس سے سندھی اور لہندا زبانیں نکلیں اِس علاقہ میں مستحکم طور پر مروّج ہو چکی تھی، اور اِس کے بعد یونانی، ساکا، پارتھین اور ہن قبائل کی یلغار نے برائے نام اِس زبان کو متاثر کیا اور وہ بھی شاید اِس حد تک کہ اِس زبان کی لُغت میں کچھ نئے الفاظ شامل ہو گئے۔

سندھ کی امتیازی خصوصیات اِسے شمال مغرب کی دارِدک زبانوں سے قریب تر کر دیتی ہیں۔ اِن خصوصیات میں سے اہم یہ ہیں: مشدد الفاظ کی زیادتی: اعراب کا بکثرت استعمال: ہر لفظ کا ایک مخصوص تہجی پر ختم ہونا: اور فعل ماضی کے بے ترتیب لامحدود صیغے۔ سندھی کے حروف تہجی میں ایک انوکھی بات یہ ہے کہ چار حروف تشدید کے ساتھ دوہری آواز پیدا کرتے ہیں۔ یعنی، ڈ، پ، چ، گ۔ سر جارج گریرسن نے اِن الفاظ کو انگریزی میں BB، DD، JJ اور GG بیان کیا ہے، یہ حروف پراکرت میں آتے ہیں، اِس سے نکلنے والی دیگر زبانوں میں دو میں سے ایک نکال دیا جاتا ہے اور اس کی بجائے اِس سے پہلے حرف کی آواز کو طویل کر کے بولا جاتا ہے۔ سندھی اور کشمیری میں جب اِن میں سے ایک کو ترک کیا جاتا ہے تو پہلا حرف بغیر کسی تبدیلی کے قائم رہتا ہے۔ لیکن سندھی میں عام طور پر پراکرت کا متشدّد حرف باقی رہتا ہے ایک اور خصوصیات یہ ہیں کہ اصل پراکرت میں کئی جگہ حرف اپنی اصل آواز کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے جبکہ سندھی میں اِن مقامات پر یہ مشدّد ہو جاتا ہے۔

دارِدک زبانوں میں اعراب کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر کشمیری زبان اور یہی لھندا زبان کی بھی صورت ہے، لیکن سندھی زبان میں اِن کا استعمال مخصوص

اہتمام اور توجہ کو ظاہر کرتا ہے۔ کشمیری زبان میں یہ اعراب صرف "اسم" کے ساتھ لگائے جاتے ہیں۔ لہندا میں "فعل اور اسم" کے ساتھ۔ لیکن سندھی میں حروف کے آغاز و اختتام پر بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اِس قسم کے دو اعراب ایک ساتھ ہی "فعل" پر استعمال کئے جاسکتے ہیں اور اِس طرح سے یہ جملہ "میں اُسے مارتا ہوں یا میں نے اُسے مارا" صرف ایک لفظ میں ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اس قسم کے جملے جیسے ''اس کو'' ''اس کا باپ'' ''میرا سر'' اکثر و بیشتر مذکورہ طریقہ پر ہی ادا کر دیئے جاتے ہیں، اِس طرح کی یکسانیت سندھی زباں کو گفتگو کے لئے ایک قابل تعریف ذریعہ بنا دیتی ہے، اور جو لوگ دوسری ہندوستانی زبانوں کا بھی اتنا ہی تجربہ رکھتے ہیں اُن کے لئے سندھی کی یہ خصوصیات خاص طور پر جاذب توجہ ہے۔

ایک اہم اور انوکھی خصوصیت جو سندھی اور کشمیری زبانوں میں مشترک ہے کہ ہر ایک لفظ مخصوص حروف تہجی پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اِس طرح کہ جب بولنے کے بجائے یہ الفاظ گائے جائیں، فرانسیسی زبان میں اختتام تانیث میں "ای" جس طرح خاموش ہے وہ سندھی کے متوازی کہا جاسکتا ہے، اِسی طرح سندھی میں اختیاری طور پر کبھی کبھی "زیر" یا حرف "ہ " کے بعد نصف زیر دونوں الفاظ کے درمیان استعمال ہوتا ہے۔ زیر کی یہ آواز عام طور پر سماعت کے لئے زیادہ واضح ہے بہ نسبت مذکورہ آخری حرف کے چنانچہ آسمان کو اکثر آسماں اور مہمانی کو مہے مانی بولا جاتا ہے۔

تمام ہند۔ آریائی زبانوں جیسے، سندھی زبان میں بھی اسم کی حالت فاعلی اور حالت مفعولی ہے۔ مگر ان کے ساتھ اس میں حالت جری اور حالت ندا بھی موجود ہیں۔ صفت کے دریں اثناء میں سندھی کی چھوٹی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب اسم جمع کے ساتھ صفت لگا کر گرداں بناتے ہیں تو اسے صفت کو بھی جمع کے صیغہ میں ڈھالا جاتا ہے، اور ہندی جیسی صفت واحد میں نہیں رہتی۔

سندھی میں خطوں کے گردان عام طور پر ہندی اور دوسری زبانوں کے سرشتے سے قریبی مماثلت رکھتا ہے۔ سندھی میں زبان ماضی شرطیہ نہیں ہوتا لیکن اس کی جگہ ماضی استمراری، ماضی مطلق یا ماضی بعید بیانیہ سے کسی حد تک کمی پوری کی جاتی ہے۔ دوسری طرف، سندھی زبان میں زمان ماضی مدامی ہے، یہ فقط اس میں یہی ہوتا ہے اور اہم فعل کے زمان ماضی کے ساتھ ''تھی'' ملانے سے بنتا ہے۔ ''تھی'' ''تھیو'' کی شکل ہے۔ ''تھیو'' گردان رکھنے والا حرف ہے، اور اس کو ایک مددی فعل کی کھوئی ہوئی شکل پہنچانی جا سکتی ہے، جس کی معنی بھی ''تھی'' (ہوئی) ''تھیو'' (ہوا) گردان میں حرکت کرتا ہے، اور ''تھی'' عام حالت میں رہتا ہے۔ جب اس مددی فعل ''تھیو'' (ہوا) کو دوسرے فعل کے مضارع مجہول میں سے ملا کر زمان حال بیانیہ بنانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، تب وہ جنس اور عدد میں فاعل سے جا ملتا ہے۔ اس طریقے سے اس کا صفت والا کام بھی ہے۔ سندھی زبان میں مضارع مجہول شرطی نوعیت کا ہے، جیسے بیشتر ہند۔ آریائی زبانوں میں ہوتا ہے، لیکن کبھی کبھار وہ زمان حال بیانیہ یا پھر جیسے کشمیری زبان میں، زمان مستقبل بیانیہ کا اثر بھی رکھتا ہے۔

سندھی زبان میں اس ''تھیو'' (تھیو = ہونا) کے علاوہ دو اور بھی مددی فعل بھی ہیں: ایک ''آھیاں، یہ لفظ انگریزوں کے 'I am' جیسے زمان حال میں کام آتا ہے، مگر وہ علیحدہ طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات انگریزی زبان میں نہیں ہے۔ دوسرا فعل ہے: ''تھین'' (تھین = ہونا) جو آخر تک گردان میں رہتا ہے۔

سندھی میں فعلوں کی مشتق اسموں (Participles) سے زمان بنانے کا قاعدہ بھی الگ ہے۔ اسم حالیہ کی مدد سے زمان مستقبل بیانیہ بنایا جاتا ہے اور نہ ہندی جیسے زمان ماضی شرطیہ، جس زمان کے بارے میں پہلے ہی جان چکے ہیں کہ سندھی میں نہیں ہے۔ بہت سے مروج زبانیں اپنا زمان مستقبل سنسکرت کے بہت کہنہ اسم مستقبل مجہول سے بناتو ہیں۔ اسم مفعول، جو کہ مجہول کی معنی رکھتا ہے، اس میں سے برآمد ہوئے زمان، سندھی میں اس

فعل مجہول کی معنی میں استعمال کر کے فعل لازمی جیسے گردان میں لایا جاسکتا ہے، یہ بات ہندی زبان میں نہیں ہے، لیکن جب اس کو ہندی جیسے معروف کی معنی میں استعمال لایا جاتا ہے۔تب فاعل سیدھی طرح سے فاعلی حالت میں آ جاتا ہے۔

ماضی مطلق، ماضی بعید اور مستقبل۔ یہ زمان سندھی زبان میں، ہندی کی طرح باقاعدہ بنتے ہیں۔

سندھی زبان میں اسم مفعول کی دو ''لاحقہ''(Suffix) ہوتی ہیں۔ایک ''-وْ'' جو فعل کی معنی رکھتی ہے اور دوسری ''-ل'' ہوتی ہے۔ یہ خالص صفتی مفہوم رکھتی ہے۔ دونوں ''لاحقہ''(Suffix) گردان والی خصوصیت رکھتی ہیں۔سندھی زبان اس لحاظ سے گجراتی، مریٹی اور دوسری زبانوں سے نرالی ہے، یہ سب ہند۔آریائی زبانوں کی بیرونی دائرہ مشرقی گروپ میں آتی ہیں۔ان زبانوں میں اسم مفعول کی ایک ''لاحقہ''(Suffix) ''-ل'' ہوتی ہے۔سندھی فعلوں میں اسم مفعول اکثر بیقاعدہ بنتا ہے۔اس ضمن میں یہ پھر بھی کشمیری اور لہندا زبانوں سے ملتا ہے۔سندھی زبانوں میں اس کے ۱۲۸ مثال موجود ہیں۔اتنی ساری مثالیں مشرقی اور جنوبی علائقوں کی کوئی اور ہند۔آریائی زبان میں نہیں ملتی۔ ہندی زبان کو دیکھو، اس میں ۷ ایسی مثالیں ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سندھی زبان کی اس خصوصیت میں اُن نووارد نسلوں کا بھی تھوڑا سا ہاتھ ہونا چاہئے، جو ایک دوسرے کے پیچھے وادیء سندھ کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں۔اس زبان کی ایک نرالی بات یہ بھی ہے کہ ایک پیچھے والی آواز کے بعد ''ت'' لگا کر اسم مفعول بنایا جاتا ہے۔

سندھی میں فعلوں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جس کو بالواسطہ یا سببی صورت کہا جاتا ہے۔ یہ صورت عام طور پر مصدر (دھاتو) سے 'ءِ' ملا کر بنائی جاتی ہے۔اس طریقے سے بنی ہوئے فعل باقاعدہ گردان میں آتے ہیں۔مگر پھر بھی کافی سببی فعل اور طریقے سے بھی بنتے ہیں۔مثال کے طور پر مصدر(Infinitive) کو تبدیل کرنے سے سندھی زبان کی ایک خاص بات سوہرا سببی فعل ہے،جس سے مفہوم کا پورا پورا اظہار ممکن ہو جاتا ہے۔

سندھی زبان کی ایک اور خاصیت ہے۔ وہ یہ ہے فعل مجہول (Passive voice) کا کثیر استعمال، خاص طور پر لازمی فعل کے فعل مجہول کا ہے۔ مجہول صورت ضمیر واحد غائب میں استعمال ہوتی ہے۔ ''آؤں ویس تھے'' میں جارہا تھا کی بجاءِ کہنے ''مون کان وجن تھیو تھے'' مجھ سے چلنا جارہا تھا''۔ سندھی میں فعل مجہول بنانے کی باقاعدہ صورت یہ ہے کہ مصدر کے ساتھ ''ئج'' لگایا جاتا ہے، جس میں ھمزہ کی آواز چھوٹی ہوتی ہے، یہ طریقہ شینا زبان میں مروج ہے جو کہ ایک داردک زبان ہے، اُس سے بہت جاملتا ہے۔ اس زبان میں بھی فعل مجہول بنانے کے لئے ''ئج'' لگایا جاتا ہے مگر اس میں ہمزہ کی آواز بڑی ہوتی ہے۔

دوسری ہند۔ آریائی زبانوں کی طرح سندھی زبان میں مرکب فعل، تاکیدی، احتمالی اور تکمیلی وغیرہ عام طور استعمال ہوتے ہیں، جن میں مددی فعل اکثر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا ہندی زبان میں ہوتا ہے۔

سندھی زبان کی وہ خصوصیات جو اوپر بیان کی گئیں عام طور پر سندھی زبان کے مختلف لہجوں اور معیاری زبان دونوں شکلوں میں نظر آتی ہیں۔ اور وچولو کے پورے علائقہ میں مروج ہیں۔ اب سندھی زبان کے مختلف لہجے ہماری توجہ چاہتے ہیں یعنی جیسا کہ پہلے ہی بیان کیا جا چکا ہے یہ سرائیکی، تھاریلی یا ڈھاٹکی، کچھی، لاڑی اور لاسی کے ناموں سے مشہور ہیں۔☆

جاٹ اور چند بلوچ قبائل جو پنجاب سے آکر سندھ میں آباد ہوئے۔ وہ لہندا زبان بولتے ہیں۔ اِس کو سرائیکی بھی کہا جاتا ہے۔ سندھ کے جس علائقہ میں بھی یہ لوگ رہتے ہیں آپس میں یہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ سرائیکی کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ وہ زبان جو

☆ سندھی زبان میں ایک اور بھی خاصیت موجود ہے جو 'اکرترک' یا فعل ہے، فاعل والی ہے، بھیرومل آڈوانی اس خاصیت کے متعلق لکھتا ہے: یہ فعل اس وقت سندھی زبان کے علاوہ کسی بھی یورپی یا مشرقی زبان میں موجود نہیں ہے، کہ جملا بنانے کے لیے فاعل ضرور چاہئے۔ ''رستے تے هلبو آھے'' (راستے پہ چلا جاتا ہے)، ''باغ مین گھمبو آھے'' (باغ میں گھوما جاتا ہے)، ''ڈورجے تھو'' (دوڑا جاتا ہے)، ''پگھر تھئی تھو'' (پسینا آتا ہے)، ان جملوں میں ایک عام حقیقت بیان کی جاتی ہے اور خاص آدمی یا چیز کے متعلق بات نہیں کی جاتی، اس لیے ایسے جملے کا فاعل ہوتا ہی نہیں ہے، اس لیے ان جملوں کا صحیح ترجمہ کسی بھی زبان میں ممکن نہیں ہے۔ (سندھی بولی کی تاریخ، طبع ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۹) سندھی مترجم۔

سرو کے علائقے میں بولی جاتی ہے۔ دادو اور کوٹ لالو سے شمال کا علائقہ عام طور پر سرو کہلاتا ہے۔ اِسے الگ زبان کہنا تو درست نہیں۔ یہ سندھی وچولے کے جیسی ہی ہے سوائے اِس کے کہ کہیں کہیں تلفظ اور متبادل الفاظ میں فرق ہے۔

تھاریلی یا ڈھاٹکی اور کچھی زبانیں، سندھی کی ایسی شکلیں ہیں جن میں علی الترتیب راجستھانی اور گجراتی زبانوں کے الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اِنھیں الگ الگ زبانیں کہنا درست نہیں یہ مخلوط لوگوں کے لب و لہجے کا فرق ہے۔ مقامی طور پر جیسے لوگ اِن زبانوں کا استعمال کرنے والے ہوتے ہیں یہ ویسا ہی رنگ اختیار کر لیتی ہیں۔

برعکس اِس کے لاڑی زبان اپنے لب و لہجے کے اعتبار سے ایک ممتاز زبان کہی جا سکتی ہے۔ معیاری سندھی بولنے والے اِس زبان کو دیہاتی لوگوں کی زبان شمار کرتے ہیں۔ کہاوت مشہور ہے " جیسی زبان لاڑی بولنے والے استعمال کرتے ہیں ویسی زبان سرو میں بیل بول سکتے ہیں " اور حقیقت یہ ہے کہ بہ ظاہر یہ زبان قدیم ترین سندھی زبان معلوم ہوتی ہے۔ وہ حروف جن سے کرخت آواز پیدا ہوتی ہے، اِس زبان میں نرم آواز والے کر دیئے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاڑی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو صرف اِسی زبان کے لئے مخصوص ہیں اور بہت سی اصطلاحات بھی جو عام طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

لاسی بھی اپنے مقام پر ایک حقیقی لہجہ ہے۔ یہ لاڑی سے دور اور معیاری سندھی سے قریب تر ہے لیکن اِس کے اپنے چند قواعد ہیں اور کچھ مخصوص الفاظ بھی جو معیاری سندھی میں نہیں ملتے اور یہ الفاظ ممکن ہے کہ پراکرت سے بھی پُرانی کسی زبان سے حاصل کئے گئے ہوں۔

سندھی زبان عرب فتوحات کے وقت ایک مستحکم، عالمگیر، لچکدار، اور کثیر اللغات زبان رہی ہوگی اِسی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ عربوں نے اِس کی وسعت میں بہت اضافہ کیا اور سندھ کی اسلامی دنیا میں شامل ہونے سے اِس زبان کو چار چاند لگ گئے۔

غزنوی اور غوری سلاطین نے جب شمالی ہندوستان کو فتح کیا اُس سے تین صدیاں

پہلے ہی سندھی زبان کے عربی کے ساتھ روابط قائم ہو چکے تھے۔ چنانچہ سندھی میں عربی الفاظ جس طرح مستعمل ہیں۔ وہ اِن روابط کی نشانی ہے۔ ہندوستانی دوسری زبانوں میں شائستہ الفاظ جن کا تعلق مذہب سائنس اور فلسفہ سے ہے وہ عام طور پر عربی زبان سے مُستعار لئے گئے ہیں جبکہ سندھی زبان نے بہت سے ایسے عام الفاظ کو اپنا جزو بنا لیا ہے۔ " پہاڑی، شے، خیمہ، پیاز، طشتری، " یہ تمام الفاظ سندھی میں اپنے عربی ناموں کے ساتھ شامل ہیں۔

یقینی طور پر یہ الفاظ براہ راست عربوں سے حاصل کئے گئے تھے۔ جبکہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں عربی الفاظ کی آمیزش فارسی الفاظ بھی کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جس طرح ہم دوسری ہندوستانی زبانوں میں دیکھتے ہیں کہ اِن الفاظ سے لُغت تو ضرور متاثر ہوئی ہے لیکن اصل زبان پر اثر نہیں پڑتا۔ صرف نحو کی رو سے بہت سے قواعد سندھی اور فارسی میں مشترک ہیں۔ لیکن اُن کے استعمال میں جو اختلاف ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ قواعد کسی ایسے قدیم لسانی ذریعہ سے سندھی کو حاصل ہوئے جس کے ذریعہ سے فارسی زبان نے بھی استفادہ کیا۔ سندھی زبان میں اُن قواعد کی قدیم شکل باقی رہ گئی، لیکن فارسی میں اُس سے مختلف ہوگئی۔ جس طرح اُردو میں الفاظ کی بناوٹ اُسی ترتیب وطریقہ سے ہے جیسے فارسی میں۔ سندھی زبان میں ایسا نہیں ہے۔ فارسی الفاظ جنھیں سندھی زبان نے اپنے اندر ڈھال لیا ہے وہ اپنا تلفظ برقرار نہیں رکھ سکے، اِسی طرح عربی الفاظ بھی۔ دونوں کا استعمال سندھی صرف ونحو کے قواعد سے ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل بالا مختصر بیان سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ سندھی زبان اپنی موجودہ شکل میں ایسی بہت سی خصوصیات رکھتی ہے جن سے اِس ملک کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، نیز اِس کی جغرافیائی حیثیت اور حالات کے اثرات کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ اگر سندھی زبان کے ادبی اثاثہ پر نظر ڈالی جائے تو نثر کے بجائے نظم میں ہمیں اِس علائقہ کی مخصوص دانش کا عکس ملتا ہے لیکن اِس موضوع پر موجودہ عنوان کے تحت مزید بحث کرنا غیر مناسب ہے۔

تشریحات باب بارہواں

1. یہ پورا باب سر-جی آر-گریرسن کی تصنیف "دی لینگویسٹک سروے آف انڈیا" جلد ہشتم - پارٹ اوّل اور رچرڈ ایف-برٹن کی کتاب " سندھ اینڈ دی ریسز دیٹ اِن ہیبٹ دی ویلی آف دی انڈس" (ڈبلیو-ایچ ایلن-۱۸۵۱) سے لیا گیا ہے۔

ضمیمہ نمبر 1

ریگستان ہند کا گمشدہ دریا

گمشدہ دریا (ہاکڑا) کا جہاں تک تعلق ہے اِس کی وضاحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ دریا کی آبی گذرگاہ کے بالائی اور زیریں حصّوں کو الگ الگ پیش کیا جائے۔ یعنی سوالیک کی پہاڑیوں سے نکلنے والے چھوٹے چھوٹے دریاؤں سے شروع کر کے دراوڑ تک ایک حصّہ اور پھر غوث پور نشیب سے رن کچھ تک دوسرا حصّہ۔

مندرجہ بالا طریقہ پر تجزیہ کرنے سے وضاحت میں آسانی ہوگی، ورنہ مختلف نظریات جو اِس ضمن میں پیش کئے جائیں گئے اُن سے عبارت کے اُلجھ جانے کا اندیشہ ہے۔ بالائی حصّہ کو ہم ہاکڑا کے نام سے بیان کریں گے اور زیریں حصّہ کو نارا کہیں گے۔ حالانکہ مجھے احساس ہے کہ یہ اصطلاح درست نہیں ہے۔

دریائے "ہاکڑا" جب محققین کی توجہ کا مرکز بنا اُس سے بہت پہلے ہی دریائے "نارا" کے متعلق حائق کی چھان بین شروع ہوگئی تھی۔ بمبئی آرمی سے تعلق رکھنے والے ایک سائنسی محقق کیپٹن جیمس میک مرڈو نے اِس آبی گذرگاہ کے متعلق معلومات جمع کیں اور اِس نتیجہ پر پہنچا کر یہ دریائے سندھ کی ایک قدیم گذرگاہ رہ چکی ہے، اور جیسا کہ تاریخِ طاہری اور تحفتہ الکرام جیسی کتب تواریخ سے ظاہر ہوتا ہے۔ مشرقی سندھ کی خوش حالی اِسی دریا کے مرہونِ منت تھی۔

بدقسمتی کی بات ہے کہ میک مرڈو نے دریائے نارا کو "پُرانا دریا" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ حالانکہ یہ نام دوسری آبی گذرگاہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جس کے آثار آج بھی میر پور خاص سے رن کچھ تک شناخت کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن یہ غلطی قدرتی بات تھی کیونکہ نارا، پُران دریا سے (یا پُران نارا سے) ملحق ہو جاتا ہے اور پچاس میل متحدہ چشمہ کی

صورت میں بہنے کے بعد رن کچھ میں گرتا ہے، چنانچہ میک مرڈو کے بیان کا جائزہ لینے کے لئے اگر ہم پُران کی جگہ نارا پڑھتے رہیں تو اِس سے مسئلہ سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

میک مرڈو کے اخذ کردہ نتیجہ کے اعتبار سے نارا شاخ دریائے سندھ سے اُس مقام سے الگ ہوتی تھی جہاں بکھر واقع ہے۔ اُس کی معلومات کے ذرائع کے مطابق دریا کے مقام فراق کو سید گنج بخش کہتے تھے۔ جو چالیس میل شمال میں واقع ہے۔ اُس وقت نارا دریا بکھر سے شاید بیس میل مشرق میں الور کے پاس سے گذرتا تھا اور جنوب کی طرف چلا جاتا تھا، بامھڑاہ (بہمن آباد) سے بیس میل مشرق میں (بہمن آباد کے صحیح محل وقوع کے تعین کا سہرا میک مرڈو کے سر ہے) دریائے نارا سے ایک اور شاخ نکل کر مغرب کی طرف چلی جاتی تھی جو ماضی میں "لوہانہ دریا" کے نام سے مشہور تھی۔ یہ شاخ "موجودہ خدا آباد یا شاید خدآباد اور ہالا کنڈی کے درمیان سے بہتی تھی اور اِس مقام پر موجودہ گذرگاہ سے مل کر اُسے کاٹتی ہوئی آگے بڑھ جاتی تھی اور قدیم بھنبھور سے گذرتے ہوئے دیبل کے مقام پر سمندر میں گرتی تھی۔[1]

نارا کی مشرقی شاخ "جو اُس وقت بھی اُسی نام سے مشہور تھی" (یعنی پُران) "۔ جنوب کی سمت بہتی چلی جاتی تھی اور عظیم ریگستان کے ساتھ ساتھ جو اضلاع آج غیر زرعی ہیں اُنھیں سیراب کرتی تھی۔ یہ شاخ جُون اور بادبان کے پرگنوں سے گذرتی ہوئی موجودہ دریائے پران میں شامل ہو جاتی تھی۔ یہ اتصال الہ بندر کے مقام پر تھا۔ یہاں میدانی علاقہ پاکر یہ شاخ کافی چوڑی ہوگئی تھی اور اِس کے بعد دریائے لکھپت کے راستے سمندر میں داخل ہوتی تھی۔

نارا کے بارے میں یہ معلومات حاصل کر لینے کے بعد کہ یہ دو لمبی شاخوں میں منقسم ہوکر سمندر تک پہنچتا تھا۔ میک مرڈو نے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کرلیا کہ یہی سکندر اعظم کے زمانہ کا ڈیلٹا تھا اور بہمن آباد کا محل وقوع خاص پٹالہ یا اُس کے قریب ہی تھا۔

میک مرڈو کے اِس نظریہ نے جو "ڈیزرٹیشن آن دی ریور انڈس" ۱۸۳۴ء[2] میں

اُس نے پیش کیا سندھ کے جغرافیائی حدود کے بارے میں جو سکندرِ اعظم کے زمانہ میں تھے ایک انقلاب برپا کر دیا، اور حالانکہ میک مرڈو کے بعد کے لکھنے والوں نے پٹالہ کے محل وقوع کے متعلق مختلف آراء ظاہر کیں۔ لیکن یہ نظریہ کہ اُس زمانہ میں دریائے سندھ جمڑاؤ ہیڈ تک وادیء نارا سے بہتا تھا، موجودہ وقت تک درست تسلیم کیا جاتا رہا۔۳ میں نے اِس کتاب کے مضمون میں وہ وجوہات پیش کی ہیں جو اِس نظریہ کو باطل کرتی ہیں۔

دریائے سندھ کے متعلق چھان بین کرنے والا دوسرا محقق الیگزنڈر برنس ہے۔ نارا کے متعلق بہرنوع اِس کی تحقیق نے بدقسمتی سے مسئلہ کو صاف کرنے کے بجائے مزید اُلجھا دیا، اُس کی معلومات کے وہ ذرائع جن کا تعلق کچھ کے علاقہ سے ہے الیگزنڈر برنس کو اِسی نتیجہ پر لے گئے کہ ۱۸۲۶ء کا عظیم سیلاب جو نارا سے گذر کر آیا اُس کا سبب یہ تھا کہ "اروڑ بند ٹوٹ گیا تھا" اور دوسرے سال جبکہ یہ بند ازسرِ نو تعمیر کیا جا چکا تھا۔ وادیٔ نارا میں پانی کی قلت واقع ہوگئی۔۴ چنانچہ ۱۸۳۱ء جب برنس نے بالائی سندھ کا دورہ کیا، اور اِسی طرح دوسرے سال کیپٹن ڈبلیو پوٹنجر اور لفٹننٹ ڈیل ہوسٹ اِس علاقہ میں آئے تو اُن کے اِس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ نارا میں پانی کی سپلائی بحال کرنے کے لئے اور اُسے دریائے سندھ کی فعال شاخ کی حیثیت دینے کے لئے اگر کسی اقدام کی ضرورت ہے تو صرف یہ کہ روہڑی اور الور کے نواح میں واقع بندوں کو ہٹا دیا جائے۔

پوٹنجر اور ڈیل ہوسٹ دونوں ہی یہ نظریہ رکھتے تھے کہ قدیم زمانہ میں نارا ہی دریائے سندھ کی صدر گذرگاہ تھی جو سمندر تک اُس کے پانی کا بڑا حصہ پہنچاتی تھی۔۵

مذکورہ افسران کو نارا کی آبی گذرگاہ کے معائنہ کا موقع نہیں مل سکا۔ اِس کا بالائی حصہ ۱۸۴۴ء میں بنگال انجینئرس کے کیپٹن ڈبلیو بیکر نے تحقیقی نظر سے دیکھا۔ اِس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ اِس میں پانی کی مستقل روانی کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں۔ بیکر نے یہ معلوم کیا کہ سیلابی پانی کو اِس گذرگاہ تک پہنچنے سے روکنے کے لئے کسی بند کی طرف سے رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی۔ اُس نے یہ بھی اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ موجودہ صورت میں جو

پانی اِس گذرگاہ میں پہنچتا ہے، اُس کا ذریعہ وہ نشیب ہے جو دریائے سندھ کے متوازی اُس کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ نیز ایک دوسرا نشیب جو دریائے ستلج کے متوازی اوپر سے بہاولپور کے نزدیک تک پھیلا ہوا ہے، یہ نشیب سبزل کوٹ اور پھر "مشرقی نارا کے ابتدائی سرے تک روہڑی سے گیارہ میل مشرق تک پھیلا ہوا تھا۔ اتفاق یہ ہے کہ بیکر نے بھی نارا کو "دریائے سندھ کے قدیم آبی گذرگاہ" کہا ہے۔٦

نارا کی پوری گذرگاہ کا لفٹنٹ جے۔ جی۔ فائف نے ۱۸۱۵ء میں معائنہ کیا۔ اُس نے معلوم کیا کہ اِس گذرگاہ میں آمدِ آب دو سیلابوں کی بدولت ہے، "ایک سبزل کوٹ کے نزدیک سے آتا ہے اور دوسرا روہڑی کے اوپر واقع ایک نشیب سے ۷" اُس نے یہ بیان کیا کہ دونوں سیلاب کچھ دور تک میدان میں بہنے کے بعد اپنے لئے آبی گذرگاہیں بنا لیتے ہیں اور خاص طور پر ایسے مقامات پر جہاں کسی رکاوٹ کی وجہ سے پانی جمع ہو جاتا ہے اور جیسے ہی رکاوٹ دور ہوتی ہے یہ پانی تیزی کے ساتھ بہہ نکلتا ہے۔ اس نے بھی رپورٹ کیا کہ جو پانی نارا میں پہنچنے کے لئے اِن درمیانی گذرگاہوں میں جمع ہوتا ہے وہ بہت صاف ہوتا ہے۔ کیونکہ مٹی جو اِس پانی میں موجود ہوتی ہے وہ دریائے سندھ سے نکلتے ہی زمین پر بیٹھنی شروع ہو جاتی ہے۸۔ فائف نے اپنی تحقیقات کو ایک عملی انجینئر کی حیثیت سے صرف اُس مقصد تک ہی محدود رکھا جو اُس کے پیشِ نظر تھا۔ چنانچہ نارا کی اصلیت اور ابتدائی تاریخ کے متعلق اُس نے کوئی توجہ نہیں کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے نارا کو دریائے سندھ کے سیلابی پانی کی گذرگاہ کی حیثیت سے ہی دیکھا۔

۱۸۵۹ء میں نارا کو ایک بارہ ماسی آبی گذرگاہ بنا دیا گیا۔ کیونکہ فائف نے روہڑی کے اوپر دریائے سندھ سے ایک نہر کھود کر اِس میں پانی پہنچا دیا تھا، دریں اثناء اِس عظیم تثلیثی جائزے کا دائرہ جب پنجاب تک وسیع کر دیا گیا تو دریاؤں کی قدیم گذرگاہیں معلوم کی گئیں۔ بہاولپور ریاست کے والی کے زمانہ طفولیت میں جب ریاست کا انتظام کرنل منچن کے ہاتھ میں تھا اُس وقت یہ معلوم ہوا کہ آبپاشی کے نظام کو خاصی وسعت دی جا سکتی ہے اور

وہ اِس طرح سے کہ دریائے ہاکڑا کی دو شاخوں میں دریائے ستلج سے نہریں کھود کر پانی پہنچا دیا جائے۔ یہ شاخیں تریوانہ اور واہند کے نام سے مشہور ہیں۔ اِسی طرح فائف کے تجربہ کو چھوٹے پیمانہ پر کام میں لاتے ہوئے دریائے ہاکڑا کے ایک حصّہ کو پانی سے پُر کر دیا گیا۔9

اِس اطلاع کی روشنی میں ایک گمنام مصنف نے، جو فی الحقیقت ڈاکٹر سی۔ ایف۔ اولڈھم ہے۔ "نوٹس آن دی لوسٹ ریور آف دی انڈس ڈیزرٹ" کے عنوان سے مضمون تحریر کیا جو کلکتہ ریویو، جولائی ۱۸۷۴ء میں شائع ہوا۔ مصنف نے اِس مضمون میں یہ نظریہ پیش کیا کہ ہاکڑا اور نارا دونوں ایک ہی دریا کی قدیم آبی گذرگاہ ہیں اور یہ دریا ستلج ہے اور حالانکہ دریائے سندھ کا سیلابی پانی بھی اِس گذرگاہ کے وسط میں اِس کے اندر داخل ہوتا تھا۔ یہ گذرگاہ دریائے سندھ کی قدیم گذرگاہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر اولڈھم نے اپنے نظریہ کی حمایت میں بہت سے منتخب بیانات اور خاموشیاں ان قدیم مورخین اور جغرافیہ دانوں کے پیش کئے ہیں جن کا تعلق شمالی مغربی ہندوستان سے ہے۔ اِسی طرح مقامی نام اور روایات بھی پیش کی ہیں۔

اِس نظریہ کو دوسرے مصنف نے للکارا جو اپنا نام "نیرکس" لکھتا ہے۔ اِس کا ایک مضمون کلکتہ ریویو، ۱۸۷۵ء میں شائع ہوا۔ اِس مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے اپنے پیش رو سے زیادہ اُس معلومات سے فائدہ اُٹھایا جو اُس وقت کے آبی گذرگاہوں کے جائزے سے حاصل ہوئی تھیں۔ اِس نے دوسرے بیانات اور مفاہیم نیز تاریخی مواد اور سطح ارض کے جائزے پیش کرتے ہوئے اِس مسئلہ پر قطعاً مختلف انداز میں روشنی ڈالی۔ اُس کا نظریہ یہ ہے کہ ہاکڑا کی گذرگاہ قدیم ترین ایام میں دریائے جمنا نے بنائی ہے جبکہ یہ دریا مغرب کی طرف بہتا تھا۔ اور مشرق کی طرف نہیں بہتا تھا جیسا کہ اب ہم دیکھتے ہیں۔ اور یہ کہ ہاکڑا دریائے سندھ سے بکھر کے اوپر ملحق ہو جاتا تھا، اُس وقت دریائے سندھ اپنی موجودہ گذرگاہ سے مشرق کی سمت اپنی گذرگاہ رکھتا تھا۔ مزید یہ کہ دریائے سندھ کا آخری

حصہ نارا کی گذرگاہ سے بہتا ہوا سمندر میں پہنچتا تھا۔ یہ صورت حال گیارھویں صدی عیسوی تک قائم رہی۔ اُس نے یہ تسلیم کیا ہے کہ ہاکڑا میں ستلج کا سیلابی پانی بھی پہنچتا تھا لیکن خود دریائے ستلج کبھی اِس راستے سے نہیں گذرا۔ چنانچہ ہاکڑا کی معاون گذرگاہیں مثلاً نائے وال کے ابتدائی حصے مٹی سے اٹ کر بند ہوگئے ہیں۔ یہ گذرگاہیں صرف ستلج کے سیلابی پانی کی گذرگاہیں ہوسکتی ہیں۔

ج-اے-ایس بنگال- پارٹ دوم ۱۸۸۷ء میں آر-ڈی-اولڈھم کا ایک مضمون شائع ہوا جس کا عنوان "اُن پروبیبل چینجز ان دی جیوگرافی آف دی پنجاب اینڈ اِٹس ریورز "اِس مضمون میں ڈاکٹر سی۔ایف۔اولڈھم کے نظریہ کی حمایت کی گئی ہے۔یعنی دریائے ستلج قدیم زمانہ میں ہاکڑا کے راستے سے بہتا تھا اور اِس سے نہیں گذرتا رہا ہے، یہ ضرور ہے کہ سندھ کا سیلابی پانی نارا میں پہنچتا رہا۔اُس نے یہ تسلیم کیا کہ ممکن ہے کہ پہلے زمانہ میں یعنی ویدک دور سے بھی پہلے دریائے جمنا کا پانی چیتانگ کے راستے ہاکڑا سے پہنچتا رہا ہو لیکن تاریخ کے ابتدائی ایام میں ہاکڑا میں پانی کا آمد کی بڑا ذریعہ صرف دریائے ستلج تھا۔

چونکہ آر۔ڈی۔اولڈھم ایک ماہر ارضیات بھی تھا لہٰذا اُس نے دریائے سندھ کے مخصوص طریقوں پر عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔خاص طور پر بکھر تنگ نائے کے علاقے میں دریائے سندھ کے بہاؤ کا جو طریقہ رہا ہے اُسے واضح کرتے ہوئے "نیرکس" کے دلائل کو رد کیا ہے جس میں نیرکس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ستلج اور ہاکڑا کے درمیان خشک آبی گذرگاہوں کی موجودگی یہ ظاہر کرتی ہے کہ خود دریائے ستلج کی گذرگاہیں ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ آر-ڈی-اولڈھم نے سی-ایف-اولڈھم کے پیش کردہ بہت سے تاریخی شواہد کو بھی درست قرار دیا ہے۔

میجر ایچ-جی-ریورٹی کے نظریات اِس ضمن میں نیرکس کے نظریات سے تقریباً ملتے جلتے ہیں جیسا کہ اُن کے مضمون "دی مہران آف سندھ اینڈ اِٹس ٹرائیبوٹریز" مطبوعہ ج-اے-ایس بنگال ۱۸۹۲ء پارٹ نمبر 1 سے ظاہر ہے لیکن اُنھوں نے مضمون کی پوری

عبارت میں کسی جگہ بھی نیر کس کا حوالہ نہیں دیا۔ میجر ریورٹی اِس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ نارا تاریخی دور میں بھی دریائے سندھ کا اختتامی حصہ تھا۱۰۔ بہرنوع وہ یہ لکھتے ہیں کہ جب دریائے سندھ نے اپنی پرانی گذرگاہ کو چھوڑ کر مغرب کی طرف بہنا شروع کر دیا تو دریائے ستلج اِس کے بعد بھی ہاکڑا۔ نارا کے راستے سے بہتا رہا اور اِس دریا کا وجود میجر ریورٹی کے مطابق ایک پُر آب دریا کی حیثیت سے بہت بعد تک باقی رہا، جبکہ دوسرے مورخین اِس دریا کو اتنی مدّت حیات نہیں دیتے۔

ریورٹی اِس امکان کو مسترد کرتا ہے کہ دریائے جمنا کسی زمانہ میں ہاکڑا تنظیم سے متعلق رہا ہوگا اِن کے دلائل زیادہ تر اُن اتفاقیہ بیانات پر مبنی ہیں جو قدیم مورخین نے وقتاً فوقتاً دیئے۔ اِن مورخین اور جغرافیہ دانوں کے ایسے بیانات کے کافی حوالہ جات مذکورہ مضمون میں دیئے گئے ہیں (یہی حال کلکتہ ریویو میں شائع ہونے والے ابتدائی دور کے مصنفین کے مضامین کا ہے)۔

پنجاب میں حال ہی میں نہروں کا جو سطحی جائزہ لیا گیا اُس کی روشنی میں آر۔ بی۔ وہائٹ ہیڈ نے "سابقہ لکھنے والوں کے نظریات پر بحث کرتے ہوئے ایک مضمون تحریر کیا جس سے یہ بات تقریباً یقینی معلوم ہوتی ہے کہ دریائے جمنا ایک قدیم زمانہ میں مغرب کی سمت بہتا تھا۔ یہ قدیم راستہ چیتانگ اور ہاکڑا سے گذرتا تھا۔ آر۔ بی۔ وہائٹ ہیڈ کے نظریہ کے مطابق ہاکڑا اور نارا اُس قدیم زمانہ میں ایک متحدہ مستقل دریا تھا اور رن کچھ تک پہنچتا تھا۔ اُس نے بیان کیا ہے کہ نسبتاً قریبی زمانہ میں نارا میں الور شہر کے قریب سے دریائے سندھ کا سیلابی پانی پہنچتا تھا۔ لیکن وہ اِس خیال سے متفق نہیں ہے کہ دریائے ستلج کا پانی کسی زمانہ میں ہاکڑا سے گذرتا تھا، (انڈین اینٹی کئیٹز، جلد ۶۱، ۱۹۳۲)۱۱۔

سر اوریل اسٹین نے ۴۰-۱۹۴۱ء میں آثار قدیم کی تحقیقاتی مہم کی دوران ہاکڑا کی گذرگاہ کا بڑی توجہ کے ساتھ جائزہ لیا۔ اُس کی پارٹی میں سروے آف انڈیا سے تعلق رکھنے والا ایک آدمی شامل تھا۔ چنانچہ اسٹین کے مقابلہ میں جو سطحی جائزے پیش کئے گئے ہیں وہ

خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مقالہ "اے سروے آف اینشی اینٹ سائٹس ایلونگ دی لوسٹ سرسوتی ریور" کے عنوان سے جیوگرافیکل جرنل نمبر۴-۱۹۴۲ میں شائع ہوا، دریائے ہاکڑا کے داہنے کنارہ پر سراسٹین نے دو مقامات پر ایسے نشانات دریافت کیے جہاں دوسرا دریا اِس دریا سے ملتا تھا۔ والار (Walar) کے مقام پر سراسٹین نے یقین کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دریائے "ستلج کا قدیم آبی راستہ کافی موڑ کے ساتھ " دریائے ہاکڑا سے ملتا تھا، اِس سے آگے چل کر کڈوالا (Kudwala) کے مقام پر بھی ایسا ہی ستلج کا ایک متروک آبی راستہ دیکھا گیا۔ ستلج بیراج سے موجودہ زمانہ میں جونہریں نکالی گئیں وہ اِنھیں آبی گذرگاہوں کی تقلید کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ہاکڑا کی پٹی پر واقع قبل تاریخ کی انسانی آبادیوں کے جو آثار ملتے ہیں اُنکے مشاہدے کے بعد اسٹین اِس نتیجہ پر پہنچتا کہ دریائے ستلج نے ہاکڑا کے راستے اپنی آبی گذرگاہ کو قبل تاریخ کے آخری دور میں ترک کیا۔ دراوڑ کے قرب وجوار کے علائقہ کی ایک خصوصیت کی طرف بھی اُس نے توجہ دلائی ہے۔ یعنی دریا کا شاخوں میں منقسم ہونا جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ دریا سمندر سے نزدیک ہونے کی صورت میں ڈیلٹا بنا رہا ہے اور اختتامی شاخوں کا ایک جال بچھا ہوا نظر آتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو پانی اِن راستوں سے سمندر میں پہنچا اُس کی مقدار کثیر تھی۔

چنانچہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک لکھنے والے نے اِس مسئلہ کی وضاحت میں کچھ نہ کچھ مواد ضرور پیش کیا ہے اور اب اِن تمام بیانات سے ممکنہ حقیقت کو تلاش کرنا زیادہ آسان ہے۔

ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ ہاکڑا کا وجود دریائے جمنا کا مرہون منت ہے جو کسی قدیم ترین زمانہ میں مغرب کی سمت بہتا تھا لیکن ممکن ہے دریائے ستلج بھی تقریباً اتنے ہی قدیم زمانہ سے ہاکڑا کے راستے بہتا رہا ہو۔ اور یہ تو یقینی ہے کہ جب جمنا نے ہاکڑا کو ترک کر کے مشرق کا بہاؤ اختیار کر لیا تو اُس کے بعد مدتوں تک دریائے ستلج اپنا فاضل پانی ہاکڑا میں پہنچاتا رہا۔ اگر ہاکڑا نارا کی اپنی ایک الگ خود مختار دریا کی حیثیت تھی جو سمندر تک پانی

پہنچا تا تھا تو وہ صرف اُسی وقت کہ جمنا اپنا پانی اِس میں دھکیل دیتا تھا۔ لیکن ستلج کا کُل پانی کبھی اِس راستہ سے گذرا ہو گا یہ مشکوک ہے۔ جو آثار باقی ہیں وہ محققین کو اِسی نتیجہ پر لیجاتے ہیں کہ ستلج کا ایک حصہ آب ہاکڑا سے گذرا کرتا تھا۔ ستلج اور ہاکڑا کے درمیان جو بہت سی گذرگاہیں ملتی ہیں وہ شاید سیلابی پانی کو ہاکڑا تک پہنچاتی تھیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ سیلاب تقریباً ہر سال باقاعدگی سے ہاکڑا تک پہنچتا تھا۔ دیراوڑ کے قریب جو ڈیلٹائی علاقہ ہے وہ میرے خیال میں اُس زمانہ کا پتہ دیتا ہے جب ہاکڑا ایک بارہ ماسی دریا کی حیثیت ختم کر چکا تھا اور صرف سیلابی پانی کی گذرگاہ رہ گیا تھا۔

پہلے مشاہدات کی رو سے نارا دریا ایک سیاہ مٹی والا دریا نہیں معلوم ہوتا اور اِس کا خط وادی بھی پست ہے لیکن اِس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ دریا کبھی بھی دریائے سندھ کی اختتامی گذرگاہ نہیں رہا۔ بلکہ صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی طویل مدت کے لئے دریائے سندھ اس راستے سے نہیں بہا۔ کم از کم یہ زمانہ اتنا طویل نہیں تھا کہ مغربی میدان اتنا بلند تعمیر کر دیتا، نیز یہ کہ اگر کسی وقت دریائے سندھ نے نارا کا راستہ اختیار کیا بھی ہوتا تو وہ اُسے صرف اُسی صورت میں ترک کر سکتا تھا کہ اُس سے بھی نیچی سطح بہاؤ کے لئے مل جاتی۔ عملاً تاریخی جغرافیہ کے نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے اور علم الارضیات سے بحث نہ کی جائے تو ہم اِسی نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ نارا دریائے سندھ کے سیلابی پانی کی مستقل گذرگاہ رہا ہے۔ مختلف مقامات سے یہ پانی اِس کے اندر آتا تھا جن میں بلند ترین وہ مقام تھا جہاں پنجاب کے دریا دریائے سندھ سے ملتے ہیں۔

جہاں تک تاریخی دور کا تعلق ہے ہاکڑا اور نارا آبی رسد کے لئے مختلف ذریعوں پر انحصار کرتے تھے۔ دیراوڑ جہاں ستلج کے سیلاب کا اثر ختم ہو جاتا ہے، اور غوث پور جہاں سے وہ نشیب شروع ہوتا ہے جو نارا تک پہنچتا ہے یقیناً ہاکڑا کی معدوم آبی گذرگاہ کا حصہ ہے۔ یہ خطہ اُڑنے والی ریت سے اب اِس قدر ڈھک گیا ہے کہ اصل گذرگاہ کا پتہ چلانا ممکن نہیں۔ چنانچہ گمشدہ دریا کا یہ حصہ اُس قدیم ترین زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جب مذکورہ بالا

جمنا کے بہاؤ کا مغربی دور تھا اور ستلج کا پانی بھی ہاکڑا کو ملتا تھا اور یہ دریا پُر از آب سمندر تک پہنچتا تھا۔

مذکورہ بالا تسلسل اُس آبی گذرگاہ کا جسے ہم ہاکڑا کے نام سے پکارتے رہے ہیں دوسرے شواہد سے بھی آشکار ہے۔ اِس دریا کا اختتامی حصّہ جو جنوبی مشرقی سندھ میں سے گذرتے ہوئے سمندر تک پہنچتا ہے، دوبارہ پھر ہاکڑا کے نام سے ہی آج بھی پکارا جاتا ہے۔ بہرنوع مقامی باشندے جو اِس کے کناروں پر آباد ہیں اِس دریا کو اور اِسی طرح وہ لوگ جو وسطی اور بالائی سندھ میں نارا اور اُس کے معاون رینی اور واہند کے کناروں پر رہتے ہیں، اُن دریاؤں کو دریائے سندھ کے سیلابی پانی کی گذرگاہوں سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

تشریحات

1. حقیقت یہ ہے کہ جو آبی گذرگاہ بہمن آباد کے قریب اور دوسرے مقامات (اکثر دوسرے ناموں کے ساتھ) بہمن آباد کے شمال اور جنوب میں نظر آتے ہیں وہ نارا کے بہاؤ کو ظاہر نہیں کرتے بلکہ ایک الگ راستہ اختیار کئے ہوئے ہیں جو ریگستان کے مغربی کنارے کے ساتھ کسی قدر مغربی سمت رکھتے ہیں اور عام طور پر موجودہ میرواہ اور نصرت کینال کے بہاؤ سے مشابہ ہیں۔
2. جے-آر-اے-ایس جلد اوّل (۱۸۳۴) صفحہ ۲۰-۲۴۔
3. ملاحظہ ہو کننگھم کی "اینشی اینٹ جیوگرافی آف انڈیا" صفحہ ۵۲-۲۵۱ بمعہ نقشہ میک کرنڈل کی "اینشی اینٹ انڈیا" (آریان)۔
ٹارن کی "الیگزنڈر دی گریٹ" جلد اوّل-صفحہ ۴-۱۰۳۔
سی-سی-ڈیویس- "این ہسٹوریکل اٹلس آف دی انڈین پین سولا" نقشہ نمبر ۴۔
4. "اے میموائر آف اے میپ آف دی ایسٹرن برانچ آف دی انڈس" مصنف لفٹنٹ الیگزنڈر برنس (گورنمنٹ لیتھوگراف پریس۔ بمبئی ۱۸۲۸) پیرا نمبر ۱۲ نیز اسی کا ضمیمہ۔ پیرا-۵-۶-۱۱۔
5. کیپٹن ڈبلیو پوٹنجر "میموائر آن سندھ" ۱۸۳۲، پیرا بابتہ "دی نارا اور نالہ" نیز لفٹنٹ ڈیل ہوسٹ۔ "میموائر آن سندھ" ۱۸۳۲۔ پیرا بابتہ "دی پران"۔
6. ایس۔آر۔بی۔جی نیو سیریز (۱۸۶۷) صفحہ ۱۔۵۔
7. ایضاً۔صفحہ ۲۶۔
8. ایضاً۔صفحہ ۴۴۔
9. آر۔بی۔بکلے "اری گیشن ورکس آف انڈیا"۔۱۸۸۰۔صفحہ ۱۵۵۔۱۵۶۔
10. سندھ کے اختتامی حصہ کے لئے ریورٹی "مہران" کا نام استعمال کرتا ہے اور دریائے سندھ کے اُس حصہ کو جو پنجاب کے دریاؤں سے اتصال سے پہلے بالائی ملک میں ہے "مہران" کے ایک معاون دریا کی حیثیت دیتا ہے۔
11. "دی ریور کورسز آف دی پنجاب اینڈ سندھ" (انڈین اینٹی کوری ۱۹۳۲)۔

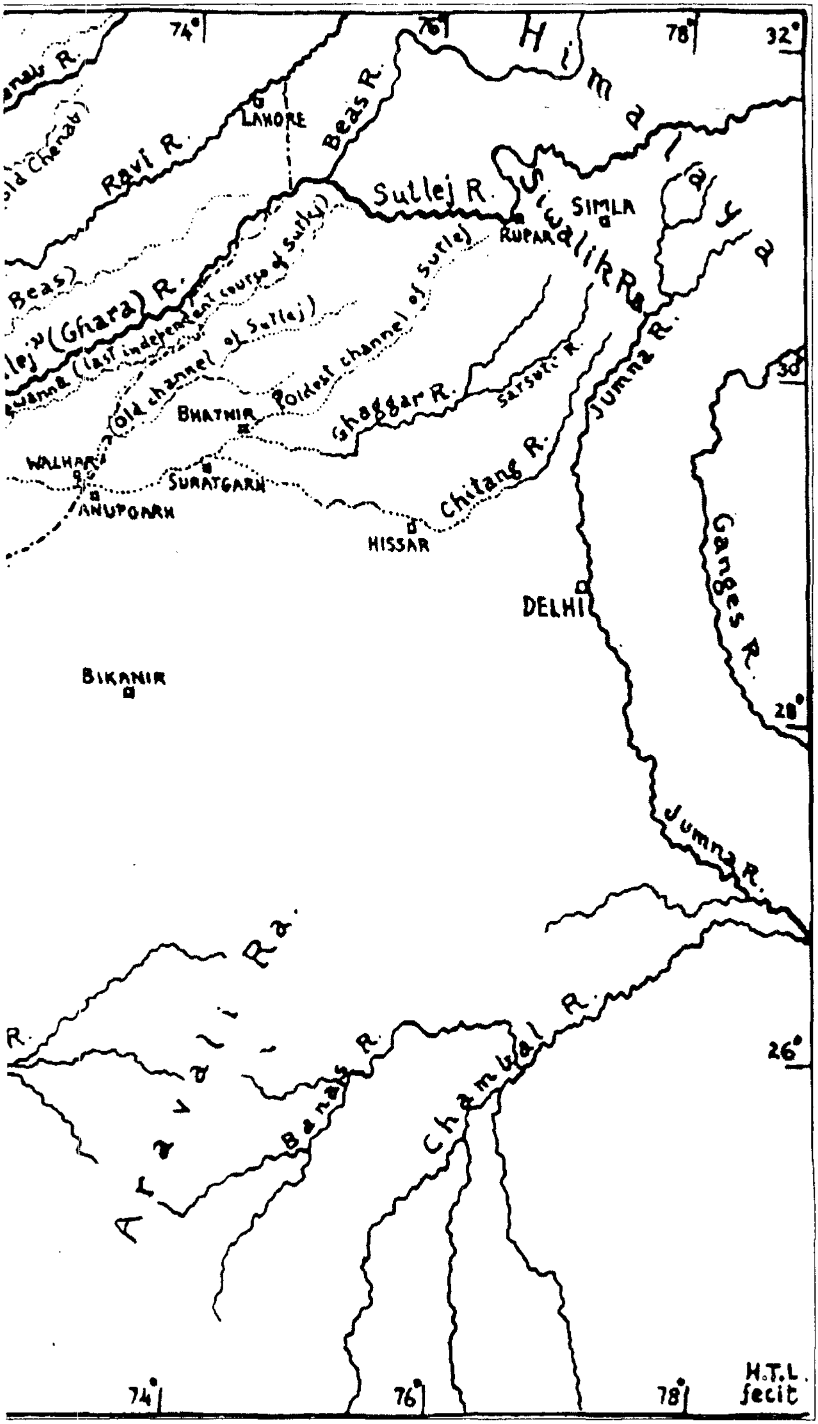

74°
76°
78°
32°
30°
28°
26°
Himalaya
Siwalik Ra.
Ravi R.
Beas R.
Sutlej R.
LAHORE
SIMLA
RUPAR
Beas)
(Ghara) R.
old Chenab)
(last independent course of Sutlej)
(old channel of Sutlej)
(oldest channel of Sutlej)
Ghaggar R.
Sarsuti R.
Jumna R.
Chitang R.
BHATNIR
WALHAR
SURATGARH
ANUPGARH
HISSAR
DELHI
BIKANIR
Ganges R.
Aravalli Ra.
Banas R.
Chambal R.
R.
H.T.L. fecit

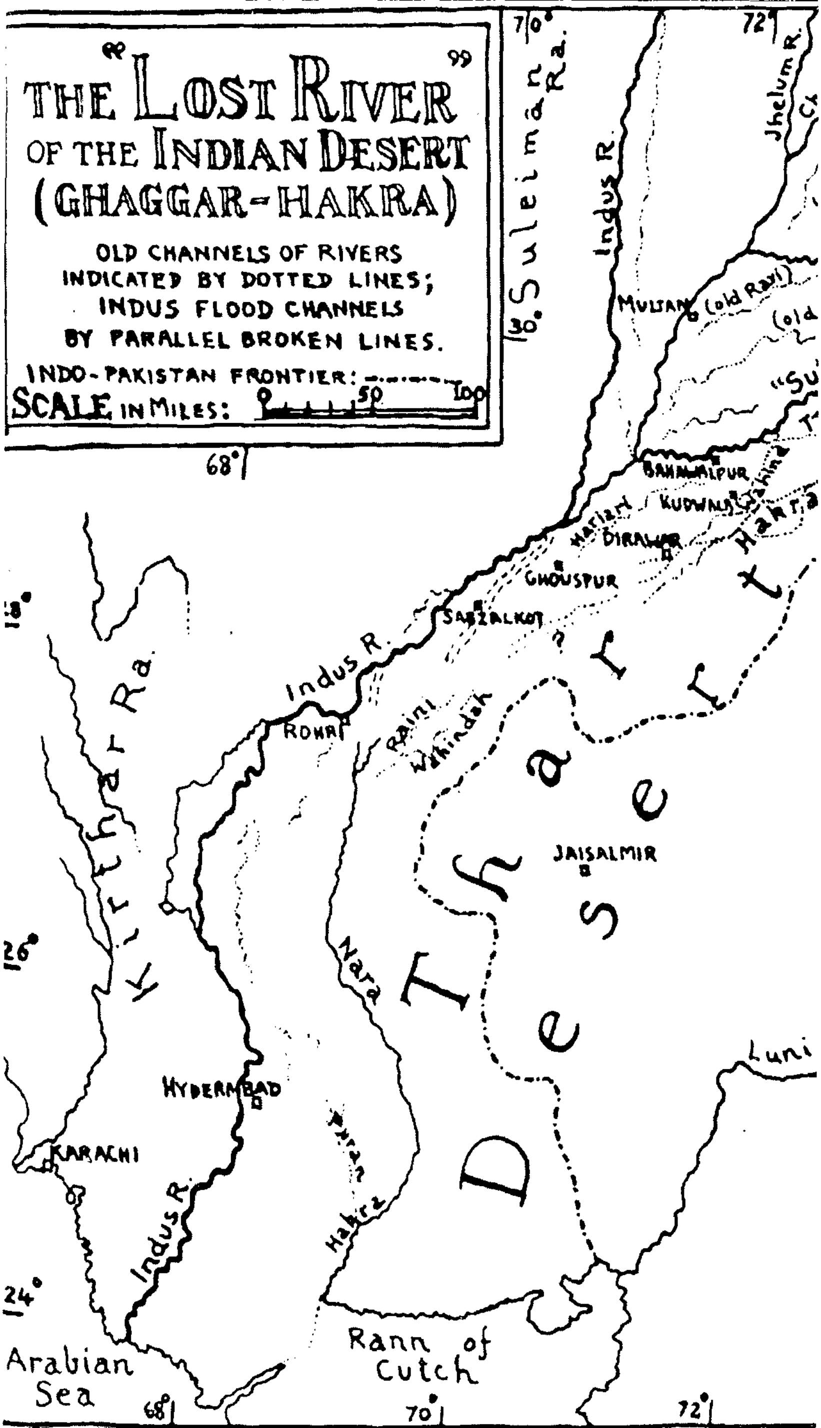

"THE LOST RIVER" OF THE INDIAN DESERT (GHAGGAR-HAKRA)
OLD CHANNELS OF RIVERS INDICATED BY DOTTED LINES; INDUS FLOOD CHANNELS BY PARALLEL BROKEN LINES.
INDO-PAKISTAN FRONTIER:
SCALE IN MILES: 0 50 100
68°
70°
72°
30°
28°
26°
24°
Suleiman Ra.
Indus R.
Jhelum R.
MULTAN
(old Ravi)
BAHAWALPUR
KUDWALA
DIRAWAR
GHOUSPUR
SABZALKOT
ROHRI
Raini
Wahindah
Nara
Hakra
Kirthar Ra.
HYDERABAD
KARACHI
JAISALMIR
Thar Desert
Luni
Rann of Cutch
Arabian Sea

ضمیمہ نمبر ۲

زمانہ وسطیٰ کے عرب جغرافیہ دانوں کی کاوشیں اور اُن کی اہمیت

حالانکہ عرب اور اُن کے بعد دوسرے مسلم جانشین سندھ اور بلوچستان پر آٹھویں صدی عیسوی سے عرصہ دراز تک مسلسل قابض رہے اور پڑوسی ممالک سے بھی اُن کے تعلقات قائم رہے۔ لیکن اِس خطہ زمین کے بارے میں عرب جغرافیہ شناسی جو اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہوتی ہے جغرافیہ کے لئے کوئی عقلی بنیاد تلاش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ اور تین یا چار صدی بعد تک بھی اِسی صورت حال میں کوئی واضح بہتری نظر نہیں آتی۔ حالانکہ چار سو سال کے عرصہ میں عام معلومات کا خزانہ یوں بھی خاصہ وسیع ہو چکا ہوگا جس کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ سابقہ غلطیوں کا ازالہ کر دیا جاتا۔

عرب جغرافیہ دانوں کی یہ کوتاہی نقشہ نویسی میں خاص طور پر نمایاں نظر آتی ہے۔ سندھ کے وہ نقشے جو الاصطخری اور ابن حوقل کی کتابوں میں ملتے ہیں وہ لمبائی کے پیمانہ کا کوئی معیار نہیں رکھتے چنانچہ ساحلی مقامات یا دوسرے اہم نشانات اِس طرح دکھائے گئے ہیں۔ کہ اُن کا محل وقوع یا اُن کے درمیان فاصلہ بالکل صحیح تو درکنار۔ قریب قریب صحیح بھی نہیں دکھایا جا سکا۔ دریا کی شاخ جو منصورہ کو گھیرے میں لئے ہوئے دکھائی گئی ہے اُس میں صحت کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ ایک نقشہ کے اندر منصورہ شہر کو بڑے دریا کے بائیں کنارے پر دکھایا گیا ہے، دوسرے میں شاخ کے دائیں کنارے پر۔

مذکورہ بالا مصنفین ہوں یا اِن سے پہلے کے عرب جغرافیہ نویس۔ دونوں ہی نے سیاحتی ناموں کو اپنی تصنیفات کی بنیاد بنایا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اِس بات کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں کہ دو مقامات کے درمیان صحیح فاصلہ کا تعین کسی قدر ضروری ہے اور ایک

قابلِ عمل معیار مقرر کرنے میں وہ لوگ ناکام رہے۔

اِس ضمن میں پروفیسر ہودی والا بجا طور پر یہ لکھتا ہے "یہ سیاحت نامے جن کے بارے میں کافی شہرت سے کام لیا گیا اُن توقعات پر پورے نہیں اُترے جو اِن کی اولین اشاعت کے وقت وابستہ کی گئی تھیں۔ یعنی یہ کہ سندھ اور بلوچستان کے تاریخی جغرافیہ پر نتیجہ خیز روشنی ڈال سکیں گے۔ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ اِنھوں نے موضوع کو واضح کرنے کے بجائے مزید دھندلا کر دیا ہے[۲]۔

اِس میں جغرافیہ نویسوں کی کوئی غلطی نہیں کہ فاصلہ بیان کرنے کے لئے اِن لوگوں نے جو پیمانہ استعمال کیا یعنی فرسخ۔ وہ ہر علاقہ میں دوسرے سے مختلف فاصلہ ظاہر کرتا ہے، بہرنوع شکر کا مقام ہے کہ ابن خرداذبہ۔ المسعودی اور البیرونی۔ سب کے سب کم ازکم یہ تو ظاہر کر دیتے ہیں کہ فاصلہ کے متعلق اُن کے پیمانوں کا معیار کیا تھا، لیکن جب ہم اِن پیمانوں کے مطابق فاصلے نکالتے ہیں تو نتیجہ ایک دوسرے کے مطابق نہیں بلکہ بہت مختلف سامنے آتا ہے۔ مثال کے طور پر المسعودی نے ملتان اور منصورہ کے درمیانی فاصلہ کو ۷۵ فرسخ جو ہر ایک آٹھ میل کے برابر ہے،" بیان کیا ہے، اِس حساب سے یہ فاصلہ تقریباً چھ سو انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے[۳]۔ البیرونی نے یہ فاصلہ پچاس فرسخ بیان کیا ہے، اُس کے معیار کے مطابق ایک فرسخ تقریباً ساڑھے چار میل سے کچھ زیادہ ہوتا ہے گویا کُل فاصلہ تقریباً ۲۲۵ میل ہوا۔ صحیح فاصلہ تقریباً ۳۶۰ انگریزی میل ہے۔ الاصطخری کہتا ہے کہ اُن دونوں مقامات کا درمیانی فاصلہ بارہ دن کی مسافت کے برابر تھا۔ یہ بھی خاصہ کم اندازہ ہے۔

فاصلہ کا یہ پیمانہ، یعنی "ایک دن کی مسافت" عرب جغرافیہ نویسوں نے عادتاً بار بار استعمال کیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اِس سے سفر طے کرنے کے ذریعہ قیام کی سہولت۔ راستے کا آسان یا دشوار گذار ہونا وغیرہ وغیرہ بہت سی باتوں کا اثر پڑتا ہے۔ حالانکہ الادریسی جو اِن لوگوں سے بہت بعد کے زمانہ کا اہل قلم ہے یہ کہتا ہے کہ ایک دن کی مسافت عام طور پر تیس

میل اور زیادہ سے زیادہ چالیس میل میں سمجھی جانی چاہئے۔ لیکن یہ پیمانے کوئی معیار نہیں اور سیاحت ناموں میں دو معروف مقامات کے درمیانی فاصلہ پر جب مذکورہ معیار الگ الگ منطبق کئے جاتے ہیں تو ہر ایک کا نتیجہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔[۴۹]

جب معروف مقامات کے درمیان فاصلہ کے بارے میں اِس قسم کی غلطیوں کا سامنا ہوتا ہے تو پھر یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ سیاحت ناموں کی مدد سے ہم غیر معروف مقامات کے جائے وقوع کو معلوم کرسکیں گے۔ اِن مقامات میں سے اکثر و بیشتر کے بارے میں صرف قیاس آرائی کی جاسکتی ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ جب یہ نقشے اور کتابیں شناختی نشانات کو سرے سے بیان ہی نہیں کرتے اور عبارت سے چھ یا سات مختلف مطالب نکالے جاسکتے ہیں۔ یہ شبہ بھی لازماً پیدا ہوتا ہے کہ نقل نویسوں نے اصل الفاظ کو کہیں کہیں ضرور بدل دیا ہوگا کیونکہ الفاظ ہی ایسے ہیں کہ اُن میں غلطی کردینا عین ممکن تھا۔ اِس ضمن میں یہ واضح کردینا ضروری ہے کہ عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں زیر زبر کی غلطیوں سے مطلب بہت کچھ بدل جاتا ہے۔

شمالی مغربی ہندوستان کے متعلق اگر کوئی طبعی شکل ایسی ہے کہ جسے ایک وہ جغرافیہ نویس جسے مقامی اطلاعات وتفصیلات جمع کرنے کا موقع ملا ہو۔ بہت احتیاط کے ساتھ منضبط کرسکتا ہے تو وہ پنجاب کے دریاؤں کا ایک دوسرے سے تعلق ہے اور اِن سب کا دریائے سندھ سے تعلق ظاہر کیا جاسکتا تھا۔ ٹالیمی نے اِن دریاؤں کی حد بندی نہایت اعلیٰ طریقہ پر کی ہے۔ اُس نے ملک کے تفصیلی حالات کے لئے ارسطو بولس اور میگستھینز کے بیانات سے بڑی مدد لی ہے اور اِن بیانات کی تصدیق کے لئے اپنے وقت کی صحیح ترین مقامی اطلاعات فراہم کی ہیں۔ موازنہ کی خاطر میں یہاں عرب جغرافیہ دانوں کے بیانات کو پیش کرنا چاہوں گا جو اُنھوں نے دریائے سندھ کے معاون دریاؤں کے بارے میں تحریر کئے ہیں۔ یہ بیانات اُن کی تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرونگا۔

المسعودی نے راوی، بیاس، کابل اور کشمیر (جہلم) کا نام دیا ہے لیکن چناب اور ستلج کو نظر انداز کردیا ہے الاصطخری نے اِن دریاؤں میں سے صرف ایک نام "رودِ سندھ" تحریر

کیا ہے، ابن حوقل کی معلومات کے مطابق دو دریا تھے جنھیں اُس نے سندھ رود یا سندروز اور جندرورد دریا جندروز کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ ہودی والا کے مطابق ستلج اور چناب کا متحدہ چشمہ ہے جو آجکل تریماب کے نام سے مشہور ہے۵۔

یہ پیش نظر رہے کہ مذکورہ تینوں مصنفین دریائے سندھ کی وادی میں سفر کرتے رہے تھے۔ البیرونی نے پانچوں دریاؤں کو اُن کے معروف ناموں کے ساتھ بیان کیا ہے، اُس نے سنسکرت ادب کے ذرائع سے استفادہ کیا ہے۔ حالانکہ ترتیب کے لحاظ سے اُس نے راوی اور بیاس کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ راوی ملتان کے مشرق میں اور بیاس ملتان کے مغرب میں بہتا ہے۔٦ ریورٹی نے البیرونی کے اِس سہو کو غیر ضروری اہمیت دے ڈالی اور ظاہر ہے کہ البیرونی کی ماہرانہ حیثیت کو خراب کرنے کے لئے ایسا کیا گیا۔ کیونکہ جب تک البیرونی کے اِس بیان کو رد نہیں کیا جائیگا کہ ستلج دریائے سندھ کے ساتھ پنج ند کے راستے متصل ہوتا ہے ریورٹی کا مشہور مہران۔ ہاکڑا نظریہ دھڑام سے زمین بوس ہوجاتا ہے۷۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسرے جغرافیہ نویسوں کے مقابلہ میں البیرونی کے بیان کو زیادہ وقعت اور اہمیت کی نظر سے دیکھنا چاہیئے۔ نہ صرف اِس لئے کہ اُس نے خود کچھ عرصہ تک ملتان میں قیام کیا بلکہ اِس لئے بھی کہ شروع سے آخر تک اُس کی نگارشات میں تحقیقی نظر کی شہادتیں ملتی ہیں اور یہ کہ اُس نے موضوع پر عالمانہ اور ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔

الادریسی اُس تمام مواد کے باوجود جو اُس سے پہلے کے اہل قلم چھوڑ گئے مذکورہ بالا اوصاف اور صلاحیتوں سے خالی نظر آتا ہے۔ اُس کی تصنیفات کیسی ہی قدر کی نظر سے کیوں نہ دیکھی جائیں لیکن یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُس میں تمیز کرنے اور انتخاب کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔٨ چنانچہ اُس نے البیرونی کو نظر انداز کیا اور لکھا کہ دریائے سندھ کے دو معاون دریا تھے۔ معلوم ہوتا ہے اُس نے آنکھ بند کرکے ابن حوقل کے بیان پر اعتماد کیا ہے اور اِس میں بھی اُس نے ابن حوقل کے بیان کردہ دونوں دریاؤں کے نام تحریر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔٩ آنیوالی صدیوں کے دوسرے مسلمان مصنفین نے اِس ضمن میں

غضب کی لاپروائی اور کم علمی کا مظاہرہ کیا ہے۔

گذرے ہوئے اہل قلم کے بیانات کو بلا تنقید و تبصرہ نقل کردینے کی عادت اتنی عام ہے کہ بیانات کی بہ ظاہر تصدیق بے معنی ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر یعقوبی نے تیرھویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف میں لغتِ جغرافیہ مرتب کی، اِس میں اُس نے منصورہ (سندھ) کی بہت سی دلچسپ تفصیلات دی ہیں ۱۰۔ اب ذرا اِن تفصیلات کو دسویں صدی کے لکھنے والوں کے بیانات سے جن میں المسعودی بھی شامل ہے ملا یئے تو معلوم ہوگا کہ یعقوبی نے صرف اِن لوگوں کی سیدھی سادی نقل کردی ہے۔

ہمیں منصورہ کے بارے میں دوسرے ہم عصر ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اُن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی کی ابتداء میں ہی منصورہ کوئی قابل اہمیت شہر نہیں تھا کم ازکم اتنا تو سب ہی جانتے ہیں کہ اُس وقت قریشی النسل کوئی حکمراں اِس شہر کا حاکم نہیں تھا حالانکہ اِسی نسل کے حاکم اِس شہر پر حکومت کرتے تھے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بیڈیکر کا "گائیڈ ٹو ریورپ (۱۹۶۱)" یہ بیان کرلے کہ فرانس پر بوربون خاندان سے تعلق رکھنے والا بادشاہ حکومت کرتا ہے۔

میں نے یہ ضروری نہیں سمجھا کہ اِس جلد میں عرب جغرافیہ نویسوں کے بیان کردہ ایک مقام مان ہٹارا یا مانہاباری کا حوالہ دوں کیونکہ تاریخ سندھ میں کبھی اِس مقام کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ لیکن اِن لوگوں نے اِس ایک مقام کے بارے میں (اگر یہ ایک ہی ہے) جو کچھ کہا ہے وہ ایسی ہی غلطیوں سے پُر ہے جیسی غلطیاں اِن کے بیانات میں اکثر ملتی ہیں۔ پہلی غلطی تو یہی ہے کہ خود نام ہی مشکوک ہے۔ جو دو نام مذکور ہو چکے ہیں اُن کے علاوہ یہ منجاباری بھی ہو سکتا ہے وہ نقشہ جو اُشکل البلاد میں شامل ہے، اِس کے محل وقوع کی وضاحت کرتا ہے، اور الاصطخری اور ابن حوقل کے بیان کے مطابق ہے، یعنی مہران کے مغرب میں شہر منصورہ کے مقابل ۱۱۔ لیکن دوسری جگہ ابن حوقل نے لکھا ہے کہ یہ مقام مکران میں واقع قنازبور کو جانے والے راستے پر واقع اور دیبل سے دو منزل کے فاصلہ پر تھا ۱۲۔ گویا نقشہ پر

جو دوسرا مقام کمبالی کے نام سے دکھایا گیا ہے یہ محل وقوع اس کا ہے اور یہ دریا سے کئی دن کی مسافت کے فاصلے پر ہے۔ اس جگہ کے متعلق یہ بیان کرتا ہے کہ سہون (شوآستان) سے تین دن کی مسافت پر اور فرابوز (قنازبور) سے چھ دن کی مسافت اور دیبل سے دو دن کی مسافت پر تھا۔[۱۳]

ہیگ اور ہولڈچ کا قول ہے کہ ایک ہی نام کے دو مقامات تھے، چنانچہ الاصطخری نے شاید ایک حوالہ دیا ہے اور ابن حوقل نے دونوں کا (جبکہ الگ الگ اُن کی شناخت بیان نہیں کی) اور الادریسی نے دونوں کو غلط ملط کر دیا ہے الادریسی کا بیان کہ "سہون سے تین دن کی مسافت ہے" الاصطخری کے بیان کردہ سنجاباری کے مطابق ہے اور باقی حصہ ابن حوقل کے بیان کردہ دوسرے منجاباری کے مطابق ہے جو دیبل سے فیرابوز جانے والے راستے پر واقع تھا۔

ہودی والا کہتا ہے کہ اِس نام کا مقام ایک ہی تھا اور ابن حوقل کا بیان درست ہے یعنی دیبل سے قنازبور جانے والے راستے پر دو دن کی مسافت۔ منصورہ اور نیرون سے اِس مقام کی جو سمت اور فاصلہ بیان کیا گیا ہے وہ ہودی والا کے مطابق نقل نویسوں کی غلطی ہے۔ اِن لوگوں نے مصنف کے بیان سے دونوں مرتبہ "قنازبور" سمجھا۔

ہودی والا کا خیال ہے کہ مانا باری کا مقام بھنبھور سے مماثلت رکھتا ہے جو اِن مصنفین نے بیان نہیں کیا۔ رچرڈ برٹن کے قول کے مطابق یہ مان ہارا کے نام سے بھی مشہور تھا۔[۱۴]

ایک قسم کی نشانیوں کے لئے یہ معقول تجویز معلوم ہوتی ہے لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ دوسرے قسم کی نشانیوں کے ساتھ اِس کی کوئی مطابقت نہیں ہے خود ہودی والا کے بیان کے مطابق نہیں ہے ہم من مانے طریقے پر اِس کا محل وقوع کیوں نہ فرض کر لیں۔ (!)

زمانہ حال کے تبصرہ نگاروں نے مان ہاباری کے لئے جو مختلف محل وقوع پیش کئے ہیں اُن پر نظر ڈالنے سے حیرت میں اضافہ ہوتا ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

میک مرڈو: روپا پرگنہ میں واقع ہے (شہداد پور تعلقہ کے جنوب میں۔ یہ محل وقوع

ہیگؔ کے بیان سے مطابق رکھتا ہے جس نے اپنے مفروضہ دومان ہاباری شہروں میں سے ایک کا محلِ وقوع بیان کیا ہے)

کننگھم: اسے ٹھٹہ قرار دیا ہے۔

ریورٹی نے پہلے اسے مانجھند قرار دیا اور پھر اُسے بدین قرار دیا۔

اس طرح قطب نما کا ایک کانٹا تقریباً دو ہزار مکعب میل کے ایریا میں گھومتا ہے، ہم کننگھم اور ریورٹی پر اس خاص نظرئے پر قائم رہنے کی وجہ سے تنقید کر سکتے ہیں اسی طرح سے یہ مغالطہ راوی کی لاپرواہی کی وجہ سے ممکن ہوئی ہوگی۔

تشریحات

1. ''عرب'' سے میرا مقصد وہ مسلمان مصنف جس نے عربی میں لکھا۔
2. ''ہند مسلم تاریخ کا مطالعہ'' ص ۳۰۔
3. ہودی والا سمجھتا ہے کہ مسعودی سندھی فرسخ ''بی یوجنہ'' کے برابر ہے (دیکھو کننگھم کا ''ہندستان کا قدیم جغرافیہ'' کا ضمیمہ ''ب'' ص ص ۷۔۱۷۵) وہ سندھی فرسخ کے پیمانے کے برابر آدھا جتنا عام فرسخ یہ کام لاتا ہے، اور گروہ یہاں پر لاگو کیا جائے تو فاصلہ تقریباً صحیح ہوگا۔ (ہودی والا ص ۲۸)
4. ھودی والا، ص ص ۳۰۔۳۲۔
5. ''مروج الذہب'' مترجم اے اسپرہنگر، ص ص ۲۔۳۸۱، ایلیٹ، جلد پہلا، ایڈیشن ص ۲۲۔۲۳، ۳۰۔۴۰، ہودی والا ص ص ۳۹۔۴۰۔
6. ''تاریخ الہند'' ایڈیٹر: ای. سچاء، جلد پہلا، ص ص ۲۵۸۔۲۶۰۔
7. ''مہران'' ص ص ۲۰۔۲۱۹۔
8. ھودی والا، ص ص ۵۹۔۶۰۔
9. ایلعٹ پہلا جلد، ص ۸۳، ہودی والا ص ۵۔۹۴۔
10. فرنیچ (مترجم: ''برییرڈی بینارڈ'') پیرس ۱۸۶۱ء ص ص ۷۔۵۴۶۔
11. ایلعٹ پہلا، ص ۳۷
12. ایضاً ص ۴۰۔
13. ایلعٹ پہلا، ص ص ۷۹۔۸۰، فرایز باتنزب شاہی پنجگور ہودی والا، ص ۶۳۔
14. ھودی والا، ص ص ۸۔۳۶۔
15. منکمرڈو، ''مملکت سندھ کا احوال'' وغیرہ ر.ا.س. رجلد پہلا، ص ۲۳۳، ہیگ، ''سندھ ڈیلٹا والا ملک'' ص ۶۸، کننگھم ''ھندوستان کا قدیم جغرافیہ'' ص ۲۸۹، ''ریوٹی'' ''مہران آف سندھ'' ص ۹۰۔۲۲۷ اور نوٹ، ھودی والا مذکورہ بالا حوالہ ہیگ ''سندھو ڈیلٹا والا ملک'' ص ص ۸۔۶۷۔

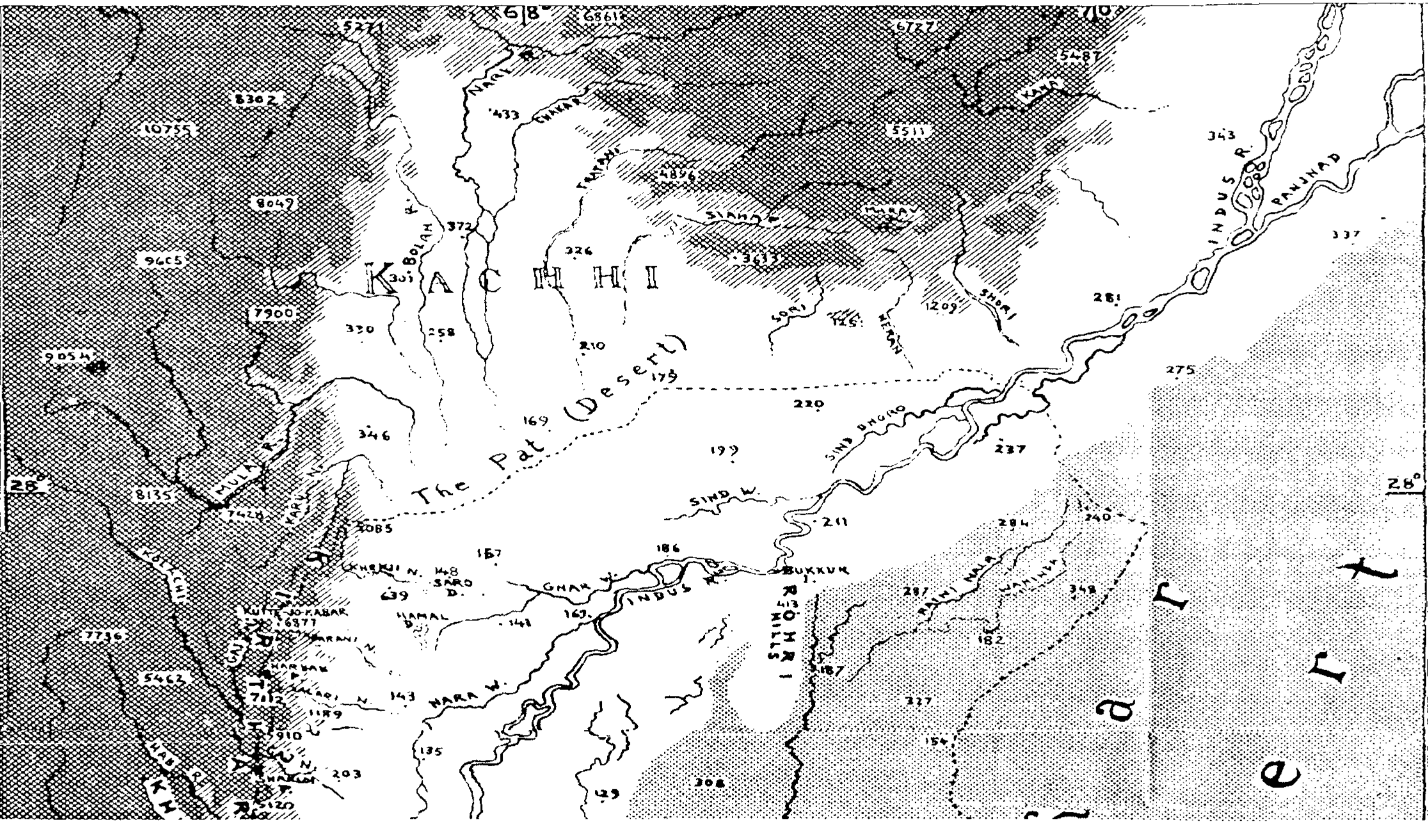

KACHHI
The Pat (Desert)
BOLAN R.
NARI R.
CHHATR
MULA R.
INDUS R.
PANJNAD
SIND W.
SIND DHORO
GHAR W.
NARA W.
BUKKUR I.
ROHRI HILLS
HAMAL D.
SARO D.
SHORI
SORI
KAHA
KARU N.
KOLACHI
10755
8302
8047
9665
7900
9054
8135
5462
7736
5511
6727
5487
68°
70°
28°

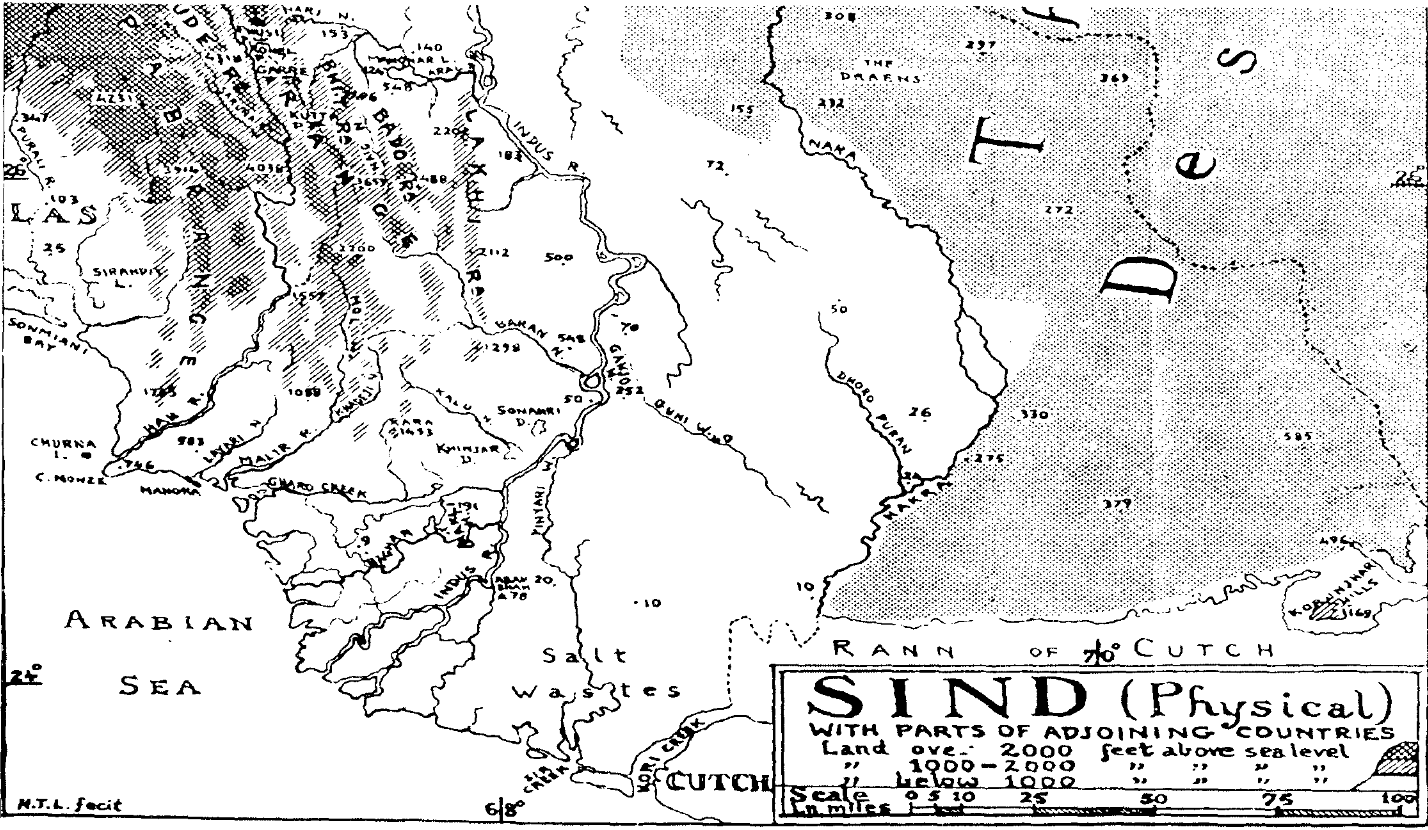
SIND (Physical)
WITH PARTS OF ADJOINING COUNTRIES
Land over 2000 feet above sea level
" 1000-2000 " " " "
" below 1000 " " " "
Scale in miles 0 5 10 25 50 75 100
ARABIAN SEA
RANN OF CUTCH
CUTCH
Salt Wastes
INDUS R.
NARA
LAS
SONMIANI BAY
CHURNA I.
C. MONZE
MANORA
GHARO CREEK
MALIR R.
LAYARI N.
HAB R.
SIRANDVI L.
KORI CREEK
PINYARI
DHORO PURAN
NAKRA
THE DRAENS
N.T.L. fecit

BIBLIOGRAPHY

Books

1. Akbar Nama.
2. Alexander The Great, by Sir W. Tarn.
3. A Manual of the Geology of India & Burma, by Sir E. H. Pascoe.
4. Anabasis, by Arrian.
5. An Account of the Country of Sindh, by James McMurdo.
6. Ancient Geography of India, by Major General Sir A. Cunningham.
7. An Historical Atlas of the Indian Peninsula, by C.C. Davies.
8. An Introduction to the Study of Indian History, by D.D. Kosambi.
9. Annals & Antiquities of Rajasthan, by James Tod.
10. Antiquities of Sind, by Cousins.
11. Araish-e-Mehfil, by Mir Sher Ali Afsos: tr. H. Court.
12. Archaeological Survey Reports, by Major General Sir A. Cunningham.
13. Ashkal-al-Bilad, by Ibn-i-Hauqal apud Sir H. M. Elliet.
14. Bibliotheca Historica, by Diodorus Siculas.
15. Brihat Samhita, by Varahamihira, tr. H. Kern.
16. Cambridge History of India.
17. Chachnamah, ed. Kalich Beg.

17. (a) Chachnamah, ed. Dr. Nabi Bakhsh Baloch.

18. Dry Leaves from Young Egypt, by ex-Political (E.B. Eastwick)
19. Early History of India, ed. Vincent Smith.
20. Early India & Pakistan, by Sir Mortimer Wheeler,
21. Early Indus Civilization, by Dr. E. Mackay.
22. Etude Sur La Geographic Greque, by M. Vivien de Saint Martin.
23. Fragments Arabes et Persans inedits relatifs a'l' Inde, by M. Reinaud.
24. Fragments, by Megasthenes.

25. Geography, by Strabo.
26. Geology of India, by R.D. Oldham.
27. Geology of Western Rajputana, by La Touche.
28. Geology of Western Sind, by Blanford.
29. Histoire de la Geography et des Decouvertes. Geographiques, by Vivien de Saint Martin.
30. Histoire de la Vie de Hiouen - Thsang, tr. Stanislas Julien.
31. History, by Ammianus Marcellinus.
32. History, by Herodotus.
33. History of Alexander the Great, by Q. Curtius Refus.
34. History of Ancient Geography, by Bunbury.
35. History of Persia, by P. Sykes.
36. History of Sind, by Kalich Beg.
37. Indian Engineering, by W.L. Strange.
38. Indian Shipping, by Dr. R.K. Mukerji.
39. Indische Alterthumskunde, by Lassen.
40. Indike, by Arrian.
41. Indus Delta Country, by Major General M. R. Haig.
42. Irrigation Works in India & Egypt, by R.B. Buckley.
43. Irrigation Works of India, by R.B. Buckley.
44. Invasion of India, by McCrindle.
45. Jataka, trs: H.T. Francis & H.T. Neil.
46. Khulasat-ut-Tawarikh, by Subhan Rai Batalvi.
47. Kitabul Hind, by Alberuni, tr. E. Sachau.
48. Kitabut tanbih, by Almasudi.
49. Kurrachee - Past, Present & Future, by A.F.
50. Life of Yuan Chawang, by Hoei-Li and Yen-Tsong.
51. Linguistic Survey of India (Vol: VII, Part I), by Sir George Grierson.
52. Mahabharata, tr: P.C. Roy.
53. Manu.
54. Masalik-wa-Mamalik, by Al Istakhari.
55. Memoir, by Seth Naomal Hotchand, ed. Sir Evan James.
56. Mohen-jo-Daro & the Indus Civilization, by Sir

John Marshall.
57. Mujmal-ut-Tawarikh. Muruj uz-Zahab (Meadows of Gold), by Almasudi, tr: Alyos Sprenger.
58. Natural History, by Pliny, ed. C. Mayhoff.
59. Narrathe of Various Journeys in Balochistan.
60. Afghanistan & the Punjab, by Masson.
61. On Probable Changes in the Geography of the Punjab and its Rivers etc., by R.D. Oldham.
62. On the Sites of Brahamanabad & Mansurah in Sindh etc., by Maj: General M.R. Haig.
63. On Yuan Chwang's Travels in India, by Watters.
64. Pentapotamia Indika.
65. Periplus of the Erythrean Sea, by an Unknown Author, ed: McCrindle.
66. Persian Gulf Pilot.
67. Personal Observations on Sind, by Capt: Postans.
68. Prehistoric India, by Stuart Piggot.
69. Record, by Yuan Chawang, tr; S. Beal.
70. Rigveda, ed: Aufrecht.
71. Rigveda Samhita, tr: H.H. Wilson.
72. Sacred Books of the Budhists, tr: T.W. Rhys Davids and C.A.F. Rhys Davids.
73. Sacred Books of the East, tr. E.W. West
74. Sindh & the Races that Inhabit the Valley of Sindh, by Richard F, Burton,
75. Studies in Indo-Muslim History, by Prof: Hodivala.
76. Supparka Jataka, ed: E.B. Conwell.
77. Tarkhan Namah, by H. M. Elliot:
78. The Alkaline Lakes and the Soda Industry of Sind, by Cotter.
79. The Behaviour & Control of Rivers & Canals, by Sir Claude Inglis.
80. The Earth, by Elisee Reclus.
81. The Great Epic of India, by H. Washburn Hopkins.
82. The History of India as told by its own Historians, by Sir H.M. Elliot.

83. The Indian Border, by T.H. Holdich.
84. The Indus Civilization, by Sir Mortimer Wheeler.
85. The Itinerary of Yuan Chwang, comp: Vincent Smith.
86. Travels in Balochistan & Sindh, by Henry Pottinger.
87. Tribes in Ancient India, by B.C. Law.
88. Tuhfatul Kiram, by Mir AH Sher Qani, tr. T. Postans.
89. Vedic Index of Names &_Subjects, by McDonald & Keth.
90. Vishnu Puran. tr. H.H. Wilson.
91. Voyages d' Ibn Batoutah, tr. C. Defremeryet B.R. Sanguinetti.

ARTICLES: REPORTS:

1. Allahabad Pillar Inscriptions.
2. An Account of the Country of Sindh, by James McMurdo.
3. An Archeaological Tour in Gedrosia, by Sir Aurel Stein.
4. A Memoir of a Map of the Eastern Branch of the Indus, by Alexander Burns.
5. A New Inscription of Darius from Hamdan, by Prof: Hertzfeld.
6. A New Type of Pottery from Baluchistan.
7. A Supplementary Memoir of a Map of the Eastern Branch of the Indus, by Alexander Burns.
8. A Survey of Ancient Sites along the 'Lost' Saraswati River, by Sir Aurel Stein.
9. Dissertation on the River Indus, by James McMurdo.
10. Early Canal Administration in Sind, by H.T. Lam brick.
11. Early Canal Irrigation in Sind.
12. Excavations in Baluchistan.
13. Explorations in Sind, by N.G. Majumdor.
14. Further Exploration in Sind.
15. Gabarbands in Baluchistan, by R. Hughes

Butter.
16. Ibn Batuta in Sind, by Major General M.R, Haig,
17. Inscription on the Tomb of Abu Turab in Sind, by N.M. Billimoria.
18. Memoir on Scinde, by "Capt. W. Pottinger.
19. Memoir on Scinde, by Liei.u: Del Hoste.
22. New Light on the Indus Valley Civilization.
21. Notes on Afghanistan & some Parts of Baluchistan, by Major H.G. Raverty.
22. Notes on the 'Lost River' of the Indian Desert, by Anon (C.F. Old).
23. Report on the Administration of Scinde.
24. Report of Capt. Preedy & J. Mcleod.
25. Report on the Pargana of Chandookah in Upper Sind, by James.
26. Report on the Survey of the mouth of the Indus in March 1877, by Lieut: Stiffe.
27. Report on the Upper Portion of the Eastern Nara, by J.G. Fife & others.
28. R.G. Bhandarkar in Indian Antiquity, Vol: I.
29. The 'Lost River' of the Indian Desert - A Comment, by Nearchus.
30. The Mehran of Sind and its Tributaries, by Major H.G. Raverty.
31. The River Courses of the Punjab & Sind, by R.B. Whitehead.
32. The Stone Industries of Holocene in India & Pakistan, by Col: D.H. Gordon.
33. Who are the Descendents of the People of Mohen-jo-daro.

OFFICIAL PUBLICATIONS: PERIODICALS: RECORDS:

1- Ancient India.
2- Ancient India (Arrian).
3- Ancient India (Ktesian).
4- Ancient India (Ptolemy), ed: I.W. Mccrincle.
5- Ancient India (Ptolemy), ed: S-N. Majumdar.

6- Annual Bibliography of Indian Archeaology.
7- Annual Reports of the Archaeological Survey of India.
8- Arts Asiatique.
9- Arts and Letters, Royal India, Pakistan & Ceylon Society.
10- Antiquity.
11- Baluchistan District Gazetteer.
12- Blue Book.
13- Bomby Govt: Files Nos: 571, 763, 763, 790
14- Bombay Govt: Records No. XIII.
15- Bulletin of The Deccan College Research Institute,
16- Calcutta Review.
17- Census of India, 1941, Vol: V & XII.
18- Gazetteer of Sind.
19- Geographical Journal, Vol: XCIV, No, 4.
20- Illustrated London News.
21- Indian Antiquary,
22- Indian Archaeology,
23- Jhalawan Gazetteer.
24- Journal of the Asiatic Society of -Bengal.
25- Journal of the Bombay Anthropological Society.
26- Journal of the Bombay Branch of the Royal Asiatic Society.
27- Journal of the Royal Asiatic Society.
28- Journal of the Royal Geographical Society.
29- Journal of the Sind Historical Society.
30- Journal of the Society of Arts, 1901.
31- Las Bela Gazetteer.
32- Makran Gazetteer.
33- Memoirs of the Archaeological Survey of India.
34- Memoirs of the Geological Survey of India.
35- Parliamentary Papers relating to Sind.
36- Selections from the Records of the Bombay Government.
37- Survey of India Map.

جغرافیائی مقامات

جغرافیائی مقامات

(آ)

آراخو توس کرین ۲۳۷

آرابیٹا (پہاڑ) ۱۹۱، ۲۳۸، ۲۴۲، ۲۴۴

آرکیوسا ۱۸۹

آری پیرا ۱۲۱

آمری ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۲۳، ۱۵۰

(ا)

ابن شاہ، پہاڑی ۹۴، ۱۹۷، ۲۰۴

ابراہیم حیدری ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸

ابیریا (ابھیرا) ۲۲۲، ۲۴۳، ۳۵۰، ۳۵۲

اے، ٹین، پو، پی، لو ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۵۷

اپوکوپی (اراولی) ۲۴، ۲۴۰

اجین، سمندر ۱۹۷

اُچ ۳۰۷، ۳۰۹

احمد بند ۱۰۴، ۱۱۸، ۱۱۹

اراتیں (شہر) ۲۱۵، ۲۳۹

ارچوسیا ۲۳۷، ۲۳۹، ۲۴۱

اروڑ (الور) ۹۳، ۱۷۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۲۳۵، ۲۵۴، ۲۶۴، ۲۶۹، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۵۳، ۳۶۱

اروڑ کی پہاڑیاں ۳۰۳

اریا ۲۳۸

اڑل نہر ۶۴، ۱۴۵، ۲۳۹، ۲۴۲، ۲۶۷

ازمیل ۲۶۹

اسٹوپا ۲۵۷

اسٹورا ۲۰۲

اسکندرہ ۱۷۸

اسوان (مصر) ۵۵

اشبہار ۲۶۵

افریکا (شمالی) ۱۴۱

افغانستان ۱۲۸، ۳۵۵، ۳۵۷

اگور کی کھاڑی ۲۳۳

اگھرور ۲۶۹

الہ بندر ۳۸۲

اللہ آباد ۱۹۱، ۳۲۱

امرکوٹ ۴۲، ۷۰

امرو ۸۳

انگئی، ناسے ۸۵، ۸۶، ۹۶، ۱۲۱
اوپیائی ۱۷۹
اوریا ۲۳۳
اوڑیسہ ۳۴۹
اوڈیرولال ۳۶۱
اوسیٹر، چٹان ۲۰۸
ایران ۲۹، ۹۸، ۱۰۲، ۱۰۴، ۱۲۹، ۱۸۰، ۱۸۹، ۲۵۵، ۳۲۰، ۳۵۵
ایروس ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۲
ایشیا (وسط) ۲۲۸، ۳۵۵

(ب)

بابل ۹۸
باتھ آئی لینڈ ۳۲۸
باٹیہ ۱۷۷
بادبان ۳۸۲
باران، ناسے ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۶، ۱۰۷، ۱۲۱
باربریکون ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۴۴، ۳۲۸
باڈھ ۲۴۶، ۲۵۷
باڑمیر ۳۱، ۳۲، ۳۷، ۳۹
باسمیڈ ۲۴۵
باگو دیرو ۶۰، ۶۱،
بدھ جو تکر ۹۴
بحرین ۱۲۹
بحیرہ روم ۵۶
بحیرہ عرب ۵۶، ۱۴۱، ۲۶۰
بحیرہ ہند ۲۳۱
بدین ۲۹۵، ۳۱۸، ۳۲۶
بڈرو ۸۶، ۸۷
برار ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶
برخان ۲۵۸
برہمن آباد (منہرا جو تھل) ۲۲۵، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۹، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۱۴
بُرودریکا ۳۵۶
برطانیا ۳۰۱، ۳۲۴، ۳۵۵
برور، پہاڑی سلسلہ ۱۲۰
بکھر (جزیرہ) ۵۱، ۵۲، ۷۲، ۹۳، ۱۴۳، ۲۳۶، ۲۶۹، ۲۷۷، ۲۹۶، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۹، ۳۵۷
بگٹی ۲۳۶
بگھاڑ ۴۴، ۶۲، ۲۶۳، ۳۱۷، ۳۲۳، ۳۲۹
بلوچستان ۲۵، ۲۶، ۸۲، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۶،

۱۰۸، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۱، ۱۴۰،
۱۴۱، ۱۴۸، ۱۵۱، ۱۹۸، ۲۵۶، ۲۵۹، ۳۴۷،
۳۷۲
بلیاری ۳۲۶
بمبئی ۳۶۵
بناگرہ ۲۳۸، ۲۴۴، ۲۴۵
بندرگاہ سکندر ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۷
بندے جی قبر ۸۲
بندھنی، ندی ۸۷، ۱۱۲
بنو ۲۴۵
بنگال ۳۴۹
بوارج ۳۱۵
بوبک ۱۴۵
بودھ دار العلوم ۲۷۵
بودھسٹ ۲۷۵
بودھیہ ۲۶۷
بودھیہ (نودھیا) ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹
بولان، درہ ۲۵، ۱۸۹
بولان، نہر ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸
بونیس ۲۴۵
بھاٹیہ ۲۹۴
بھاولپور (اسٹیٹ) ۶۱، ۶۷، ۶۸، ۱۸۶،
۳۰۲، ۳۱۹، ۳۷۲
بھٹ ۳۴۰
بھٹ لور ۲۶۸
بھٹنڈ ۶۸۱
بھٹ نیر ۶۸
بھٹی ۲۷۹
بہرہ ۳۰۱
بہرور ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۵
بھگرور ۲۶۹، ۲۷۷
بہلور ۱۱۹
بھمبور ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۴
بھنگر ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۱۹۴
بیاس (دریاہ) ۱۸۶، ۱۸۷، ۲۳۰، ۲۳۵،
۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۳۰۲، ۳۱۸
بیاکتا ۲۰۳، ۲۰۵
بیٹ ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۵
بیری گاز ۲۳۲
بیکانیر ۳۲، ۳۸، ۶۷، ۲۷۸، ۳۰۲
بیگاری، نہر ۳۲۳
بیلہ (لس بیلہ) ۱۱۷
بیلی تھاپ ۱۲۱

(پ)

پاتلی پتر ۲۳۰
پارتھین ۲۳۲، ۲۴۵
پاکستان ۹۹، ۳۶۵

پب (پہاڑی سلسلہ) ۱۲۰
پپونی ناکہ ۱۵۲
پٹالہ ۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۷،
۱۹۸، ۲۰۰، ۲۳۰، ۲۴۴
پٹالین ۲۴۲، ۳۵۰
پٹھانی وٹ ۹۶
پڈعیدن ۲۷، ۲۸
پراستھا ۱۹۱
پراسیاں ۱۹۱، ۲۳۰
پران ۱۵۷، ۲۷۶، ۳۰۰، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۹،
۳۲۲، ۳۲۳
پرگالہ ۲۱۲، ۲۱۳
پلائیسٹوسین ۲۸
پنجاب ۲۳، ۲۹، ۴۸، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۳۳،
۱۷۸، ۱۸۰، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۹۴، ۲۳۵، ۲۶۱،
۲۷۷، ۲۹۴، ۲۹۹، ۳۰۲، ۳۳۹، ۳۴۷،
۳۵۰، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱،
۳۶۲، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۷۷
پنجند ۲۶، ۱۸۵، ۱۸۷، ۲۳۷، ۲۲۱، ۳۰۰،
۳۱۹
پنگریو ۳۱۶
پنیاری ۶۲، ۲۳۵
پورالی ندی ۲۶، ۲۳۴
پورچندر ۳۶
پوکران ۸۸
پھیلی ۳۲۲
پھور دریا ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۳۴
پھوگ ۳۶
پی ہتو، شہر، لو ۲۵۶، ۲۵۷
پیر پٹھو ۹۴، ۱۹۷، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۱۷، ۲۶۳
پیر لاکھو ۹۴
پیر مناغرہ ۱۰۴، ۱۱۸، ۱۱۹
پیر مشتاق ۱۴۶، ۱۴۷
پی شن، پی ہتو، لو ۲۵۲، ۲۵۳
پیش واٹ ۱۲۱

(ت)

تراپن ناسے ۱۰۵
تری پوری، لک ۱۲۱
تغلق آباد ۳۱۷
توران ۲۶۸، ۲۶۹
تونگ (چشمہ) ۹۱
تونگ (گاؤں) ۱۱۲، ۱۱۴، ۱۳۴، ۱۵۲
تونگ، وادی ۹۵
تھانو احمد خان ۳۲۹
تھر ۱۴، ۲۶، ۳۱، ۳۵، ۳۸، ۴۰، ۴۱، ۴۲،
۶۶، ۷۱، ۱۳۰، ۱۴۵، ۱۵۶، ۱۹۴، ۳۶۳

تھرپارکر ۳۲۸
تھرڑی محبو ۱۵۲، ۲۰۵
تھری ۳۱۱
تھل (بنگر یا تھل بھنگر) ۳۱۶
تیز ۳۱۴

(ٹ)

ٹرشری ۴۸
ٹرہنی ۱۴۶
ٹکیہ ۲۷۹
ٹوجی ۱۰۴
ٹوے رزی (دریا) ۲۱۶، ۲۳۳
ٹونگ ۱۰۲
ٹھٹہ ۹۴، ۱۵۸، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۲۳، ۳۵۷،
۳۶۳
ٹھٹاگوش (مغربی پنجاب) ۱۸۰
ٹھری ۳۱۶
ٹیکسلا ۱۸۲

(ج)

جام ۲۷۹
جانوجی ۶۷
جتوئی ۳۰۹
جٹک ۱۷۸
جتی ۴۴
جلوالی ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۴
جنانی ۳۰۹
جھراؤ ہیڈ ۲۴، ۳۰۷، ۱۹۳، ۳۲۴
جمنا، دریا ۶۷، ۱۵۹
جھالوان ۹۶، ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۲۰،
۱۲۱، ۱۲۲، ۲۵۵، ۲۵۷، ۲۶۰، ۲۶۸، ۳۴۷
جھانگر ۱۵۷
جھرک ۹۴، ۳۶۳
جُھکر ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۵۶، ۱۵۷
جھم ۲۶۴، ۲۷۰
جھمپیر ۲۶۴
جودھپور ۳۲۹
جُون ۳۸۲
جے پور ۲۷۰، ۳۵۱
جیسلمیر ۳۷، ۳۹، ۴۲، ۶۹، ۷۰، ۲۷۹،
۲۹۸
جیکب آباد ۲۳۶، ۲۳۷، ۳۶۴
جیہون (مہران) ۲۶۲
جےورہ ۲۷

(چ)

چانڈکا ۳۵۶
چانہوں جو دڑو ۱۱۶، ۱۱۹، ۱۴۳، ۱۴۸
چتانگ ۶۷، ۶۸، ۱۵۹

چتور ۲۷۹

چُرنا ۲۱۲

چناب (دریا) ۶۶، ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۲۷۷، ۲۷۸

چنا کریک (آئی لینڈ) ۳۲۸

چوٹن ۳۷

چورلک ۵۲، ۳۰۳

چھہ کا ۲۶۱، ۲۷۹

چھوٹا تاڑ ۹۵

چین ۲۵۱

(ح)

حب سرونا ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹

حب، ندی ۲۵، ۴۸، ۹۰، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۱، ۲۱۳، ۲۱۵، ۲۱۷، ۳۶۳

حب، وادی ۹۰

حیدرآباد ۲۷، ۳۹، ۴۰، ۶۲، ۷۳، ۸۹، ۹۳، ۹۴، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۹۳، ۱۹۶، ۲۵۶، ۲۶۵، ۲۶۶، ۳۱۸، ۳۲۱، ۳۲۲

(خ)

خاران ۱۰۴

خدا آباد ۳۸۲

خضدار ۲۶۸، ۲۶۹

خلیج عرب ۲۲۹

خیرپور ۵۲، ۷۰، ۳۷۲

(د)

دادر، نالے ۸۴

دادو ۸۵، ۲۷۸

دادو واہ ۲۷، ۲۷۶

دارنگ ۸۷، ۸۸

دخمے ۱۰۳

دراوڑ ۳۱۹

درنگیانا ۲۲۸

درواٹ ۸۹

درہ بولان ۲۵

درے سجے ۱۲۱

دریائے ارابس (=حب) ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۳۸، ۲۳۹

دریائے جہلم ۱۸۳، ۱۸۶، ۱۸۸، ۲۷۸

دریائے دشت ۲۳۹

دریائے راوی ۱۳۹، ۱۸۶، ۲۷۸

دریائے سندھ ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۳۹، ۴۰، ۴۴، ۴۵، ۴۷، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۸۸، ۸۹، ۹۳، ۹۴، ۱۰۹، ۱۱۱، ۱۲۸، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷،

۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۹،
۱۵۰، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۹،
۱۶۰، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۳، ۱۸۴،
۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲،
۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰،
۲۰۱، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۱۷، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۳،
۲۳۴، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰،
۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۵۴،
۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۲، ۲۶۳،
۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۰،
۲۷۹، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹،
۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵،
۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳،
۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹،
۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۶،
۳۲۷، ۳۲۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۳، ۳۵۸،
۳۶۲، ۳۶۴، ۳۷۲

دریائے کابل ۱۷۹، ۲۳۵، ۲۵۸

دریائے نیل ۲۶، ۲۷، ۵۵، ۵۶، ۵۷،
۵۸، ۲۲۹

دلورا ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۴

دمبار ۸۷

دوستانی ۶۱

دومائی، جزیرہ ۲۰۶

دہایت ۲۶۹

دہلی ۱۲۸، ۲۹۸، ۳۲۵

دیبل (دیول) ۲۵۵، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۷۶،
۲۹۵، ۳۰۷، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۲۸

دیوانہ ۱۳۱

(ڈ)

ڈاڑھیارو ۸۱

ڈرب ڈیتھری ۳۷، ۱۵۴، ۱۵۵

ڈلھ ۱۲۳

ڈھب بھٹی ۱۱۲

ڈھالیاں ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۴، ۲۷۹

ڈہر واہ ۷۲

ڈیپر گھانگھرو ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵

ڈیرو مہابت (ماتلی) ۳۱۶

ڈیرہ جات ۲۵۳، ۳۵۶

ڈیرہ غازی خان ۳۰۴، ۳۶۴

ڈیسوی ۱۵۲

(ر)

راجپوتانہ ۲۶، ۲۹، ۳۱، ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۹۲،
۲۵۲، ۲۷۹، ۳۵۱

رام گڑھ ۳۷

رانک ڈہر ۴۲

راوڑ ۲۷۰

رن ۲۴۰

رن کچھ ۲۴، ۳۸، ۳۹، ۴۲، ۹۲، ۹۳، ۱۰۴، ۲۲۳، ۲۲۲،
۲۴۰، ۲۷۶، ۲۹۵، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۸،
۳۱۹، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۵۲، ۳۵۳
رنگوا ۸
رنی کوٹ ۸۸، ۸۹، ۹۱
رورو ۱۷۸
روریکا ۱۷۸
روس ۱۷۹
روہڑی ۳۷، ۴۲، ۴۵، ۵۱، ۵۲، ۶۱، ۶۶،
۶۹، ۷۰، ۷۲، ۷۳، ۹۲، ۹۳، ۹۸، ۹۹، ۱۳۲،
۱۴۳، ۱۵۵، ۱۵۸، ۱۸۵، ۱۸۹، ۱۹۰، ۲۴۲،
۲۴۶، ۲۶۹، ۲۷۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۳،
۳۰۷، ۳۱۰، ۳۲۰، ۳۲۴
روہڑی ڈویزن ۴۵
روہیل ۸۵
رین شاخ ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲
رینی نالہ ۵۴، ۵۵، ۶۹، ۷۰، ۱۵۴، ۱۵۹،
۱۹۰، ۳۱۸

(ز)

زنجیبار ۲۳۱
زہوب ۲۵۹
زہری ۲۶۸
زئی، لک ۱۲۰

(س)

سادھ بیلا ۵۱۱
سارنگا ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۷
ساراواں ۳۴۷
ساسانی ۱۰۲، ۱۰۴
سایتی ۲۷۵
ساکرو ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۳۱۰
ساماروڈھنڈ ۲۹۵
ساموئی ۳۱۷
ساموئی، جھیل ۳۶
سانکرا (سانگرا) واہ ۳۲۰
سانگھڑ ۱۷
ساوسیکان ۲۴۵
ساوندی ۲۷۵
سبالیسا ۲۴۰، ۲۴۴
سبائے ۳۵۱
سبی ۳۵۶
سیارا ۲۴۰، ۲۴۴
ستلج ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۷۱، ۱۵۹، ۱۸۶، ۱۸۷،
۲۳۰، ۲۳۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۳۰۰، ۳۰۲،
۳۰۳، ۳۱۸، ۳۱۹
ستونہر ۶۲
سرطاف ۸۷
سدھیرن جودڑو ۲۴۶

سرجانو ۸۹
سردارگڑھ ۲۷۸
سرسوتی ۶۷
سرکالہ ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۷
سکرنڈ ۳۲۷
سکہ بتان ۲۷۸
سلورج ۲۶۸
سلیمان، کوہ ۲۵۵، ۲۵۹
سکھر ۵۱، ۶۰، ۷۲، ۹۲، ۹۳، ۱۳۲، ۱۴۳،
۱۴۸، ۱۸۳، ۱۸۵، ۱۹۰، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۳،
۳۰۷، ۳۰۸، ۳۲۷
سکھر بیراج ۴۴، ۶۶، ۱۹۲، ۳۲۵
سکھر بیگاری بند ۶۰
سکھر پرانا ۹۳
سگاپہ ۲۴۰
سنتھون ۲۳، ۲۴۰
سندھارا ۱۷۸
سندھ ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۱،
۳۳، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۲، ۴۴،
۴۵، ۴۶، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۳، ۵۴،
۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲،
۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۱،
۷۴، ۷۹، ۸۰، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶،
۸۸، ۹۲، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱،
۱۰۲، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱،
۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۳،
۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴،
۱۳۵، ۱۳۷، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳،
۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۶،
۱۵۷، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۲،
۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۱،
۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۸، ۲۰۰، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۱۱، ۲۱۸،
۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷،
۲۴۶، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶،
۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۷۷،
۲۷۹، ۲۸۰، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۰۰،
۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۷، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲،
۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹،
۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵،
۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۴۷، ۳۴۸،
۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷،
۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۳، ۳۶۴،
۳۶۵، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۷، ۳۷۸
سندھڑی ۳۲۲
سندھ ڈھورو ۷۲، ۲۳۷، ۲۹۹
سندھ واہ ۷۲، ۲۹۹
سندھو ساگر ۲۶۴، ۲۹۵، ۳۱۵
سنگادا ۲۰۳، ۲۴۰

سن، نائے ۲۳۹
سوالک ۱۴۲
سورت ۳۲۸
سوراشٹرین ۲۳۲، ۲۴۳
سوہن کوٹ ۲۷۸
سونہری ندی ۹۱
سون میانی ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۳۴، ۳۱۴
سوویر ۱۷۸
سویز ۲۶
سلیمانی ۸۵، ۸۶
سہتہ ۳۵۴
سین تو ۲۵۲
سیتا، نائے ۱۰۵
سیستان ۲۵۹
سید گنج بخش ۳۸۲
سیسم ۲۶۷، ۲۶۹
سیرکریک ۳۱۶
سہون (سیوستان) ۱۳۲، ۱۳۴، ۱۴۸، ۲۵۷، ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۹۷، ۳۰۵، ۳۰۹، ۳۱۵، ۳۱۷، ۳۲۹، ۳۵۶، ۳۶۲، ۳۶۳
سیالکوٹ ۲۶۱

(ش)

شاکرہ ۲۶۳، ۲۷۶
شام ۳۵۵
شاہ بندر ۳۴۸
شاہ گودڑا ۸۲
شاہ جوکوٹیرو ۱۵۲، ۱۵۳
شیرو ۲۷۹
شکارپور ۶۰، ۱۳۰، ۱۳۵، ۱۸۵، ۳۵۷
شکلوئی کھنڈ ۸۵
شمس پیر ۲۰۹، ۲۱۰
شوستر ۱۰۲
شہداد پور ۱۹۴
شہداد کوٹ ۴۵
شیخ بھرکیو ۳۲۱

(ص)

صورت گڈھ ۳۱۹

(ط)

طوران ۳۱۴

(ع)

عاملانو ۱۵۲
عراق ۲۹، ۱۲۹
علی مراد ۱۰۸، ۱۵۱
عمرکوٹ ۲۵۶، ۳۲۰، ۳۲۶

(غ)

غازی شاہ، چشمہ ۹۲، ۱۵۰
غزنی ۲۵۸، ۳۲۵

غوث پور ۶۱، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۲۴۱، ۳۱۹

(ف)

فارس ۱۷۹، ۳۱۳
فا، لا، نا ۲۵۷، ۲۵۸

(ق)

قاسم پور، بندر ۶۱
قاہرہ ۲۶، ۵۵
قصا ۲۷۰
قلات ۱۱۳
قندابیل ۲۶۸، ۲۶۹، ۳۵۴
قندھار ۲۵۹، ۲۶۹
قنوج ۲۷۸، ۲۷۹

(ک)

کابل ۲۹۸
کاٹھیاواڑ ۲۹، ۲۳۲، ۲۴۲، ۲۴۳، ۳۶۰، ۳۶۲
کاچھو ۲۶، ۴۵، ۱۴۰، ۱۴۱
کارونجھر ۳۷، ۹۲
کچھو ۲۵، ۴۷، ۱۱۷، ۳۶۲
کراچی ۲۷، ۳۲، ۳۹، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۸، ۱۳۰، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۷، ۲۵۶، ۳۱۸، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۴۸، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۷۲
کشمور ۶۰، ۱۸۵، ۲۳۷، ۲۴۱
کشمیر ۲۶۰، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰
کلفٹن ۲۰۳، ۲۰۸
کندھ کوٹ ۱۸۵
کنڈیارو، تعلقہ ۲۶۹
کوٹ ڈی جی ۹۹
کوٹڑی ۸۹، ۳۶۲، ۳۶۳
کوٹ لالو ۳۷۸
کوئٹہ ۱۱۰
کھادر ۴۸، ۴۹
کھپ ۴۶
کھپرو ۴۲، ۷۱
کُھڈا ۱۲۱
کھڈر ۴۸
کھڑک، بندر ۲۱۱
کھیرتھر ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۵، ۹۶، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۹، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۴۳، ۳۲۸، ۲۵۷
کھینجی، نالے ۸۱، ۸۳
کیماڑی ۲۰۳
کینجھر ۹۱

(گ)

گاج نالے ۸۰، ۸۲، ۸۴، ۹۰، ۹۱، ۱۱۰، ۱۴۰
گاڑ، لک ۸۵، ۱۲۱
گاڑھو بھڑو ۱۵۶، ۱۵۸

گاگو ۲۱۵
گبر بند ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۸، ۱۱۹
گجرات ۴۲، ۱۲۸، ۱۲۹، ۳۰۷، ۳۶۴، ۳۶۵
گجو ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۱۷، ۳۱۱
گنجوٹکر ۳۹، ۹۳، ۱۹۶، ۲۴۲، ۳۲۱
گڈانی ۲۱۴
گڑھی یاسین ۳۵۷
گنڈاوا ۲۶۸، ۲۶۹
گز ۸۷، ۱۲۱
گرو ۸۵
گندھارا ۱۸۰
گنگا ۲۳۰، ۳۴۷، ۳۴۹
گنگاوادی ۴۸، ۱۸۶
گنگرو ۳۱۶
گوجرہ ۲۵۲
گورک ۸۵
گوزبانی ۸۰، ۱۰۵
گونی کینال ۳۱۸
گوہر بند ۱۰۲
گومال ۲۳۷، ۲۵۸

(ل)

لاڑ ۲۸
لاڑکانہ ۶۰، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۵، ۲۵۷، ۳۰۹
لاس (میدان) ۲۳۴
لاکھیو ۱۱۶، ۱۴۵، ۱۴۶
لال چھتو ۱۴۵، ۱۴۶
لالن جی ماڑی ۱۴۰
لانگ ـ کالو ۲۵۵
لاہور ۱۳۰
لاہری ۲۳۶، ۳۰۹، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۸، ۳۲۸
لائڈ بیراج ۲۹۸، ۳۲۴، ۳۲۷
لس بیلا ۹۰، ۱۰۲، ۱۵۲، ۲۱۵، ۲۳۳، ۲۵۵، ۳۲۹، ۳۵۲، ۳۶۳، ۳۷۲
لکھانی ۸۱
لکھ پت ۳۱۸
لکھمیر جی ماڑی ۱۱۳، ۱۱۴
لکی پہاڑ ۲۸، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۶، ۱۰۹، ۱۰۱، ۲۴۲، ۲۹۷، ۳۱۷
لکی، چشمہ ۹۱
لنکا ۲۳۰، ۲۳۵
لورالائی ۲۵۹
لونی، دریا ۲۴۰
لوہارانی ۲۹۴، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۵
لوہانو، ڈھورو ۲۴۶، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۵
لوہرانی ۲۶۳

لوہم جودڑو ۱۴۳، ۱۴۷
لوہری ۱۲۳، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۵۰
لیاری ۲۱۴
لیبیا ۲۷
لیلان ۸۹

(م)

ماچھکو ۳۶۴
مارواڑ ۲۷، ۴۱، ۴۲
مازرانی ۸۴
مالن، راس ۲۱۶، ۲۱۷
مالابار ۲۳۰
مانجھند ۳۹
متھراو ۶۹، ۱۹۳، ۲۴۱، ۳۲۴
متھن کوٹ ۵۸، ۲۴۱
مٹھی، تعلقہ ۱۵۶
مچل ۸۱
محفوظہ ۲۷۳، ۲۷۴
محمد طور ۳۱۶
مدرا ۳۵۱
مراکش ۱۳۴
مرکنڈا ۶۷
مستیہ پوران ۱۷۸
مصر ۲۶، ۵۸، ۱۴۱، ۱۷۹، ۱۸۳، ۲۲۹، ۲۳۴
مغل بھیی ۳۱۸
مقدونیہ ۱۹۰
مکران (=گیدروشیا) ۲۹، ۱۰۰، ۱۰۲، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۶، ۲۵۵، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۸، ۲۶۹، ۳۱۴، ۳۵۳
مکلی ۹۴، ۱۹۷، ۲۰۴، ۲۰۵، ۳۱۷
ممڑو ۱۵۵
ملاستانی پور ۲۵۳
ملتان ۲۵۳، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۱، ۲۶۸، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۹۴، ۳۰۷، ۳۱۴، ۳۱۸، ۳۵۳، ۳۵۶
ملوٹ، نالے ۶۸
ملیر ۹۰، ۳۶۳
ملیری ۸۷، ۸۸
منجھل، ندی ۲۶۲
منچھر، جھیل ۲۵، ۶۰، ۶۴، ۸۰، ۸۳، ۸۴، ۸۶، ۸۷، ۹۴، ۱۰۷، ۱۱۶، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۵۰، ۱۸۱، ۲۳۶، ۲۴۲، ۲۶۷، ۳۴۸
منچھر، سلسلہ ۸۳، ۸۴
منصورہ ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۹۴، ۲۹۶، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۵۲
منگھوپیر ۹۱
منوڑا ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰

موروں تو بارا ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲،
۲۳۳، ۲۳۹، ۲۵۵، ۲۵۶
موج ۲۶۶
مولا، نالے ۱۸۹، ۲۳۸، ۲۶۹
مونز راس ۲۰۴، ۲۱۱، ۲۱۶
موہن جودڑو ۲۳، ۵۸، ۱۰۹، ۱۱۶، ۱۲۲، ۱۲۹،
۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۸،
۱۳۹، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۱، ۱۵۳،
۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۹، ۲۵۷، ۲۹۴
موہن، نالے ۸۸
مول ۹۰
مہرا ۱۷۸
مہران ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۲، ۲۷۴،
۲۷۶، ۲۷۷، ۲۹۴
مہیش وورا کا مندر ۲۵۴
میر پور ساکرو ۲۰۵، ۲۶۴، ۳۶۳
میر پور خاص ۲۴۶
میانی ۳۲۴
میانی ہور ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷
میوسی کانس ۱۸۵، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱،
۱۹۲، ۲۴۵
میسوپوٹامیہ ۱۱۴، ۱۴۱
میری ۱۱۳
میہر ۹۰
میاں گن ۸۱
میہی ۸۷، ۱۱۰، ۱۱۵، ۱۱۶
میر پور بٹھورو ۱۹۷

(ن)

نارا ۵۱، ۶۱، ۶۶، ۶۷، ۷۰، ۷۱، ۷۳، ۹۳،
۱۵۵، ۱۵۸، ۱۶۰، ۲۷۵، ۲۷۶
نارا۔ ہاکڑا ۱۵۸، ۱۵۹
ناری، ندی ۲۳۶
ناری، نالے ۸۲، ۸۵، ۹۰، ۲۳۸
ناری سلسلہ ۸۱، ۸۳
نال ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۲۶۰
نال اور نندرا ۱۱۰
نگہند ۱۰۵
نشیب سندھ ۶۱
نصر پور ۳۱۷، ۳۲۱
نگر پارکر ۳۷، ۹۲، ۲۵۶، ۳۶۳
نواب شاہ ۷۳، ۱۹۴
نوانار ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۷
نودھیا ۲۶۸
نوکوٹ ۱۵۷، ۳۱۶
نوہٹو ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۶۰
نیننگ چشمہ ۹۲، ۹۵
نیننگ، گاؤں ۱۱۲، ۱۱۳
نیننگ، وادی ۸۰، ۸۶، ۹۵، ۱۰۵

نیرون کوٹ ۲۶۵، ۲۶۹، ۳۱۸، ۳۲۱

نینوا ۹۸

نیوبی ۳۳

(و)

واہان ۲۹۹

واہندہ ۶۸، ۶۹، ۲۹۹

واگھودر ۹۲، ۹۸، ۳۲۹

وڈھا۔تھ ۲۷۱، ۲۷۴

ورکی لوک (وڈواس) ۱۲۰

ویلپٹ ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۵۵

ولہار ۶۸

ونجروٹ ۶۹، ۳۱۹

(ھ)

ہاشم ۸۳

ہاکڑو (=گھاگھر) (=نالہ ساگرا) (=رینی) (=واہندہ) (=نارا) ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۴، ۱۵۵، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۸۶، ۱۹۰، ۱۹۳، ۲۴۱، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۲، ۳۲۴، ۳۲۷، ۳۵۱

ہالہ ۳۷، ۳۲۱

ہالہ کنڈی ۳۸۲

ہانجی ۹۱

ہامون ۲۳۷، ۲۳۸

ہائے فاسس ۱۸۷

ہخا منشی ۱۰۲، ۱۰۴

ہرباب کا مقام ۸۲

ہری رود ۲۳۸

ہڑاپہ ۱۰۹، ۱۲۳، ۱۲۹، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۷، ۱۵۰، ۱۵۵، ۲۹۴

ہمالیہ پہاڑ ۴۹، ۶۷، ۱۳۳

ہندوستان ۲۴، ۲۹، ۴۸، ۶۵، ۶۷، ۹۹، ۱۲۸، ۱۳۴، ۱۴۱، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۹۱، ۲۰۷، ۲۱۱، ۲۲۹، ۲۳۵، ۲۵۱، ۲۵۵، ۲۶۱، ۲۷۱، ۲۷۹، ۳۰۴، ۳۰۹، ۳۲۰، ۳۲۵، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۲، ۳۵۴، ۳۶۵، ۳۷۱، ۳۷۸

ہندسندھ ۱۸۰، ۲۶۱

ہنگول ۲۱۶، ۲۱۸، ۲۳۳

ہوربٹ ۲۱۷

ہیلمند، نالے ۱۸۹، ۲۳۷، ۲۳۸

(ی)

یارولنڈ ۳۷

یزدانی ۳۰۳

یمن ۳۱۳

یورپ ۹۹، ۱۲۹

یونان ۹۸، ۱۸۴

اسمائے رجال

(آ)

آر۔ڈی۔اولڈہم ۵۲

آر۔ہیوز بلر ۱۰۲

آریان ۱۸۷، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۶، ۱۹۸، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۷

(ا)

ابن حوقل ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۹۵، ۳۵۳

ابن بطوطہ ۱۳۴، ۲۹۶، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵

ابوتراب شیخ ۳۱۰

استرابو ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۹۳، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۴، ۳۴۹، ۳۵۱

ارسطو بلس ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۶، ۱۹۳، ۱۹۵

اسٹین ۱۰۵، ۳۱۹، ۳۴۷

اسطخری ۲۶۵، ۲۷۱، ۲۷۷، ۲۹۵

اکبر ۴۲، ۳۱۷

البیرونی ۱۳۴، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶

البلاذری ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۷، ۲۹۵، ۳۰۵، ۳۵۳

الادریسی ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۹۵، ۲۹۶، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۱۰، ۳۱۲، ۳۵۳

المسعودی ۲۶۳، ۲۷۶، ۲۹۴، ۲۹۵، ۳۱۲

القزوینی ۳۰۴، ۳۰۵

امیانس مارسیلی نس ۲۱۱

اوڈیرولال ۳۶۱

اونیس کریٹس ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۸

ای۔بی۔ایسٹوک ۳۰۳

ایلیوٹ ۳۰۱، ۳۰۸

(ب)

بدیع الجمال ۲۹۷

بلینڈفورڈ ۳۹

بھمبورائے ۳۰۱

بھیرومل ۳۴۸، ۳۷۷

(پ)

پتنجلی ۲۴۳

پگوٹ ۴۶، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۴۷

پلائنی ۱۹۱، ۲۱۰، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۴۲،

۳۴۸، ۳۴۹
پنج ناہیات ۲۷۸
پنہوں ۳۱۱
پورس ۱۸۶
پورنی کانس ۱۹۱
پوسٹنس ۱۳۰
پیتھن ۱۹۹

(ٹ)

ٹالمی ۱۸۲، ۱۹۱، ۲۱۱، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۵۶، ۲۶۴، ۲۹۶، ۳۰۲، ۳۵۰

(چ)

چچ ۲۷۰، ۲۷۵، ۲۷۸
چندر گپت ۱۹۱
چنگیز خان ۳۱۲

(ج)

جارج گریئرسن ۳۷۳
جان مارشل ۱۴۲
جانیفوس ۹۸
جت ۱۸۲
جتوئی ۳۰۹
جمڑاؤ، نہر ۳۲۴
جنانی ۳۰۹
جنید ۲۹۵
جُون، شاخ ۳۸۲
جوینی ۳۰۸
جے سینُھ (جے سین) ۲۶۴، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۹۵
جیمز، لفٹنٹ ۱۳۱

(ح)

حجاج ۲۶۹

(خ)

خسرو ۱۰۲
خواجہ خضر (زندہ پیر) ۳۰۳

(د)

داریوش ہستاسپ ۱۷۹، ۱۸۰، ۳۷۳
دلورائے ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۲۸
دھاج بیٹا سانر ۳۶۱

(ر)

راجہ ڈاہر ۲۶۴، ۲۷۰، ۲۷۲، ۲۷۹، ۲۹۵، ۳۵۹
راسل ۲۷۰، ۲۷۱
رائے دروہر ۲۷۹، ۲۸۰
راہل ۲۷۱، ۲۷۹
راوڑ ۲۷۰

رائے چچ ۲۷۹، ۳۵۴، ۳۶۰
رائے سہارس ۲۵۹
رائے سہیرس ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۷۷
رائے ہرچندر ۲۷۸
رچرڈ برٹن ۳۰۱
رحیم خان خانان ۳۱۸
رہمبا کیہ ۲۳۳
ریورٹی (میجر) ۷۱، ۱۴۲، ۱۵۷، ۱۵۹، ۱۸۰، ۲۰۶، ۲۳۶، ۲۴۱، ۲۶۳، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۹۵، ۲۹۷، ۲۹۸، ۳۰۱، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۵۶
(س)
سکائی لیکس ۱۷۹
سامبس ۱۸۸، ۱۹۰، ۱۹۲
سراوریل اسٹین ۱۰۴، ۱۱۰
سربارٹل فریئر ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹
سرفراز خان ۳۲۳
سسئی ۳۱۱
سکندر اعظم ۲۳، ۶۵، ۹۸، ۱۰۰، ۱۷۹، ۱۸۲، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۸، ۲۱۵، ۲۲۹، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۴، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۶۱، ۲۶۸، ۳۰۲، ۳۴۹، ۳۵۰
سلطان محمد جلال الدین ۳۱۲، ۳۱۳
سلطان حسین لانگاہ ۳۱۸
سلطان محمد سام غوری ۳۰۷
سمندر گپتا ۳۵۲
سوورائے ۳۵۰
سیف الملوک ۲۹۷
سیمی رامس ۱۰۱
سینٹ مارٹن ۲۳۶
(ش)
شاہ بیگ ارغون ۳۱۰، ۳۵۶
شاہ حسین ۳۱۹، ۳۵۶
شیخ علی تراب ۳۱۱، ۳۱۴
(ع)
عبداللہ بن سواد ۲۵۹
عثمان، خلیفہ ۲۶۱
عرب ۶۵، ۱۱۸، ۱۳۲، ۲۲۹، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۹، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۸، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۴، ۳۲۸، ۳۳۰، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۶۰، ۳۶۲،

۳۷۸،۳۷۹
علاؤالدین خلجی ۳۱۶
علی شیر قانع ۳۱۰
علی کوفی ۲۹۸
عمران ۳۵۳،۳۵۴

(غ)

غلام شاہ، میاں ۲۶۵، ۳۰۱، ۳۲۱، ۳۲۲،
۳۲۳

(ف)

فیڈن ۱۱۲
فیروز شاہ ۳۲۶

(گ)

گبول ۳۶۳

(ل)

لاتوش ۳۸، ۳۹
لاسین ۱۸۰
لیوناٹس ۲۱۵، ۲۱۶

(م)

مارشین (ہراکلیا والا) ۲۱۱
مالی (قبیلہ) ۱۸۸
محمد بن تغلق ۴۲
محمد بن قاسم ۱۱۷، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۵،
۲۶۶، ۲۶۷، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۴،
۲۷۵، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۹۸، ۳۱۰، ۳۱۴،
۳۱۷، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۶۰
محمد مراد یاب ۳۲۱
محمد شاہ ۳۲۰، ۳۲۶
محمود غزنوی ۴۲، ۳۶۱
مدراکا ۳۵۱
مرزا جانی بیگ ۳۱۷
مرزا شاہ بیگ ۳۱۹
معاویہ، خلیفہ ۲۵۹
مَلو ۳۴۹
منہاج السراج ۳۰۵
مورٹیمر وہیلر ۱۳۵، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۲
میک مرڈو ۳۰۱، ۳۱۱
میکے، ڈاکٹر ۱۲۹، ۱۳۸، ۱۳۹
میر طاہر ۳۱۰
میر معصوم ۳۰۳، ۳۰۴
میگاس تھینیز ۱۹۱، ۲۳۰، ۳۴۹

(ن)

نادر شاہ ۳۲۰، ۳۲۸
ناصرالدین قباچہ ۲۴۵، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۶۱
نالاشنکر ۳۲۰
ناؤں مل ۳۲۸، ۳۲۹
ن۔ج۔ مجمدار ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۹،

۱۴۶، ۱۴۷
نصرت خان ۳۱۶
نظام الملک ۳۰۸
نکولاس وتھنگٹن ۳۱۴
نزہت المشتاق ۲۹۵، ۳۱۲
نور محمد کلہوڑو ۳۲۰، ۳۲۳
نیرون ۲۶۲، ۲۶۵، ۲۶۶
نیرکس ۱۰۰، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۸، ۱۹۵، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۸، ۲۳۱، ۲۳۳، ۲۴۰، ۲۴۴، ۲۵۵

(و)

واٹرس ۲۵۵
واریڈن برگ ۲۱۵
والٹر پینٹن ۳۱۴
ورہمہ ہیر ۳۴۹
ونسنٹ اسمتھ، ڈاکٹر ۱۸۰

(ھ)

ہارگریوز ۱۱۴، ۱۱۶، ۱۱۹
ہارون الرشید ۳۱۴
ہپالس ۲۲۹
ہرکیولس ۹۸، ۱۰۱
ہفائیشن ۲۰۰
ہمایوں ۴۲
ہنری کیپرٹ ۲۰۷
ہیگ، جنرل ۱۹۸، ۲۴۴، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۶۳، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۳، ۲۹۵، ۳۰۵، ۳۱۲، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱
ہیروڈوٹس ۹۸، ۱۷۹
ہیکاٹیوس (یونانی جغرافیدان) ۱۷۹، ۱۸۲
ہیگ ۲۹۵، ۳۰۵، ۳۱۶، ۳۱۸، ۳۲۰، ۳۲۱
ہیوز بلر ۱۱۸، ۱۱۹

(ی)

یدان چوانگ ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۷۹، ۳۵۳
ین سونگ ۲۵۲

☆

ادبی تحریریں (کتب)

(ا)

اسکال البلاد ۲۵۹، ۲۷۲

الہند ۲۹۴

انسائیکلوپیڈیا لغت، جلد اول ۳۸

(ب)

بری ہت سمہیتا ۳۴۹، ۳۵۰

(ت)

تاج الماثر ۳۰۸

تاریخ سندھ ۳۰۴

تاریخ طاہری ۲۹۶، ۲۹۹، ۳۰۱، ۳۰۴، ۳۱۹

تاریخ الفی ۳۰۸

تاریخ معصومی ۳۱۸

تاریخ ہندوستان ۲۵۸، ۲۶۰

تحفۃ الکرام ۲۵۹، ۲۶۵، ۲۹۶، ۳۰۴، ۳۱۰، ۳۱۴، ۳۲۱

(ج)

جامع التواریخ ۳۰۸

جامع الحکایات ۳۰۸

جہاں کشا ۳۰۸

(چ)

چچ نامہ ۲۵۳، ۲۵۸، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۴، ۲۶۸، ۲۷۳، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۹۸، ۳۵۳، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۷۳

(د)

دی پیری پلس آف دی ایری تھریں سی ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۴

(ر)

رگ وید ۱۷۸

(س)

سندھی بولی کی تاریخ ۳۷۷

(ط)

طبقات ناصری ۳۰۵، ۳۰۸

(ق)

قدیم سندھ ۳۴۸

(گ)

گزیٹیئر آف لس بیلا ۱۲۰
گوتم بدھ کے اقوال ۱۷۸

(ل)

لس بیلا گزیٹیئر ۲۱۵
لائف میگزین ۲۵۸

(م)

مجمل التواریخ ۲۷۴، ۳۵۲، ۳۵۳
مسالک وممالک ۲۵۹، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۱، ۲۷۲
مغربی دنیا کے حالات ۲۵۱
مہابھارت ۱۷۸، ۱۸۱، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲
مہران آف سندھ ۱۴۲

(ن)

نیچرل ہسٹری ۳۴۸

☆

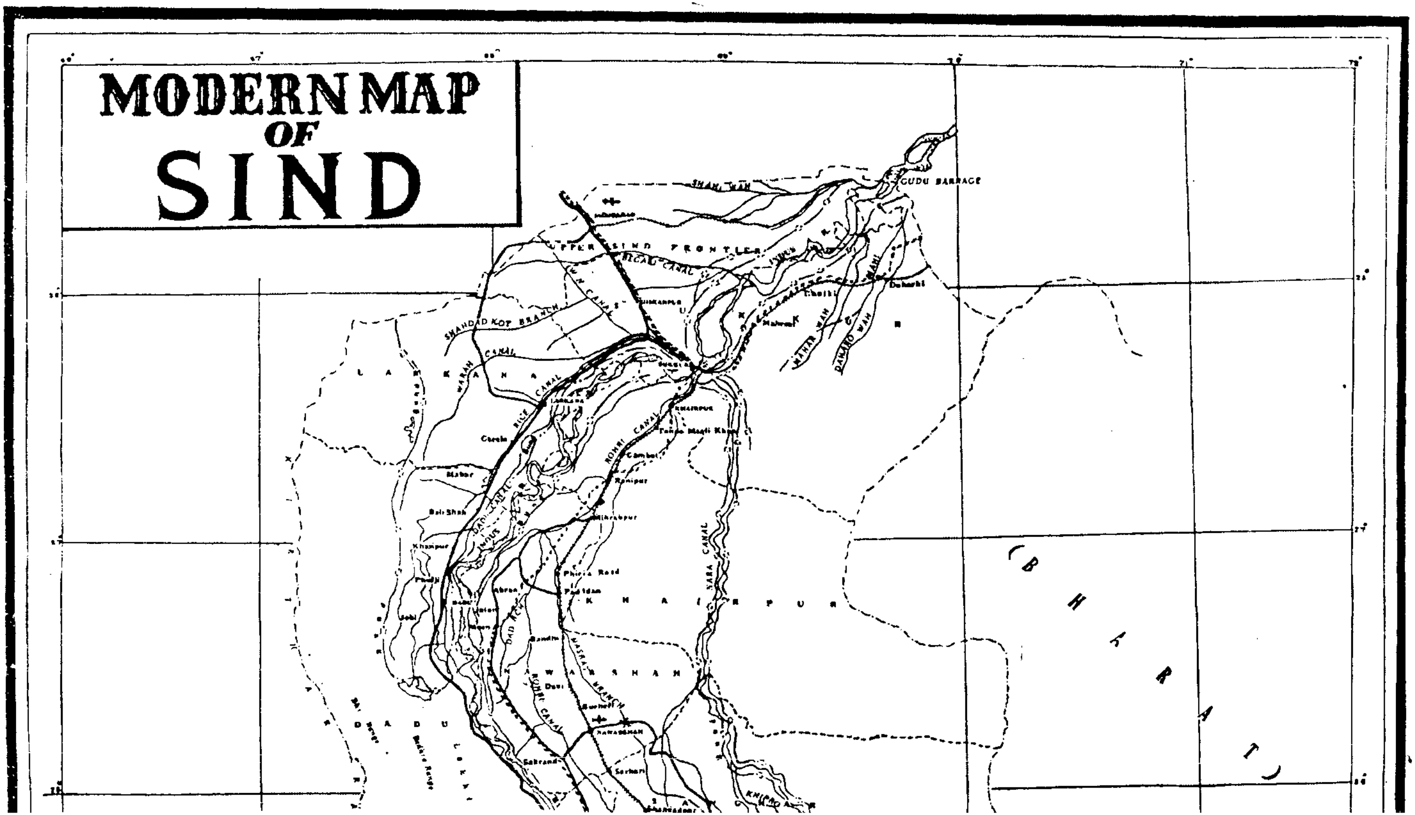
MODERN MAP OF SIND
GUDU BARRAGE
SHAHI WAH
UPPER SIND FRONTIER
BEGARI CANAL
INDUS
SHANDAD KOT BRANCH
WARAH CANAL
RICE CANAL
DADU CANAL
ROHRI CANAL
NARA CANAL
NASRAT BRANCH
MAHAR WAH
DAHARO WAH
Sukkur
Khairpur
Mehrabpur
Ranipur
Phiria Road
Padidan
Nawabshah
Sakrand
Dadu
Bandhi
Daur
Sehwan
Dahorki
KHAIRPUR
NAWABSHAH
DADU
LARKANA
(BHARAT)

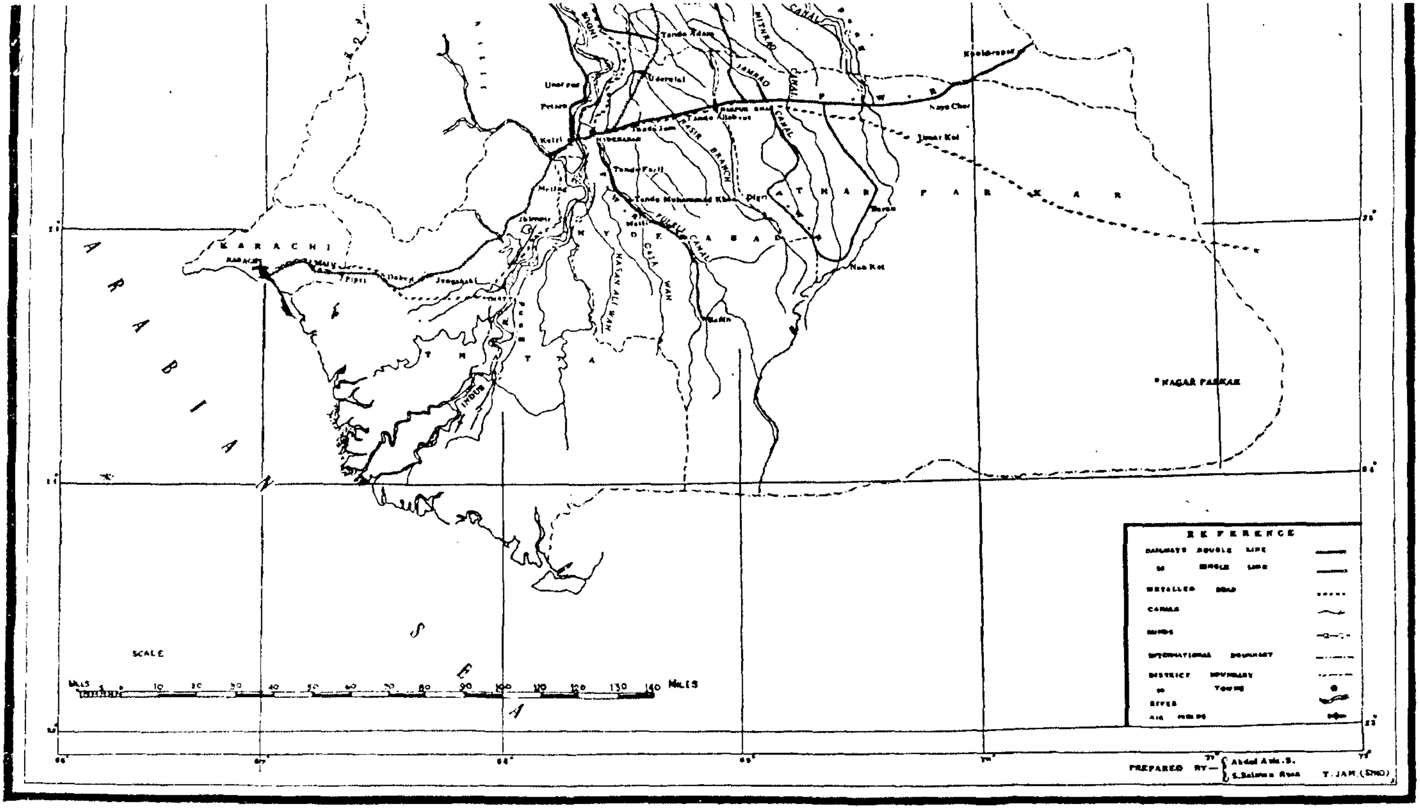
ARABIAN SEA
KARACHI
Karachi
Tatta
Hyderabad
Kotri
Tando Muhammad Khan
Tando Adam
Mirpurkhas
Badin
INDUS
FULELI CANAL
JAMRAO CANAL
NASIR BRANCH
HASAN ALI WAH
GAJA WAH
NAGAR PARKAR
THAR PARKAR
REFERENCE
SCALE
MILES
PREPARED BY

سندھ کی جغرافیائی اور موسمی کیفیات نے اس ملک کی تاریخ کے دھارے کو جس حد تک متاثر کیا ہے اس جلد میں اس کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس قسم کے جائزے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ مختلف علوم کے ماہرین کی طرف رجوع کیا جائے، مثلاً ماہرین علم ارضیات، بحریات، علم الاثار، جغرافیہ اور تاریخ، جن ماہرین سے استفادہ کیا گیا انھیں ذیلی نوٹ اور حوالہ جات میں بیان کردیا گیا ہے۔ عام طور پر تفصیلات، تنقید اور دوسرے بیانات جن کے ضمن میں کوئی سند پیش نہیں کی گئی ان کے متعلق میں نے اپنے ہی مشاہدات اور معلومات، تنقید اور دوسری اور معلومات پر تکیہ کیا ہے۔ سندھ اور یہاں کے باشندوں کے متعلق جو معلومات مجھے حاصل ہیں وہ اس علاقہ میں برسوں قیام کرنے اور اندرون ملک سفر کرنے کے دوران حاصل ہوئیں ہیں۔

ایچ ٹی لیمبرگ

Digitized By M. H. Panhwar Institute Of Sindh Studies, Jamshoro.